# طویل کہانی نمبر

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

# نیا دور

۹، ۱۰

[illegible] دہلی

قیمت پانچ روپے



شائع کردہ: پاکستان کلچرل سوسائٹی کراچی

ادارہ

ثناء اللہ

قمر سلطانہ

# ترتیب

'نیا دور' کا طویل کہانی نمبر آپ کے سامنے ہے۔ اس میں نو کہانیاں ہیں۔ سب کی سب طویل اور طبعزاد ان میں سے بعض کہانیاں ایک سال پہلے لکھی گئی تھیں اور بعض چھپنے سے چند دن پہلے۔ مختصر چیز لکھنا نسبتاً آسان ہے لیکن طویل چیز لکھنے کے لئے جب تک احساس خیال اور تکنیک فن کار کے ذہن میں بالکل واضح نہ ہوں طویل چیزیں نہیں لکھی جا سکتیں۔ اسی لئے بعض فن کاروں کو کئی کئی بار اپنے مسودے بدلنے پڑے۔ آپ کی رائے کو متاثر کئے بغیر ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ ہر کہانی کسی نہ کسی پہلو سے ایسی ضرور ہے کہ برسوں یاد رہے گی۔ اس شمارہ میں نئے لکھنے والے بھی شامل ہیں اور پرانے بھی، لیکن نئیوں نے بھی اپنی محنت اور ذہانت سے کہانی لکھنے کا حق ادا کر دیا ہے۔ اب رہا پسند و ناپسند کا معاملہ، تو وہ بالکل ذاتی ہوتا ہے لیکن ترتیب و انتخاب میں ہم نے 'حسب معمول' اپنے قارئین کرام کے مذاق کو پیش نظر رکھا ہے۔ پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ اجتماعی طور پر کوئی چیز سنی یا پڑھی جاتی تھی۔ سننے والوں میں ہر مذاق کے لوگ ہوتے تھے، کسی کو کوئی پہلو بھاتا تھا، کسی کو کوئی گوشہ۔ یہاں تک کہ اس چیز کے سارے حسن و قبح سامنے آجاتے تھے مگر اب کسی کو نہ اتنا شوق، نہ اتنی فراغت۔ نہ بحث و مباحثہ اور تبادلہ خیال کے مواقع۔ اسکول اور کالجوں کی تعلیم کا معاملہ ایسا ہو گیا ہے کہ توبہ بھلی۔ نہ تعلیم ہوتی ہے نہ ذہن کی صحیح تربیت۔ دو چار کتابیں پڑھ لیں۔ امتحان کا پرچہ حل کر دیا، فیل یا پاس ہو گئے، چلئے چھٹی ہوئی۔ اب سے پہلے اتنا تو ہوتا ہی تھا کہ طالب علم اپنے نصاب کے علاوہ دو چار اچھی بری کتابیں پڑھ لیا کرتے تھے۔ دوستوں میں اس کا تذکرہ کرتے تھے۔ بحث کرتے تھے، دوسروں

کی سنتے تھے اپنی سناتے تھے۔ کچھ مزا بھی ہوتی تھی۔ کچھ چرچے ہوتے تھے۔ ہم جماعتوں میں ایسے لڑکوں کی عزت بھی ہوتی تھی مگر اب تو یہ حال ہے کہ بی۔ اے کے طالب علم کو یہ تک نہیں معلوم کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ جدید دُنیا کے کیا تقاضے ہیں۔ کون کون سے ادیب کیا کیا لکھ رہے ہیں۔ اسے خود زندگی میں کیا کرنا ہے ـــــــ بہرحال یہ ایک لمبی داستان ہے جس کے ذیل میں ہماری ساری نام نہاد تعلیمی سرگرمیاں، مدرسوں کا انداز طبع اور معاشرتی عوامل آجاتے ہیں۔

ایک طرف تو یہ حال اور دوسری طرف یہ کہ لکھنے والوں پر اُکتا ہٹ اور بے زاری کی کیفیت طاری ہے۔ پُرانے سماجی اداروں اور اقدار سے ایمان اُٹھ چکا ہے۔ نئے اقدار اور معیار سامنے نہیں آئے ہیں اور سچ پوچھئے تو کسی نے ان کی ٹوہ لگانے کی کوشش بھی نہیں کی ہے۔ ویسے تو یہ بات بظاہر ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے کہ سماجی زوال کے ساتھ ادبی زوال کا ہونا لازم و ملزوم ہے لیکن یہ بات ہے غالباً بالکل لغو۔ اس لئے کہ میرؔ، غالبؔ، انیسؔ بھی سماج کے ایسے ہی دَور کی پیداوار ہیں۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے علاوہ بھی کوئی چیز ایسی ہے جس سے ادبی محرکات مُردہ یا زندہ ہوتے ہیں جس سے تخلیقی گرمی تیز ہوتی ہے یا سرد پڑتی ہے۔ وہ فضا، وہ محرکات، وہ عوامل کیا ہیں؟ اگر اس موضوع پر ہمارے اہلِ قلم اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں تو کسی نتیجہ پر پہنچا سکتا ہے۔

اب سنئے ادبی رسالوں کی بات۔ گرانی آہستہ آہستہ گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ کاغذ، طباعت، بلاک، ہر چیز گراں۔ نیوز پرنٹ پر کتاب یا دو ماہی، سہ ماہی رسالے چھپ نہیں سکتے۔ کرنافلی والے خدا ان کی حیات میں درازی بخشے، بے حد مہنگا کاغذ فروخت کرکے پانچ فی صد منافع کا اعلان بھی برسوں بعد کرتے ہیں۔ ادبی پرچے سسک سسک کر دم توڑ رہے ہیں۔ بڑی آن بان سے ایک پرچہ نکلتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ماہنامہ نکالنا ویسے بھی دشوار ہو گیا ہے۔ حکومت بے چاری بھی کیا کرے۔ اس کے اپنے مسائل ہیں۔ تہذیب کا معاملہ ایسا

اہم ہے کہ اس پر توجہ دی جائے۔ سیاسی جماعت کی سلامتی ظاہر ہے تہذیبی مسائل سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ آخر دنیا کی سب زندہ قوموں نے بغیر تہذیبی ترقی ہی کے تو ناموری حاصل کی ہے جو کچھ نیم سرکاری ادارے ہیں، ان کے پاس فنڈ ہیں سلیقہ نہیں، پچھلے سال حلقۂ ارباب ذوق کی طرف سے کتابوں کی اشاعت کا اعلان ہوا تھا مگر وہاں بھی ہنوز دلی دور است والا حساب ہے۔ مرکزی حکومت نے اپنے تازہ بجٹ میں کچھ رقم اس سلسلہ کے لئے مخصوص کی تھی۔ اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا۔ اب کچھ دنوں سے یہ وبا چلی ہے کہ جہاں اُردو کا ذکر آیا وہاں بی بنگلہ آکھڑی ہوئیں، اے لو دونوں گتھم گتھا ہو گئیں۔ اصل مقصد تو فوت ہو گیا جھگڑا باقی رہ گیا۔ اس میں سوکن کو کچھ مل گیا تو مل گیا بیاہتا منہ دیکھتی رہ گئی۔ ثالث بھی اس بات کو بھول بیٹھے کہ دونوں سرکاری زبانیں ہیں۔ دونوں کی ترقی شانہ بہ شانہ ہو تو کیا بات ہے۔ بنگلہ والے اُردو والوں کی اور اُردو والے بنگلہ والوں کی مدد کریں تو کچھ کام ہو۔ یہ سارے حالات ایسے پریشان کُن ہیں کہ آدمی سوچے تو پسینے چھوٹنے لگیں مگر ایسے ہی وقت میں تہذیب کی شمع روشن کرنا سب سے بڑا کام ہے۔ "نیا دور" نے مقدور بھر یہی کوشش کی ہے کہ معاشرہ میں تہذیبی اقدار کی اہمیت کا احساس اور ذہنی سنجیدگی پیدا ہو۔ "پاکستان کلچرل سوسائٹی" کا قیام بھی اسی لئے عمل میں لایا گیا تھا۔ یوں تو اس تہذیبی ادارے کے پروگرام میں بہت کچھ شامل ہے ——— کلچرل اکاڈمی، کلچرل کالج، اشاعت گھر، پریس، کتب خانہ، ادیبوں کو سالانہ پرائز وغیرہ۔ لیکن اب تک بہت کچھ ہاتھ پیر مارنے کے باوجود ہم آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ اس بار ہم نے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ہمارا مقصد اعلیٰ اور معیاری کتابیں شائع کرنے کا ہے۔ ایسی کتابیں جن سے تہذیبی مسائل کے سمجھنے میں مدد ملے ——— بھیک مانگنے کے تو ہم قائل نہیں البتہ اتنا ضرور کہیں گے کہ اگر کھاتے پیتے لوگ ہر ماہ کچھ اُردو کی کتابیں اور رسالے خرید لیا کریں تو اس سے اُردو کی ترقی میں بہت مدد مل سکتی ہے۔ پڑھنے کی کوئی قید نہیں، جیسے پرانے وقتوں میں ہوتا تھا کتابیں اور رسالے "زیب و زینت" کے لئے رکھ لی جاتیں تا کہ سند رہیں

اور وقتِ ضرورت کام آویں۔ ریڈیو پاکستان والوں نے تو "آرمیتق جمال" کے لئے لکوئی کی خوب صورت ڈمیاں رکھ چھوڑی ہیں۔ انہیں ہاتھ لگائیے تو SHOCK , ہوتا ہے۔ غالباً ریڈیو والے سرئیلزم کی تحریک سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ بہر حال تہذیبی اظہار کے سلسلہ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے۔

جب سے میاں افضل حسین صاحب پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ہوئے ہیں اُردو اور السنۂ شرقیہ پر مسلسل عتاب نازل ہو رہا ہے۔ صاحب عقل و شعور اس بات کا فیصلہ آسانی سے کر سکتا ہے کہ کوئی قوم، کوئی معاشرہ یا کوئی تہذیب اپنے اسلاف کے سرمایہ کو نظر انداز کر کے زندہ نہیں کہلا سکتی۔ مغرب والوں کی ویسے تو ہم پیروی کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کا اتباع و تبلیغ بھی کرتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ انہوں نے نہ صرف اپنے قدیم تہذیبی سرمائے کو مختلف انداز سے اُجاگر کیا بلکہ مشرقی علوم اور زبانوں کی طرف بھی گہری توجہ دی۔ ویسے تو ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کا کام بھی فضول ہی تھا مگر اسے کیا کیا جائے کہ انہوں نے اسے بھی سر کر کے چھوڑا۔ پنجاب یونی ورسٹی آزادی سے قبل بھی پاک و ہند کا ایک ایسا ادارہ تھا جہاں اُردو اور السنۂ شرقیہ کی ترویج و ترقی کا کام بہت زیادہ ہوتا تھا۔ آزادی کے بعد توقع تھی کہ اس کام کی طرف اور زیادہ توجہ دی جائے گی اور جدید اصولوں کے پیشِ نظر کام کچھ اس ڈھنگ سے کیا جائے گا کہ مغرب والے بھی اس سے استفادہ کر سکیں گے، اور اس طرح علوم شرقیہ اور اُردو کے اثرات بڑھ سکیں گے، مگر افسوس کا مقام ہے کہ پنجاب یونی ورسٹی میں ان علوم کو ثانوی حیثیت دے کر نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس بات پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ اسی سلسلہ میں "انجمن طلبائے قدیم، اورینٹل کالج لاہور" کی طرف سے حال ہی میں ایک جلسہ ہوا جس میں فیض احمد فیض نے صدارت کی۔ اس جلسہ میں مختلف خطبات اور تجاویز پیش کی گئیں جن کے مطالعہ سے اُس تشویش کا اظہار ہوتا ہے، جس کا

ذکر ہم نے اِن سطور میں کیا ہے، ہم "انجمن طلبائے قدیم" کی تجاویز سے پورا پورا اِتفاق کرتے ہیں، اور حکومتِ مغربی پاکستان سے اپیل کرتے ہیں کہ اس سے قبل یہ معاملہ خرابی کی صورت اختیار کرے وہ فوراً اس میں مداخلت کرکے اپنی دانش مندی اور معاملہ فہمی کا بروقت ثبوت دے۔

یہ وبا اِس وقت اپنے عروج پر ہے کہ ہندوستان کے ناشر پاکستان کی کتابیں اور پاکستان کے ناشر ہندوستان کی کتابیں بغیر کسی اجازت کے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ شائع کر رہے ہیں جس سے اُردو زبان و ادب کو حد درجہ نقصان پہنچ رہا ہے۔ ہم حکومت کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ وہ اس سلسلہ میں جلد کوئی اقدام کرے اور حکومتِ ہند سے "کاپی رائٹ" کا معاہدہ کرکے اس "بے ایمانی" کا ازالہ کرے۔ "انجمن ادبی رسائل" اور "انجمن ناشرین" کا بھی فرض ہے کہ وہ بھی جلد کوئی قدم اُٹھا کر اس معاملہ کو آگے بڑھائیں۔

'نیا دور' کا اگلا شمارہ تقریباً تیار ہے اور دو ماہ کے اندر اندر شائع کیا جا سکے گا۔ جن اداروں نے اپنی کتابیں ہمیں تبصرے کے لیے بھیجی تھیں، ان پر تبصرہ اگلے شمارہ میں شامل کیا گیا ہے۔

'نیا دور' کا سرورق اِس بار فضل الرحمٰن صاحب نے بنایا ہے۔ فضل الرحمٰن کو رنگوں کے امتزاج اور تاثر کا بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ 'نیا دور' موصوف کا حد درجہ شکر گزار ہے ساتھ ساتھ ہم عبدالغفور صاحب کے بھی شکر گزار ہیں، جنہوں نے ہمیں اپنے فنی مشوروں سے ممنون فرمایا۔



غلام عباس



عزیز احمد



بلونت سنگھ



ابوالفضل صدیقی



شوکت صدیقی



ضمیرالدین احمدؒ



ناصر شمسی



واجدہ تبسم



صادق حسین



حسن حامد

(نیلا گلدان) ——— سیزاں

# کن رس

غلام عباس

بعض لوگوں کو گانے بجانے سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے، خود چاہے بے سُرے ہی کیوں نہ ہوں مگر سریلی آواز پر جان دیتے ہیں۔ راگ اُن پر سحر کا سا اثر کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ گانے بجانے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں جیسے کسی کو کوئی نشہ لگ جائے۔ صاحبِ ثروت ہوئے تو عمر بھر گویّوں کی پرورش کرتے رہے۔ نہیں تو اُستادوں کی جُوتیاں سیدھی کر کے ہی اپنے ذوق کی تسکین کر لی۔ دراصل ان ہی لوگوں کے لیے موسیقی روح کی غذا کے مصداق ہوتی ہے۔ گانے بجانے والوں کی اصطلاح میں ایسے لوگوں کو کن رسیا کہتے ہیں۔

فیاض کو بھی قدرت کی طرف سے موسیقی کا کچھ ایسا ہی ذوق عطا ہوا تھا۔ مگر بدقسمتی سے ایک تو وہ پیدا ہی ایک غریب وثیقہ نویس کے گھر ہوا تھا دوسرے اس کا باپ بڑا سخت گیر اور مذہب کا پابند تھا۔ یہی وجہ تھی، کہ فیاض کا یہ ذوق پنپنے نہ پایا۔ پھر بھی اُس نے بچپن سے لے کر جوانی تک جیسے تیسے موسیقی سے اپنی دلبستگی قائم رکھی۔

اسکول میں حمد گانے والے لڑکوں میں اُس کا نمبر ہمیشہ اوّل رہا۔ قوالی اور سماع کی محفلوں میں وہ رات رات بھر جاگا کیا۔ کیونکہ باپ ان میں شریک ہونے کی اجازت دے دیتا بشرطیکہ یہ پاس پڑوس ہی میں منعقد ہوتیں۔ شام کو کہیں چوراہے پر یا کسی باغ میں انگریزی بینڈ بج رہا ہوتا، تو فیاض دُور ہی سے اُس کی آواز سُن تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں پہنچ جاتا۔ اور بڑے غور سے سازوں پر مغربی موسیقی سُنتا رہتا اور جب تک باجے والے اپنے باجے اور ڈھولکیا جس نے وردی پر شیر کی کھال پہنی ہوتی، اپنا ڈھول سنبھال، لاری میں بیٹھ رخصت نہ ہو جاتے وہ وہاں سے نہ ہلتا۔ وہ جو سڑک کی پٹڑی پر میاں، میلی سی چادر بچھا، ہارمونیم کھول بیٹھ جاتا ہے۔ ڈھولک گھٹنے تلے دبا، گھونگھٹ کے اندر سے کراری، کوئل کی سی آواز میں الاپنے لگتی

ہے۔ اُن کا گانا فیاض گھنٹوں بڑی محویت سے سُنا کرتا، اور یوں گھر سے غائب رہنے پر اکثر پٹا بھی کرتا۔

اُس کی یہ بڑی تمنا تھی، کہ مَیں بھی کوئی سستا سا ہارمونیم خریدوں۔ اور گھر میں گانے بجانے کی مشق کیا کروں۔ مگر وہ جانتا تھا۔ کہ باپ کے جیتے جی اُس کا یہ ارمان پورا ہونا محال ہے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک بار جب اُس کا باپ کسی کام سے پردیس گیا تھا تو وہ کچھ دوستوں کے اصرار پر تھیئٹر دیکھنے گیا۔ یہ پارسیوں کی کوئی بڑی مشہور کمپنی تھی۔ جس میں بڑے بڑے نامی گرامی ایکٹر اور گوّیے ملازم تھے۔ کھیل بھی ایسا تھا۔ کہ اُس میں شروع سے آخر تک گانا ہی گانا تھا۔ اُس رات تمام وقت فیاض پر بے خودی و سرمستی کا عالم طاری رہا۔ اور پھر برسوں اُس کے کانوں میں اُن نغموں کی گونج رہی۔

اسکول کی تعلیم ختم کی۔ تو باپ نے تنگدستی کے باوجود اُسے کالج میں داخل کرا دیا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ لڑکا جتنی زیادہ تعلیم حاصل کرے گا، اتنی ہی اچھی اسے نوکری ملے گی۔ کالج میں فیاض نے خود کو زیادہ آزاد محسوس کیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ باپ کی نظروں سے اوجھل رہ کر اسے کالج کی "بزمِ موسیقی" میں اپنے ذوق کی تسکین کا سامان نظر آنے لگا۔

باپ کا قاعدہ تھا کہ رات کو جب تک فیاض بستر پر نہ لیٹ جائے، وہ خود آرام نہیں کرتا تھا۔ اور پھر رات کو ایک دو دفعہ اُٹھ کر وہ بیٹے کے پلنگ کے پاس ضرور جاتا۔ ایک دفعہ رات کو پچھلے پہر اُس نے فیاض کو نیند میں بڑبڑاتے سُنا۔ وہ اُٹھ کر اُس کے پلنگ کے پاس گیا فیاض کی زبان سے بے خبری میں عجیب عجیب الفاظ نکل رہے تھے۔ کچھ انگریزی کچھ اُردو بیچ بیچ میں کبھی وہ ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتا کبھی یکبارگی کراہ اُٹھتا۔ باپ دیر تک یہ ماجرا دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ اپنے بستر پر آ کر لیٹا تو آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ رات بھر وہ طرح طرح کے اندیشوں میں کھویا رہا۔ اگلے ہی روز اُس نے بہو کی تلاش شروع کر دی۔ اور چند ہی دنوں میں ایک اپنے سے بھی غریب گھرانے کی مگر خوش جمال لڑکی سے فیاض کی شادی کر دی اور یوں بیٹے کی آوارگی کے امکانات کا بڑی حد تک سدِباب کر دیا۔

کالج میں فیاض کا تیسرا سال تھا جب اس کے باپ نے اچانک انتقال کیا۔ ماں اس سے ایک برس پہلے ہی سدھار چکی تھی۔ چنانچہ اب فیاض آزاد تھا۔ مگر یہ آزادی اپنے ساتھ کئی ذمہ داریاں لے کر آئی تھی۔ سب سے اہم مسئلہ اپنی اور اصغری کی، جو اب ایک بچی کی ماں بن چکی تھی

کا تھا کیونکہ باپ نے اپنے بعد کچھ بھی اثاثہ نہ چھوڑا تھا اور فیاض کوئی ایسا دھندا نہیں جانتا تھا جس سے گزارے کی جلد ہی کوئی صورت نکل آتی۔ اس میں شک نہیں کہ جتنی تعلیم اس نے حاصل کی تھی، وہ اسے کسی دفتر میں ایک معمولی کلرک کی جگہ دلانے کے لئے کافی تھی۔ مگر اس ادنیٰ ملازمت کا حاصل کرنا بھی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لئے بھی ہزاروں جتن کرنے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ فیاض نے مہینوں سڑکوں کی خاک چھانی، دفتروں میں دھکے کھائے، پھر کہیں باپ کے ایک پرانے دوست کی سفارش سے اُسے آبکاری کے محکمے میں ایک عارضی کلرک کی جگہ مل سکی۔

اُس نے دن رات کی محنت اور اپنی قابلیت سے جلد ہی دفتر میں اپنے لئے مستقل جگہ پیدا کر لی۔ اس کے بعد اسے اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر ہوئی۔ کیونکہ دوسرے بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی اخراجات خاصے بڑھ گئے تھے۔ چنانچہ دن کو دفتر میں کام کرتا۔ اور رات کو گھروں پر جا کر لڑکوں کو پڑھاتا۔ اور اس طرح بڑی مشکل سے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا۔

اِس زمانے میں اُس کا ذوقِ موسیقی جیسے فائلوں کے انبار اور حساب کے قاعدوں میں گم ہو کے رہ گیا تھا پھر بھی کبھی کبھی رات کو پچھلے پہر کے سناٹے میں اگر وہ جاگ رہا ہوتا۔ اور کوئی تانگے والا سنسان سڑک پر سرپٹ گھوڑا دوڑاتا، اپنی قدرتی سُریلی اور پاٹ دار آواز میں کسی پنجابی گیت کا بول گاتا ہوا نکل جاتا۔ تو اُسے سُن کر فیاض کے دل میں ہوک سی اُٹھنے لگتی۔

دھیرے دھیرے اُس کی حالت سنبھلتی گئی یہاں تک کہ دس سال کے عرصے میں وہ اپنی قابلیت محنت، اور خوش اخلاقی کی وجہ سے اُسی دفتر میں ہیڈ کلرک بن گیا۔ سب افسر اس کے کام سے خوش تھے۔ اور وہ بھی اپنی حالت پر مطمئن سا ہو گیا تھا۔ اُسے جو مشاہرہ ملتا تھا، وہ اس کے بیوی بچوں کے گزارے کے لئے کافی تھا، اور اب اُسے غیروں کے بچوں کو پڑھانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

اُس کا معمول تھا کہ وہ چراغ جلنے سے پہلے دفتر سے نہیں اُٹھتا تھا۔ دفتر سے نکل کر وہ اس باغ کا راستہ لیتا۔ جو فصیل کے ساتھ ساتھ شہر کے گرداگرد چلا گیا تھا۔ اُس کا مکان شہر کے اندر ایک تنگ اور گنجان آباد محلے میں تھا۔ شہر سے باہر باہر باغ سے ہو کر گھر پہنچنے میں اُسے قریب قریب دگنی مسافت طے کرنی پڑتی۔ پھر بھی وہ اُس راستے کو شہر کے تنگ متعفن اور پُر پیچ راستے پر ترجیح دیتا وہ باغ کی کشادہ سڑک پر، جس پر سُرخ بجری بچھی تھی اور جو صرف پیدل چلنے والوں کے لئے مخصوص تھی، مزے مزے قدم اُٹھاتا خاصی دیر میں گھر پہنچا کرتا۔ اس ہواخوری سے اُس کے دن بھر کی محنت کے تھکے ہوئے دماغ کو آسودگی حاصل ہوتی۔ اور جس وقت وہ گھر پہنچتا تو خاصا تازہ دم ہوتا۔ اُس کی

بیوی اور بچے ملازمت کے ابتدائی زمانے ہی سے اُس کے دیر سے گھر پہنچنے کے عادی ہو چکے تھے۔

ایک دفعہ ہفتہ کی ایک رات کو وہ معمول سے بھی کچھ زیادہ ہی دیر میں دفتر سے نکلا۔ گلابی جاڑوں کے دن تھے۔ ابر چھایا ہوا تھا اور اکا دُکا بوند بھی اُس کے مُنہ پر آ پڑتی تھی۔ مگر وہ حسب عادت باغ کی سڑک پر ٹہلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سڑک کے کنارے کنارے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے کھمبے تھے جن کی روشنیوں کی قطار اس اندھیری رات میں سڑک کے ساتھ ساتھ خم کھاتی ہوئی دُور سے بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔

فیاض اپنی دُھن میں مست چلا جا رہا تھا۔ کہ اچانک اُس کے کانوں میں کسی ساز کے بجنے کی دھیمی دھیمی آواز آنی شروع ہوئی۔ جوں جوں وہ قدم بڑھاتا گیا، آواز بلند ہوتی گئی۔ آخر جب وہ قریب پہنچا۔ تو اُس نے بجلی کے ہنڈے کی روشنی میں دیکھا۔ کہ سڑک کے قریب ہی باغ کے ایک حصے میں ایک درخت کے نیچے کوئی شخص فقیروں جیسی گُدڑی اوڑھے، سرکاری بنچ پر آ کر ڈول بیٹھا ایک بڑا سا ساز بجا رہا ہے اُس کی آنکھیں بند ہیں، اور چہرے سے ایک عجیب وارفتگی ظاہر ہو رہی ہے۔

اِس موسیقی میں بلا کی کشش تھی۔ نغمہ تھا کہ بے اختیار دل میں اُترا جاتا تھا۔ ٹکی ہوئی رات میں ایک ایک سُر واضح اور الگ الگ سُنائی دے رہا تھا۔ عجیب سماں بندھا ہوا تھا۔ فیاض کے قدم آپ ہی آپ رُک گئے اور وہ سازندہ کی طرف رُخ کر کے ایک محویت کے عالم میں اُس کی موسیقی سُننے لگا۔

سازندہ آنکھیں بند کیے، اِس بات سے بے نیاز کہ کوئی اُس کے کمال پر دھیان دے رہا ہے یا نہیں دیر تک گت پر گت بجاتا رہا۔ اُس کی انگلیاں تھکنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ وہ کبھی اِس تار پر دوڑتیں، کبھی اُس تار پر۔ دوسرے ہاتھ سے وہ تاروں پر ضربیں لگا رہا تھا، اس قدر تیزی کے ساتھ کہ اُن سے ایک مسلسل ارتعاش کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ بلاشبہ اسے اپنے ساز پر اُستادانہ مہارت حاصل تھی، بلکہ اُس سے بھی کچھ زیادہ۔ اُس کے ہاتھ میں وہ رَس تھا جو کوشش سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ قدرت کا عطیہ ہوتا ہے۔

فیاض کے دل پر اِس موسیقی کا کچھ ایسا اثر ہوا۔ جیسے کوئی سوئی ہوئی چیز دفعتہً جاگ اُٹھے۔ اس کے دل میں پہلے تو ایک ہیجان پیدا ہوا جس کی وجہ سے اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ اُس کے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے۔ نقاہت محسوس ہونے لگی۔ جیسے جسم میں سے جان نکلی جا رہی ہو۔ راگ سُن کر اکثر اُس پر رقت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے

مگر اس رات کی موسیقی کا عالم ہی کچھ اور تھا۔ اس موسیقی نے تو جیسے جادو کرکے اُسے پتھر کا بنادیا تھا۔

تھوڑی دیر اور یہ سماں بندھا رہا۔ اس کے بعد سازندے نے ساز بجانا بند کر دیا۔ اور آنکھیں کھول پہلی مرتبہ اپنے واحد سامع کو دیکھا، جو کچھ فاصلے پر سڑک پر کھڑا تھا۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ بھی نہ چل دے، سازندے نے جلدی سے ہانک لگائی :-

"بابوجی کی خیر ہو۔ مل جائے کوئی دھیلی پاؤلا فقیر کو نشے پانی کے لئے"

فیاض چونک پڑا۔ اُس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس وقت اتفاق سے اُس کی جیب میں صرف ایک دونی ہی تھی۔ ایسے صاحبِ کمال کو یہ حقیر نذرانہ پیش کرتے ہوئے اُسے بڑی ندامت محسوس ہو رہی تھی۔

" اُستاد" آخر اُس نے سازندہ کی طرف بڑھتے ہوئے ہمت کرکے کہا " اس وقت تو یہی قبول کرو۔ ہاں اگر کھانا کھانا ہو۔ تو میرے ساتھ چلے چلو۔ میرا گھر یہاں سے قریب ہی ہے"

سازندہ نے لمحہ بھر تامل کیا۔ ساز بجاتے بجاتے وہ یقیناً تھک گیا تھا اور بھوک بھی لگنے لگی تھی۔ ایسے میں پکا پکایا گرم گرم کھانا مل جائے تو کیا بُرا تھا۔

"اچھا بابوجی تمہاری خیر ہو چلتا ہوں"

اور وہ ساز بغل میں دبا، گدڑی سنبھال بنچ سے اُٹھ کھڑا ہوا، اور فیاض کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ سڑک پر بجلی کی روشنی میں فیاض کو اُس کا حلیہ زیادہ صاف نظر آنے لگا۔ اُس کے سر پر لمبی سی ترکی ٹوپی تھی جو بہت میلی ہو گئی تھی۔ اور جس کا پھُندنا بھی ٹوٹ گیا تھا۔ لمبے لمبے پٹے تھے۔ جن میں نکاس بھوس کے تنکے اُلجھے ہوئے تھے۔ کھچڑی ڈاڑھی جو کئی دن سے منڈائی نہیں گئی تھی آنکھیں سُرخ سُرخ گویا دُکھنے آئی ہوں۔ ان میں سے پانی رِستا ہوا۔ اس کا لباس جو کُرتے پاجامے اور کالی واسکٹ پر مشتمل تھا۔ سخت بوسیدہ اور میلا تھا۔ پاؤں میں ٹوٹا ہوا بوٹ، جو اُس کے پاؤں کے ماپ سے بڑا تھا، اور اُسے جوتے کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنا پڑتا۔ پیٹھ میں تھوڑا سا کُوب، جو شاید جھک کر ساز بجانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

" یہ ساز جو تم بجا رہے تھے اس کو کیا کہتے ہیں ؟" فیاض نے چلتے چلتے پوچھا۔

" اس کو سرود کہتے ہیں، تمہاری خیر ہے بابوجی "

"سرود؟"

"جی ہاں"

"بہت کمال کا بجاتے ہو اُستاد تم تو"

"اجی بابو جی، کمال تو بس خدا کی ذات کو حاصل ہے"

"میں نے تو آج تک اتنا اچھا ساز بجاتے کسی کو نہیں سُنا"

"کرم ہے کلیر والے بابا کا۔ میں کس لائق ہوں بابو جی"

"کب سے یہ ساز بجا رہے ہو؟"

"کوئی چالیس برس کا ریاض ہے بابو جی۔ چار برس کا تھا جب بجانا شروع کیا تھا۔ باوا نے چھوٹا سا بنوا دیا تھا کھیلنے کے لئے۔ کیونکہ میں اُن کا سرود بجانے کے لئے بہت مچلا کرتا تھا۔ بس میں اس کھلونے سے کھیلتا رہتا۔ کبھی کبھی اپنے تِن تَان بھی کر لیا کرتا۔

"تو بابو جی، اللہ تمہاری خیر کرے ایک دن کیا ہوا۔ کہ صبح ہی صبح اُستاد دلدار خاں (نام لینے کے ساتھ ہی اس نے دو انگلیوں سے اپنے کان کی لو کو چھوا) باوا سے ملنے گھر پر آئے۔ اُستاد کے سرود کی ساری خدائی میں دھوم تھی مگر اللہ بخشے بجا چُوں کی آپ بیٹے ہاتھ کی کلائی پر چکّی کا پاٹ گر پڑا تھا اور ہاتھ بیٹھ گیا تھا۔ خود بجانا چھوڑ دیا تھا بس سکھلایا کرتے تھے وہ بھی رجواڑوں میں۔ باوا سے اُن کا بڑا یارانہ تھا۔

"ہاں تو بابو جی وہ دونوں آنگن میں چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے، مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں اور میں ذرا اُن سے ہٹ کے زمین پر اپنے اُسی کھلونے سے کھیل رہا تھا، ایکا ایکی اُستاد دلدار خاں (کان کی لو چھو کر) باوا کی بات کاٹ کر چلّا اُٹھے" ذرا سُننا میاں یہ لونڈا کیا بجا رہا ہے؟"

"تو بابو جی مولا خیر کرے تمہاری، دونوں نے سُنا تو میں گُن کری کی گت بجا رہا تھا۔ باوا نے کلام مجید اُٹھا لیا کہ میں نے بچے کو بتایا ہو تو اسی کی مار پڑے۔ بلکہ اس ساز کے تو کبھی تار بھی درست نہیں کئے۔ اس پر اُستاد باوا سے کہنے لگے، میاں یہ لونڈا تو تم مجھے دے دو۔ دیکھو میرا ہاتھ عیبی ہو گیا ہے دل میں بہت ارمان رہ گئے ہیں۔ اب میری جگہ یہ لڑکا دُنیا کو بتائے گا کہ دلدار خاں (کان کی لو چھو کر) کیا کچھ جانتا تھا۔

"تو بابو جی بڑی حیل حجت ہوئی آخر باوا مان گئے۔ کیونکہ مجھ سے بڑے دو بیٹے اور تھے اُن کے۔ استاد مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ بس اُس دن سے میں اُن کی خدمت میں رہنے لگا چِلّوں پر آگ

رکھتے رکھتے چٹکیاں جل جل گئیں۔ چارچوٹ کی مار مارا کرتے تھے بابوجی مجھے۔ آج جو چار آدمیوں میں میری واہ واہ ہوتی ہے اُستاد دلدار خاں (کان کی لو چھو کر) ہی کی جوتیوں کا صدقہ ہے بابوجی"

فیاض بڑی دلچسپی سے یہ قصہ سُنتا رہا۔ جب ختم ہوا تو دونوں کچھ دیر چُپ چاپ چلتے رہے۔

"تمہارا نام کیا ہے۔ بابوجی؟" اچانک سردیئے نے سوال کیا۔

"مجھے فیاض کہتے ہیں"

"ماشاءاللہ سے طبیعت کے بھی فیاض ہو۔ اسم بامسمّیٰ اور کام کیا کرتے ہو بابوجی؟"

"میں ایک دفتر میں ملازم ہوں"

"کیا تنخواہ ملتی ہے تمہیں بابوجی"

"کچھ زیادہ نہیں مگر شکر ہے گزارہ ہو جاتا ہے"

"پھر بھی کتنی؟"

"یہی کوئی ڈیڑھ سو"

"اور بچے کتنے ہیں ماشاءاللہ سے تمہارے؟"

"دو ۔۔۔"

"لڑکے یا لڑکیاں؟"

"لڑکیاں"

یہ سُن کر سردیئے نے زبان سے افسوس کا ایک مہمل کلمہ نکالا۔

"خیر بابوجی" وہ بولا "اللہ کی دین ہے۔ جیتی رہیں اور بابوجی ۔۔۔۔؟"

فیاض تابڑ توڑ ان سوالوں کا جواب دیتے دیتے زچ ہو گیا۔ اُس نے اس سلسلے کو روکنے کے لئے خود یہی حربہ استعمال کرنے کی سوچ لی۔ یعنی خود اُس سے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ اُسے معلوم ہوا کہ سردیئے کا نام حیدری خاں ہے۔ وہ پیار خاں کا چھوٹا بھائی ہے جو کسی مہاراجہ کے ہاں "پان سے" روپے پر ملازم ہے۔ ایک بڑا بھائی اور تھا۔ وہ بھی کسی رجواڑے میں تھا۔ مگر کسی نے دشمنی سے اُسے زہر دے کر مار ڈالا۔ اُس کا اپنا گھر در کوئی نہیں ہے۔ اپنی بدمزاجی کی وجہ سے اُسکی خاندان بھر میں کسی سے نہیں بنتی۔ اُس کی طبیعت میں آزادی اور فقیری ہے۔ وہ کسی کا دبیل ہو کر

نہیں رہ سکتا۔
جس وقت وہ دونوں باغ سے نکل شہر کے اندر داخل ہوئے تو رات کے کوئی دس بجے کا عمل ہوگا۔ فیاض حیدری خاں کے آگے آگے چلتا، راستہ دکھاتا، دو تین گلیوں سے گزرتا ہوا آخر اُسے اپنے بالاخانہ کے نیچے لے آیا۔
"اُستاد تم ذرا یہاں گلی میں ٹھہرو" اُس نے کہا "میں اوپر جاکر پردہ کرا دوں"
"بہت دیر نہ لگانا بابو جی اللہ تمہاری خیر کرے"
فیاض سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ اُس کی بیٹیاں تو سو گئی تھیں۔ مگر اصغری حسب معمول اُس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ فیاض نے مختصر الفاظ میں اُسے حیدری خاں سے ملنے اور اپنے ساتھ لانے کا حال سُنایا اور تاکید کی کہ جلدی سے کھانا گرم کرلو۔
"یہاں داتو فقیروں کا سا ہے" آخر میں اُس نے کہا۔ "مگر میں نے اِتنا بڑا صاحب کمال اپنی عمر میں کبھی نہیں دیکھا۔ اُفوہ کس غضب کا ساز بجاتا ہے۔ جادو ہے جادو اس کی اُنگلیوں میں"
جس وقت وہ یہ کہہ رہا تھا تو اُس کا ذہن اُس لذّت کو یاد کر رہا تھا جو تھوڑی دیر ہوئی حیدری خاں کی موسیقی سے اُسے حاصل ہوئی تھی۔
فیاض لالٹین لے کر نیچے گیا اور حیدری خان کو اوپر بیٹھک میں لے آیا۔ اُس کے گھر میں باورچی خانہ کے علاوہ دو کمرے تھے۔ ایک بڑا جس میں وہ، اُس کی بیوی اور لڑکیاں رات کو سویا کرتیں دوسرا کچھ چھوٹا جو سیڑھیاں چڑھتے ہی سامنے پڑتا اور بیٹھک کا کام دیتا۔ فیاض اکثر وہاں بیٹھ کر دفتر کا کام کیا کرتا۔ اس میں ایک پُرانی دری بچھی تھی۔ ایک چھوٹی سی میز۔ دو تین کرسیاں اور کتابوں کی ایک الماری تھی۔
حیدری خاں نے سرود کو احتیاط سے کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ خود دری پر بیٹھ گیا اور گردن پھرا پھرا کر گھر کے در و دیوار کا جائزہ لینے لگا۔
"کیا کرایہ دیتے ہو بابو جی اس کا؟" اس نے پھر سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔
"پندرہ روپے"
"افوہ! اتنے سے مکان کے پندرہ روپے۔ بہت کرایہ دیتے ہو تم تو بابو جی۔ بجلی بھی تو ہے نہیں اس میں۔"
اس کی چندھی آنکھیں پیتل کے اس پرانے لیمپ پر جمی ہوئی تھیں جو تپائی پر روشن تھا۔

اور جس کی چمنی کچھ کچھ دھواں دے رہی تھی۔

"ہاں خاں صاحب کرایہ کچھ زیادہ ہی ہے" فیاض نے کہا، "کیا کروں مدت سے یہیں رہتا ہوں۔ جی لگ گیا ہے۔"

ایک لمحہ خاموشی رہی۔ پھر حیدری خاں بول اٹھا

"لے اب بابو جی جلدی سے کھانا لے آؤ۔ اللہ تمہاری خیر کرے۔"

تھوڑی دیر میں اس کے سامنے دری پر ایک چھوٹے سے دسترخوان پر کھانا چُن دیا گیا۔ کھانا تھا تو معمولی سا مگر پکانے والی نے ایسے سلیقے سے پکایا تھا کہ حیدری خاں کی زبان چٹخارے لینے لگی۔

"خوب پیٹ بھر کر کھاؤ۔ اُستاد" اور یہ کہہ کر فیاض نے اپنے حصے کا کھانا بھی جو وہ مدرسے اُٹھا لایا تھا اس کے سامنے رکھ دیا۔ موسیقی کا ابھی تک اس پر ایسا اثر تھا کہ اس کو کھانے کی ذرا اشتہا نہ تھی۔

"بس بس بابو جی" حیدری خاں بولا۔ فقیر کا تو بس دو نوالوں ہی میں پیٹ بھر جاتا ہے۔ لے اب چائے پلوا دو۔ اللہ تمہاری خیر کرے۔"

"چائے ابھی آتی ہے۔ میں نے کیتلی چولھے پر رکھوا دی ہے۔"

برتن ہٹا دیئے گئے اور فیاض، حیدری خاں کے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا۔ اور بڑی اشتیاق بھری نظروں سے اس کے سرود کو دیکھنے لگا۔ حیدری خاں اس کے اشتیاق کو بھانپ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنا ساز اٹھایا اور فیاض کی طرف بڑھا دیا۔

"لو شوق سے دیکھو بابو جی،" اس نے کہا "ایسا ساز بھی تم نے کم ہی دیکھا ہوگا۔ یہ میرے اُستاد دلدار خاں (کان کی لَو چھو کر) کی نشانی ہے۔ بڑے بڑے گویوں نے ہزاروں روپے کا لالچ دے کر مجھ سے یہ ساز خریدنا چاہا۔ پر میں نے ٹھکرا دیا۔ میری تو جان ہے اس میں۔ جیسے جن کی جان طوطے میں تھی۔ مجھے کوئی لاکھ روپے بھی دے تو میں اسے اپنے سے جُدا نہ کروں۔"

فیاض ساز کو گود میں لے کر بڑے غور سے دیکھنے لگا۔ اس کی عجیب سی بناوٹ۔ اس کی درجنوں کھونٹیاں، اس کا بڑا سا ڈھانچا جس پر کھال منڈھی تھی اس کی ہاتھی دانت کی گھوڑی جس پر سارے تار ٹکے تھے۔ غرض ہر چیز اس کے لئے عجوبہ تھی۔

"اس کو بجاتے کس طرح ہیں بھلا؟" بے اختیار فیاض کی زبان سے نکلا۔

" لو میں تمہیں بتاتا ہوں بابوجی " حیدری خاں نے کہا " پہلے یوں اکڑوں بیٹھ جاؤ جیسے میں بیٹھا ہوں۔ اور سرود کو یوں اپنے آگے رکھ لو۔ یہ لو جوا۔ اس کو دہنے ہاتھ کی انگلیوں میں یوں پکڑ لو اور اس طرح تار پر ضرب لگاؤ۔"

فیاض نے ایسا ہی کیا۔ ایک ننھی سی آواز پیدا ہوئی۔

" پھر ضرب لگاؤ "۔

اب کے آواز کچھ بہتر تھی۔

" شاباش۔ بس یوں ہی ضرب لگاتے رہو بابوجی۔ لو اب بایاں ہاتھ سرود کے نیچے سے نکال لو۔ یوں۔ اب اس انگلی سے یوں اس تار کو دباؤ۔ اب دہنے ہاتھ سے ضرب لگاؤ۔ دیکھا ایک نیا سُر پیدا ہوا۔"

سبق یہیں تک پہنچا تھا کہ دوسرے کمرے سے کُنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔

" خاں صاحب ذرا اسے تھامنا۔ میں چائے لے آؤں۔"

چائے پینے کے بعد، موسیقی کی تعلیم پھر شروع ہو گئی۔ حیدری خاں نے فیاض سے کھرج رکھب۔ گندھار۔ مدھم۔ یہ چار سُر سرود پر نکلوائے۔ فیاض کی یہ کیفیت تھی کہ فرطِ اشتیاق سے اس کا بند بند کانپ رہا تھا۔ اپنی دھن میں اس کو دھیان ہی نہ تھا۔ کہ رات تیزی سے گذری جا رہی ہے۔ آخر دوسرے کمرے سے پھر کُنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ فیاض ناچار اُٹھ کر اندر گیا تو اصغری نے کہا:

" شاباش ہے تمہاری۔ بارہ بج لیے مگر تمہاری تُن تُن ختم نہ ہوئی۔ اب سونے بھی دو گے کسی کو۔ شریفوں کا محلہ ہے۔ لوگ کیا کہیں گے آخر۔"

فیاض چونک اُٹھا۔

" تم سچ کہتی ہو۔ بس اب نہیں بجاؤں گا۔" وہ بیٹھک میں آیا تو حیدری خاں کو گدڑی اوڑھے دری پر دراز پایا۔ سرود کو اُس نے پھر کونے میں رکھ دیا تھا۔ اس سے فیاض کو کسی قدر مایوسی ہوئی۔

" بابوجی " حیدری خاں بولا " اللہ تمہاری خیر کرے۔ رات بہت بیت لی۔ میں نے سوچا اب کہاں جاؤں گا۔ یہیں پڑ رہتا ہوں۔ صبح ہوتے ہی چلا جاؤں گا۔ تمہاری خیر ہو۔ ذرا لیمپ کی بتی نیچی کر دینا۔ پر بجھانا نہیں۔"

"اچھی بات ہے" فیاض نے کہا اور وہ لیمپ کی بتّی نیچی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے روز ابھی سورج نہیں نکلا تھا کہ فیاض بستر سے اُٹھ بیٹھک میں آ گیا۔ اس وقت سردی خاصی بڑھ گئی تھی۔ حیدری خاں گدڑی میں گٹھڑی بنا بے خبر سو رہا تھا۔ مگر معلوم ہوتا تھا فیاض کو سردی کی کمی یا زیادتی کا کچھ احساس نہیں۔ وہ سرود اُٹھا دری پر بیٹھ گیا اور ہلکے ہلکے بجانے لگا۔ ساز کی آواز سُن کر گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔ حیدری خاں نے گدڑی میں سے سر باہر نکالا۔ آنکھ آدھی کھولی فیاض کی صورت دیکھی۔ ہلکی سی مُسکراہٹ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور پھر اس نے سر گدڑی کے اندر کر لیا۔

فیاض دیر تک اس کے بتائے ہوئے سبق کی مشق کرتا رہا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی دونوں بیٹیاں شہناز اور رعنا بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ دونوں نے پشمینے کی رنگ دار چادریں اوڑھ رکھی تھیں۔ شہناز کی عمر گیارہ برس تھی اور رعنا کی نو برس۔ دونوں بڑی پیاری بچیاں تھیں۔ وہ ایک معصومانہ ادا کے ساتھ جس میں اچنبھے اور تعریف کے ساتھ ساتھ مذاق کا عنصر بھی شامل تھا۔ باپ کو یہ بڑا سا عجیب و غریب ساز بجاتے دیکھنے لگیں۔ بار بار ان کی نظریں آپس میں ملتیں۔ اور ان کے چہرے مُسکراہٹ سے کھل اٹھتے۔

"میں نے کہا آج دفتر نہیں جاؤ گے؟" اصغری نے چلمن کے پیچھے سے کہا۔

"اتوار ہے بھئی۔ اتوار ہے۔"

یہ کہہ کر فیاض پھر سرود بجانے میں مشغول ہو گیا۔ اصغری نے حیدری خاں کو گدڑی میں منہ چھپائے خراٹے لیتے سُن لیا تھا۔ وہ دوپٹہ سنبھالتی ہوئی بیٹھک میں چلی آئی۔ اور فیاض کے کان کے قریب منہ لا کر کہنے لگی

"یہ کب دفان ہو گا؟"

"چپ رہو خدا کے لئے۔ کہیں سُن نہ لے۔" فیاض نے فکرمندی کے ساتھ دھیمی آواز میں کہا "تم کو کیا خبر۔ بڑا صاحبِ کمال آدمی ہے"

"ہوا کرے۔ میں پوچھتی ہوں، یہ جائے گا کب؟"

"بس ناشتہ کرا کے بھیج دیں گے"

کوئی دس بجے کے قریب حیدری خاں جمائیاں لیتا، اپنی کالی کالی انگلیوں کو، جن کے ناخن بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے چٹخاتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ فیاض ابھی تک سرود بجانے میں

مصروف تھا۔ اس تین چار گھنٹے کے ریاض سے اُسے اُن چاروں سُروں کی جو حیدری خاں نے بتائے تھے خوب مشق ہو گئی تھی اور سُر روانی سے نکلنے لگے تھے۔ حیدری خاں کو فیاض کے اس انہماک پر حیرت ہوئی۔

"لو بابو جی۔ اب تم گنڈا بندھوانے کی فکر کرو۔ تم نے تو کمال ہی کر دیا، تم تو سچ مچ بجانے لگے بابو جی۔ مجھے اب تک جو شاگرد بھی ملا کوڑھ مغز ہی ملا۔ تم جیسا ذہین شاگرد ہو تو تین ہی مہینے میں اُستاد نہ بنا دوں تو میری مونچھیں منڈوا دینا۔ پر سُن رکھو میاں، میری ٹیوشن کی فیس سَو روپے مہینہ ہے سو روپے مہینہ:" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ "ایک بات ہے بابو جی ماشاءاللہ سے تمہارے ڈیل ڈول پر یہ ساز پھبتا بھی خوب ہے۔ شیر کے بچے معلوم ہوتے ہو شیر کے بچے!"

اس تعریف پر فیاض کا چہرہ چمک اُٹھا۔

ناشتہ ہو لیا مگر حیدری خاں کے رخصت ہونے کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ اس پر دوسرے کمرے میں اصغری نے پھر کنڈی کھٹکھٹائی۔ فیاض اُٹھ کر اندر گیا۔

"میں نے کہا آج سودا سلف نہیں آنے کا۔ تم کو تو گانے بجانے میں کھانے پینے کی سُدھ نہیں رہی مگر بچوں کو تو بھوکا نہ مارو۔"

"اوہو، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ لو ابھی جاتا ہوں۔"

جس وقت فیاض کپڑے بدل کر بیٹھک میں آیا تو حیدری خاں بھی سر پر اپنی بے پھندنے کی میلی ٹوپی رکھے، سرود بغل میں دبا چلنے کو تیار کھڑا تھا۔ فیاض کا مُنہ اُتر سا گیا۔

"کیوں اُستاد، کہاں چل دیئے؟"

"جا کر ذرا نشہ پانی کروں گا،" اُستاد نے جمائی لیتے ہوئے کہا "ایک روپیہ ہو تو دلواؤ"

فیاض فوراً اندر جا کر روپیہ لے آیا۔

"بابو جی کی خیر ہو" اس نے روپیہ واسکٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "شام کو پھر آؤں گا"

اس نے ایک اور جمائی لی۔ واقعی نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف چلا۔ جب تک وہ سیڑھیوں سے اُتر نہ گیا فیاض برابر دروازے میں کھڑا جھانکتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد فیاض کو اچانک ایک بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ کاش حیدری خاں اپنا ساز یہیں چھوڑ جاتا

اور وہ آج چھٹی کے دن محبوب اس کی مشق کرتا۔ وہ دل شکستہ سا ہوکر چارپائی پر لیٹ گیا۔ کل رات سے اب تک اس پر ایک مسلسل اضطراب کی کیفیت طاری رہی تھی۔ رات کو اسے اچھی طرح نیند بھی نہیں آئی تھی۔ اصغری نے اس کی اداس صورت دیکھی تو کہا:

"اس عمر میں تمہیں یہ کیا شوق لگ گیا ڈوم ڈھاری بنو گے۔ پھر یہ موا —— "

"جس کو تم موا کہتی ہو ملک میں جواب نہیں اس کا۔"

"نہ ہو۔ بھاڑ میں جائے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے کہ اس نے گھر دیکھ لیا ہے۔ اب تو روز ہی آدھمکا کرے گا۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو"

"تو کیا تم ساز بجانا سیکھو گے؟"

"کاش میں اسے سو روپے ٹیوشن کی فیس دے سکتا۔"

اصغری کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

سودا سلف آیا۔ کھانا پکا۔ میاں بیوی اور لڑکیاں کھانے بیٹھیں مگر فیاض نے دو چار نوالوں کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ اصغری نے یہ ماجرا دیکھا تو اس کو سچ مچ تشویش ہونے لگی پچھلے چند گھنٹوں میں وہ اسے بہت بدلا ہوا پا رہی تھی۔ وہ نہ تو اس کی بات غور سے سنتا نہ ڈھنگ کا جواب دیتا۔ لڑکیوں کی طرف بھی اس کی کچھ توجہ معلوم نہیں ہو رہی تھی۔

جوں جوں وقت گذرتا گیا فیاض کی بے چینی بڑھتی ہی گئی۔ دن ڈھل گیا۔ شام ہوگئی گھروں میں چراغ جل گئے۔ مگر حیدری خاں نہ آیا۔ فیاض کا جی کسی کام میں نہ لگتا۔ وہ بار بار بستر پر لیٹ جاتا۔ پھر فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوتا۔ آخر دس بجے کے قریب جب فیاض کو اس کے آنے کی مطلق امید نہ رہی تھی وہ اچانک آ پہنچا۔ وہ جھوم رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پچھلی رات سے بھی زیادہ سرخ ہو رہی تھیں۔ اس کے حواس بجا نہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا آج وہ کچھ زیادہ ہی نشہ پانی کیئے ہوئے ہے۔

"لو میاں، ہم آ گئے" اس نے بیٹھک کے اندر قدم رکھتے ہی ہانک لگائی "تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

وہ آلتی پالتی مار دری پر بیٹھ گیا۔

"فیاض میاں" وہ پھر کہنے لگا۔ "ذرا اندر کہہ کے میرے لئے چائے بنواؤ۔ میں

آج کھانا نہیں کھاؤں گا "۔

اچانک نہ جانے کیا ترنگ اُٹھی کہ وہ سرود سنبھال بجانے بیٹھ گیا۔ چلمن کی طرف مُنہ کر کے چلّایا۔ " بہو جی۔ یہ آپ کی خاطر ہے " اور زور شور سے سرود بجانا شروع کر دیا۔ مگر دو ہی منٹ میں انگلیاں سست پڑنے لگیں۔ جس وقت اندر سے چائے بن کر آئی تو وہ سرود پر جھکا ہوا خراٹے لے رہا تھا۔

فیاض نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا مگر اس پر ایسی بے ہوشی کی نیند طاری تھی کہ مطلق نہ جاگا۔ فیاض نے سرود کو اس کی گرفت سے الگ کر کے آہستہ سے اُسے دری پر لٹا دیا۔ اور گدڑی اُڑھا دی۔ پھر بڑے چاؤ سے سرود اُٹھا سبق دُہرانا شروع کر دیا۔

اگلے روز حیدری خاں کی آنکھ صبح سویرے ہی کُھل گئی۔ دیکھا کہ فیاض اس کے قریب ہی بیٹھا ہوا اس کے بتائے ہوئے چاروں سُروں کی مشق کر رہا ہے۔

" فیاض میاں۔ ماشاءاللہ سے کیا سچے سُر نکال رہے ہو۔ آج میں تمہیں اگلے تین سُر بھی بتا دوں گا۔ پھر سپتک پوری ہو جائے گی "

تھوڑی ہی دیر میں حیدری خاں نے پنچم۔ دھیوت اور نکھاد کے سُر بھی فیاض کے ہاتھوں سرود پر نکلوا دیئے۔ خوشی کے مارے فیاض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مگر تھوڑی دیر بعد اسے بادلِ ناخواستہ اس سلسلے کو ختم کرنا پڑا کیونکہ آٹھ بجنے والے تھے اور اسے دفتر جانے کی تیاری کرنی تھی۔

حیدری خاں نے ناشتہ کے بعد اپنا سرود اُٹھایا۔ اس دفعہ اسے روپیہ مانگنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ بلکہ فیاض نے خود ہی اندر سے روپیہ لا کر اسے تھما دیا۔

" خوش رہو میاں "، حیدری خاں بولا۔ پھر کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے بڑے گمبھیر لہجے میں کہنا شروع کیا۔

" دیکھو میاں۔ اگر تمہیں مجھ سے سیکھنا ہے تو تمہیں میری دو تین شرطیں منظور کرنی ہوں گی۔ یوں یہ شرطیں بہت آسان معلوم ہوں گی، پر غور کرو تو بہت دشوار بھی ہیں۔ کیونکہ میں پہلے ہی سے بڑی منہ زور ہوں۔ کوئی کام ذرا بھی میری مرضی کے خلاف ہو تو مجھے بڑا قلق ہوتا ہے۔ اپنے اسی مزاج کی خاطر ہی میں نے فقیری قبول کی ہے۔ لو شرطیں بھی سُن لو۔ ایک تو یہ کہ تمہیں صبح کو میرے لئے چائے اور ناشتے کا بندوبست کرنا ہو گا۔ دوپہر کو کھانا میں نہیں کھاؤں گا۔ بلکہ صبح اِدھر تم دفتر کو چلے

اور اُدھر میں کھِسکا۔ شام کو جب تم دفتر سے آیا کرو گے تو میں بھی اپنے پھیر پھار کر آجایا کروں گا۔ رات کو کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ گے۔ اور سویا میں یہاں بیٹھک ہی میں کروں گا۔ وہ جو میں نے سو روپے مہینہ ٹیوشن کی بات کی تھی وہ تو میں تم سے مذاق کرتا تھا میاں، بھئے روپے کا لالچ ہوتا تو اب تک حویلیاں نہ کھڑی کر لی ہوتیں۔ رہا میر انشہ پانی بس اس کا ذرا خیال رکھنا۔ بس یہ ہیں میری شرطیں اگر تمہیں منظور ہوں تو بسم اللہ۔"

فیاض گردن جھکائے کچھ دیر سوچ میں ڈوبا رہا۔ جب اس نے سر اُٹھایا تو سب سے پہلے اس کی نظر چلمن پر پڑی۔ حیدری خاں کی طرح اصغری بھی پردے کے پیچھے اس کے جواب کی منتظر تھی۔ پھر وہ حیدری خاں کی طرف متوجہ ہو کر دھیمی آواز مگر فیصلہ کن لہجہ میں کہنے لگا:

"خاں صاحب مجھے آپ کی سب شرطیں منظور ہیں۔ آج سے آپ میرے اُستاد ہیں"

اُسی دن شام کو حیدری خاں اپنا بوریا بدھنا لے فیاض کے یہاں اُٹھ آیا۔ یہ بوریا بدھنا کیا تھا ٹین کا ایک ٹرنک روغن اُڑا ہوا، کُنڈا غائب۔ حیدری خاں نے اُس کو رسّی سے باندھ رکھا تھا اور ایک مٹی کا پیالہ۔

اصغری کے دل کو چوٹ تو لگی اور اس نے کچھ آنسو بھی بہائے مگر طبعاً وہ اُن اطاعت گذار بیویوں میں سے تھی جو میاں کو مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ اور ہر حال میں ان کی خوشنودی کی طالب رہتی ہیں۔ موسیقی سے میاں کے اس جنون کی حد تک بڑھتے ہوئے شوق کو دیکھ کر اُس نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ اور حیدری خاں کا اپنے یہاں رہنا منظور کر لیا۔ دو چار ہی دن میں اسے اندازہ ہو گیا۔ کہ حیدری خاں نشہ باز تھا تو تھا مگر بدنظر ہرگز نہ تھا۔ پرائی بہو بیٹیوں کو تاکنے جھانکنے کی عادت نہ تھی۔ وہ اصغری کو ہمیشہ بہو اور بیٹی کہہ کر پکارتا اور جب تک فیاض باہر رہتا گھر کے نزدیک نہ پھٹکتا۔

اب فیاض کو حیدری خاں کی ظاہری حالت سدھارنے کی فکر ہوئی۔ اس لئے اپنے کپڑوں میں سے ایک سفید پتلون، اچھی سی قمیص، اور ایک پرانا سا گرم کوٹ اس کے لئے نکالا اس کی تُرکی ٹوپی کو دُھلوا کر نیا پھندنا لگوایا۔ اور اس کے لئے ایک اچھا سا مضبوط جوتا خریدا۔ پھر یہ سب چیزیں لے حیدری خاں کو ایک حمام میں لے گیا۔ پہلے اس کے پٹوں کو مختصر کرایا۔ ڈاڑھی منڈوائی، مونچھوں کو ترشوایا، ناخن کٹوائے پھر حمام والے سے دو تین مرتبہ حمام خوب نہلوایا۔ پھر اس کی گدڑی اور میلے پھٹے کپڑے وہیں پھنکوا اُسے نیا جوڑا

بدلوایا جس وقت حیدری خاں حمام سے نکلا تو وہ ایک اچھا خاصہ معقول انسان معلوم ہونے لگا تھا۔ اب خود اپنی نگاہ میں اس کی عزّت بڑھ گئی تھی۔ پہلے جو بات بات پر دُعائیہ کلمے اس کی زبان پر جاری رہتے تھے ان میں بڑی حد تک کمی ہو گئی۔ نشہ پانی کے استعمال میں بھی وُہ احتیاط برتنے لگا۔

اصغری نے اس کی یہ دھج دیکھی تو بڑی حیران ہوئی۔ اسے اس شخص سے پہلے پہل جو کراہت محسوس ہوتی تھی وہ جاتی رہی۔ حیدری خاں اپنی بدمزاجی کے باوجود شہناز اور رعنا سے بڑی شفقت سے پیش آتا۔ فیاض اسے ہر دوسرے دن ایک روپیہ دیا کرتا۔ اس میں سے بھی حیدری خاں دو ایک آنے بچا ان کے لئے مٹھائی یا پھل ضرور خرید لاتا۔ بچیاں چند ہی روز میں اس سے بہت مانوس ہو گئیں۔ وہ اس کو "خاں صاحب جی، خاں صاحب جی" کہہ کر پکارتیں اور سرود پر عام مقبول دھنیں بجانے کی فرمائش کرتیں جنہیں وہ دلی مسرّت سے پورا کرتا۔

حیدری خاں، اصغری کے کھانا پکانے کی بھی سچے دل سے تعریف کیا کرتا۔ وُہ کہا کرتا:
"بیٹی، سبحان اللہ۔ کیسا لذیذ کھانا پکاتی ہو، جو راجوں مہاراجوں کو بھی نصیب نہیں ان کے کھانوں میں تو بس تکلف ہی تکلف ہوتا ہے، مزہ کچھ بھی نہیں۔"

رفتہ رفتہ اصغری کو اس کی تعریفوں میں مزہ آنے لگا۔ کبھی کوئی خاص چیز پکاتی تو دِل میں کہتی دیکھیں آج خاں صاحب کیا کہتے ہیں۔ چند ہی دنوں میں خاں صاحب پر گھر میں آنے جانے کی کوئی پابندی نہ رہی تھی۔ کیونکہ اصغری نے میاں کا عندیہ پاکر اس سے پردہ کرنا چھوڑ دیا۔ وہ حیدری خاں سے کہا کرتی "خاں صاحب آپ دوپہر کا کھانا بھی گھر آ کر کھایا کریں"۔ مگر حیدری خاں یہ وقت تکیوں میں گزارنا ہی زیادہ پسند کرتا۔

فیاض کے دل میں روز بروز اپنے استاد کی عزّت بڑھتی جاتی تھی۔ اُدھر حیدری خاں نے موسیقی میں اس کا انہماک اور جوش وخروش دیکھ کر اسے پوری توجہ سے بتانا شروع کر دیا تھا۔ اس نے مہینے ہی بھر کے اندر فیاض کو دو ایک راگوں کی الاپ اور گت سکھا دی تھی۔ اس زمانے میں فیاض کو ایسی مسرّت حاصل ہوئی جو اُسے زندگی بھر نصیب نہ ہوئی تھی۔ صبح دفتر جانے سے پہلے وہ دو گھنٹے خوب دل لگا کر ریاض کرتا۔ دفتر میں بھی اس کی انگلیاں فائلوں پر دوڑتی رہتیں، جیسے سرود بجانے کی مشق کر رہا ہو۔ اب وہ دفتر سے ٹھیک پانچ بجے چھٹی کر دیتا۔

اور تیز تیز قدم اٹھاتا شہر کے متعفن، تنگ اور پُر شور راستے سے ہوتا ہوا تھوڑی ہی دیر میں گھر پہنچ جاتا۔ چھٹی کے دن سرود کو ہاتھ سے چھوڑتے کی اسے قسم ہو جاتی تھی۔ حیدری خاں نے اپنے ایک پرانے واقف کار ساز فروش سے فیاض کے لئے ایک خوبصورت سا سرود بنانے کو کہہ دیا تھا۔ اس وقت تک وہ اُستاد ہی کے ساز پر مشق کیا کرتا۔ چونکہ حیدری خاں نے بازار وں میں بیٹھ کر سرود بجانا اور مانگنا ترک کر دیا تھا اس لئے اس کا ساز بیشتر گھر ہی میں رہتا۔

رفتہ رفتہ حیدری خاں کے دل میں فیاض کی محبت گھر کرنے لگی۔ وہ اسے بیٹے کی جگہ سمجھنے لگا۔ فیاض سے جدا ہو کر اس کا دل نہ لگتا، اور وہ اُس کے دفتر سے آنے سے گھنٹہ دو گھنٹہ پہلے ہی دروازے کے آگے گلی میں چارپائی ڈال بیٹھ جاتا۔ بیڑی پیتا رہتا اور انتظار کی گھڑیاں گنا کرتا۔ عموماً وہ اکیلا ہی ہوتا مگر کبھی کبھی کوئی دوست یا شاگرد بھی اس کے ساتھ آجاتا۔ اِس پر گلی میں گانے بجانے کے بلیے بلیے تذکرے چل نکلتے۔

"میاں جانتے بھی ہو لفظ موسیقی کا مطلب کیا ہے" حیدری خاں اپنے ساتھی سے مخاطب ہو کر کہتا "خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اُستاد دلدار خاں (کان کی لو چھو کر) کہا کرتے تھے یہ یونانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں ہوا میں گرہ لگانا۔ اب تم ہی غور کرو کہ یہ فن کتنا مشکل ہے۔" پھر وہ سیڑھیوں میں جھانک کر پکارتا:

"بٹیا شہناز، دو چار پان بنوا لانا۔"

ایسے میں جو لوگ گلی میں آجا رہے ہوتے اُن کی نظریں بے اختیار اس طرف اُٹھتیں اور وہ تھوڑی دُور اِدھر مُڑ مُڑ کر دیکھتے ہوئے جاتے۔ یہ محلہ خاص شُرفا کا تھا۔ زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ یہاں رہتے تھے مگر کچھ گھر کھاتے پیتے لوگوں کے بھی تھے۔ کچھ مولویوں اور ثقہ قسم کے لوگوں کے تھے۔ ایک چھوڑ تین تین مسجدیں اس چھوٹے سے محلے میں تھیں۔ علی الصباح مُرغوں کی ککڑوں کوں کے ساتھ ہی آگے پیچھے مسجدوں سے اذانوں کی صدائیں سُنائی دینے لگتیں۔ اور سارے محلے پر ایک تقدس کی فضا چھا جاتی۔

فیاض کو یہاں رہتے دس برس ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں کبھی کسی کو اس سے شکایت نہ پیدا ہوئی تھی۔ سب لوگ اسے خاموش، کم آمیز اور شریف سمجھ کر پسند کرتے تھے۔ مگر اب حیدری خاں کی وجہ سے گھر پر دن رات موسیقی کا جو ہنگامہ رہنے لگا اس پر لوگ ٹھٹکے۔ ایک غیر آدمی کا جسے پچھلے دس برس میں اس محلے میں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ فیاض کے گھر میں یوں آزادی

کے ساتھ آنا جانا لوگوں کو ناگوار گزرا۔ انہیں تعجب ہوا کہ فیاض جیسے شریف اور سمجھ دار آدمی نے یہ کیسے گوارا کر لیا کہ اس کی غیر موجودگی میں عجیب عجیب قماش کے لوگ یوں گھر پر تسلط جما لیں جیسے وہی اس گھر کے مالک ہوں۔ اسے اپنی بیوی اور جوان ہوتی ہوئی بیٹیوں کے اخلاق پر بُرا اثر پڑنے کی ذرا بھی تو پروا نہیں۔ جگہ جگہ چہ می گوئیاں ہونے لگیں۔ ناراضگی کی لہر بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ ایک شام جب فیاض دفتر سے گھر آ رہا تھا تو گلی کے موڑ پر محلے کی بڑی مسجد کے امام سے اس کی مدبھیڑ ہوئی :-

"السلام علیکم" امام صاحب نے مصافحہ کر لینے کے بعد سینے پر ہاتھ رکھا، اور گویا ہوئے "حضرت، میں کئی دن سے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔ وہ بات یہ ہے کہ آپ کو موسیقی سے از حد لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ہر چند اسلام نے خوش آوازی اور لحن کی اجازت دی ہے مگر استغفراللہ یہ خرافات جو دن رات آپ کے گھر پر ہوتی رہتی ہیں اس کی تو کسی صورت میں بھی اجازت نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ آپ اپنے فعل کے خود مختار ہیں اور رب العزت کے سامنے اپنے اعمال کے جواب دہ آپ خود ہوں گے۔ مگر برادر یہ مسئلہ صرف آپ کی ذات تک ہی محدود نہیں ہے۔ کبھی آپ نے یہ بھی غور کیا کہ آپ کی ان خرافات سے محلے والوں کے اخلاق پر کتنا بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جناب ٹھنڈے دل سے میری اس گذارش پر غور فرمائیں گے۔ اور ان لغویات سے جلد چھٹکارا حاصل کر لیں گے۔ آخر آپ کو ایک دن حق تعالیٰ کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ بس مجھے یہی کہنا تھا۔"

جس وقت فیاض گھر پہنچا تو وہ گم سُم تھا۔ اتفاق سے حیدری خاں ابھی تک نہیں آیا تھا۔ فیاض سیدھا اپنے کمرے میں پہنچ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔ گو اس کا دل ریاض کرنے کے لئے بے چین تھا مگر اسے سرود کو ہاتھ لگانے کی جرات نہ ہوئی۔ دیر تک وہ بستر پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ اصغری نے جو اس کی یہ کیفیت دیکھی تو اس سے نہ رہا گیا۔

"نصیبِ دشمناں، طبیعت کچھ خراب ہے آپ کی" اس نے پوچھا۔

"نہیں تو" فیاض نے کہا مگر وہ بستر سے نہ اُٹھا۔

چراغ جلنے پر حیدری خاں آیا۔ فیاض سیڑھیوں ہی سے اس کی قدموں کی چاپ سن جلدی سے بیٹھک میں آ سرود لے بجانے بیٹھ گیا۔ وہ اب استاد سے بہت ڈرنے لگا تھا۔ وہ اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ اس نے یہ دو گھنٹے یوں ہی گنوا دیئے۔

"فیاض بیٹے!" حیدری خاں نے کہا "تھک گئے ہو تو ذرا دم لے لو۔ اور ہاں آج میں نے تمہارے لئے طبلچی کا بھی بندوبست کر لیا ہے۔"

فیاض نے سُنا مگر کچھ جواب نہ دیا۔ اس کے بعد حیدری خاں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا اتنے ہی میں کھانے کا وقت ہو گیا اور یوں فیاض اس شام سرود سے کنارہ کش ہی رہا۔ مگر دل میں اہلِ محلہ اور خاص کر اس مسجد کے امام کے خلاف سخت غصہ بھرا ہوا تھا۔

دوسرے دن جب فیاض دفتر گیا ہوا تھا تو ٹھیک دوپہر کو حیدری خاں ایک اجنبی کو ساتھ لئے ہوئے آیا۔ پردہ کرا دیا گیا اور وہ دونوں بیٹھک میں دری پر بیٹھ گئے۔ اجنبی کی وضع قطع پنڈتوں کی سی تھی۔ ٹھیک اسی وقت شہناز اور رعنا استانی سے پڑھ کر گھر آئیں۔ انہوں نے حیدری خاں کو سلام کیا۔

"جیتی رہو" حیدری خاں نے پُرشفقت لہجے میں کہا "بستے رکھ کر اِدھر آؤ۔ ذرا ایک بات سنو، دیکھو بھئی، آج ہم تمہارا امتحان لیں گے"

دونوں لڑکیاں ماں کے پاس اپنا اپنا بستہ رکھ حیدری خاں کے سامنے ادب سے آکر بیٹھ گئیں۔ اُستاد نے سرود اُٹھایا اور اس کا ایک سُر بجا کر شہناز سے کہا:

"لے بیٹی، اس آواز کے ساتھ آواز ملا کر آ۔ آ ــــ کر"

لڑکی کچھ جھینپی شرمائی مگر حیدری خاں کے اصرار پر آواز ملانے کی کوشش کرنے لگی۔ حیدری خاں نے خود آ۔ آ ـ کر کے بتایا۔ کہ یوں۔ لڑکی ذہین تھی تھوڑی سی مشق سے اس نے ساز کے سُر کے ساتھ اپنی آواز ملا دی۔ اس پر حیدری خاں نے اپنے ساتھی کی طرف پُرمعنی نظروں سے دیکھا اور کہا:

"کیوں کالکا پرشاد جی؟"

ساتھی نے تحسین آمیز نظروں سے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے سر ہلایا۔ اس کے بعد چھوٹی بہن رعنا کی باری آئی۔ وہ بڑی بہن کو آواز ملاتے دیکھ چکی تھی، اس لئے جلد ہی وہ بھی اس امتحان میں پوری اُتر گئی۔ ایک بار پھر حیدری خاں نے ساتھی کی طرف دیکھا:

"کیوں کالکا پرشاد جی؟"

کالکا پرشاد کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ کھیلنے لگی اور اس نے دو تین بار "ہوں۔ ہوں" کے بعد حیدری خاں بچیوں سے کہنے لگا:

"بس جاؤ۔ شاباش۔ شاباش۔ جاکر منہ ہاتھ دھوؤ اور کھانا کھاؤ"
ان کے جانے بعد حیدری خاں نے اپنے دوست کی طرف مخاطب ہوا:
"شام کو ان کا باپ آئے گا تو اس سے بات کروں گا" اور وہ تھوڑی دیر بعد اپنے دوست کو لے کر چلا گیا۔

اس روز جب فیاض دفتر سے آیا تو اصغری بھری بیٹھی تھی اسے دیکھتے ہی برس پڑی:
"دیکھو جی، اب تک تو ہم تمہاری سب باتیں مانتے جارہے تھے۔ مگر اب معاملہ حد سے بڑھتا جا رہا ہے۔ میں اپنی لڑکیوں کو ہرگز ہرگز گانا سیکھنے دوں گی۔"
"آخر ہوا کیا کچھ بتاؤ تو سہی۔ تم تو معموں میں باتیں کرتی ہو"
"آج دوپہر کو خاں صاحب آئے تھے ان کے ساتھ کوئی پنڈت جی بھی تھے۔ شہناز اور رعنا بھی اس وقت اسکول سے آئی تھیں۔ پہلے خاں صاحب نے دونوں لڑکیوں کو گوایا۔ پھر جانے چپکے چپکے آپس میں کیا باتیں کرتے رہے۔ میں چلمن کے پیچھے کھڑی سب دیکھتی رہی۔ سوچتی اگر خاں صاحب چاہیں کہ میری معصوم بچیاں رنڈیوں کی طرح ناچنے گانے لگیں تو یہ تو ہونے کا نہیں۔ چاہے مجھے انہیں لیکر میکے ہی میں کیوں نہ بیٹھ رہنا پڑے۔"

فیاض کچھ کہنے ہی کو تھا کہ اتنے میں حیدری خاں بھی آ گیا
"فیاض بیٹے" اس نے سیڑھیاں چڑھتے ہی کہنا شروع کیا "اللہ تمہاری عمر میں برکت دے میں تم سے ایک بہت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں اور بیٹی اصغری، اللہ تمہارا سہاگ قائم رکھے۔ تم بھی کان دھر کر سنو۔ تم دونوں نے کبھی یہ بھی سوچا کہ دونوں لڑکیاں ماشاءاللہ سے برس دو برس میں جوان ہونے کو ہیں۔ تم نے کچھ ان کی شادی بیاہ کی بھی فکر کی۔ مجھے تو کچھ نظر آتا نہیں کہ تم نے ان کے لئے کچھ جہیز جمع کیا ہو۔ اور پھر تم کر بھی کیا سکتے ہو۔ بھلا ڈیڑھ سو روپلی کی حقیقت ہی کیا ہے۔ آخر تم ان معصوم بچیوں کو کس طرح ٹھکانے لگاؤ گے۔ یہ ذرا سوچنے کی بات ہے۔ تم خدا نخواستہ کسی کنجڑے قصائی کو تو بیٹی دینے سے رہے۔ رہے دفتروں کے بابو جن کو تیس چالیس روپلی سے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی۔ ان کو لڑکی دینا ایسا ہے جیسا بھاڑ میں جھونک دینا۔ بچیاں ماشاءاللہ سے ایسی خوبصورت ہیں جیسے چاند کا ٹکڑا۔ ان کو تو کسی قدردان رئیس کے گھر میں رانی بن کر راج کرنا چاہئے۔ مگر میاں صاحبزادے۔ امیر لوگ شادی بیاہ کے معاملے میں بڑی مین میخ نکالتے ہیں۔ لڑکی خوب صورت ہو۔ پڑھی لکھی ہو۔ بہت سا جہیز لائے۔ اور پھر اسے

کوئی گُن بھی آتا ہو جیسے گانا یا مصوّری۔ مگر ان بچیوں میں سوائے شکل صورت کے اور کوئی بات نہیں۔

"مجھے کئی دن سے اس بات کی بڑی فکر تھی۔ تم دونوں میاں بیوی تو سو جاتے تھے مگر میں اسی فکر میں غلطاں پیچاں جاگتا رہتا تھا۔ آخر سوچ سوچ کر میں نے یہ ترکیب نکالی ہے کہ ان لڑکیوں کو تھوڑا سا ناچ گانا سکھا دیا جائے۔ تم جانو، آج کل امیر امراء میں ناچنے گانے کا شوق کس قدر ترقی پر ہے۔ پہلے ہندوؤں نے یہ بات شروع کی تھی۔ ان کی دیکھا دیکھی اب مسلمان بھی اپنی بیٹیوں کو گانا بجانا سکھلانے لگے۔ دوپہر کو میں پنڈت کالکا پرشاد کو لایا تھا۔ وہ شہر کے نامی کتھک ہیں۔ نواب شمشیر علی خاں کی لڑکیاں، رائے بہادر سنتا رام کی لڑکیاں، چودھری نیک عالم کی لڑکیاں آج کل ان ہی سے سیکھ رہی ہیں۔ ان تین گھروں کو تو میں جانتا ہوں، معلوم اور کتنے گھروں میں جاتے ہوں گے۔ تو میاں صاحبزادے میرا اللہ جانتا ہے تم مجھے بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہو۔ اور اصغری بیٹی تو بھی میری سگیوں سے کم نہیں۔ میں نے جو بات سوچی ہے تمہارے ہی بھلے کے لئے سوچی ہے میرے نہ آل ہے نہ اولاد۔ جو کچھ ہو تمہیں ہو، پھر میں تمہارا برا کیوں چاہوں گا۔"

تقریر کے آخری حصے کے دوران میں حیدری خاں کی آواز شدتِ جذبات سے بھرا گئی تھی اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے تھے آخر وہ کرتے کے دامن سے آنسو پونچھتا ہوا اٹھا اور یہ کہتا ہوا سیڑھیوں کی طرف چلا:

"تم دونوں سوچ سمجھ لو اگر منظور ہو تو بچیوں کی تعلیم شروع کر دی جائے، میرے کچھ دوست نیچے کھڑے ہیں۔ مجھے ان سے کام ہے۔ میں ذرا دیر میں آؤں گا۔"

اس کے جانے کے بعد فیاض اور اصغری دیر تک خاموش بیٹھے ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے۔

"کہو کیا کہتی ہو؟" آخر فیاض نے سکوت کو توڑا۔

"میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں" اصغری نے جواب دیا۔ اور واقعی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"میرا خیال ہے" فیاض نے کہا "خاں صاحب درست ہی کہتے ہیں۔ واقعی ہم نے اب تک ان کے مستقبل کا کچھ خیال نہیں کیا اور جو تمہیں اس میں برائی کی کوئی بات نظر آتی ہو تو

بھلا ہمارے ہوتے ہوئے ہماری مرضی کے خلاف کوئی کیا کر سکتا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ لیکن ایک بات ہے ہمیں اس محلے کو چھوڑ دینا ہوگا۔"

"میں کچھ نہیں کہتی، تم مختار ہو۔ جو چاہے کرو۔"

حیدری خاں کوئی نو بجے کے قریب گھر آیا، سر، کے آنے پر دسترخوان بچھایا گیا کھانے کے دوران میں فیاض نے مسجد کے امام سے اُس دن کے ملنے کا واقعہ سنایا۔ حیدری خاں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"وہ تو میں پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا۔" وہ بولا "مگر تم کوئی فکر نہ کرو۔ نہ کسی کی بات سنو۔ بس اپنے کام سے کام رکھو۔ جب دیکھیں گے کہ اب کوئی چارہ ہی نہیں رہا تو اُس محلے کو چھوڑ دیں گے۔"

اس بات سے فیاض کی ہمت بندھ گئی۔ اس رات وہ بڑی دیر تک سرود پر ریاض کرتا رہا اور یوں پچھلے روز کی کسر پوری کر لی۔

اس کے دو ہی دن بعد لڑکیوں کے ناچ گانے کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اب محلے والوں کے کانوں میں دوپہر سے لے کر ظہر کی نماز تک کچھ اس قسم کی آوازیں گھنگروؤں کی جھنکار کے ساتھ مل کر سنائی دینے لگیں۔

"تا تت تھئی تھئی۔ تا تت تھئی تھئی۔ ایک۔ دو تین چار۔ ایک دو تین چار تا تھئی تھئی۔ تا تھئی تھئی۔ ایک دو تین۔ ایک دو تین۔"

اس سے اگلے روز جب شہناز اور رعنا اُستانی کے یہاں پڑھنے گئیں تو پانچ ہی منٹ کے بعد بستے اُٹھاتے واپس آ گئیں۔ اُستانی نے بچیوں سے کہا تھا۔ "اب تم یہاں نہ آیا کرو"

اسی روز شام کو مالک مکان فیاض سے ملنے آیا۔ وہ سر جھکائے ہوئے تھا۔ معلوم ہوتا تھا شرم کے مارے مُنہ سے بات نہیں نکلتی۔ پچھلے دس برس میں اسے فیاض سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہ ہوئی تھی۔ فیاض نے نہ کبھی مکان کی مرمت کے لئے کہا تھا اور نہ سفیدی کرانے کے لئے۔ ہمیشہ پیشگی ہی ہر مہینے کی پہلی کو کرایہ اس کی دکان پر پہنچ جایا کرتا۔

"معاف کیجئے گا، فیاض صاحب" آخر اُس نے زبان کھولی۔ "میں آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ چاہے آپ کو گانے بجانے ہی کا شوق کیوں نہ ہو۔ سچی بات یہ ہے مجھے خود بھی گانے بجانے سے رغبت ہے۔ مگر کیا کروں ان کمبخت محلے والوں نے میری دُکان پر آ آ کر میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ آپ کے ہاں کا نقشہ ایسے بھیانک طریق سے پیش کرتے ہیں گویا محلے بھر کی بہو بیٹیوں

کی عزت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ میں جانتا ہوں۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ مگر اتنے آدمیوں کے سامنے مجھ اکیلے کی کچھ پیش نہیں چلتی۔ آپ جیسے ایمان دار کرایہ دار کو گنوا کر مجھے بہت دکھ ہوگا۔ پر کیا کروں مجبور ہوں۔ امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔"

"میں سمجھ گیا۔ آپ فکر نہ کیجیے۔ میں ہفتے بھر میں آپ کا مکان خالی کر دوں گا۔"

جب یہ ماجرا حیدری خاں کے کانوں میں پہنچا تو اس کی چندھی آنکھوں میں جیسے یکبارگی ایک روشنی سی پیدا ہوگئی۔

"چلو یہ جھگڑا بھی نمٹا" اس نے کہا "بیٹے ہم خود اس مکان میں رہنا نہیں چاہتے۔ شہر میں ایک سے ایک اعلیٰ درجے کا مکان مل سکتا ہے۔ اور پھر کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔"

"لیکن خاں صاحب مجھے مکان تلاش کرنے کی فرصت کہاں!"

"تم فکر نہ کرو میری جان۔ آج کیا دن ہے جمعرات۔ بس اس اتوار تک میں خود مکان تلاش کر لوں گا۔ اس دن تمہیں چھٹی بھی ہوگی، آسانی سے اسباب لے چلیں گے۔"

اور حیدری خاں نے سچ مچ اتوار سے پہلے ہی مکان تلاش کر لیا۔ فیاض حیدری خاں کے ساتھ مکان دیکھنے گیا۔ یہ مکان بازار کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ فیاض اس بازار میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ مگر وہ ویسا ہی تھا جیسے اور بازار۔ اس میں بھی وہ تمام اجناس ملتی تھیں جو دوسرے بازاروں میں دستیاب ہوتی ہیں۔ بنیے۔ قصائی۔ کنجڑے۔ تنبولی۔ بساطی۔ دوا فروش۔ پھل والے۔ درزی لانڈری والے۔ بزاز۔ سنار۔ سب اپنی اپنی دکانیں لگائے بیٹھے تھے۔ وہ تمام اشیا جن کو خریدنے کے لئے فیاض کو لمبی لمبی گلیاں طے کرنی پڑتیں یہاں موجود تھیں۔ علاوہ ازیں یہاں بوٹوں کا ایک کارخانہ اور ایک یتیم خانہ بھی تھا۔ اور پھر ایک جگہ حکیم بھورے میاں کے مطب کا بورڈ بھی لگا تھا۔

ان دکانوں کے اوپر پختہ مکان تھے۔ کوئی سہ منزلہ تھا تو کوئی چہار منزلہ مگر دو منزلہ سے کوئی کم نہ تھا۔ زیادہ تر مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں یا ان پر چلمنیں پڑی تھیں فیاض کو ایک مکان کی دوسری منزل پر دو کمروں کا ایک فلیٹ ملا تھا۔ کمرے بہت صاف ستھرے اور کشادہ، بجلی اور نل کا انتظام ٹائلوں کا فرش۔ چوڑے چوڑے دروازے۔ کھلی کھلی کھڑکیاں۔ ان کے روشن دانوں میں سرخ، سبز، نیلے پیلے رنگوں کے شیشے، کٹاؤ دار پھولوں کی وضع کے لگے ہوئے تھے۔ بازار کے رخ ایک خوبصورت پختہ بالکنی تھی اسے دیکھ کر فیاض کی باچھیں کھل گئیں۔ یہاں وہ چھوٹی سی چوکی بچھا کر بازار کا نظارہ کیا کرے گا۔ اور سرود کا ریاض بھی خوب ہو سکے گا۔ وہ مارے

خوشی کے حیدری خاں سے لپٹ گیا۔

"بیٹے" حیدری خاں نے جیسے اُس کے خیال کو بھانپ کر اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "یہاں تمہیں کوئی نہیں روکے گا۔ چاہے ساری رات سرود بجاتے رہو۔"

فیاض خوشی خوشی اصغری کو یہ مژدہ سُنانے گھر آیا۔ اس مکان کی اتنی کچھ خوبیاں سُن کر اصغری اور بچیوں کو بھی اس کے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ مگر حیدری خاں نے کہا:

"بس اب ایک دفعہ ہی چل کر دیکھ لینا۔ فوراً اسباب باندھنا شروع کرو تاکہ چار بجے سے پہلے پہلے وہاں پہنچ جائیں۔"

دوپہر کا کھانا کھا کر فیاض، حیدری خاں۔ اصغری اور دونوں لڑکیاں جلدی جلدی اسباب باندھنے میں مصروف ہو گئیں پچھلے دس برس میں نہ جانے کیا کیا ضروری اور غیر ضروری سامان اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس کا چھانٹنا مشکل تھا۔ صلاح ٹھہری کہ نئے مکان میں پہنچ کر چھانٹ لیں گے ابھی تو سارے کا سارا سامان ویسے کا ویسا وہاں پہنچا دیا جائے۔ پھر بھی اسباب باندھتے باندھتے اور ٹھیلے پہ لاتے لاتے چار بج گئے۔ جس وقت یہ لوگ اپنے نئے مکان میں پہنچے تو سہ پہر ہو چکی تھی۔

فیاض اس کی بیوی اور بیٹیاں صبح سے کام کرتے کرتے ایسی تھک گئی تھیں کہ انہوں نے مکان کا جائزہ بھی نہ لیا۔ ایک کمرے میں دری بچھا چاروں اس پر پڑ رہے مگر حیدری خاں کے چہرے سے تھکن کے کچھ آثار ظاہر نہیں ہو رہے تھے۔ وہ کہیں جانے کی سوچ رہا تھا۔

"اندر سے کنڈی لگا لینا" اس نے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے کہا "جب تک میں نہ آؤں دروازہ نہ کھولنا۔ شاید مجھے آنے میں کچھ دیر ہو جائے۔"

حیدری خاں کے جانے کی دیر تھی کہ میاں بیوی اور دونوں بچیوں کو نیند نے آدبوچا اور وہ کوئی دو ڈھائی گھنٹے خوب بے خبر سوتے رہے۔ سب سے پہلے فیاض کی آنکھ کھلی۔ اُس نے خود کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پایا۔ وہ جانتا تھا کہ دیوار پر بجلی کا بٹن کہاں ہے مگر اس خیال سے کہ کہیں بیوی بچوں کی نیند نہ اچٹ جائے اُس نے کمرے میں روشنی نہ کی۔ وہ اندھیرے میں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا ہوا بالکنی کی طرف گیا۔ اور اس کے آہنی کٹہرے پر جھک کر آس پاس کا نظارہ کرنے لگا۔ آمنے سامنے، اغل بغل، نیچے اوپر جو کچھ اُس نے دیکھا اس نے اس کی سِٹّی گم کر دی اس نے دیکھا کہ تمام مکان اور مکانوں کے تمام کمرے بجلی کی تیز روشنیوں سے بقعۂ نور بنے ہوئے ہیں۔ دروازوں کے کواڑ اور کھڑکیوں کے پٹ جو دن بھر بند رہے تھے کھلے ہوئے

ہیں اور ان کے رنگ برنگے شیشوں والے روشن دانوں میں سے روشنیاں جھلمل جھلمل کر رہی ہیں۔

اب فیاض کی نظر بازار پر پڑی۔ اس وقت اس کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ دکانیں جہاں دن کو آٹا۔ دال۔ گوشت۔ سبزی۔ کپڑا۔ سونا۔ چاندی۔ پیتل۔ تانبا ملتا تھا۔ وہ تو سب بند تھیں مگر ان کی جگہ پھول والے چنگیروں میں طرح طرح کے ہار گجرے۔ کنگن۔ چمپا کلی اور دوسرے پھولوں کے گہنے سجائے دکان لگائے بیٹھے تھے۔ گندھیوں نے اپنی بڑی بڑی پٹاریاں کھول رکھی تھیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی عطر سے بھری ہوئی رنگ برنگی شیشیاں دور سے چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ گندھی راہ چلتوں کو عطر کے پھوئے پیش کر رہے تھے۔ ایک بند دکان کی جگہ مٹھائی کے بڑے بڑے تھال چنے ہوئے تھے جن میں قلاقند، پیٹھے کی مٹھائی، قسم قسم کے لڈو، رنگ رنگ کی جلیبیاں سجی تھیں، امرتی اور برفی کے قلعے بنے ہوئے تھے۔ ان سب پر سونے چاندی کے ورق لگے تھے۔ یتیم خانے کا پھاٹک بند تھا۔ اس کے باہر اس وقت قطر بندی کا تماشہ ہو رہا تھا، پتلیاں ناچ رہی تھیں۔ اور پاٹے خاں بارہ کا گجر بجا رہا تھا۔ ایک ہجوم اس تماشے کو دیکھنے میں مصروف تھا۔ ایک دکان پر ایک نابینا نوجوان گاندھی ٹوپی پہنے ہارمونیم بجا کر گا رہا تھا۔ پاس ہی چادر پر اکنیاں، دونیاں ٹکے پیسے پڑے تھے۔ یہاں بھی خوب مجمع تھا۔

کچھ دکانیں ایسی تھیں جو صبح سے اب تک بند نہیں ہوتی تھیں۔ یہ لانڈری، درزی، حجام حکیم بھورے میاں کا مطب اور پھل کی دکانیں تھیں جن میں اس وقت خوب روشنی ہو رہی تھی اور گاہکوں کی گہما گہمی تھی۔ اور پھر تنبولیوں کی دکانیں، ان کا تو کہنا ہی کیا تھا۔ طرح طرح کے رنگدار شربتوں کی بوتلیں، سوڈے اور میٹھے پانی کی بوتلیں، پانوں کی تہیں، جن پر پھول کی پتیاں بکھری ہوتی، مہ جبینوں، لیڈروں اور پہلوانوں کی تصویریں چوکھٹوں میں جڑی ہوئی اپنے اپنے قرینے سے لگی تھیں۔

علاوہ ازیں سڑک کے کنارے کنارے متحرک دکانیں تھیں۔ جن میں قسم قسم کی مٹھائیاں، خشک اور تر میوے، چٹ پٹے کھانے، کباب، گردے اور کلیجی کی سیخیں بکتی تھیں۔ دکان دار اپنی پاٹ دار آواز میں صدا لگاتے ان دکانوں کو دھکیل کر لے جا رہے تھے۔ جب کوئی گاہک آتا تو دکان دار ٹھہر جاتا۔ سودا تول کر گاہک کو دیتا۔ اور پھر آگے بڑھ جاتا۔

بازار کے دونوں طرف عیدگاہ تک یہی کیفیت تھی۔ تانگے والے گھوڑوں کے گلے میں پھولوں،

کے ہار ڈالے اور سروں پر رنگ دار پروں کی کلغیاں سجائے، ڈلکی چال چلا رہے تھے۔ سائیکل رکھشا والے رکھشاؤں کو بیٹری کے لیمپوں اور طرح طرح کے ننھے ننھے رنگ دار بلبوں سے روشن کئے سواریوں کو اُن کی منزل پر پہنچا رہے تھے۔

ہر شخص اپنی بساط کے مطابق بن سنور کر نکلا تھا۔ اور خوش طبعی کے سبھاؤ میں تھا۔ گویا میلہ دیکھنے آیا ہو بعض دفعہ بازار میں اتنی بھیڑ ہو جاتی کہ کھوے سے کھوا چھلنے لگتا۔ جب کبھی کوئی بڑی سی چمکتی ہوئی موٹر پوں پوں کرتی گزرتی، تو ہجوم آگے سے یوں ہٹ جاتا، جیسے جہاز کے چلنے سے سمندر میں جھاگ چھٹ جاتے ہیں۔

اب فیاض نے بازار سے نظر ہٹا کر پھر اپنے آس پاس دیکھنا شروع کیا۔ کمرے جن میں پہلے کچھ خاموشی سی تھی، اب وہاں چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ ایک کمرے میں اُجلی چاندنی کا فرش بچھا تھا۔ اور صدر میں ایک حسین کم سن عورت دھانی جوڑا پہنے گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی تھی، چہرہ جوش شباب سے تمتمایا ہوا، لمبے لمبے بال جو اس کی کمر تک جاتے تھے۔ نازک خوبصورت کلائیاں بھرے بھرے بازو۔ وہ کوئی کتاب پڑھ رہی تھی مگر دھیان اس میں نہیں لگتا تھا۔ بار بار نظر اٹھا کر سیڑھیوں کی طرف دیکھتی جیسے کسی کی انتظار ہو۔ اس سے ذرا ہٹ کے سازندے بیٹھے اپنے ساز و کو ملانے میں مصروف تھے۔

ایک بالکنی پر چھ سات جوان جوان لڑکیاں بارہ ابرن سولہ سنگار کئے کھڑی آپس میں چہلیں کر رہی تھیں۔ ان کے نقرئی قہقہوں کی آواز فیاض کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

یکایک ایک کمرے میں جو فیاض کے عین سامنے تھا زور سے طبلے پر تھاپ پڑی۔ اور آسمان کی خبر لانے لگی۔ فیاض جلد اُس طرف متوجہ ہوا۔ اس نے دیکھا کہ کمرہ نور کے سیلاب میں ڈوبا ہوا ہے۔ کئی خوش وضع اور خوش پوشاک آدمی مخملی گاؤ تکیوں سے لگے بیٹھے ہیں۔ ان کے چہروں سے شادمانی اور فرحت ٹپک رہی ہے۔ مئے ارغوانی کا دَور چل رہا ہے۔ اچانک ایک غیرتِ ناہید روپہلی پشواز پہنے، چھم سے بیچ میں کودی اور ترت کرنے لگی۔ ہاتھ پاؤں کی چلت پھرت اس غضب کی تھی، کہ ہر ہر ادا پر دیکھنے والوں کے دل مسلے جاتے۔ تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوتیں، تالیاں بجنے لگتیں۔

فیاض محو حیرت ہو کر یہ ماجرا دیکھ رہا تھا۔ کہ اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اندھیرے میں کوئی سایہ سا بالکنی پر اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ فیاض کچھ دیر ساکت و جامد رہا۔ بولنے کی سکت

نہ تھی۔ بساتے نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔ آخر فیاض نے ڈرتے ڈرتے گردن پھیری۔ دیکھا تو صغری تھی ——

---

# جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں

عزیز احمد

ویران مینار کی سیڑھیوں پر شکست خوردہ تاجدار کو انجام کا انتظار تھا۔ قزل قُم اور قراقرم کی شطرنج پر ایک ایک کرکے سب مہرے پٹ چکے تھے۔ شہ مات پر شہ مات۔ بامیان کے اسپ، اور کابل کے پیادے سب نثار ہو چکے تھے، ترمذ پر امیر تیمور کے کار رُخ کا حملہ آ چکا تھا، توران کے اشتر اور منگول فرزین اور [illegible] ستادہ کیا تھا۔ [illegible] ہو چکا تھا۔ مگر جنگ کی شطرنج کھیلنے کی شطرنج سے الگ تھی [illegible] ہونے پر بھی ملک [illegible] پردوں کی [illegible] کی طرح [illegible] دی گئی۔ اور اب چنگیز کی نسل کے آخری جلاوطن تاجدار سلطان حسین کو اس کا انتظار تھا کہ اس ویران مینار میں اُس کے گوشت کے آر پار ہڈیوں تک پہلے کون سا حربہ پہنچے گا؟ چلچلاتی ہوئی دھوپ میں چکر لگاتے ہوئے گدھوں کی چونچ یا تیمور کے کسی سپاہی کا خنجر۔

اُس کے ہاتھ میں تب زرنگاری کی سنہری شاخ تھی جس سے وہ اُس مقدس درخت کی پوجا کیا کرتا جہاں زہرہ جشن کی دیوی کا مندر تھا۔ اُس کی رگوں میں [illegible] کا خون تھا، جو فرات کے کنارے اس سے پہلے بھی بہایا جا چکا ہے۔ [illegible] اور اس کے سر پر تاج تھا، اور اس لئے اس کے سر، اس کے عصا اور اُس کے تن کی قیمت تھی۔

یہ ویران مینار کسی زمانے میں کسی مسجد کا مینار رہا ہوگا۔ مگر مسجد کب کی منہدم ہو چکی تھی۔ ان صدیوں کی شطرنج میں قزل قُم پر بھی شمال کے وحشی ترکوں اور مغلوں کا قبضہ ہو جاتا [illegible] کے ہل چلانے والے، [illegible] والے، کلمہ پڑھنے والے ترک [illegible] اور اس ویران مینار سے اگر کوئی چیز نظر آتی تھی تو اس لق و دق ریگستان اور ریتیلے ٹیلوں کے سمندر میں ایک چھوٹا سا نخلستان جس کے کنارے اونچی اونچی گھاس اگ آئی تھی اور [illegible] کھڑے ہوئے چند درخت تھے۔

آخری شکست کو پانچ چھ روز گذر چکے تھے۔ تیسرا دن تھا کہ روٹی کا آخری ٹکڑا ختم ہو چکا تھا۔ اور اس تین دن کے عرصے میں سلطان حسین نے [illegible] بہت کچھ [illegible]

اُس کی داڑھی کے بال دفعتاً سفید ہونے لگے تھے، اُس کے سر کے بال وحشیوں کی طرح اُلجھ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے گڑھے پڑ گئے تھے، اُس کے زرتار لبادے پر میل کے بڑے بڑے دھبّے تھے۔ رات کو گرمی، اور گرمی سے زیادہ خوف... لمحہ لمحہ وہ چونک پڑتا۔ وہ بار بار چشمے پر جاتا، وضو کرتا، اور نمازیں پڑھتا، مگر اس کے دل کو تسلّی نہ ہوتی۔ اس سے پہلے بھی اُسنے مصیبت جھیلیں تھیں کبھی دیبا و حریر کے بستر پر حسین حوروں کے ساتھ، اور کبھی حسین تر دلشاد کے ساتھ راتیں گذاری تھیں، اور کبھی تپتے ہوئے پتھروں پر سر رکھ کر، گرم ریت کے بستر پر۔ لیکن اور ہر مرتبہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ خواب ٹل جائے گا، مگر اس مرتبہ ٹلتے نظر نہ آتا تھا، اُسے خدائے ذوالجلال سے نرم نرم سا شکوہ تھا، جس نے یہ تاروں بھری رات بنائی تھی، اور ریت کے ان چمکدار ذروں کے درمیان نگینے کی طرح اس نخلستان کو جڑا تھا، کہ اُس کی قسمت کیوں کھوٹی نکلی، جب کہ اُس کا خون کھرا تھا۔ اپنے ساتھیوں کی غداری کا احساس تیمور کی غداری، اور نمک حرامی کے احساس سے کہیں زیادہ سخت تھا، اس کی کنپٹیوں کی رگیں چربی کی تہوں کے اندر دھڑک دھڑک کر فریاد کر رہی تھیں، اور اس فریاد میں بھی ایک شاہانہ جاہ و جلال تھا۔ اس شکست میں ایک جارحانہ ملامت کا انداز تھا، اور اس ملامت کا نشانہ تمام کون و مکان تھے۔ یہ دشت و در، یہ پہاڑ یہ وادیاں، اور ان کے پرے بدخشاں کے لعل، اور ختن کے غزال اور خیبر کے جنگجو سب اُس سے منہ موڑ چکے تھے سب غداری کر چکے تھے۔ آسمان پُل صراط کی طرح سمٹ کر ایک تلوار کی دھار بن چکا تھا، اور سمٹ کر چمکتے ہوئے تاروں کو اوپر کی ظلمت کے حوالے کر کے اس کے قدموں کے نیچے آ چکا تھا کہ اس کے دو ٹکڑے کر کے اسے نیچے قعرِ جہنم کی بے پناہ گہرائیوں میں گرا دے۔ اور اب بھی سلطان حسین کے دل میں تاسّف نہ تھا، افسوس تھا اور حسرت تھی۔ صرف وہ مظلوم تھا، اور ہر شخص، ہر شے تقدیر، تدبیر ہر شے ظالم تھی۔ اُسے یاد نہ رہا تھا کہ اسنے بھی شب خون مارے ہیں، کیونکہ ایسی باتیں اس آخری وقت کے خشوع و خضوع میں یاد نہیں آتیں۔ نہیں اب ساری کائنات ظالم تھی، اور صرف وہی مظلوم تھا۔

جب بھوک کا تیسرا دن گذرا اور چوتھا دن آیا، اور سوائے پانی اور درخت کے پتوں کے جن کا چبانا تک ممکن نہ تھا۔ اور کچھ نہ رہا، تو صبح کی سنہری بھوکی دھوپ میں اُس نے پہلی بار ایک گدھ کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھا۔ گدھ اُس مینار کی چوٹی پر اطمینان سے جا پہنچا جس کی سیڑھیوں پر سلطان حسین نے پناہ لی تھی۔ کبھی اُس کی انگلیوں سے شاہین و شہباز اُڑتے تھے، اور ارض و سما کا شکار کرتے تھے۔ اب گدھ کو اُس کی بوٹیاں چننے کا انتظار تھا۔ روز صبح اور شام یہ گدھ چکر لگائے گا، ابھی تو یہ تفتیش کو نکلا تھا کہ

اُور کتنے دن یہ گھسیٹی ہوئی جان جئے جائے گی۔ اور پھر اس کے ساتھ اور گدھ آئیں گے۔ سلطان حسین کی نظروں میں وہ ہزاروں منظر گھوم گئے جو اُس نے زندگی بھر دیکھے تھے جب جنگ میں فتح کے بعد اُس کا گھوڑا چکر کاٹتا اور سڑتی ہوئی لاشوں سے چیختے ہوئے گدھ چلا کے کچھ دور اوپر اُڑتے اور پھر ضد کر کے اپنے خوانِ ضیافت پر بیٹھ جاتے۔

سلطان حسین نے اُس شدید گرم جلتی ہوئی رات کو ایک کپکپی سی محسوس کی۔ گویا گدھ ابھی تک اسی طرح تاک لگائے بیٹھا ہے۔ کچھ خواب، کچھ بیداری میں اُسے محسوس ہوا کہ جیسے گدھ کی بھی ایک ٹانگ لنگڑی تھی، تیمور کے لنگ کی طرح، اور یہی اُس مردار خور کی قسمت کا راز تھا۔ یہ کہ اس مردار خور گدھ نے بھی شاید کسی شہباز یا شاہین کی بہن سے شادی کی تھی، اور اب وہ شاہین کا گوشت کھانے کے لئے قزل قسم کے نکیلے پتھروں پر اپنی چونچ تیز کر رہا تھا۔ اور شاید یہ سب بھیانک خواب ہو۔ مگر اس سے پہلے کے خوابوں میں دلشاد اس کے ساتھ تھی، اب دلشاد بھی اس سے بچھڑ چکی تھی۔ اُس کا حرم، اُس کی کنیزیں۔ اُس کے صبا رفتار راہوار، اس کے جاں نثار جلایر، اس کے وفادار محسود اور مہمند، اُس کے کالے گیسوؤں اور تیز پنجوں والے ترکمان سب پہاڑوں، گھاٹیوں، دریاؤں میں منتشر ہو چکے تھے، کوہ و دشت، دربار پر غاصب کا قبضہ تھا۔

اور اب جب کہ سب کچھ چھن چکا تھا، سلطان حسین کو قدر ہوئی کہ سب سے زیادہ عزیز چیز اب بھی اُس کی اپنی تھی اور اُس کے قبضے میں تھی۔ یہ اُس کی اپنی جان تھی۔ وہ زندہ تھا، اور یہ خود ایک بہت بڑی عید تھی یہ کہ اُس کی سانس چلتی ہے، اور ہر سانس پر شکر واجب ہے۔ یہ کہ جب تک سانس ہے، زندگی ہے حال بھی ہے اور مستقبل بھی۔ اور یہ حقیقت بھوک سے بڑھ کر تھی گدھ سے بڑھ کر شکست سے بڑھ کر۔ یہ کہ اور سب نعمتیں اس نعمت کے لئے ہیں اور اگر یہ نہیں تو کچھ نہیں، لیکن اگر کچھ اور نہیں تو یہ تو ہے۔

اور وہ اسی کو لئے آن چھپا تھا، چھپتا پھرتا تھا، افریقہ کے کالے شکاری بجاری کی طرح جس کے سر کا شکار کھیلا جا رہا تھا، یا ہر صحیح النسب تاجدار کی طرح جس کا تاج اس کا مرض الموت ہے۔

## ۲

یہ پہلی رات نہیں تھی جو ساری بوغا نے تاروں کی چھاؤں میں گذاری تھی، یہ پہلی مرتبہ نہیں تھی کہ اُسنے المالیک سے سمرقند تک تنہا سفر کیا تھا۔ لیکن جب تارے ڈوب چکے، اور آدھا سفر ابھی باقی تھا تو اُس نے اپنے سر پر دھوپ کی گرمی محسوس کی۔ حالانکہ ابھی ابھی صبح ہوئی تھی، اور آفتاب صبح کا زاویہ ابھی بہت ٹیڑھا تھا۔ اسنے اٹھ کر انگڑائی لی۔ سر پر آہنی خود پہنا، زرہ لگائی، شکنجے سے ایک گھونٹ

پانی پیا۔ کھانے کو کچھ نہ تھا۔ دُنبے کی پوری کی پوری بھنی ہوئی ران وہ رات ہی کو پوری کی پوری کھا گیا تھا۔ اُس سے دوست دم پر بندی پڑی ہوئی تھی۔ اس ریگستانی حصے میں سوائے چٹانوں اور ریت کے کچھ نہ تھا۔ پتھریلے یا ریتیلے ٹیلے تھے، اور کچھ اور نہ تھا۔ اور دفعتاً اُس کے ذہن میں بجلی سی دوڑ گئی کہ اس کا رفیق غائب تھا۔

اپنے رفیق کو اُس نے تھوڑی سی سوکھی ہوئی گھاس رات کو دے دی تھی۔ اپنے مشکیزے سے تھوڑا سا پانی بھی دیا تھا۔ حالانکہ یہ جنس بہت قیمتی تھی۔ پھر اُسنے اُسے کندر کی رسی سے گرہیں دے کر ایک نکیلی چٹان سے باندھ دیا تھا۔ رات کو اُسے یاد تھا کہ ایک آدھ بار اُسنے اپنے رفیق کے ہنہنانے کی آواز سنی تھی۔ پھر وہ ایسا غافل سویا کہ اُسے نہ دُنیا کی خبر رہی نہ آخرت کی۔ اور اب جب صبح کا اعلان نہ مُرغِ سحر نے کیا نہ سمرقند کی طرح کوؤں کی کائیں کائیں نے اور آفتاب نے ریگستان میں سوانیزے پر سر نکالا تو اسکا رفیق غائب تھا، زین، رکاب، لگام سمیت۔

اس کا احتمال کم تھا کہ کوئی چور آ کے اُس کے پستہ قد منگول ٹٹو کو لے گیا ہو کیونکہ ریت میں دُور دُور تک کسی کے قدموں کے نشان نہ تھے۔ ساری بوغانے سب سے پہلے یہ اطمینان کر لیا۔ نہیں بے وفائی اس کے رفیق نے کی تھی جو عام طور پر وفادار تھا معلوم نہیں اُس وحشی جانور کے دل میں کیا سمائی، جو کسی نہ کسی طرح رسّی چھڑا کے بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک دوسرے کے بغیر ریگستان دونوں کے لئے موت تھا، لیکن بھاگتے وقت اُس کے رفیق نے یہ بھی نہ سوچا۔ جانور جو ٹھیرا۔

ساری بوغانے مشکیزہ کمر سے باندھا، تلوار لگائی، اور گھوڑے کے سُم کے نشانات ڈھونڈھتا ہوا روانہ ہوا، تھوڑی دُور تک تو چمکتی ہوئی ریت پر نشانات صاف صاف نظر آتے، پھر پتھریلی زمین یا کوئی ٹیلہ آ جاتا اور نشانات چھپ جاتے معلوم ہوتا تھا، بے وقوف جاندار نے واپس المالیک کا رُخ کیا تھا۔ ویسے یہ بڑا بزدل، ناخلف ٹٹو نکلا۔ حالانکہ اس کے آبا و اجداد نے چنگیز کے ساتھ نکل کر دُنیا فتح کی تھی۔ روس کی چراگاہوں میں جاڑوں میں سُموں سے برف کھود کھود کے گیلی جمی ہوئی گھاس کھائی تھی، اور ایران کے ریگزاروں کو تپتی ہوئی دھوپ میں طے کیا تھا۔ ساری بوغا میں ابھی تک مغلوں کی سخت جانی باقی تھی۔ تیمور اور سلطان حسین کے ساتھ رہ کر بھی اُسنے اپنی وضع نہ بدلی۔ وہی لمبی لمبی مونچھیں دونوں رخساروں پر بچھو کی ٹوٹی ہوئی ڈنک کی طرح جھکی ہوئی، اور ٹھوڑی پر وہی مختصر سی داڑھی، گرد سے اَٹی ہوئی۔

دھوپ سر پہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ گھوڑے پہ یہ دھوپ کچھ نہیں تھی۔ کیونکہ جب سے اُسنے ہوش سنبھالا تھا، گھوڑا اُس کے جسم کا گویا نصف حصہ تھا۔ اُس کے بغیر اس کی زندگی، اس کا وجود

اُس کا جسم نامکمل تھا۔ وہ دماغ تھا، قوی بازو تھا، تلوار تھا، مگر قدم، رفتار، حرکت یہ سب گھوڑے کا کام تھا۔ اپنی زندگی میں ساری بوغا نے کبھی اپنے آپ کو اس قدر مجبور محسوس نہیں کیا تھا، جیسے اس تپتی ہوئی دوپہر کو، اُس جھلستے ہوئے ریگستان میں پیادہ پا۔

جب گھوڑے کی ٹاپوں کے نشان غائب ہو جاتے تو ساری بوغا کسی ٹیلے پر چڑھ کے دیکھتا اور تھوڑی دور پر پھر نشان نظر آتے، اور وہ پھر ٹیلے پر سے اُترتا۔ اس مرتبہ جو وہ ایک ٹیلے پر چڑھا تو اُسنے ایک ویران سا مینار دیکھا۔ کسی مسمار عمارت کا مینار جو اس لق و دق ریگستان میں معلوم نہیں کس نے بنائی تھی؟ غالباً خوارزم شاہیوں نے۔ غزنوں یا مغلوں یا شمال کے شہسواروں کی نقل و حرکت دیکھنے کے لئے۔ اور اب بھی یہ نامکمن مُدوّر مینار اس ریگستان میں کھڑا تھا۔ اس مرکی واحد علامت کہ یہاں انسان کا بھی گذر ہوتا رہا ہے۔ ورنہ اس کڑکتی ہوئی دھوپ میں کسی جاندار کا پتہ نہ تھا۔ نہ کوّے کی کائیں کائیں تھی، نہ گیدڑ کی آواز۔ آسمان پر اکیلا ایک گدھ منڈلا رہا تھا۔

ساری بوغا نے جلدی سے مینار کا رخ کیا۔ یہی ایک موقع تھا۔ اگر مینار پر چڑھنے کی سیڑھیاں ہوں، یا کم سے کم دیوار میں کچھ پتھر لیسے ہوں جن کے سہارے اوپر چڑھا جاسکے تو اطراف میں بہت دُور دُور تک کا علاقہ نظر آئے گا، اور کہیں نہ کہیں اُس کا گھوڑا نظر آ ہی جائے گا۔ کیونکہ بیوقوف گھوڑا اکیلا ایک تک پہنچ ہی نہیں سکتا۔ اُس کے بغیر اُس کے گھوڑے کا وجود بھی تو نامکمل تھا۔ کیونکہ وہ اس کا دماغ تھا، وہ وہ ہاتھ تھا جو اس گھوڑے کو سوکھی ہوئی گھاس اور مشکیزے کا پانی دیتا۔ اور اس ریگستان میں نہ کہیں ہری گھاس تھی اور نہ چشمے کا پانی۔

مینار کے قریب پہنچ کر اُسنے دیکھا، تو یہ کافی اونچا تھا، پتھروں کا رنگ ریت کے تھپڑوں میں اور زیادہ ریتیلا ہو چکا تھا، اور ان میں کہیں کہیں سُرخی جھلک رہی تھی۔ زینے پر چڑھنے سے پہلے اُس نے صدا لگائی " او۔ او۔ او "

اور اُس کی اپنی ہی آواز گونج کر واپس آئی۔ اس کی تلوار کی نیام پتھروں سے ٹکرائی، اُس کے چمڑے کے جوتوں کی چرچر کی آواز سے بھی گونج سی پیدا ہوئی۔ اُسنے کھنکھارا اور کھنکھارنے کی آواز بھی مینار کی سیڑھیوں پر گونج اٹھی۔ ساری بوغا بہادر تھا، لیکن انسانوں کے مقابل غولِ بیابانی کے متعلق اُس نے بہتسے قصے سمرقند میں سُنے تھے اور بڑے معتبر لوگوں کی زبانی۔ مثلاً جلال الدین گیلانی نے ایک بڑے مناظرے میں جنّات، غولِ بیابانی اور ارواحِ خبیثہ کا وجود ثابت کیا تھا۔ اور ساری بوغا کا عقیدہ ذرا ذرا کچا تھا کہ یہ ساری غیر مرئی اور شیطانی مخلوق شاید ہو شاید نہ ہو۔

معلوم نہیں اُسے غولِ بیابانی کا خیال پہلے آیا، یا دو آدمیوں کا — یا دونوں یکساں تھے۔ مگر یہ ایک نئی طرح کی آواز تھی۔ کسی اوپر کے چمڑے کے جوتوں کی چرچراہٹ کی گونج۔ پتھروں سے کسی اور کی تلوار کے میان کے کھڑکھڑانے کی آواز اور پھر ایک صدائے بازگشت۔

اُس نے فوراً لاحول ولا قوۃ پڑھا۔ اور بہادری سے دل میں سوچا کہ اب تک آدمیوں سے لڑتا رہا ہوں۔ اب غولِ بیابانی سے بھی مقابلہ سہی۔ لاحول ولا قوۃ کے ساتھ ہی ساتھ اُسنے من کے کوکو تینگری، نیلیں جاودانی آسمان کو یاد کیا کیونکہ اور حقیقتاً مغلوں کی طرح اس کا عقیدہ کچا تھا۔ کبھی وہ خدائے واحد القہار سے مُراد مانگتا اور کبھی جاودانی آسمان سے۔ کبھی ایک پر ایمان لے آتا، اور کبھی اپنے دل کی گہرائیوں میں دوسرے کی حکومت محسوس کرتا اور کبھی کبھی سوچتا کہ دونوں ایک ہی ہیں۔

اُسنے وحشیانہ مغل انداز میں پھر نعرہ لگایا۔ "کون ہے؟ . . . . . اُو . . . . . اُو . . . . . اُو"

وہ جو اوپر کی چھپی ہوئی چکر دار سیڑھیوں پر آگے آگے اوپر چڑھ رہا تھا، ایک لمحے کے لئے رکا۔ اور پھر چرمی جوتوں کے چُرمُر کی گونج بڑھ گئی۔

ساری بوغا نے تلوار کھینچ لی۔ "یہ جن نہیں انسان ہے۔ میری آواز سن کے اوپر بھاگ رہے"

اور اُسنے جلدی جلدی سیڑھیاں پھاند کے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ اب اوپر اوپر جو آدمی چڑھ رہا تھا، اُس کی شکل اُسے اپنے سے بہت قریب نظر آئی۔ اُس نے بھی تلوار کھینچ رکھی تھی اور ساری بوغا کو اوپر چڑھتا دیکھ کر وہ ایک لحظے کے لئے ٹھٹکا اور تلوار سونتی۔ بے اختیار ساری بوغا کی زبان سے حیرت کے عالم میں نکل گیا۔

"سلطان حسین"

سلطان حسین کا بھاری بھرکم جسم اُس سے صرف چند سیڑھیوں اوپر تھا، اس کی گھنی داڑھی کے ملگجے بالوں پر گرد تھی، وہ مُنہ چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سفید چوڑی پیشانی کے نیچے اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں مایوسی اور اندوہ سے اپنی چمک کھو چکی تھیں۔ اُس کا وقار اب بھی شاہانہ تھا۔ اور اُس کی تلوار کی دھار تیز تھی۔

سلطان حسین نے ساری بوغا کی چھوٹی چھوٹی منگول آنکھوں میں مکاری اور چالاکی کی چمک پڑھی۔ اس نے پھر اپنا سوال دُہرایا۔ "تو یہاں کیا کر رہا ہے؟"

"میں الغ بیگ سے سمرقند جا رہا تھا۔ اکیلا۔ خداوند بھی کوئی زندگی ہے برفستانوں اور ریگستانوں

میں اکیلے ایلچی اور جاسوس کی زندگی۔ مگر آپ کی خدمت میرا فرض ہے۔ میں ہر خدمت کے لئے تیار ہوں
میں المالیک سے ختن گیا مغلستان کی سرحدوں تک گیا۔ اور مجھے چغتائیوں کے سب حالات معلوم ہیں...
میں المالیک سے سمرقند واپس جا رہا تھا کہ میرا گھوڑا رات کو کھو گیا۔ وحشی گھوڑا تھا، چھوٹا سا منگول ٹٹو،
مگر اپنے آپ کو شاید عرب شبدیز سمجھتا ہے، یا سمجھتا ہے کہ میں من کے کوکو تمنگری کے علاوہ کسی اور کی سواری
کے قابل نہیں۔ رات کو میں نے اُسے کھلایا پلایا۔ صبح کو دیکھا تو غائب۔ خداوند میں نے بلی کی بے وفائی
کے قصے سنے ہیں، عورت کی بے وفائی کے قصے سُنے ہیں، بھائی بھائی کی بے وفائی کے قصے سُنے ہیں لیکن
کتے یا گھوڑے کو نہ بے وفا دیکھا تھا نہ سُنا تھا۔ اور جو نہ دیکھا تھا اور نہ سُنا تھا وہ مجھ پر گذر گئی۔ میں
نے دُور سے یہ مینار دیکھا، اور سوچا کہ اس پر چڑھ کے اِدھر اُدھر نظر دوڑاؤں۔ یہاں آیا تو خداوند کی قدم
بوسی نصیب ہوئی۔ مگر حضور یہاں اکیلے کیسے؟"

"تو نے واقعات کا احوال نہیں سُنا؟" سلطان حسین نے شک کے لہجے میں پوچھا۔

"حضور والا کون سے واقعات؟"

"میری اور امیر تیمور گورگاں کی لڑائی۔ اس لنگڑے کے آگے میری تقدیر میرا ساتھ چھوڑ گئی۔ میرے
خیال میں تو اسی کا بھیجا ہوا جاسوس ہے۔"

ساری بوغا ایک لحظے کے لئے ہچکچایا کہ اپنی تلوار سلطان حسین کے سینے میں گھونپ دے یا اُس کے قدموں
پر ڈال دے۔ لیکن اُس کی اپنی گردن کے قریب سلطان حسین کی تلوار کی نوک تھی۔ اُس نے المالیک میں تیمور
اور سلطان حسین کی لڑائی کی خبریں خوب سُنی تھیں۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ نکلتے ہوئے سورج کا ساتھ اچھا
ہے، ڈوبتے ہوئے چاند کا کیا ساتھ۔ اُس کے جی کے پر یکلخت کر خشگی پیدا ہوئی یہ خواہش نہ، بلکہ حشیانہ وار
میں یہ تلوار سلطان حسین کے ہاتھ سے گرا دے۔

اور اس کی آنکھیں سلطان حسین کی سرد، منجمد آنکھوں سے دوچار ہوئیں، تو اُسے محسوس ہوا کہ جیسے
اسکے خیالات سلطان حسین پر آئینے کی طرح روشن ہیں۔

اُس نے ایک لحظے کے اندر اندر تصفیہ کیا اور اپنی تلوار سلطان حسین کے قدموں پر ڈال دی
اور گردن جھکا دی۔

"خداوند میں مغل ہوں۔ اور آپ جلائر مغل سلطان ہیں۔ آپ کی رگوں میں خانِ اعظم چنگیز
خاں اور ایلخاں ہلاکو خاں کا لہو ہے۔ یاسائے چنگیزی نے مجھے آپ کی اطاعت کا حکم دیا ہے میں آپ
سے غداری کر کے تیمور لنگ کا ساتھ کیسے دے سکتا ہوں، جو گورگاں ہے، جو چنگیز کے خانوادے کا داماد ہے۔

اور یہ بھی تو آپ ہی کے رشتے سے۔ میں ان کے کوکو تنگری کی یا یاسائے چنگیزی کی قسم کھاتا ہوں کہ میں آپ ہی کا نوکر ہوں۔"

یہ کہہ کر ساری بوغا نے اوپر کی سیڑھیوں پر سلطان حسین کے قدموں کے قریب اپنا سر رکھ دیا۔

سلطان حسین کے ہونٹ لرزنے لگے، اس کے ہاتھ کپکپائے۔ شک ایک لمحہ کے لئے ٹپکا اور غائب ہوگیا۔ پھر یہ کہ شک سے فائدہ ہی کیا تھا۔ اب شہ مات کے وقت دیر کیا سویر کیا۔ فرزیں نہیں رخ نہیں سپاہ نہیں، ایک مغل اسپ ملا ملانہ ملا ملا۔ سلطان حسین کی گھنی پلکوں پر ایک نمکین ستارہ جھلکا۔ اسنے اپنی میلی خورجی سے مروارید کا ایک ہار نکالا اور ساری بوغا کے ہاتھ میں پکڑا دیا "اس وقت میرے پاس کچھ نہیں، تو جا، اپنا راستہ لے۔ اور کسی سے اس کا ذکر نہ کر کہ تو نے مجھے یہاں دیکھا ہے۔ میں نے اوپر سے تیرے گھوڑے کو دیکھ لیا ہے، شمال مشرق میں اس نوکیلے ٹیلے کے اس پار ایک نخلستان ہے جہاں تیرا ٹٹو گھاس چر رہا ہے۔

ساری بوغا خوشی سے چیخ پڑا۔

سلطان حسین نے پھر اسی وقار سے دہرا کر کہا "جا اور اپنا راستہ لے"

سلطان حسین کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ ساری بوغا نے اس کی طرف دیکھا اور اب وہ ایک نظر میں بھانپ گیا کہ ہارا ہوا شہریار کئی روز سے بھوکا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ وہ دیوار کے سہارے اپنا وزنی بوجھ سنبھالے تھا، لیکن اب بھی اس کا ہاتھ تلوار کو مضبوطی سے تھامے تھا۔ اور ساری بوغا کو مجال نہ ہوسکی کہ اپنی نثار کی ہوئی تلوار پھر سے اٹھالے، اور وہیں غداری کا وار کرے۔ اسنے نظر اٹھا کے سلطان حسین کی طرف دیکھا، اسکے سارے خیالات پھر سلطان حسین پر آئینے کی طرح آشکارا تھے، گویا سلطان کی آنکھیں اس کی غداری کو سمجھ گئی رہی تھیں اور معاف بھی کر رہی تھیں۔ اسنے پھر سلطان کے قدموں پر سر رکھ دیا اور رونے لگا "میرے آقا نے مجھ پر رحم کیا، میری جان بخشی کی، مجھے مروارید کا ہار دیا، اور میں نے اپنے آبا و اجداد سے وفاداری نہ سیکھی۔ میرے آبا و اجداد نے چغتائی خاں کے ساتھ ختن فتح کیا اور میں آج حضور کے کام نہ آسکا۔ اب مجھے جاں نثاری کی اجازت مرحمت ہو۔ اس وقت میرے مشکیزے میں گندے پانی کے سوا کچھ نہیں۔ میں نخلستان سے اپنے ٹٹو کو لے کے کسی قریب کی ترکمان خیمہ گاہ تک جاؤں اور وہاں سے اپنے آقا کے کھانے کے لئے کچھ نہ کچھ لیتا آؤں"

سلطان حسین نے اسے اٹھنے کا حکم دیا لیکن اس کی تلوار اسکے حوالے نہیں کی۔ یہ حفاظت

کی آخری کوشش تھی۔ لیکن اُسے قتل بھی نہیں کیا۔ شاید اُس کے دل میں وفا کی شمع روشن ہو۔ شاید وہ پہلا منگول ہو جو اور شطرنج کے سب مہرے اُسی کے ذریعہ فراہم ہوں۔ اور شاید تقدیر کا یہی منشا ہو۔ اس سے پہلے بھی کئی بار یہی ہو چکا ہے کہ دوست نے دشمنی کی، اور دشمن نے دوستی۔ غدار نے جان بچائی، اور جاں نثار نے غداری کی۔ سلطان حسین نے اُسے اُٹھنے کا حکم دیا۔ اور کہا "یا تو اپنا راستہ لے۔ یا اگر تو سچا ہے تو دن کو اِدھر کا رُخ نہ کرنا۔ رات کو اگر کچھ کھانے کے لئے لا سکتا ہے تو لے آ۔"

یہ کہہ کے سلطان حسین نے اُسے شک کی نظروں سے دیکھا۔ مگر اب اس منگول سردار کے چہرے پر کہیں مکاری اور چالاکی کے آثار نہ تھے۔ اُس نے سلطان حسین کے ہاتھ چومے، اپنی تلوار دیتے اس کے قدموں پر پڑی رہنے دی۔ اور دبے پیر سیڑھیاں اترنے لگا۔ اور مینارے باہر جانے سے پہلے ایک بار پھر اس نے سر بسجدہ ہو کے سلام کیا اور کہا کہ "یہ جاں نثار اندھیرا ہوتے ہی اپنے آقا کے لئے کھانے کا سامان کہیں نہ کہیں سے لیتا آئے گا۔"

سلطان حسین اسی طرح دیوار کو سہارا لئے ہوئے کھڑا رہا، مگر اُسے بھوک سے چکر آرہا تھا۔ جب ساری بوغا مینارے باہر غائب ہو چکا تو سلطان حسین نے مینار پر سے چڑھ کے دیکھا۔ نخلستان میں اپنا ٹٹو دیکھ کے ساری بوغا اس اشتیاق سے اُس کی طرف دوڑا کہ اس عالم میں بھی سلطان حسین کو ہنسی آ گئی اور پھر اُسے ذرا اطمینان ہوا کہ ساری بوغا نے سمرقند کا رُخ نہیں کیا بلکہ وہ جنوب میں اُس طرف روانہ ہوا جہاں ترکمانوں کے خیمے تھے۔ اس کے باوجود سلطان حسین کو ساری بوغا کی غداری کا اندیشہ برابر کھٹکتا جاتا تھا۔ اس کے دل میں یہی آئی کہ شام ہوتے ہی اس ویران مینارے اور کہیں بھاگ نکلے، لیکن پھر بھوک پیٹ میں اژدہے کی طرح پھنکارے مارنے لگی، اور سلطان حسین نے اپنے دل میں کہا کہ یہ گدھ جو دن بھر مینار پر میرے انتظار میں منڈلاتا رہا ہے، مجھے کتنی دُور اور جانے دے گا۔ اور وہ تن بہ تقدیر نیم غشی کے عالم میں سو سا گیا۔

## ۳

اور جب اندھیرے میں اس نے سیڑھیوں پر اور اپنے اطراف قدموں کی چاپ سنی تو وہ لمحہ بھر میں سمجھ گیا کہ یہ ساری بوغا اکیلا نہیں۔ ایک پورا دستہ اُس کے ساتھ ہے اور یہ دستہ وفاداروں کا نہیں۔ اور اُس نے ساری بوغا کی مکار آواز سنی جو تاریکی میں استہزا بکھیر رہی تھی "ہم حضور کے جاں نثار خادم ہیں لیکن اب حضور کی مزاحمت بیکار ہے۔"

سلطان حسین نقاہت کے عالم میں تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا، اس کا تن ہلکے ہلکے بخار سے، اور اُس کا من ایک طرح کی بے حسی سے جل رہا تھا۔ مگر اُس نے پورے شاہانہ دبدبہ کے ساتھ کہا "مجھے اپنے امیر کے پاس لے چلو

تیمور کے خیمے میں ہر چیز سلطان حسین کی جانی پہچانی ہوئی تھی، یہاں تک کہ وہ شکل بھی جو بچھے سے حاشیہ دار تخت پر آہنی خود پہنے براجمان تھی، اور جس کی ایک ٹانگ آگے کی طرف پھیلی ہوئی تھی۔

تیمور نے سلطان حسین کی طرف ایسی آنکھوں سے دیکھا جو گویا شیشے کی بنی ہوئی تھیں، جن میں جذبہ ندارد تھا۔ اس کے چہرے پر نہ خوشی تھی نہ رحم نہ خشونت۔ ایک خشکی تھی جس میں جذبات کا قطعی وجود نہ تھا۔ اور اس نے سلطان حسین کو عزت سے بٹھانے کا حکم دیا۔

پھر اس نے اپنے اس رقیب، اس عزیز کی طرف دیکھا جو اولجائی کا بھائی تھا۔ اور اولجائی اسے یاد آگئی اب وہ شہرِ سبز کے ایک سرسبز و شاداب پائیں باغ میں سرو کے ایک نوخیز پودے کے سائے میں ازلی ابدی نیند سو رہی تھی۔ اس کی اولجائی جس کے حسین، گداز جسم سے ایسی زندگی ٹپکتی تھی کہ وہ ہر لمحے چہکتی ہوئی، بھیانک دانت دکھاتی ہوئی موت کو بھول جاتا، جو ہر زاویہ، ہر گوشہ سے اس سے آنکھ مچولی کھیلتی۔ اور جب تیمور کو اولجائی یاد آئی تو اس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکلے، لیکن ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے اوپر سے نیچے تک اس کے دل کو کسی بڑھئی کے آرے سے چیر دیا ہے۔ جیسے یہ زخم جسے کسی انسان کے ہاتھ نے نہیں لگایا تھا، شہرِ سبز کی طرح ہمیشہ ہرا رہے گا۔

سلطان حسین میں اولجائی سے ذرا سی مشابہت تھی، وہی کشادہ پیشانی، وہی ذرا ذرا پھیلی ہوئی ناک اور پھڑکتے ہوئے نتھنے۔ اور تیمور نے ایک جذبہ سا محسوس کیا کہ وہ اٹھ کر اپنے اس خون کے پیاسے دشمن سے بغل گیر ہو جو اس کی محبوبہ کا بھائی تھا لیکن سنگین آنکھیں، فولادی اعصاب پھر سنگ و آہن کے ہو گئے۔ اولجائی کو سلطان حسین کے ہاتھوں کون سی راحت ملی تھی۔ کیا اسنے اولجائی کا ایک ایک محبوب زیور اپنے ہاتھ سے اتار کے سلطان حسین کو بطور محصول کے نہیں دیا تھا۔ اور یہ جان کر بھی کہ یہ زیور بہن کا ہے سلطان حسین نے اس خراج کو قبول نہیں کیا تھا۔ کیا اولجائی کی زندگی میں بھی وہ اس کے خون کا پیاسا نہیں رہا تھا۔

اس جنگل میں کوئی کسی کا بھائی نہیں تھا۔ کوئی کسی کا عزیز نہیں تھا۔ یہاں شیر تھے، چیتے تھے اور ان کے ساتھ بہت سے جنگلی جانور لگے ہوئے تھے۔ کچھ شغال، کچھ بھیڑیئے، کچھ خرگوش۔ یہاں کون کس کا تھا؟ یہاں نری موت تھی۔

پہلا فرض مہمان نوازی تھا۔ سلطان حسین کے ہاتھ دھلائے گئے اور اس کے آگے دسترخوان بچھایا گیا۔ تیتروں کی یخنی، شیشں کوفتہ اور پتلی پتلی ترکمانی نانوں کی رکابیاں اس کے آگے سجائی گئیں۔ تیمور کو معلوم تھا کہ سلطان حسین کو توراتی کومیس پسند نہیں۔ ہراتی انگوروں کی کشید کی ہوئی شراب کا ساغر اور اس کے ساتھ کاشان کا منقش طلائی جام اس کے آگے رکھا گیا۔ اس کا اپنا بھانجا اور تیمور کا سب سے بڑا بیٹا جہانگیر اس کے سامنے، تیمور

کے اشارے پر دو زانو ہو بیٹھا۔ سلطان حسین کئی دن کا بھوکا تھا، لیکن اس کے چہرے سے یا اُس کے شاہانہ اندازِ استغنا سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی اتنا کھا پی چکا ہے، کہ اب صرف اپنے میزبان کی خاطر سے دوبارہ کھانے پر آمادہ ہوا ہے۔

کھانے کے دوران میں فراست اور خالص ترین شر کی ایک جھلک تیمور کے چہرے پر نمودار ہوئی اس کے ابرو اور گھنے ہو گئے، اور اُس کی پیشانی پر تین لکیریں نمودار ہوئیں۔ اور اُس نے تین مرتبہ تالی بجائی۔ اس سہ بارہ تالی کا مطلب سب کو معلوم تھا، ایک زرد زرد لاغر اندام شخص پردے کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ وہ چینی اطلس کا لبادہ پہنے تھا، اور اُس کی تلوار کی میان طلائی تھی۔ وہ سر سے پیر تک بجائے زرہ بکتر اور جوشن کے محبوب خواجہ سراؤں اور غلمانوں کی طرح جواہرات پہنے تھا۔ اُس کے کان چھدے ہوئے تھے۔ اور اُس کے گلے میں مروارید کے ہار پڑے تھے۔ لیکن اُسکے سر پر مغلوں کا چنگیز خانی تاج تھا۔

تیمور کے ہونٹوں پر ایک طرح کی فریب شیطانی مسکراہٹ جھلکنے لگی اور اُس کا اشارہ پاتے ہی، تیمور کی اپنی اولاد کے سوا جتنے درباری اور سپہ سالار تھے وہ سب جھک کر آداب بجا لائے۔ اور تیمور نے اس چینی اطلس کے لبادے کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

سلطان حسین نے یہ سب کن انکھیوں سے دیکھا، اور نفاست اور بے نیازی سے نان اور شیش کوفتہ کا ایک بڑا سا لقمہ اپنے منہ میں رکھا۔ اور پھر رائی شراب کا جام اپنے مُنہ سے لگا لیا۔

اب تیمور نے اُس سے کہا۔ "برادرِ عزیز سلطان حسین جب آپ ہم سے جُدا ہو گئے۔ اور آپنے مجھ سے مقابلہ اور میرے خلاف صف آرائی میں مصلحت جانی تو میں نے سیور غاتمش کو جو خانِ اعظم چنگیز خاں کی نسل سے ہے، اور جس طرح آپ ایلخانی شاخ کے چشم و چراغ ہیں، اُسی طرح اُس کا تعلق چغتائی شاخ سے ہے، ماوراالنہر سمرقند اور تاتار کا بادشاہ مقرر کیا۔ کیونکہ بادشاہ کا خانِ اعظم چنگیز خاں کی نسل سے ہونا ضروری ہے۔"

سلطان حسین نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جہانگیر نے اپنے باپ کی طرف نیچی نظر سے ایک بار دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔ خدام نے آگے بڑھ کے سلطان حسین کے آگے سلفچی رکھ دی، اور اُس کا ہاتھ دُھلانے لگے۔ — سلطان حسین نے مُنہ میں انگلی ڈال کے دانت صاف کئے اور کلّی کی۔ خُدام نے تُرکی طوال اور کنگھا پیش کیا۔ سلطان حسین نے طوال سے منہ صاف کیا، اور اپنی گھنی داڑھی میں کنگھی کی۔ دسترخوان بڑھایا جانے لگا۔ اور اُسوقت دانتوں میں طلائی خلال کرتے کرتے سلطان حسین تیمور کی طرف متوجہ ہوا۔ سیور غاتمش پر اُسنے حقارت اور رعونت کی نظر ڈالی اور تیمور سے کہا۔ "برادرِ عزیز امیر تیمور گورگاں تعز من تشاء و تذل من تشاء۔"

قاضی زین الدین نے تسبیح پڑھتے پڑھتے گردن جُھکا لی۔ تسبیح ختم کرکے اُس نے گہری سانس لی۔ اور تیمور

کی طرف لجاجت کی نظر سے دیکھا، گویا وہ سلطان حسین کی سفارش کر رہا ہے۔ پھر ہمت کرکے اُس نے ہاتھ جوڑے اور کہا:

"اگر اس بوڑھی بے مصرف جان کو اماں ملے تو کچھ عرض کرنے کی جرأت کروں۔"

تیمور نے اُس کی طرف دیکھا، یہ گویا اُس کے اپنے ضمیر کی آواز تھی۔" زین الدین بابا آپ کا ارشاد میرے سر آنکھوں پر۔"

زین الدین نے کہا" امیر تیمور صاحب قراں، اللہ تعالیٰ کی مصلحتیں عظیم ہیں، اور عجیب و غریب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت اور توقیر بخشی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیمور کے چہرے پر بے صبری کی لہر دیکھ کر اُس نے کہا" اُس کے فیض سے آپ کے بازو کو وہ قوت عطا ہوئی کہ آپ نے چغتائی مغلوں کا قلع قمع کیا، ماوراالنہر اور سمرقند کو کفار سے پاک کیا۔ اپنے اور تمام حریفوں کو شکست دی، اور بجا طور پر آپ نے اپنے لئے امیر صاحب قراں کا لقب انتخاب فرمایا۔ آپ نے قرآن کے ساتھ یاسائے چنگیزی کی بھی پابندی کی۔ آپ نے تاج کو ٹھکرایا، اور اپنی ایک ٹھوکر سے امیر سیورغاتمش کو تاجدار بنا دیا۔ آج آپ کا حریف اور برادر نسبتی سلطان حسین آپ کے دربار میں اسیر ہو کے آیا ہے۔ یا امیر صاحب قراں یقیناً آپ کا وقت ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" زین الدین کی آواز میں اب خوشامد یا مصلحت کا اثر باقی نہ رہا اور اس نے کڑک کر کہا" یہ جان بخشی، اور فراخ دلی کا موقع ہے سلطان حسین آپ کا بھائی ہے۔ آپ کی مرحوم اہلیہ جنت مکانی اولجائی خاتون آغا کا بھائی ہے۔ اس بوڑھے کی سفید داڑھی کی لاج رکھئے۔ آپ دونوں میری دونوں آنکھوں کا نور ہیں۔ آپ سلطان حسین کی خطا سے درگزر کیجئے۔ اور اولجائی خاتون آغا کی محبت اور اُن کی یاد کے واسطے سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

تیمور نے دیکھا کہ جہانگیر کی گردن جھک گئی ہے، اور اُس کی پلکوں پر ذرا سی نمی پیدا ہو چلی ہے۔

تیمور نے کرخت آواز لیکن بڑے ادب کے لہجے میں کہا" بابا زین الدین مجھے ایک لمحے کے لئے معاف فرمائیں۔ میں ساری بوغا سے ایک سوال پوچھ لوں۔"

جہانگیر پر نظر گاڑ کے تیمور نے ساری بوغا سے پوچھا۔

"ساری بوغا مروارید کا جو ہار تمہیں سلطان حسین نے دیا، تمہارے پاس ہے؟"

ساری بوغا نے دوزانو ہو کر وہ ہار اپنی خورجی سے نکالا اور تیمور کی خدمت میں پیش کر دیا۔

تیمور نے کہا" ساری بوغا اس کے بدلے اس کی دہری قیمت کے جواہر تمہیں ملیں گے۔ میں نے تمہیں تمہاری وفاداری کے صلے میں منگ باشی مقرر کیا۔" اور پھر تیمور نے جہانگیر پر شفقت کی ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال کے اسی طرح بیٹھے بیٹھے اپنی گردن سلطان حسین کی طرف پھیری، اور اس طرح کہا جیسے کوئی اپنے آپ سے کوئی راز کی

بات کہے۔"

"یہ ہار اولجائی خاتون آغا کا تھا۔"

دفعتاً خیمے میں سناٹا چھا گیا۔ زین الدین کی زبان بند ہو گئی۔ جہانگیر کی پلکیں خشک ہو گئیں۔ ایلچی بہادر کے چہرے کے اعصاب سخت ہو گئے، ساری بوغا کی منگول مونچھوں کے نیچے ایک وحشی سی مسکراہٹ ایک کان سے دوسرے کان تک پھیل گئی ——— اور سلطان حسین نے سر جھکا لیا، اور لمحہ بھر بعد جب کنکھیوں سے تیمور کی طرف دیکھا تو معلوم ہوتا تھا کہ تیمور کی آنکھیں زرد ہو چکی ہیں، جیسے اُسے یکلخت یرقان ہو گیا ہو۔

اور تیمور نے آہستہ آہستہ کہا: "سلطان حسین، خدا نے تمہیں جلائروں کے خاندان میں، چنگیز خاں کی اولاد میں پیدا کیا۔ تم سلطان تھے، الجائی تمہاری بہن تھی۔ یاد ہے میں نے ہمیشہ تم سے وفاداری کی۔ میں نے چغتائیوں کو سیر دریا کے اُس پار دھکیلا، اور جیحون اور سیحوں کے درمیان کی سرزمین تمہارے حوالے کی۔ میں نے تم سے برابری اور ہمسری کا دعویٰ نہیں کیا تھا، لیکن تم نے مجھ پر اور اپنی بہن پر جو مصیبت کے زمانے میں تمہارے ساتھی تھے، اپنی سلطنت کے زمانے میں بہت سختی کی۔ . . . . . ." مصنوعی زخم خوردہ آواز میں تیمور نے کہا: "تم اس ہار کو پہچانتے ہو، جب تم نے لگان بڑھا دیا اور مجھ پر سختی کی تو میں نے اولجائی خاتون آغا کے زیور اُتار کے لگان میں ادا کئے۔ اور تم جانتے تھے کہ یہ تمہاری بہن کا زیور ہے، لیکن تم نے اُسے بطور لگان کے قبول کیا۔ . . . . . تم نے مجھ پر، اور اپنی بہن کی زندگی میں اُس پر رحم نہ کھایا . . . . . ." اور پھر بپھرے ہوئے زخمی شیر کے لہجے میں اُس نے قاضی زین الدین کو مخاطب کیا: "میرے مرشدِ کامل زین الدین بابا سچ بتاؤ کیا جو کچھ میں کہہ رہا ہوں غلط ہے؟"

زین الدین کا ہاتھ اُسی طرح تسبیح کے دانوں سے اُلجھا رہا۔ دوسرے درباریوں نے بآوازِ بلند ندا لگائی: "امیر صاحب قراں کا ارشاد درست اور برحق ہے۔"

سلطان حسین نے پہلو بدلا۔ پہلے وہ ذرا بے تکلفی سے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، اب دو زانو ہو گیا۔ اُس نے اس کی بڑی کوشش کی کہ اُس کی آواز گلوگیر نہ ہونے پائے، اور اُس کے لہجے میں کھویا ہوا وقار کھوٹے سکے کی طرح کھنکھتا رہے۔ اُس نے کہا: "امیر تیمور گورگاں . . . . ."

آوازیں آئیں: "امیر تیمور صاحب قراں۔"

اُس نے کہا: "امیر تیمور صاحب قراں، خدا تجھے صاحب قرانی مبارک کرے۔ خدا سیورغاتمش کو سلطنت مبارک کرے۔" اس نے ایک حقارت کی نظر سیورغاتمش پر ڈالی جو کھسک کر تیمور کے لنگڑے پیر کے قریب آ بیٹھا تھا "مجھے اب سلطنت کی ہوس باقی نہیں رہی۔ میں اب صرف ایک استدعا کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ مجھے اجازت

ہوکہ میں حج بیت اللہ کا ارادہ کروں۔ میں اس سرزمین سے جہاں میں نے کچھ دن پہلے حکومت کی تھی، اپنا منہ کالا کروں۔ اور باقی ایام خانۂ کعبہ کے طواف اور توبہ و استغفار میں بسر کروں۔"

سادی بوغا اتنی آسانی سے اپنے شکار کو چھوڑنا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے کہا: "اے امیر کتنی بار سلطان حسین سے صلح کی اور دوستی بڑھائی اور کتنی بار دھوکہ کھایا . . . . . ."

بابا زین الدین نے پھر ہاتھ جوڑے اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا: "امیر صاحب قران جو لطف در گذر میں ہے انتقام میں نہیں۔ اگر اجازت ہو تو کچھ عرض کروں . . . . . تیمور کے قیافے پر بے صبری کے آثار دیکھ کر اُس نے کہا: میں کوئی فقہ و حدیث کا حوالہ نہیں دینا چاہتا صرف دنیاوی دانش و سیاست کا ایک واقعہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ واقعہ امیر معاویہ کی زندگی کا ہے جس کے متعلق یعقوبی نے یہ روایت کی ہے کہ کسی نے امیر معاویہ سے پوچھا کہ کس طرح آپ نے اپنے اطراف اتنے وفادار سپہ سالار جمع کئے، اور کس طرح دنیاوی کامرانی میں آپ بازی لے گئے تو امیر معاویہ نے ہنس کر جواب دیا کہ اگر تازیانہ سے کام چل سکتا ہے تو میں تلوار استعمال نہیں کرتا۔ اور اگر زبان سے کام چل سکتا ہے تو میں تازیانہ استعمال نہیں کرتا . . . . . . یہ روایت میں نے اس لئے بیان کی ہے کہ یہ دنیاداری کی دانش ہے۔ اسی مناسبت سے الفخری نے اپنی تاریخ میں امیر معاویہ کے حلم کی تعریف کی ہے۔ حلم کا تقاضہ یہ ہے کہ شکست خوردہ دشمن سے درگذر سے پیش آیا جائے۔"

تیمور کی پیشانی کی شکنیں اُسی طرح گہری تھیں، ابرو پر وہی بل تھے۔

ایلچی بہادر جو ذرا سرور کے عالم میں تھا، بے صبری سے پہلو بدلنے لگا جب کومیس کا نشہ تیز ہوتا تھا تو اُس کے چہرے کی سنجیدگی میں خشونت کا انداز پیدا ہونے لگتا۔ وہ دُنیا بھر سے برہم معلوم ہوتا۔

بابا زین الدین کی بات کاٹ کے اُس نے اکھڑ سپاہی کی طرح تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھا، سر بسجدہ ہو کے زمین چومی اور کہا: "امیر صاحب قران، سلطان حسین نے آپ سے بغاوت کی ہے۔ اور اُسے اس کی سزا ملنی چاہیئے یعقوبی اور فخری جیسے سپاہی کی سمجھ سے باہر ہیں۔"

اس پر سلطان حسین کو طیش آگیا اور وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ قیدی ہے۔ جلائروں کے خاندانی دبدبہ کے لہجے میں اُس نے کہا: "نمک حرام ایلچی بہادر تو نے یہ کیا کہا کہ ہم نے بغاوت کی ہے؟ ہم نے؟ ہم جو جلائروں کے خاندان سے ہیں۔ ہماری رگوں میں ہلاکو خاں اور چنگیز خاں کا خون ہے۔ تو اپنے آپ کو مغل کہتا ہے تو نے کبھی یاسائے چنگیزی پڑھی ہے یا پڑھوا کر سُنی ہے۔ تو نے خانِ اعظم چنگیز خاں کا حکم نہیں پڑھا کہ سلطانی اور بادشاہی اُسی کے اپنے خاندان میں رہے گی۔ تیمور اس لئے امیر ہوا کہ وہ میرے خاندان کا گورگاں ہے یعنی

خاندان میں اُسنے دامادی کی۔ اُس کی شادی میری بہن او لجائی سے ہوئی۔ اور او لجائی جو شاہزادی تھی آج زندہ نہیں۔ پھر بتا کس نے کس سے بغاوت کی۔ اور بادشاہت کس کا حق تھا . . . . "

اب ایلچی بہادر کا سر گھومنے لگا۔ وہ سُوبوتائی بہادر کی اولاد تھا۔ جو چنگیز خاں کا دستِ راست تھا جس نے کبھی چنگیز سے غداری نہیں کی، اور چنگیز سے غداری کر کون سکتا تھا جس نے کبھی باتو خاں سے غداری نہیں کی۔ لیکن چنگیز خاں کی بات اور تھی اور سلطان حسین کی بات اور تھی۔ یا دایلچی بہادر کے دانتوں میں ہرن کے نمکین کباب کی طرح پسنے لگی، اور پھر یاد کچھ یوں بدل گئی گویا وہ تلا ہوا گردہ تھی جسے وہ نمکین ککڑی کی طرح چبا رہا تھا۔ اور اُسنے کہا۔

"بادشاہت کسی کا حق نہیں مگر صاحب قران اور سلطنت اُس کا حق ہے جس کے حق میں بدخشاں کے بڈھے شامان نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ آگ جلا کے ایک لشکر کو شکست دے گا، اور گرد اُڑا کے ایک شہر کو تسخیر کرے گا۔"

اور اس پر آق بوغا نے جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا صدا لگائی: "ہاں سلطان حسین۔ اس وقت تم کہاں تھے، جب امیر تیمور صاحب قران نے آگ جلا کے ایک لشکر کو شکست دی اور گرد اڑا کے ایک شہر کو تسخیر کیا۔"

سبور غاتمش جو تیمور کی لنگڑی ٹانگ کے قریب خاموش بیٹھا تھا، اس طرح بول اُٹھا جیسے راوی ایک دوسرے کی داستان بڑھانے کے لئے بول اُٹھاتے ہیں یا جیسے شاعر ایک دوسرے کا مصرع اُٹھاتے ہیں "بدخشاں کا کون سا شامان؟"

بات کو کبابوں کی طرح دانتوں میں پیس پیس کر ایلچی بہادر نے کہنا شروع کیا "وہی اندھا شامان جسے آمو دریا کے پُل کی لڑائی سے پہلے ہم نے بدخشاں میں چغتائیوں کا جاسوس سمجھ کے پکڑا تھا . . . ."

یہاں سے آق بوغا نے بات اٹھائی "مگر وہ شامان چغتائی نہیں، قپچاق لہجے میں ایغوری بولتا تھا۔ معلوم نہیں کس دُھن میں قپچاق کی ہری بھری چراگاہیں چھوڑ کے بدخشاں کے برف زاروں میں آنکلا تھا۔ بدھ مت کے بھکشوؤں کی طرح کہا کرتا تھا کہ یہیں پہاڑوں میں من کے کو تینگری سے لو لگائی جا سکتی ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل میری سمجھ میں نہ آئی کیونکہ نیلا جادوانی آسمان قپچاق کے مرغزاروں سے تو صاف صاف نظر آتا ہے مگر بدخشاں کے پہاڑوں میں بادلوں سے گھرا رہتا ہے . . . . ."

بات کاٹ کے ایلچی بہادر نے کہا "حضور امیر صاحب قران، بابا زین الدین کی طرح آق بوغا نے بھی لن ترانی شروع کر دی۔ وہ عربی لن ترانی تھی یہ تورانی لن ترانی ہے . . . . . . . میں . . . . . میں تو صرف سلطان حسین

سے کہنا چاہتا تھا کہ میں نے جو امیر تیمور سے وفاداری کا عہد باندھا وہ اس لئے تھا کہ سلطان حسین کا تو دُور دُور کہیں پتہ بھی نہ تھا۔ مگر چغتائیوں کے مقابلے میں امیر تیمور نے گرد اڑا کے ایک حصار کو تسخیر کیا۔"

تیمور کے چہرے پر تحسین کی ایک جھلک تھی۔ عدالت دفعتاً روایت گاہ بن گئی تھی۔ ایلچی بہادر نے نمکین مچھلی، اور تلے ہوئے بادا موں کی آہستہ آہستہ جگالی شروع کی۔

"سلطان سیور غاتمش، تم اُس زمانے میں ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ میرے رفیقوں کو یاد ہوگا کہ ہم سب چالیس آدمی تھے۔ سب سے آگے آگے امیر تیمور گورگاں، اُن کے پیچھے اولجائی ترکان آغا، پھر جاکو برلاس، پھر میرا یہ یار آق بوغا، پھر میں تھا، اور پھر اور سب تھے۔ اور پہاڑی پگڈنڈی بہت تنگ تھی۔ گھوڑوں کے سُم بار بار چٹانوں کی نوکوں سے ٹکراتے۔ ڈھلوانوں پر گندی گندی برف چمک رہی تھی۔ ہم جہاں کہیں دم بھر کو ٹھہرتے، لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیتے۔ ہمارے گھوڑے نرم برف سے رستے ہوئے پانی کی دُھلی ہوئی گھاس کو اس طرح چباتے جیسے مرغ کی یخنی میں ڈوبی ہوئی ترکاری ہم لوگ کھاتے ہیں۔ پہاڑی درندے خال خال تھے، مگر جب ایک موڑ پر امیر گورگاں نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑی تو اُن سے چند قدم کے فاصلے پر ایک پہاڑی تیندوا اسی پگڈنڈی پر سامنے کھڑا ہوا ملا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس یاد کے جادو سے تیمور کی پیشانی پر روشنی سی جھلکنے لگی۔ اور وہ بے ساختہ بول اٹھا۔ "مجھے خوب یاد ہے بالکل میرے مقابل، گویا یہ مقابلہ کرنے کو آنکلا تھا۔ مجھے اس کا رنگ یاد ہے۔ برف کے سمور کی طرح سفید اور اس پر بھورے بھورے دھبے تھے۔ بہت کم زرغے میں مَیں نے ایسے خوبصورت جانور دیکھے ہیں۔ جاکو برلاس نے کمان اٹھائی تو میں نے اُسے روک دیا اور کہا: کہ یہ میری تقدیر کی نشانی ہے۔ اگر اس زخمی ہاتھ سے تیر چلا کے میں نے اس تیندوے کو مار لیا تو میرے تاج کے چالیس ساتھی ایک دن چالیس ہزار بن کے چغتائیوں کو شکست دیں گے۔"

آق بوغا نے کہا: "اور جب حضور نے تیر چلایا تو چشم زدن میں تیندوا وہیں ڈھیر تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور یہی حال امیر صاحب قراں کے اور دشمنوں کا ہوگا۔" اس پر سب نے نظر بھر کے سلطان حسین کو دیکھا، جس کے چہرے کا رنگ سفید پڑتا جا رہا تھا۔

ایلچی بہادر نے کہا "جیسا امیر صاحب قراں نے ارشاد کیا تھا وہی ہوا۔ برلاس سوار آتے گئے اور ہماری تعداد بڑھتی گئی، اور ہم اپنے پیارے آمو دریا کے کنارے کنارے بڑھتے گئے جس کے اُس پار دشمن کا پڑاؤ تھا۔ اُدھر پل چوک کا لشکر تھا، اور ایک مہینے تک ہم آمو دریا کے آر پار اُس سے آنکھ مچولی کھیلتے رہے۔ مغل فوج ہمارے ساتھ ساتھ بڑھتی، ہمارے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹتی۔ اور روز تیروں کے بادل اِس کنارے سے اُس کنارے، اُس کنارے

سے اِس کنارے تک اُمڈتے اور برستے جاتے۔ یہاں تک کہ ہمارے پیارے آمو دریا نے ایک نرالی وادی میں قدم رکھا جس میں نہ سبزی تھی، نہ صنوبر تھے۔ کالی کالی چٹانیں تھیں جن کے کنارے کائی جم رہی تھی اور گھوڑوں کے قدم پھسلتے تھے، اور یہاں پتھر کا ایک مضبوط پُل تھا۔ کالا پُل، مضبوط پُل، آمو کے اِس پار سے اُس پار تک۔ اِس پُل پر امیر نے معاوہ اور امیر موسٰے کے ساتھ پانچ سو بیرلاس سوار چھوڑے اور ہم سب امیر کے ساتھ مغلوں کی فوج کے پیچھے والی پہاڑیوں میں جا پہنچے۔ یہاں امیر تیمور کے حکم سے ہم سب منتشر ہو گئے اور ہم نے دُور دُور تک پہاڑیوں میں آگ جلائی۔ آدھی رات کو جب بکی جوک نے اپنے آگے پیچھے ہر طرف دُور دُور تک آگ جلتی دیکھی اور سُرمئی دھواں پھیلتا دیکھا تو سمجھا کہ ہماری فوج اُس سے کئی گُنی زیادہ ہے، حالانکہ اس کی فوج ہم سے دس گُنی تھی۔ سمجھا کہ وہ ہماری فوج سے گھر گیا۔ سمجھا کہ شطرنج ہار گیا۔ سمجھا خیریت اسی میں ہے کہ بچ کر نکل جائے۔ اور جب وہ بھاگ گیا تو اِس طرح اندھے بدخشانی شامان کی پہلی پیشین گوئی پوری ہوئی۔ امیر گورگاں نے صرف آگ جلا کے ایک جرّار لشکر کو شکست دی۔ سلطان حسین اُس وقت تم کہاں تھے؟"

اور اس پر آق بوغا نے کہا "ایلچی بہادر تجھے یاد ہے۔ اِس واقعہ کے بعد ہمارے آقا امیر صاحب قراں نے کہا آق بوغا وہ اندھا شامان جھوٹا نہیں تھا۔ اگر وہ پیشین گوئی نہ کرتا تو مجھے آگ کا لطیفہ ہرگز نہ سُوجھتا۔ اب چل دوسری پیشین گوئی پوری کر دکھائیں۔" آق بوغا کے اندازِ بیان میں فلفل ہندی کا گرم گرم سُرخ چٹخارہ نہیں تھا۔ "امیر نے کہا سب سے پہلے ماوراالنہر کا جو شہر چغتائیوں سے آزاد ہو گا وہ میرا اپنا شہر، میرا شہر سبز ہو گا۔ تُو اپنے ساتھ دو سو سوار لے۔ اِن سواروں کی رکابوں کے دونوں طرف سُوکھی ہوئی خار دار جھاڑیاں اِس طرح باندھ کہ جب وہ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑائیں تو بے حد گرد و غبار بلند ہو۔ اور اِن سواروں کے ساتھ تُو علی الصباح شہر سبز کی فصیلوں کا طواف شروع کر۔ الغرض صبح سے لے کر نصف النہار تک ہمارے گھوڑے شہرِ سبز کی فصیلوں کا طواف کرتے رہے۔ گرد و غبار کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ لاکھوں کا لشکر شہر کا طواف کر رہا ہے۔ چغتائی دستے نے سفید جھنڈا لہرایا اور شہر کے دروازے کھول دیئے۔ اِس طرح اندھے شامان کی دوسری پیشین گوئی پوری ہوئی۔"

دربار میں "سبحان اللہ۔ سبحان اللہ" کا شور بلند ہوا۔ اور تیمور نے زور سے قہقہہ لگایا "بابا زین الدین تم نے امیر معاویہ کی روایت کیا شروع کی کہ میرے بہادر سرداروں کو راوی بنا دیا۔"

ایلچی بہادر نے کہا "سلطان حسین اس وقت تم کہاں تھے۔ تم جب چغتائیوں سے لڑے۔ غلط طریقہ پر لڑے اور ہمیشہ لڑے۔ اور ہمیشہ منہ چھپاتے پھرے۔"

امیر تیمور کے چہرے پر کڑی، استہزا کی ہنسی کے آثار پیدا ہوئے، لیکن اُس نے اپنے آپ کو روک کے للکار کے کہا "ایلچی بہادر خاموش۔"

پھر اُس نے سلطان حسین کی طرف دیکھا۔ "حسین اس میں کوئی شک نہیں کہ بادشاہت کا حق تجھے پہنچتا تھا، مجھے نہیں۔ لیکن میں نے کبھی بادشاہت کا دعوے نہیں کیا۔ جب تو میری جان کے درپے ہوا تو میں نے تیرا مقابلہ کیا۔ میں نے قرشی کو تسخیر کیا۔ میں نے سمرقند فتح کیا۔ مجبوراً میں نے سیورغاتمش کو بادشاہ بنادیا۔ یہ کیا میرے قدموں سے لپٹا ہوا بیٹھا ہے۔ یہی سیورغاتمش تاتار کا بادشاہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ سلطانی یا خانی کسی گورگاں کو نہیں ملے گی۔ بادشاہ چنگیز خاں کی نسل سے ہوگا۔ لیکن پہلے وہ ہلاکو خاں کی نسل سے تھا، اب چغتائی خاں کی نسل سے ہے۔ اس لئے اب ماوراالنہر میں تیرا کوئی مقام نہیں۔"

سلطان حسین نے کہا "میں تخت و تاج سے دست بردار ہوچکا ہوں۔ مجھے بیت اللہ جانے کی اجازت دو۔"

تیمور نے آنکھیں بند کرلیں۔ گویا وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ ایلچی بہادر نے پھر آق بوغا سے بآواز بلند کہا۔ "اس بہانے ایک مرتبہ پھر چنگل سے نکل گیا تو پہلے کی طرح پھر سر اٹھائے گا۔ اور امیر صاحب قراں سے پھر بغاوت کریگا۔"

امیر تیمور نے ڈانٹ کر کہا "ایلچی بہادر۔ خاموش۔"

جب دربار میں خاموشی چھا گئی تو امیر تیمور نے بآواز بلند کہا "کسی اور امیر کو کچھ اور کہنا ہے۔ سلطان حسین کو میں کوئی سزا اس لئے نہیں دے سکتا کہ جب وہ میرا حریف تھا، اس ملک کا بادشاہ تھا۔ آج جب کہ وہ بادشاہ نہیں، وہ صرف اس ملک سے باہر حج بیت اللہ کو جانے کی اجازت چاہتا ہے۔ میں اسے روک نہیں سکتا۔ کوئی اور امیر ایسا ہو کہ جسے سلطان حسین سے کوئی اور شکایت ہے، اگر ہے تو وہ ابھی بیان کرے کیونکہ میرے دربار میں انصاف ہے، جبر نہیں۔"

تیمور کی آنکھوں میں چالاکی اور مکر کی ایسی بے پناہ چمک تھی کہ بابا زین الدین نے سر جھکا لیا۔ سب سمجھ گئے کہ اب کے جو چال چلی جائے گی، اصل شہ مات وہی ہے۔

عین اُس وقت اس بے ساختگی سے جیسے کوئی مُہرہ خود بخود اٹھے، جیسے برابر برابر کی بازی کے درمیان یکلخت خطرناک طور پر شہ پڑ جائے، ایک نوجوان نے دو زانو ہو کر فریاد کی "بادشاہی آپ کا، سلطان حسین کا اور سلطان سیورغاتمش کا آپس کا معاملہ ہے۔ میں آپ سے انصاف کا طالب ہوں کہ مجھے اپنے بھائی اولجایتو کے خون کا قصاص ملنا چاہئے۔"

یہ مُہرہ جو یوں بے ساختہ اٹھا تھا، تیمور نے سلطان حسین کی گرفتاری کی اطلاع سنتے ہی محض اس موقع کے لئے جما دیا تھا، اب تک وہ خاموش تھا، اب اس جھٹکے کے چلنے سے سناٹا سا چھا گیا۔

امیر تیمور نے قاضی زین الدین کو اشارہ کیا "بابا زین الدین۔ یہ امیر کیخسرو کی فریاد ہے سلطان حسین

کے حکم سے اُس کے بھائی اولجاتیو کو قتل کر دیا گیا تھا۔ تم نے مجھے انصاف کا مشورہ ہمیشہ دیا ہے اور میں نے ہمیشہ مانا ہے۔ اب تم انصاف کا فتوےٰ دو . . . . . ."

سلطان حسین نے کہا "مجھے یہ واقعہ یاد بھی نہیں۔ لیکن امیر تیمور کسی نے آج تک بادشاہ پر قتل کا الزام لگایا ہے ! کیا ہر جان بادشاہ کی ملکیت اور اُس کے اختیار کی چیز نہیں ؟"

مگر شاطر کے چہرے کے اعصاب سخت ہو گئے۔ اور اُسنے کہا "یہ معاملہ انصاف کا ہے۔ اس کا باقاعدہ فیصلہ ہونا چاہئے۔ میں اس میں دخل نہ دوں گا" اور پھر اُس نے تحکّم اور تقویٰ کے ملے جُلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ورنہ کل داورِ محشر کو کیا منہ دکھاؤں گا"

اُس نے نظر اُٹھا کے دیکھا، اُس کے سامنے ایک خمیدہ قامت پیر مرد عصا کا سہارا لئے کھڑا تھا، اس پیر مرد کے جسم میں رعشہ تھا۔ یہ اُس کا پرانا رفیق، اس کا استاد قاضی زین الدین تھا۔

زین الدین کی رعشہ دار آواز میں لجاجت بھی تھی اور ملاحت بھی "اے امیروں کے امیر۔ اے سرداروں کے سردار جس داورِ محشر کا تو نے نام لیا وہ عادل ہے میں نے مانا کہ وہ رحیم بھی ہے اور قہار بھی۔ وہ سب کچھ ہے مگر مدعی نہیں۔ اور قاضی اگر مدعی بھی ہو تو انصاف کیا خاک کرے گا۔ وہ کسی فریق کا فریقِ مخالف نہیں"

بڈھے کی نظروں میں ایک طرح کا جلال تھا جس کے آگے تیمور کا اپنا جلال ماند تھا اسنے کہا بابا زین الدین آپ تشریف تو رکھیں۔ آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر لیکن اب تو اس قضیے میں ایک فریق امیر کیخسرو ہے جو مدعی ہے اور دوسرا فریق سلطان حسین ہے۔ میری حیثیت اس مقدمے میں منصف اور قاضی کی ہے۔ کیا آپ مقدمے کی اس صورت کو تسلیم نہیں کرتے ؟"

بابا زین الدین نے اسی طرح بھرائی ہوئی آواز میں رُک رُک کر جواب دیا "میں کیا اور میری مجال کیا کہ آپ کے مقدمے کی اس صورت کو تسلیم کروں یا نہ کروں۔ لیکن آپ ہی کے والد نے مجھے شہرِ سبز کا قاضی مقرر کیا تھا پھر آپ کے نانا کازغان نے مجھے سمرقند میں قاضی القضاۃ بنایا۔ میں نے ہمیشہ آپ کی اور آپ کے خاندان کی خدمت کی۔ اور آپ کا خاندان سلطان حسین کے خاندان سے الگ نہیں . . . . ."

شاطر گویا لمحہ بھر کے لئے مات کھا گیا۔ اس دہکتے ہوئے جہنم میں کہیں ٹھنڈا نور تھا جو اُبل پڑا اور تیمور نے کہا "اگر آپ چاہیں تو بجائے خود فیصلہ کرنے کے میں سلطان حسین کا مقدمہ آپ کے سپرد کرتا ہوں"

زین الدین کی تھکی ہوئی آواز نے جواب دیا "میں کیا اور میری بساط کیا۔ لیکن اے امیر میں اب چراغِ سحری ہوں۔ اس مقدمے اور اس کے بعد کے ہر مقدمے کی سماعت خود آپ کو کرنی ہے۔ جب میں نے آپ کے لئے امیر صاحبقِراں کا لقب تجویز کیا تو خوشامد کی بات نہیں تھی۔ میں نے آپ کی پیشانی پر

اقبال کا ستارہ چمکتا دیکھا جو آج اگر توران میں چمک رہا ہے تو کل مصر، روم، شام اور قپچاق پر چمکے گا۔ اب یہ آپ کے اختیار کی بات ہے کہ یہ جبر کا ستارہ ہو گا یا عدل کا۔ یہ پہلا مقدمہ آپ کا پہلا امتحان ہے۔ بظاہر سلطان حسین کا حریف اور مدعی کیخسرو ہے، لیکن کیخسرو کو مدعی بننے کی جرأت اس لئے ہوئی ہے کہ اصلی مدعی آپ ہیں۔ اے امیر اگر اِس بوڑھے کی زبان کٹوانی ہو تو کٹوا دیں۔ لیکن جب تک اس زبان میں طاقتِ گویائی ہے مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ عدل میں سازش کا کوئی مقام نہیں۔ عدل ایک مقصود بالذات صفت ہے اور یہی میری ساری زندگی کے سارے تجربے کا نچوڑ ہے۔ اِس سے زیادہ اِس بوڑھے نمک حلال کو کچھ اور نہیں کہنا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

جب زین الدین اپنی تقریر ختم کر چکا تو پُرانے جاں نثاروں نے ــــ ایچی بہادر نے، اور جاکو برلاس نے، اور آق بوغا نے دیکھا کہ تیمور کے چہرے کا رنگ بدل چکا تھا۔ اُس کی نظریں سامنے قالین پر گڑی ہوئی تھیں، اُس کی پیشانی کی تینوں لکیریں اور گہری ہو گئی تھیں، اور وہ گہری سوچ میں تھا۔ اُس وقت پورے دربار پر موت کی سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ زور سے سانس لے سکے یا پہلو بدل سکے۔

دفعتاً زور سے تیمور نے اپنی ران پر ہاتھ مارا۔ اور کہا" خدا کی قسم میں اس وقت کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اب دن ڈھلتا جا رہا ہے۔ صبح کو سلطان حسین کو پھر دربار میں پیش کیا جائے۔"

محافظ دستے کے سپاہی سلطان حسین کو حراست کے خیمے لے گئے، اور جب تیمور دربار کو برخاست کرنے کے لئے اُٹھنے لگا تو اُس نے پوچھا" بابا زین الدین آپ کو کچھ اور کہنا ہے۔"

قاضی زین الدین نے کہا" صرف اتنا کہ جب جسم کو فولاد کا زرہ بکتر پہنایا جاتا ہے، اور سر پر آہنی خود اوڑھا جاتا ہے، تب بھی آنکھیں کھُلی رہتی ہیں۔ حالانکہ آنکھیں جسم کا سب سے نازک حصہ ہیں۔ لیکن جب آنکھیں آہن پوش ہو جائیں تو زرہ بکتر بیکار ہے، فولادی خود بیکار ہے، تیر اور تبر، ڈھال اور تلوار بیکار ہے۔ عدل میں اتنا ہی خطرہ ہے جتنا آنکھیں کھلی رکھنے میں۔ لیکن آنکھوں کے آہن پوش ہونے میں اور زیادہ خطرہ ہے۔۔"

تیمور نے کہا" میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔"

## ۴

آدھی رات کو اُردو میں خاموشی سی چھا گئی، یعنی اگر اُردو میں خاموشی ممکن ہے کیونکہ گھوڑوں کے ہنہنانے اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں لگاتار آ رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد نقیبوں کے گشت اور اُن کی تلواروں کے کھڑکھڑانے کی آواز آتی۔ خیمے کی سیاہ اطلسی چھت کے نیچے، قالینوں کے نرم فرش پر سر اُلمک خانم

غافل سو رہی تھی۔ تیمور نے اُس کے جوان، خوابیدہ، معصوم حسن کی طرف دیکھا اور پھر شطرنج کی بازی میں محو ہو گیا جو وہ ہمیشہ کی طرح اپنے آپ سے اکیلا کھیل رہا تھا۔ اور پھر اُسنے ایک ہاتھ مار کے تمام مُہرے بکھیر دیئے۔ اور اپنے اور سلطان حسین کے متعلق سوچنے لگا۔

یاد کی بساط پر ایام کے پٹے ہوئے مُہرے پڑے تھے، جو دن کو تو فوجوں کے کوچ تلواروں کی چمک، ڈھالوں کی کھڑکھڑاہٹ اور رزم و بزم کے ہنگاموں میں یاد نہ آتے، لیکن راتوں کو بے شمار ستاروں کی طرح نیلگوں جاودانی آسمان کے پردے سے جھانکتے، جگمگاتے اور چھُپ جاتے۔ گویا دن کی ساری مُہم رات کے ان گنت تاروں، اِن ایام، اِن یادوں سے فرار کے علاوہ کچھ اور نہ تھی۔ اور وہ جس کا ثانی عمل اور حرب اور دن کی دُنیا میں کوئی اور نہ تھا رات کو وہ بھی اِن بے خواب ستاروں کے آگے بے بس تھا۔ کیونکہ اِن گذرے ہوئے ایام کی ہر بازی، خواہ وہ جیتی ہوئی بازی ہو یا ہاری ہوئی در اصل ہاری ہوئی بازی تھی ہر روز جو ختم ہو چکا تھا اب نیلگوں جاودانی آسمان پر تارہ بنکے چمک رہا تھا۔ ایک شہ مات تھا، اور ہر ستارہ اس طرح جھلملاتا تھا گویا یہ کل ہی کی بات ہو۔ اور ہر ستارے کی چمک ریا کی، دغا کی، فریب کی چمک تھی۔

اور بابا زین الدین کے الفاظ۔ آج کے الفاظ نہیں، کئی برس پہلے کے الفاظ جب جہانگیر شیر خوار بچہ تھا: اور اولجائی حسین تھی، جوان تھی ـــــــ اور زندہ تھی۔ یہ الفاظ کر چغتائیوں کا خان تو غلوق اس طرح ہمارے سروں پر نمودار ہوا جیسے شہباز کافوری پر جوڑ کر قمریوں کی ٹولی میں آگرتا ہے۔ اور چچا حاجی برلاس، (پگیلی داڑھی کرنجی آنکھیں، مکروہ دہانہ) کی بدحواسی اور ریاکاری "تیمور۔ میرے بیٹے۔ تیرے باپ تارگائی کے مرنے کے بعد میں ہی برلاسوں کا سردار ہوں۔ یہ بھی کوئی شک کی بات ہے۔" بزدلی کے پسینے کے قطرے۔ "بایزید جلائر تیری بیوی کا چچا ہمیں دھوکا دے چکا ہے۔ کہہ گیا تھا کہ خجند پر وہ جم کر چغتائیوں کا مقابلہ کرے گا لیکن اُسنے پہلے ہی تو غلوق خاں کے اُردو میں پہونچ کر چغتائیوں کی اطاعت کر لی۔ اب ماوراالنہر میں مقابلہ بیکار ہے۔ چل ہرات چلیں، اور جتنے بچے عورتیں مویشی ساتھ چل سکیں ہرات لے چلیں سمرقند جانے اور اُس کی قسمت۔ ویسے سمرقندیوں نے ہم برلاسوں سے کون سا اچھا سلوک کیا ہے جو ہم لوگ اُن کے لئے اپنی جانیں خطرے میں ڈالیں سمرقند اور قرشی اور شہر سبز کو لوٹ کے چغتائیوں کا جی بھر جائے گا اور وہ اپنا راستہ لیں گے۔"

تیمور نے اُسے ٹوک دیا "کیا کہا آپنے؟ شہر سبز، جہاں میرے باپ کی ہڈیاں دفن ہیں؟"

[اور وہی دن تھا جب سلطان حسین سے اُس کی رفاقت کا آغاز ہوا تھا۔ رفاقت اور رقابت دونوں کا۔ اپنے خیمے پہنچ کر اُسنے اولجائی سے کہا تھا "تیرا چچا چغتائی مغلوں سے مل گیا، اور میرا چچا اُن سے

بھاگ کے ہرات جا رہا ہے۔ میرے خیال میں تیرا چچا زیادہ عقلمند ہے"۔
اولجائی نے جہانگیر کو جو ابھی چھوٹا تھا اٹھا کے پیار کیا۔ اور لپٹا لیا۔ اور اس طرح پوچھا جیسے یہ کوئی بالکل معمولی سی بات ہو۔" اور تمہارا کیا ارادہ ہے؟"
"چغتائی مغل لوٹ اور مال کے بھوکے ہیں۔ وہ شہرِ سبز، قرشی اور سمرقند کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اور پھر یہ علاقے بھی تو انہیں کا۔ تیرے نانا کازغان نے اُن سے بغاوت کر کے اس علاقہ کو آزاد کرایا تھا، اب مغل پھر اپنا حق مانگتے ہیں جو انھیں چنگیز اور چغتائی سے ملا ہے۔ میں نے تو تغلوں کے اُردو میں پہنچ کے اطاعت کرنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ یہی صورت ان شہروں کے بچانے کی ہے ....."
اولجائی خاموشی سے سنتی رہی جیسے وہ ہمیشہ خاموشی سے سنتی رہتی تھی، شکایت کے بغیر، ہراس کے بغیر۔
اور تیمور نے اُس کی گود سے جہانگیر کو لے لیا۔ وہ مُسکرائی۔ عام طور پر تیمور اپنے بچے کو گود میں لیتے ہوئے گھبراتا تھا، مگر اسنے جہانگیر کو اپنی گود میں لیا۔ اُس کے ابرو چومے۔ اولجائی کھلکھلا کر ہنسی۔ اور تیمور نے پھر اسی سنجیدہ چہرے کے ساتھ جس پر مُسکراہٹ کا کہیں شائبہ نہ تھا، آہستہ آہستہ کہا گویا اپنے آپ سے سرگوشی کر رہا ہے :" لیکن چغتائیوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ کوئی اعتبار نہیں۔ تو غلوق خان کے اُردو میں جانا اپنی جان کو ہتھیلی پہ لے کر جانا ہے۔ میں تجھکو اور جہانگیر کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ تجھے میں اپنے چچا حاجی برلاس کے ساتھ ہرات بھیج رہا ہوں، وہاں سے تو اپنے بھائی سلطان حسین کے پاس کابل چلی جائے گی اور تو اور جہانگیر وہاں محفوظ رہیں گے"۔
[ پہلی مرتبہ سلطان حسین کا نام اس طرح آیا گویا مغلوں کے خلاف دماغ میں تیمور کی اور سلطان حسین کی تقدیر منسلک تھی۔]
آہستہ آہستہ اولجائی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے اور اُس کے چکنے سُرخ رخساروں پر سیال نمک کی طرح ڈھلکنے لگے۔ [ تیمور نے یہ یاد کر کے ایک گہری آہ بھری اور اپنے سمور کے کمبل میں کروٹ لی ] اور پھر اولجائی نے سر جھکا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب اُس کا دل دے چکا تھا، اور تیمور اس جواب کو جانتا تھا کہ" میں تمہارے ہی ساتھ جینا اور تمہارے ہی ساتھ مرنا چاہتی ہوں۔ لیکن جو تم کہہ رہے ہو ٹھیک ہے۔ میں مغلوں کے ہاتھ پڑنا اور اُن کی لونڈی بننا نہیں چاہتی۔ نہ میں یہ چاہتی ہوں کہ میرا بچہ جہانگیر غلاموں کی طرح پلے۔ خیر یہی سہی۔ میں اپنے بھائی سلطان حسین کے پاس کابل چلی جاؤں گی"۔
اور پھر مغلوں کے مقابل بساط۔ چغتائی مال کے بھوکے ہیں۔ جواہرات سے جب آنکھیں چوندھیا جائیں تو آنکھوں میں سلائی پھونک دی جائے۔ یہاں تک کہ نفلیوں نے خبر دی کہ چغتائیوں کے ہراول دستے پہاڑوں سے

اُتر اُتر کے وادی میں داخل ہو رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے خوفناک سپاہی جو چھوٹے چھوٹے بڑی بڑی ایالوں والے پہاڑی ٹٹوؤں پر سوار تھے۔ ہر ایک کے پیچھے کئی کئی ٹٹوؤں پر لوٹ کا مال اسباب حسین دوشیزائیں جنکے چہروں پر نقاب نہیں تھے، جن کی زلفیں سوگوار تھیں۔ مغل سواروں کے کاندھوں پر لمبے لمبے نیزے۔ اُن کے ٹٹو گیہوں اور جو کی پکی ہوئی کھیتوں کو اس طرح چر رہے تھے، جیسے یہ اُن کے لئے بوئی ہوئی گھاس ہے، انسان کی محنت اور غذا نہیں۔

تیمور بیسُنکر اپنے موروثی محل سے باہر نکل آیا۔ اور جب جغتائی ہراول دستے کا سردار وہاں پہنچا تو اُس کا اس طرح استقبال کیا جیسے کوئی مہمانوں کا استقبال کرتا ہو۔ ضیافت کے لئے دسترخوان بچھے۔ مسلّم بھیڑیں سینکے کوئلوں کی آگ پر بھونی جانے لگیں، چاولوں کے بڑے بڑے خوانوں پر میلے گرسنہ ہاتھ بڑھے۔ احتیاط سے مغلوں میں اتنی کومیس تقسیم کرائی گئی کہ وہ سُرور کے عالم میں رہیں لیکن اتنی زیادہ نہ پی جائیں کہ شہرِ سبز میں لوٹ کھسوٹ شروع کر دیں۔ جغتائی سردار ایک بھیڑ کی ٹانگ دانتوں سے نوچ نوچ کے کھا رہا تھا اور تیمور تغلوق خان سے اپنی ارادت کا اظہار کرتا جا رہا تھا۔ تیمور نے یہاں تک کہہ دیا کہ تغلوق خاں نے مجھے خفیہ پیغام بھیجا ہے کہ تو نے اپنے اصلی بادشاہ تغلوق خاں کی اطاعت قبول کر لی ہے، تجھے شہرِ سبز کی سرداری دوبارہ عطا ہو گی۔ بیسُنکر جغتائی سردار شہرِ سبز کے اُس سفید محل کے لوٹنے کی اُمید سے اور مایوس ہو گیا۔ لیکن اُسنے چکنے چکنے ہونٹوں پر چکنی چکنی زبان پھیر کے چاندی کے آفتابوں کی مبالغہ سے تعریف کی اور تیمور نے یہ آفتابے اُس کی نذر کر دیئے۔ پھر اُس نے کومیس کے طلائی جام کی تعریف کی اور تیمور نے یہ بھی اُس کی نذر کر دیا۔ اور اُس سے تغلوق خاں کے اُردو تک پہنچنے کا پروانہ لیا۔ اور پھر شہر کی قحباؤں کو مغلوں کے خیموں میں بھیج دیا، جہاں دوسرے شہروں کے شرفا کی بہو بیٹیاں کنیزوں کی طرح گھوڑیوں کا دودھ دوہ رہی تھیں اور کومیس تیار کر رہی تھیں۔ اور اُن کے گریبان کھلے ہوئے تھے۔

اور پھر مغل خیمہ و خرگاہ۔ دُور دُور تک فوجی گھوڑے اور باربرداری کے ٹٹو بوئی ہوئی کھیتیوں یا پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر شبنم سے دھوئی ہوئی نرم نرم گھاس چر رہے تھے۔ اونٹ اطمینان سے بیٹھے بیٹھے اوپر گردن اٹھا کے میوے درختوں کے پتّے اپنے جبڑوں سے چبا رہے تھے اور کف نکالتے جاتے تھے۔ مویشیوں کے ریوڑ چراگاہوں سے جگالی کرتے ہوئے واپس آ رہے تھے۔ اور قریب ہی مطبخوں کی آگ جل رہی تھی، اور اُن پر بڑی بڑی دیگوں میں گوشت کے تکّے اور چاول اُبالے جا رہے تھے، کومیس کی سڑاند اور اُس کے اُبال کی بدبو کے بھبکے اُٹھ رہے تھے۔ خیمے دس دس، سو سو، ہزار ہزار کے ٹکڑوں میں بٹے ہوئے تھے اور بڑے بڑے خیموں سے گھوڑے کی دُم کے بالدار جھنڈے لہرا رہے تھے۔ جب زور سے ہوا چلتی تھی تو آدمیوں کے قدموں، گھوڑوں کی ٹاپوں اور بھیڑ بکریوں کے گلّے سے خاک اور گوبر سے ملا جلا ایک غبار سا اٹھتا اور چکّر کاٹتا ہوا خیموں کے درمیان غائب ہو جاتا۔ جغتائیوں کے سفید خیموں کا ایک سمندر تھا کہ دُور دُور

تک لہریں مارتا نظر آتا تھا۔

نقیبوں کے گھوڑے، تیمور اور اُس کے ساتھیوں کے ہمراہ ہوگئے۔ جب وہ خیموں کے درمیان سے اس مال و اسباب کے ساتھ گذر رہا تھا، تو ہزارہا مغل سپاہی اپنے خیموں سے نکل نکل کے اُس کے اسباب کی طرف للچائی نظر سے دیکھتے، اور جب تک وہ گذر نہ جاتا دیکھتے رہتے۔ یہ سپاہی چینی اطلس کے لبادے پہنے تھے جن پر رنگ برنگ کے، سنہری، قرمزی، سبز، لاجوردی پھول اور طرح طرح کے جانور کڑھے ہوئے تھے۔ ان کے پاؤں میں لکڑیوں کی کھڑاویں تھیں، مگر کھڑاوں پر چرمی تسمے تھے جن پر سنہرا کام بنا ہوا تھا۔ ان کی مونچھیں، پتلی لکیروں کی طرح دہانے کی دونوں جانب رخساروں پر نیچے جھکی ہوئی تھیں۔ اور اب تو تیمور کے اپنے وطن میں بھی اس طرح کی مونچھیں بہت مقبول تھیں۔ نہ ان کے چہروں پر داڑھیاں تھیں، نہ ان کے دلوں میں خدا کا خوف۔

[تیمور نے تغلوق خاں سے اپنی ملاقات یاد کی] وہ اپنے خیمے میں جس کے دروازے کے قریب گھوڑے کی دُم والا علم لہرا رہا تھا، ایک شہنشاہ کی سی صولت و جبروت کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ فرش سموروں کا تھا، قالینوں کا نہیں۔ یہ دشت و جبل کی فضا تھی، شہروں کی نہیں۔ تغلوق کی پیشانی چوڑی تھی، اور گالوں کی ہڈیاں برلاسوں اور دوسرے تاتاریوں اور ترکوں کے مقابل زیادہ ابھری اور اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ چنگیز کی نسل کا صحیح النسب خان تھا۔ اس کی آنکھوں میں جنگلی لومڑیوں کی سی مکاری تھی، اور نیچے جھکی ہوئی مونچھوں کے ساتھ ساتھ اُس کی ٹھوڑی پر چھوٹی سی چینی داڑھی تھی جس کا بال بال چھٹا ہوا تھا۔

تیمور مغل انداز میں کورنش بجا لایا۔ اور اس کے آداب ایسے شائستہ تھے کہ چغتائی سردار جو خان کے اطراف نصف دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے دل میں تعریف کئے بغیر نہ رہ سکے۔

ایغوری میں جو اُس کی اور چغتائیوں دونوں کی زبان تھی، تغلوق خان نے اس سے پوچھا "تمہارا نام تیمور ہے؟"

شائستگی اور بے خوفی سے تیمور نے جواب دیا "میرا نام تیمور ہے۔ میں برلاسوں کا سردار ہوں۔ مجھ سے پہلے میرا باپ تارگائی برلاسوں کا سردار تھا، لیکن اُس نے اللہ کی طلب میں یہ دُنیا چھوڑ کے درویشوں کی زندگی اختیار کی [اس پر چغتائی کافر سردار بدتمیزی سے کھلکھلا کے ہنسے] میرے باپ کے بعد برلاسوں کی سرداری اور شہر سبز اور قرشی کی ولایت میرا حق ہے۔ لیکن میرے چچا حاجی برلاس نے یہ حق غصب کر رکھا ہے۔ اسی لئے میں تیری اطاعت کرنے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے میرا حق عنایت کر۔"

تیمور دیکھ رہا تھا کہ اُس کے الفاظ تغلوق خاں پر اثر کر رہے ہیں۔ اس نے کہا "خانِ اعظم چنگیز خاں، اور چغتائی خان کے زمانے سے ماوراءالنہر کی سرزمین تیرے آباد اجداد کی اور تیری ہے۔ میں تجھے اپنا آقا اور سرپرست

مانتا ہوں۔ لیکن میرے چچا حاجی برلاس نے تیرا مرتبہ نہیں پہچانا اور وہ جنوب کی طرف بھاگ گیا۔ میں نے برلاسوں کی وادی کی ساری دولت بچا لی اور اُسے جمع کر کے تیرے قدموں میں ڈالنے کے لئے لایا ہوں۔"

تو غلوق اور چغتائی سرداروں کی آنکھوں میں بے پناہ حرص کی موروثی چمک نمودار ہوئی، اور تیمور کے رفیقوں نے ان چرمی تھیلیوں کے دہانے کھول دیئے جن میں جواہر، دینارات، طلائی زیورات، خزانے کے خوانچے قیمتی قیمتی سمور تھیلے کے فرش پر بکھیر دیئے۔ کمخواب اور اطلس کے تھان، اور طرح طرح کے ریشم جو فرنگ سے ماوراء النہر کے شہروں میں آتے تھے۔ چغتائیوں کے قدموں پر ڈال دیئے، اور جب انھوں نے خیمے کا پردہ اٹھا کے اونٹوں پر لدے ہوئے قالینوں کے ڈھیر، چاندی کے ظروف کے انبار دکھائے تو تو غلوق اور اس کے امیروں کو یقین آ گیا کہ اب برلاسوں کے پاس سوائے ان کے کھیتوں، ان کے محلوں کی دیواروں، اور ان کے خیموں کے اور کچھ نہیں رہا۔

"تُو نے اور کسی کو کوئی تحفہ دیا؟" تو غلوق کی مکار، خوفناک آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔

تیمور نے اُسی بے خوفی اور بے تکلفی سے جواب دیا: "صرف تیرے تین سرداروں کو۔ ایک جو مجھے شہر سبز میں ملا اور جس نے مجھ تک پہنچنے کا پروانہ دیا۔ دوسرے دو اور سردار جنھوں نے مجھ تک پہنچنے کا راستہ نہ روکا۔"

تو غلوق نے بگڑ کے کہا: "یہ یاسائے چنگیزی کے خلاف ہے کہ انھوں نے تجھے ستایا، اور خان کے حصے سے مال لیا وہ کہتے ہیں لیکن میرے کتے ہیں۔ اور ان کی لالچ سے میں اس قدر تنگ ہوں جیسے آنکھ کے ڈیلے میں بال پڑ جائے یا جیسے دہان میں پھانس چبھ جائے۔" پھر اُس نے حکم دیا کہ وہ مال ان مغل سرداروں سے چھین کے حاجی برلاس کو بھیجا جائے۔ وہ تیمور کو ماوراء النہر یا شہر سبز کے علاقے کا واحد سردار نہیں بنانا چاہتا تھا، نہ وہ یہ چاہتا تھا کہ برلاسوں اور تاتاریوں کی باہمی رقابت اور خانہ جنگی کم ہو۔ اور تیمور نے یہ اسی وقت سمجھ لیا جب اُسے محض تومان باشی بنایا گیا۔ ہزار سواروں کا سالار۔ اور شہر سبز کا حاکم۔ اور پھر جیسا کہ مغل چغتائیوں کا قاعدہ تھا، گرمیاں گذارنے کے لئے اُن کا لشکر دیکھتے دیکھتے ختلان کی پہاڑیوں میں غائب ہو گیا۔

تیمور نے اپنے خیمے میں لیٹے لیٹے، گرم سمور کی تہہ کے اندر خانہ جنگی کے وہ تین سال یاد کئے جو کل کی بات معلوم ہوتے تھے۔ چغتائیوں کی واپسی کے بعد حاجی برلاس ہرات سے واپس آیا۔ اور بایزید جلائر خجند سے سمرقند آیا۔ اور سلطان حسین کابل سے آیا۔ اور اُس کے ساتھ اولجائی آئی۔ اور اولجائی کے ساتھ جہانگیر آیا جو خوش خال کرنے کے بجائے کچھ لفظ فارسی میں اور کچھ لفظ الیغوری میں تتلا تتلا کے بول لیتا اور اسکو دیکھکر تیمور کو اتنی خوشی ہوئی جتنی شہر سبز اور قرشی کو چغتائیوں کے ہاتھ سے بچا کے بھی نہ ہوئی تھی۔

اور پھر اُسے غداری کی وہ شام یاد آئی جب اُس کے چچا نے اُسے قتل کرنے کی سازش کی تھی۔ سمرقند

کی وہ خنک شام جب حاجی برلاس کے محل میں ہر طرف خربوزوں کی مہک پھیلی ہوئی تھی اور باغوں میں فوارے چل رہے تھے۔ اور گرم گرم کبابوں کی مہک پھولوں کی خوشبو سے کچھ کم نہ تھی۔ تیمور پہلے ہی کھٹکا تھا کہ آس پاس مسلح سوار کیوں پھر رہے ہیں۔ لیکن دسترخوان بڑی نفاست سے چنا ہوا تھا۔ حاجی برلاس کے ساتھ ہرات سے کئی باورچی آئے تھے جو کھانوں میں فلفل ہندی اور دوسرے ایسے مسالے ڈالتے تھے جن کا کسی نے سمرقند میں نام بھی نہ سُنا تھا۔ اور جن کی خوشبو بڑی گرم تھی۔ مگر حاجی برلاس زہر کھلانے والا چچا نہ تھا۔ تھا وہ برلاس ترک، اور قتل کے لئے وہ تلوار ہی استعمال کرتا، زہر نہیں۔

دسترخوان پر اس کے قریب بایزید جلائر بیٹھا تھا جو بہت زیادہ کومیس پی گیا تھا اور نشے سے بدمست ہو رہا تھا۔ اور اس نے جھک کے تیمور کے کان میں سرگوشی کی۔

"بھاگ یہاں سے بھاگ۔ تیرے سر پر قضا کھیل رہی ہے" یہ کہہ کے مدہوشی کے عالم میں بایزید جلائر نے قہقہہ لگایا۔ تیمور نے ذرا جو نظر اٹھائی تو جو خادم مور چھل جھل رہا تھا وہ بھی مسلح تھا۔ تیمور نے جلدی سے لقمے کے ساتھ ایک نوکدار سی ہڈی اٹھائی اور ہڈی سے اپنے نتھنے کو کھرچ لیا۔ کوئی اس کی طرف دیکھ تو نہیں رہا تھا۔ کوئی نہیں۔ اُسنے اپنے نتھنے پر ایک اور زخم لگایا اور دوسرے ہاتھ سے پونچھ کے دیکھا تو تھوڑا تھوڑا خون بہنے لگا تھا۔ اُسنے حاجی برلاس کی طرف نظر جھکا کے دیکھا، اور ایسی آواز میں جس سے ذرا بھی شک یا ہراس ظاہر نہ ہو، ذرا سعادت مندی کے لہجے میں کہا: "چچا میری نکسیر پھوٹی ہے۔ اجازت ہو تو حوض میں دھو آؤں اور سر پر ذرا ٹھنڈا سا پانی ڈال لوں۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تو موت کے فرشتوں کو شک نہیں ہوا، وہ مطمئن تھے کہ سر پر ٹھنڈا پانی ڈال کے پھر واپس آئے گا چپ چاپ کھائیگا، خوب کومیس پیئے گا اور پھر اطمینان سے۔

اُس نے حوض کا رُخ کیا، جہاں سرد حصار باندھے گھوڑے تھے ایک مسلح سپاہی کا ہاتھ مروڑ کے اُس کی تلوار پیچھے سے چھینی اور اُسے قتل کیا، اپنے گھوڑے کی رسّی کاٹی اور جب وہ دروازے سے باہر نکل چکا، تو چند لمحوں کے بعد اُسنے اپنے پیچھے تعاقب کرنے والے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سُنی۔ لیکن سمرقند کی گلیوں میں تعاقب آسان نہیں تھا۔

گھر پہنچ کے اُس نے اولجائی سے کہا: "تیرا چچا بھی سازش میں ضرور شریک تھا، پھر معلوم نہیں کیوں اُس نے مجھے خطرے سے آگاہ کیا۔ اُسنے میرے کان میں سرگوشی کی بھاگ یہاں سے بھاگ"

اولجائی نے کہا "یہ نشہ کی شرافت ہوگی اس کی نہیں"

"اب اس شہر میں ہمارا گذر نہیں۔ بھاگ یہاں سے بھاگ۔ تیرے چچا نے غلط نہیں کہا"

"کہاں شہر سبز؟"

"تمام برلاس میرے چچا حاجی برلاس کے ساتھ ہیں، اور مجھے غدار او رچغتائیوں کا دوست سمجھتے ہیں۔ شہر سبز میں بھی بچاؤ کی صورت نہیں۔"

اولجائی کی آنکھیں ذرا ذرا چوڑی ہو گئیں۔ اُسنے بلغم نگل کے پوچھا "پھر کہاں؟"

"تیرے بھائی سلطان حسین کے پاس جو بلخ کی پہاڑیوں میں اپنے لشکر کے ساتھ میرا انتظار کر رہا ہے۔ اُسنے مجھے اپنے ساتھ آملنے کا پیغام بھیجا ہے۔"

[تیمور نے یہ سب کچھ یاد کیا۔ کس طرح اُن دنوں اس کی قسمت سلطان حسین سے منسلک تھی۔ لیکن آج اولجائی شہرِ سبز کے ایک باغ میں مٹی کے نیچے ابدی نیند سو رہی ہے۔ اور پھر اُس نے ایام میں تسلسل کی تلاش کی۔]

[یہ ساری یاد ایک زہر خند تھی۔ یہی تیمور کی یادداشت اور اولجائی کی یادداشت کا فرق تھا۔ تیمور کی یادیں کسی طرح کی آرزو کا شائبہ نہ تھا۔ کوئی تمنا شامل نہ تھی۔ یہ جنگل کے خطرے، شکاری جانور کی چاپ، پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ، جھلستی ہوئی ریت کی یاد تھی، قزل قُم اور قراقم کے لال اور کالے ریگستانوں کی یاد]

اور پھر جب جلائر اور برلاس آپس میں لڑ رہے تھے، اور سازشوں کا بازار گرم تھا۔ تو غلوق خاں اُفق پر نمودار ہوا۔ خان تینگری کی ٹھنڈی ٹھنڈی برفانی چراگاہوں میں گرمیاں گذار کے جاڑوں کے شروع میں اُس نے پچھم کا رُخ کیا۔ اُس کے پستہ قد، تیز قدم، ٹٹوؤں، اور اُون سے لدے ہوئے ریوڑوں نے ایسیک کول کی جھیل کا ٹھنڈا نیلا نیلا پانی پیا، اور صنوبر سے لدے ہوئے پہاڑوں سے اُتر کے، کھیتوں اور لہلہاتی چراگاہوں میں پھر فرغانہ کی وادی سے ہوتے ہوئے قزل قُم کے لال لال ریگستانوں میں مغلوں کا اژدہام مور و ملخ کی طرح چھا گیا۔

قضا و قدر کی طرح ایک ایک کرکے تیمور کے دشمن مغلوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔ بایزید جلائر کے قتل کا حال سنکے اولجائی رو دی تھی۔ اور تیمور کے چہرے کو بے حس دیکھ کر اُسنے کہا تھا "میں نے مانا میرا چچا بایزید تیرا دشمن تھا۔ مگر شریف دشمن تھا، اُسی نے تجھے تیرے چچا کے فریب سے آگاہ کر کے تیری جان بچائی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اس پر تیمور سے نہ رہا گیا اُسنے کہا تھا "شکرم۔ پہلے تو تُو کہتی تھی کہ اُسنے نہیں بلکہ توران کی توپیں نے اور ایران کی انگوری شراب نے میری جان بچائی تھی۔"

"اب تو شرابیوں کی ایسی باتیں کر رہا ہے۔" اولجائی جھنجھلا گئی تھی۔

"شراب کی فضیلت سے مجھے انکار نہیں۔ یہی بایزید جلائرکے منھ سے بوا رہی تھی اور تجھے یاد ہے جب میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تیرے بیٹے نے مجھے خطرے سے آگاہ کیا تو تو خود بول اٹھی تھی کہ یہ نشہ کی شرارت ہوگی۔ اس کی نہیں"

"مجھے یاد ہے" ذرا لاجواب ہو کے اولجائی نے کہا" مگر تب میرا باپ زندہ تھا۔ اور جب جو چاہتی کہہ سکتی تھی۔ اب تو وہ مرگیا"

[ یہ اولجائی کی عادت تھی۔ اور تیمور کی سخت اور خشمگیں آنکھوں سے بس اس کی یاد میں ایک ایک قطرہ ٹپک پڑا۔ ناممکن تھا کہ اولجائی دشمن کو تہہ دل سے معاف نہ کرے۔ اور مرے ہوئے دشمن کو تو وہ دوست سمجھتی تھی ]

اور پھر تیمور کو اپنے چچا حاجی برلاس کی موت یاد آئی۔ کیسی کمینی موت۔ بزدلی کی موت۔ وہ موت نہیں جو مغلوں سے لڑتے ہیں میسر آتی۔ تلوار کی، تیر کی، نیزے کی موت نہیں، قراقم کے کالے ریگستان میں سفید بھیڑ کے اونی خیمے میں چوروں کے ہاتھ قتل۔ اس واقعہ کا ذکر بھی بڑی غضب سے قاضی زین الدین نے لکھ بھیجا تھا جس نے سارا قصہ حاجی برلاس کی ترکمان کنیز کی زبانی سنا تھا۔ آدھی رات کو ترکمان کنیز کی آنکھ کھلی تو اس نے عجب تماشہ دیکھا، یہ کہ ایک بڑا اونچا پورا سیاہ فام سا آدمی جس کے سینے پر گھنے بال تھے، اور جو کمر تک ننگ دھڑنگ تھا، اپنے منہ پر صافہ لپیٹے ایک بڑا سا پتھر اپنے ہاتھ میں لئے حاجی برلاس کے سرہانے دوزانو بیٹھا تھا، کہ اگر وہ ذرا بھی حرکت کرے تو وہ پتھر سے اس کا سر کچل دے۔ اور دوسرا چور بڑے اطمینان سے اس کے سمور سمیٹ رہا تھا اور اس صندوق کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا جس میں سونے اور جواہر کے کیسے رکھے تھے۔ مارے خوف اور بے چینی کے حاجی برلاس کے اعصاب کھنچے جا رہے تھے، اور اندھیرے میں بھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ خوف سے اس کی آدھی جان نکل چکی ہے۔ باہر برلاس سپاہی غافل سو رہے تھے۔ ترکمان کنیز نے پہلے چیخنا چاہا، مگر پھر آنکھ ذرا سی کھلی رکھی اور سوتی بن گئی۔ اسے یقین تھا کہ مال اسباب لینے کے بعد یہ چور اسے بھی پکڑ لے جائیں گے۔ اتنے میں باہر آہٹ ہوئی اور حاجی برلاس نے جھپٹ کے اپنا خنجر کمربند سے نکالنا چاہا۔ بڑا سا پتھر پوری طاقت سے چور کے ہاتھ سے نکل کے اس کے سر پہ آگرا۔ ترکمان کنیز نے خون کی سرخی اور بھیجے کی سفیدی کا ملا جلا ملغوبہ بہتا دیکھا اور مارے کراہت اور خوف کے آنکھیں بند کرلیں پھر جو اس نے آنکھیں کھولیں۔ تو نہ چوروں کا پتہ تھا نہ سونے اور جواہر کے صندوق کا۔ حاجی برلاس کی لاش البتہ اس کے قریب اسی طرح پڑی تھی اور قالین کے نیلے نیلے پھولوں پر سرخ اور سفید ملغوبہ ابل ابل کے پھیل گیا تھا۔ اب وہ بہت زور سے چیخی اور سپاہی اندر آگئے۔

اور پھر تیمور نے یاد کیا کہ اُس کے دشمنوں کے بعد اُس کے دوستوں کی باری تھی۔ کیونکہ اس کے دوست اور اس کے دشمن دونوں چغتائی مغلوں کے دشمن تھے۔ اُسنے اور اولجائی نے سلطان حسین کو کتنا سمجھایا کہ مغل بہت طاقتور ہیں۔ ان سے لڑنا بیکار ہے۔ کابل واپس جانے ہی میں سلامتی ہے۔ مغل ماوراالنہر کو تاراج کرکے واپس چلے جائیں گے، خواہ مخواہ کابل پر حملہ نہ کریں گے۔ اور کابل بہر حال چغتائیوں کا علاقہ نہیں ایلخانوں کا علاقہ ہے۔ اور جلائر ہونے کی حیثیت سے سلطان حسین کا حق ہے کہ ایلخانیوں کی سرزمین پر حکومت کرے۔ لیکن ہمیشہ کی طرح کبھی سلطان حسین اس کی باتیں مانتا تھا اور کبھی نہیں مانتا تھا۔

[بے چینی سے تیمور نے قیدی سلطان حسین کی پُرانی رفاقت یاد کی] ہاں اُسنے اور اولجائی نے سلطان حسین کو بہت سمجھانا چاہا مگر بے سُود سلطان حسین نے اُسے طعنہ دیا "میں چنگیز اور ہلاکو کی اولاد سے ہوں، اور بادشاہت میرا حق ہے۔ تو برلاس ہے، ترک ہے، نوکر ہے۔ تیرے لئے برابر ہے کہ میرا نوکر بنے یا تغلوق خاں کا۔ میں اور تغلوق تلواروں کے پھل ہیں جو ایک ہی درخت سے اُگے ہیں، وہ چغتائی خاں کی شاخ پر ہے اور میں ہلاکو خاں کی شاخ پر۔ دو تلواریں ایک میان میں رہ نہیں سکتیں۔ رہ گیا تُو۔ تجھے تو بہر حال کسی نہ کسی کی خدمت کرنا ہے۔

تیمور کو یہ سُن کے بڑا طیش آیا تھا۔ مگر اولجائی کو اور زیادہ غصہ آیا۔ اور اُس نے کہا تھا کہ "بھائی اگر تو چنگیز اور ہلاکو کی اولاد سے ہے تو کیا میں اُن کی اولاد سے نہیں؟ اور اگر میں اُن کی اولاد سے نہیں تو پھر تیری بہن کیسے ہوئی؟"

سلطان حسین نے جھنجھلا کے کہا "عورتوں کی نرالی منطق ہے۔ تیرے رشتے سے تیمور کیسے شاہزادہ ہو گیا؟"

نرالی منطق نے جواب دیا "شاہزادہ نہ سہی، لیکن وہ گورگاں ہے چنگیز کے خاندان کا داماد ہے اُسے تم نے نوکر کیوں کہہ دیا۔ اگر وہ بجائے تمہارا ساتھی ہونے کے چنگیز خان خانِ اعظم کے زمانے میں پیدا ہوتا تو ترخان بنایا جاتا اور ترخانوں کا سردار ہوتا۔"

"کیا گورگان نوکر نہیں ہوتے۔ آسائے چنگیزی کے مطابق ہر وہ شخص جو خان نہیں خان کا نوکر ہے مثلاً میرا سگا بھائی بھی میرا نوکر ہی ہوتا۔"

اور اولجائی نے غضبناک ہو کے کہا تھا "تیری بہن ہونے کے بجائے اگر میں تیرا بھائی ہوتی تو میں بھی دیکھتی کہ تو میرا نوکر بنتا ہے یا مجھے نوکر بناتا ہے۔"

اس پر سلطان حسین اُٹھ کھڑا ہوا، اُس کا بھاری بھرکم جسم اطلس اور کمخواب کے لبادے میں پیچ میں

بادشاہ کا پیکر معلوم ہو رہا تھا، اور اولجائی نے اس لڑائی کے عالم میں بھی فخر سے اس کی طرف دیکھا کر وہ اُس کا بھائی ہے۔ اور سلطان حسین نے شاہانہ تمکنت سے تیمور کے شانے پر ہاتھ رکھ کے کہا "تیرے لئے برابر ہے کہ تُو میرا ساتھ دے یا تو غلوق خاں کا۔ تو چغتائی خاندان کا ساتھ دے یا ایلخانیوں کا۔ یہ یاد رکھ کہ تیری شادی ایلخانیوں میں ہوئی ہے۔ ایلخانی رسول اللہ پر ایمان لے آئے ہیں اور چغتائی ابھی تک نیلے جاودانی آسمانی کو پوجتے اور مسلمانوں کو قتل کرتے ہیں۔"

تیمور اٹھ کھڑا ہوا۔ سُرو قد، اس کی چوڑی، سفید، بلند پیشانی پر غصّے اور حرارت سے پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ اور اُس نے اپنی لانبی ذُوالفقار تلوار زمین پر ٹیکی اور خشونت کے لہجے میں اپنے برادرِ نسبتی سے کہا "میں گور گاں ہوں، کسی کا نوکر نہیں۔ اگر تم نے تو غلوق خاں سے لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو خدا تمہیں ظفریاب کرے میں کسی کا ساتھ نہیں دُوں گا۔ نہ تمہارا اور نہ تو غلوق خاں کا۔ میرے لئے شہرِ سبز کا رستہ کُھلا ہے جہاں میرے باپ کی ہڈیاں دفن ہیں۔"

سلطان حسین کے لہجے میں استہزا کی خفیف سی جھلک تھی۔ جب اُس نے کہا تھا "تو کیا تمہارا ارادہ تارک الدنیا کی جگہ خانقاہ میں صُوفی بنکے بیٹھنے کا ہے۔ مگر کافر چغتائی صُوفیائے کرام کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ وہ خانقاہوں کو اپنے گھوڑوں کا اصطبل بناتے ہیں۔"

تیمور شانے ہلا کے خاموش ہو گیا۔ لیکن جب سلطان حسین خیمہ کا پردہ ہٹا کے باہر نکل رہا تھا تو تیمور نے کہا "بھائی خدا تمہیں ظفریاب کرے۔ میں اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ میں اُس وقت صُوفی بنوں گا جب میری فولادی تلوار کو زنگ لگ جائے گا۔ اور تیمور جو خود لوہا ہے اُس کی تلوار کو شکل سے زنگ لگتا ہے۔ لیکن ہر چیز کا وقت ہوتا ہے۔ ابھی اس کا وقت ہے کہ میں دیکھوں کہ ہوتا کیا ہے۔"

شہرِ سبز میں جب تیمور نے تو غلوق خاں کے ہاتھوں سلطان حسین کی شکستِ فاش کی خبر سُنی تو اُسے صدمہ ہوا۔ اُسے اس کا بھی رنج تھا کہ کاش اُس نے سلطان حسین کا ساتھ دیا ہوتا۔ لیکن اب بہر حال اُسے اپنی غیر جانبداری کا انعام وصول کرنے جانا تھا۔

اور کوچ سے پہلے کی رات، اندھیری اندھیری، مٹیالی مٹیالی سی تھی، جس میں شہرِ سبز کے کچے مٹی کے مکانوں میں دیئے جگنوؤں کی طرح جگمگا رہے تھے۔ چنار کے ایک پُرانے قد آور درخت کے نیچے بیٹھا تیمور اپنے ساتھیوں کو کوچ کے آخری احکام دے رہا تھا، اس حالت میں بوڑھا قاضی زین الدین ایک ہاتھ میں زیتوں کے تیل سے روشن چراغ، اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح لئے آ کے اس کے پاس کھڑا ہو گیا، اور تیمور کے سلام کا اُس نے بڑے گرمجوش لہجے میں جواب دیا۔

تیمور نے اُس کی طرف گردن اٹھا کے دیکھا اور اپنے ساتھیوں کو جلدی جلدی رخصت کیا۔ انکے جانے کے بعد قاضی زین الدین ایک ٹھنڈی سی آہ بھر کے سفید سمور کے فرش پر بیٹھ گیا۔

"منگ باشی امیر تیمور برلاس"

تیمور نے اس کی طرف استفہامیہ نظر سے دیکھا۔

"مجھے کچھ پوچھنا ہے"

بہت کم قاضی زین الدین نے اس لہجے میں بات چیت کی تھی۔

"پوچھئے"

"آج تک کسی چٹان سے کبھی دودھ کے فوارے اُبلے ہیں؟"

"نہیں"

"آج تک کسی شیرنی کو بھیڑ بکری کے بچے پر رحم آیا ہے"

"نہیں"

"فرغانہ کی چراگاہوں میں آج تک بجائے پانی کے کبھی خون کی بارش سے سبزہ اُگا ہے؟"

"نہیں"

"اگر نہیں تو پھر تم سمرقند جاؤ اور ضرور جاؤ - اور تغلق خاں سے کہو کہ چٹان سے دودھ نکالے اور شیرنیوں کے بھٹ میں میمنوں کو جھونک دے، اور مرغزاروں کی آبیاری کے لئے خون چھڑکے"

وہ اوہام پرست جو بہادر تیمور کے سائے میں کہیں چھپا بیٹھا تھا ذرا گھبرا گیا "آپ کا مطلب؟"

"کچھ نہیں"

قاضی زین الدین زمین پر ہاتھ ٹیک کے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جھک کے اُس نے وہ چراغ اٹھایا جو زیتون کے تیل سے روشن تھا۔

"زین الدین بابا" تیمور نے پھر ایک بار اُسے مخاطب کیا۔

"کیا ہے"

"میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا"

"ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے، جب وقت آجائے گا تو مطلب خود بخود سمجھ میں آجائے گا"

لیکن صبح کو تیمور نے اپنا ارادہ نہیں بدلا۔ وہ اپنے مختصر سے دستے کے ساتھ تغلق خاں کی قدمبوسی کے لئے سمرقند روانہ ہوا۔

[یا دپھر ایک زہر خند بن گئی] کیا یہ وہی سمرقند تھا جو موسم سرما میں اس نے حاجی برلاس کی سازش کے خوف سے چھوڑا تھا۔ صرف چند مہینے پہلے۔ اس کے باغوں کے درخت بچے ہوئے تھے۔ اس خزاں میں چناروں تک کو یاد نہ رہا تھا کہ لہلہا کے آگ کے شعلوں کی طرح سُرخ ہو جائیں۔ کیونکہ چناروں تک کی پتیاں گھوڑوں اور دو کوہانوں والے اونٹوں کی خوراک بن چکی تھیں۔ وہ اور آگے بڑھا مغلوں کے بدبودار سموروں کے لبادوں کی بُو سونگھتا اور ان کے گھوڑوں کی لید کے انباروں کو دیکھتا ہوا۔ اس مرتبہ مغل سردار اُسے کُھلّم کُھلا مغلظات سُنا رہے تھے، اور یہ سب سُنتا ہوا لاچار و مجبور قیدیوں کے دستے کے قیدی سردار کی طرح توغلوق خاں کی سرائے کو جا رہا تھا۔ جہاں امیر کازغان کا محل تھا، اس محل کے باغ میں توغلوق خاں کا رو پہلا خیمہ تھا۔ خیمے کی روشیں ویران تھیں، پھولوں کے تختے کچلے جا چکے تھے، محل جل کر خاکستر ہو چکا تھا، اور اس کی لکڑیاں تک ہیزم بن چکی تھیں۔ یہ جو صدہا کنیزیں مغلوں کے خیمے میں ماری پیٹی جا رہی تھیں، سمرقند کے برلاسوں، تاتاریوں اور ترکمانوں کے شریف ترین گھرانوں کی دوشیزائیں تھیں جس طرف سے وہ گذرتا، وہ اُسے دیکھ کر مُنہ پھیر لیتیں۔ اور اس مرتبہ جب تیمور توغلوق خاں کے سامنے پہنچ کے مُغل انداز میں کورنش بجا لایا تو توغلوق خاں نے اُسے بیٹھنے تک کو نہیں کہا۔

اس مرتبہ اُس نے سچ مُچ اپنے آپ کو نوکر محسوس کیا۔ ماورالنہر کی ساری آبادی کی طرح وہ بھی حقیر تھا، محکوم تھا، غلام تھا۔

بڑی کرخت آواز میں توغلوق نے کہا۔ "تیرے چچا حاجی برلاس نے ہم سے بغاوت کی۔"

"خانِ آعظم۔ وہ میرا بھی دشمن تھا۔" تیمور نے جواب دیا۔

"ہمیں معلوم ہے۔"

اب اس کے سامنے کُمیس کا بڑا سا سفالی جام اور اُبلے ہوئے گوشت کی ایک قاب رکھی گئی، اور توغلوق خاں نے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

اُس نے اپنی پیشانی سے توغلوق خاں کے قدموں کے پاس کی زمین چُومی۔ اُس کا خُون غصّہ سے کھول رہا تھا جس سمرقند کو وہ آنا چاہتا تھا وہ یہ سمرقند نہیں تھا۔

"تیرے برادر نسبتی سلطان حسین نے ہم سے بغاوت کی۔" کرخت الغوری میں توغلوق خان کی آواز پھر گونجی۔

"میں نے اُسے بہت روکا۔" تیمور نے اُبلے ہوئے گوشت کا لقمہ چباتے ہوئے جواب دیا۔

"ہمیں معلوم ہے۔ ہمارے مخبروں نے یہی خبر دی۔" اب توغلوق خاں کا لہجہ ذرا نرم تھا۔

اس نے پھر پوچھا: "امیر حسین اب کہاں ہے؟"

"خانِ اعظم مجھے معلوم نہیں۔"

اس نے ایک ہڈی چبائی اور کومیس کا ایک گھونٹ پیا۔ اُس کو اِس طرح کھاتے دیکھ کر توغلوق خاں نے اطمینان سے ڈکار لی۔

توغلوق خاں نے اپنے بیٹے الیاس خواجہ اوغلان کو مخاطب کر کے کہا: "سمرقند کے برلاسوں کا کوئی اعتبار نہیں۔"

کئی چغتائیوں نے اُس کا جملہ دہرایا "کوئی اعتبار نہیں" اور تلواریں کھڑکھڑائیں۔

ایک سمرقندی غلام آفتابہ لایا۔ تیمور نے غور سے دیکھا تو وہ سید بدرالدین تھا جو امیر کازغان کے مقربین میں سے تھا، اُس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ تیمور نے اُس کی طرف سے منہ پھیر لیا اور ہاتھ دھوکے کلّی کی، منہ میں انگلی ڈال کے دانت صاف کئے اور ڈکارے کے "الحمد اللہ" کہا اور کھانے کی تعریف کی۔

اس کے بعد توغلوق خاں کی گرجدار آواز بلند ہوئی۔ اُس نے پکارا "بِکی جُوک بہادر!" اُس کا سپہ سالار بِکی جُوک آگے بڑھا۔ تیمور نے اس کا ذکر بہت سُنا تھا اب اسے غور سے دیکھا۔ گول منگول چہرہ، زرد زرد رنگ، پتلی چھوٹی سی داڑھی، بچھو کے اٹھے ہوئے ڈنک کی طرح لٹکتی ہوئی مونچھیں، چھوٹے چھوٹے پاؤں مگر چوڑا اور مضبوط سینہ۔

"راوی سے کہو کہ ہمارا یرلیغ سُنائے۔"

بِکی جُوک نے سربسجدہ ہو کے توغلوق خاں کے قدموں کے قریب کی زمین چُومی۔ اور جب وہ اٹھا تو راوی نے اس کے ہاتھوں سے چینی ریشم پر لکھا ہوا ایغوری فرمان لیکر چوما، اُسے بڑے ادب سے کھولا۔ اور پڑھنا شروع کیا۔

یہ یرلیغ ہے توغلوق خاں خانِ اعظم چغتائی کی۔ یہ فرمان بیت پاک والوں اور قزل قُسم اور قراقُم کے رہنے والوں کے لئے واجب التعمیل ہے۔ یہ یرلیغ سمرقند اور توقند اور فرغانہ اور کابُل کے باشندوں کے لئے واجب التعمیل ہے کہ خانِ اعظم توغلوق خاں نے منگ باشی امیر تیمور برلاس کو سمرقند کا حاکم مقرر کیا۔

اِس مقام پر تیمور نے جھک کے توغلوق خاں کے قدموں کے آگے کی زمین چومی۔

لیکن یرلیغ ختم نہیں ہوئی تھی۔ راوی کی لڑکھڑاتی ہوئی۔ رُکتی ہوئی آواز پھر گونجی اِس طرح جیسے کوئی بےسُرا نغمہ الاپتا ہے۔

"امیر تیمور برلاس پر ہم نے بِکی جُوک بہادر کو سردار مقرر کیا۔ بِکی جُوک بہادر قزل قُسم، قراقُم،

اُست اُرت کابل اور بدخشاں میں مغل اُردو کا سپہ سالار ہو گا۔"

تیمور کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا۔ سر بسجدہ ہو کے بکی چوک نے توغلوق خاں کے قدموں کے آگے کی زمین چومی اور پھر کھڑا ہو گیا، اور اُسی لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں راوی نے آگے پڑھنا شروع کیا۔

"اور بکی چوک پر سبھی نے اپنے فرزند الیاس خواجہ اوغلان کو سردار مقرر کیا۔ خانِ اعظم توغلوق خان کا یہ فرمان ہے کہ ایلی دریا اور چو دریا اور سیر دریا کے جنوب میں جتنا علاقہ ہے۔ اور سیر دریا اور کافرنہاں دریا اور سُرخان دریا کے مغرب میں جتنا علاقہ ہے، اور جتنا علاقہ اِن دریاؤں اور دشتِ قپچاق کے درمیان ہے، اُن سب پر ہم نے اپنے فرزند الیاس خواجہ اوغلان کو نائب السلطنت مقرر کیا۔"

الیاس نے بڑھ کے اپنے باپ کے زانو پر سر رکھ دیا۔ اور توغلوق خاں نے اُس کا سر اُٹھا کے اُس کے گالوں اور چینی داڑھی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

تیمور کے دماغ میں کوئی فولاد کی تلواریں اور ڈھالیں کھڑکھڑا رہا تھا۔ اُس کی رگوں میں طبلِ جنگ اور قرنا کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کا خون اِس شدت سے کھول رہا تھا کہ دماغ کی رگیں گویا اب پھٹیں۔ اب پھٹیں۔ یہ سمرقند کی دوشیزائیں تھیں جو اب وحشی پہاڑی چغتائیوں کے رپوڑ چرا رہی تھیں۔ یہ سید تھے جو ان کے مہمانوں کے ہاتھ دُھلا رہے تھے۔ اور اِن سب سے بڑھ کے یہ کہ اُسے صرف توغلوق خاں کا ذکر نہیں بننا تھا۔ اُسے الیاس خواجہ اوغلان کا، اور الیاس کے بعد وحشی گندے بکی چوک کا ذکر بننا تھا۔

اُسنے آخری مرتبہ شطرنج کی چال چلنی چاہی۔

سینے پر ہاتھ رکھ کے، اور زمین کی طرف جھک کے اُسنے کہا: "خانِ اعظم توغلوق خاں کا یہ لیغ مبہم سب کے لئے واجب التعمیل ہے۔ لیکن خانِ اعظم کے جدِ امجد نے ماوراء النہر کی حکومت ہم برلاسوں کے سپرد کی تھی۔ میری یہی استدعا ہے کہ خانِ اعظم توغلوں کے ساتھ ہی الیاس خواجہ اوغلان اور بکی چوک بہادر کا ایک کول کے ٹھنڈے پانی کے کنارے اور خان تینگری کے خنک صنوبروں اور مرغزاروں میں قیام رہے۔ میں چغتائیوں کا وفادار ہو کے ماوراءالنہر میں اور قزل قم اور قراشتم کے تپتے ہوئے ریگزاروں میں امن قائم رکھوں گا۔ یہاں کا موسم چغتائیوں کے لئے خشک اور گرم اور ناخوشگوار ہے۔"

بکی چوک بہادر اور چغتائی سرداروں نے طنز و استہزا سے ناخوشگوار قہقہہ لگایا۔ اور توغلوق خاں نے ذرا شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

"تینگ باشی امیر تیمور برلاس تجھے ہمارے یرلیغ کی اطاعت سے انکار ہے؟"

تیمور نے پھر جھک کے زمین چومی اور کہا" مجھے خانِ آعظم کے حکم سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ میں نے تو محض وفاداری کا مشورہ دیا"

توغلوق خاں نے کہا" تو یہ جان لے کہ ہمیں برلاسوں پر اعتبار نہیں۔ برلاسوں نے امیر کازغان کے زمانے میں اور اُسکے بعد چغتائیوں سے بغاوت کی ہے"

امیر تیمور نے سینے پر ہاتھ رکھ کے بے ہر مس لہجے میں کہا" میں نے کبھی خانِ آعظم سے بغاوت نہیں کی، حالانکہ میری بیوی جلائر ہے اور خانِ آعظم ہلاکو خاں کی اولاد سے ہے۔ میں نے اپنے اور اس کے عزیزوں کا ساتھ نہیں دیا"

" یہ ہمیں معلوم ہے" توغلوق خاں نے کہا" اسی لئے ہم نے تجھے سمرقند کا حاکم مقرر کیا۔ حالانکہ ہماری اُردُ کے نوکروں کو سمرقندی عورتیں پسند ہیں، اور سمرقند کے باغوں کے میوے پسند ہیں"

تیمور کا خون غصہ سے کھولنے لگا مگر وہ خاموش رہا۔ اور توغلوق خاں نے کہا" رہ گئی یہ بات کہ تو چنگیز خاں کے خاندان کا داماد اور گورگان ہے۔ یہ بھی ہمیں قبول ہے۔ لیکن کیا تجھے اپنے جدِّامجد کیولی خان کا وہ پیمان یاد ہے جو اُسنے چین کے خانِ آعظم قبلائی خان سے کیا تھا، جو خانِ آعظم چنگیز خاں کا پوتا تھا اور تیرا جدِّامجد کیولی خاں چنگیز خان کے خاندان کا داماد تھا۔ قبلائی خاں سے کیولی خان نے یہ پیمان کیا تھا کہ بادشاہت چنگیز خاں کی اولاد میں رہے گی اور گورگان بادشاہت کا حق نہیں مانگیں گے، وہ چنگیز کے شاہی خانوادے کے نوکر رہیں گے"

راویوں نے توغلوق خاں کی بات اٹھائی اور نعرہ لگایا" من کے کو کو تینگری کی قسم کہ یہ بات سچ ہے، اور اس پیمان کا ذکر تمام پرانی داستانوں میں ہے"

تیمور نے آخری کوشش کی" خانِ آعظم یہ سچ ہے کہ بادشاہت چنگیز خانِ آعظم کے خانوادے کا حق ہے، اور نوکری ہم دامادوں اور گورگانوں پر واجب ہے۔ یہ میں مانتا ہوں، لیکن اس صورت میں صرف اپنے بیٹے الیاس خواجہ اور غلان کو میرا حاکم اعلےٰ بنا۔ یکی جوک بہادر تو محض ایک چغتائی امیر ہے۔ میں جو شاہی خانوادے کا گورگان ہوں اس کی اطاعت کیسے کر سکتا ہوں"

بے صبری سے توغلوق خاں نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ اور اُٹھ کھڑا ہوا" میں، توغلوق خاں، چغتائی، خانِ اعظم، جو کہنا تھا، کہہ چکا۔ اب مجھے اور کچھ نہیں کہنا ہے"

اور راویوں اور نقیبوں نے صدا بلند کی" خانِ آعظم توغلوق خاں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ اس کی یہ لیغ واجب التعمیل ہے"

تیمور نے پھر آستانے کی زمین چومی۔ اُس کی آنکھوں میں زہر بھرا تھا، اس لئے اُسنے اپنی آنکھیں نیچی رکھیں اور اُلٹے پاؤں تو غلوق خاں کے نقرئی خیمے سے باہر نکل گیا۔

اور جب رات آئی تو اُس نے قاضی زین الدین کی بات یاد کی، اور چپکے سے اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا " چلو "

وہ سب سمرقند کے ایک ویران مکان میں جمع تھے۔ انھوں نے پوچھا " کہاں "

" جہاں ہماری قسمت لے جائے۔ جہاں ہمارے خدا کی مرضی ہو "

[تیمور کروٹیں بدلتا رہا اور یاد کرتا رہا۔]

ایک شاہ، ایک فرزیں، اور بیس مہرے۔ بیس رفیق جو اُس کے ساتھ تھے۔ اور اُس کی فرزیں، اُس کی فرزانہ ملکہ اولجائی ترکان آغا، جو سیاہ لباس پہنے تھی جس کی دونوں چوٹیاں ہند و سندھ کے افعیوں کی طرح بل کھاتی جاتی تھیں۔ وہ اس غربت، اس بے مقصد سفر میں بھی برابر ہنستی ہنساتی جا رہی تھی۔

" آج مجھے یقین ہے کہ سلطان حسین سے ملاقات ہو گی " اُسنے پھر ایک بار بڑی شگفتہ ہنسی ہنس کر کہا۔

" یہ تو تو روز کہتی ہے جس دن سے ہم نے سمرقند چھوڑا ہے "

" روز جھوٹ موٹ کہتی تھی۔ آج سچ مچ کہتی ہوں۔ تیمور تمہیں معلوم ہے کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آج یہ بات ہو کر رہے گی۔ اُس کی وجہ پوچھو تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ مگر یقین سا ہوتا ہے کہ یہ بات آج ہو کر رہے گی۔ آج صبح جب میں سو کر اٹھی، جب میں نے تمہیں نان اور کومیس دی تو اُسی وقت سے مجھے یقین سا تھا کہ آج سلطان حسین ضرور ملے گا "

تیمور کا منھ فکر اور سوچ سے سُوجا ہوا تھا۔ اسنے زور سے " ہوں " کہا۔

اُس کی طرف جھک کے اولجائی ترکان آغا نے دیکھا، اور اُسنے ایک لحظہ کے لئے لگام کھینچ لی۔ اولجائی کے کانوں کے دونوں آویزے جو چینی موتیوں کے تھے جھولا جھولنے لگے۔ اُس کی زلفیں سینے پر لہرا گئیں۔ اُس کی آنکھوں میں محبت اور شرارت کی ملی جلی چمک تھی۔

[آج وہ خاک کے تلے ہمیشہ کے لئے سو رہی تھی]

وہ ہنسی۔ تو اُس کے دانت موتیوں کی طرح چمکے۔ اور اُس نے پھر پوچھا " کیا سوچ رہے ہو؟"

" کچھ نہیں "

" مرد ہمیشہ سوچتے رہتے ہیں، اور کبھی نہیں بتاتے کہ کیا سوچتے ہیں۔ زیادہ سوچو گے تو گھوڑا لگام توڑ کے

بھاگ جائے گا۔"

تیمور کے چہرے کی سختی ذرا کم ہوئی اور وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

اطمینان سے، اولجائی پھر زین پر تن کر بیٹھ گئی، اور اُسنے اور تیمور نے لگام کھینچ لی۔

"تیمور" اولجائی نے تھوڑی دیر کے بعد پوچھا۔

"میں سوچتی ہوں کہ ساری دُنیا اس سُرخ ریگستانوں کی جیسی نہیں ہے۔ ہرات کے قریب بڑے بڑے ہرے بھرے کھیت ہیں، اور سمرقند کے باغ خربوزوں سے لدے رہتے ہیں۔ فرغانہ میں نہریں بہتی ہیں اور ایسک کول کے کنارے پہاڑوں پر صنوبروں کے جھنڈ ہیں۔"

"اولجائی تو تھک گئی ہے، اسی لئے ایسی باتیں سوچتی ہے۔ ہمیں ہمیشہ اس سُرخ ریگزار میں پھرنا نہیں پڑے گا۔"

"ہاں کبھی نہ کبھی ہمارے دن پھریں گے" اولجائی نے کہا۔ "تم میرے لئے شہر سبز میں ایک باغ بنوا دینا۔ وہاں میں جہانگیر کے ساتھ رہوں گی۔ اور وہاں جہانگیر پڑھنا لکھنا سیکھے گا۔"

"پہلے اُسے تیر اندازی اور لڑنا بھڑنا سیکھنا ہے" تیمور نے کہا۔

"خیر یہی سہی۔"

"اور میں اُس باغ سے باہر نہ نکلوں گی۔"

[آج وہ ایک باغ میں ہمیشہ کے لئے گہری نیند سو رہی تھی۔ قزل قُسم کا بے پایاں سفر، بے اندازہ آوارہ گردی ختم ہو چکی تھی۔ اور یہ یاد کر کے تیمور کا سینہ جل اُٹھا۔ اور اُسنے گہری ٹھنڈی سانس لی۔]

تیمور نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ اور انگلیوں کی آڑ سے سورج کے مقام کا اندازہ کرنا چاہا۔ ابھی اور کتنا دن باقی تھا، معلوم نہیں رات ریت کے ٹیلوں پر ہی گذارنی پڑے گی یا کہیں کوئی نخلستان مل جائے گا۔ آسمان پر آفتاب بہت گرم تھا، اور سر پر خود تپ رہا تھا۔ تیمور نے خود کو سر سے اتار کے کیسے میں رکھا اور سر پر قراقل کی اونی کلاہ پہن لی۔

پھر ایک ٹیلے سے اُس نے ریگ اور پتھر کے اس سمندر کی طرف دیکھا، جسے قزل قُسم کہتے ہیں۔ ہر طرف لال لال ریت۔ زمین پر، ہوا میں، آسمان پر ہر طرف ریت کی سُرخی۔ حالانکہ آسمان کا رنگ نیلا ہونا چاہئے، اور ہوا کو بے رنگ ہونا چاہئے۔ لیکن گرم ہوا کے جھکڑ ہر طرف لال لال ریت کو اڑا رہے تھے۔ زمین اس طرح تپ رہی تھی، جیسے تنور پر کوئی نان کی جگہ مٹی کی ٹکیاں پکائے۔ اس بجر ریت کے سیلاب کے سیلاب اس طرح اٹھتے جیسے سمندر کی موجیں۔ ننھی ننھی ہزاروں لاکھوں کنکریاں، پانی کے قطروں کی طرح بکھیرتیں اور ٹیلوں

کی پسلیاں کھود کے اُن میں جذب ہو جاتیں۔ جہاں زمین زیادہ پتھریلی تھی، گرمی سے چٹانیں چٹخ گئی تھیں، کیونکہ یہ صدیوں کی گرمی تھی، جسے سرما کا برف کبھی ٹھنڈا کر سکتا کبھی ٹھنڈا نہ کر پاتا۔

آفتاب نصف النہار کے قریب پہنچ رہا تھا اور ریت کے جھکڑوں سے ایک دُھند سی پھیل گئی تھی، سُرخ سُرخ دھند جس میں ہزار قدم آگے کی چیز ایسے نظر آتی جیسے کسی دوسری دُنیا میں ہو۔ آنکھیں معلوم ہوتا تھا کہ اُبل پڑیں گی۔

اولجائی نے اپنے سر پر کپڑا باندھا، اور ایلچی بہادر سے تھوڑا سا پانی مانگ کے اُسے تر کیا، پانی کے کٹورے کی تہہ میں ریگ کے ننھے ننھے ذرّے بیٹھ گئے تھے۔ اِس ریت کو پانی میں حل ہونا گوارا نہ تھا معلوم نہیں ہوا میں کس طرح تحلیل ہو جاتی تھی۔

جیسے کسی اور دنیا میں کوئی خوشگوار سی لکیر ابھرے، ریت کی جھلستی ہوئی لال لال دُھند کے اُس پار کبھی کبھی کسی نیم خشک نخلستان کے کنارے سوکھی ہوئی گھانس کچھ دور تک نظر آتی۔ اور گھوڑے بے اختیار ہنہنانے لگتے۔ سب سے پہلے ایلچی بہادر اور اس کے بعد اور رفیق گھوڑوں کی مرضی کو مان لیتے اور لگامیں ڈھیلی کر دیتے۔ اور جتنی دیر گھوڑے گھانس چرتے، خشک بے نم، بے روغن گھانس، کومیس کا ایک دَور چلتا اور لدے ہوئے ٹٹوؤں کی پیٹھ سے خورجیاں اُتاری جاتیں جن میں خشک کیا ہوا نمکدار گوشت تھا، سب اِس مزیدار گوشت کو چباتے، پھر بڑی احتیاط سے لدی ہوئی مشکوں سے پانی کٹوروں میں بھر بھر کے تقسیم کیا جاتا۔ پانی، کومیس اور گوشت دونوں سے زیادہ قیمتی تھا، کیونکہ اِس گرمی میں پیاس بہت لگتی تھی، اور ٹھنڈے پانی کے چشمے یا سوکھی ہوئی ندیوں کی تہ میں نخلستانی سبزی کے ٹکڑے بہت دُور دُور تھے۔ اور گھوڑے اور باربرداری کے ٹٹو کومیس نہیں پیتے تھے۔ لیکن پانی کے بغیر اُن کا گذارہ نہیں تھا۔

آج بھی ایسی ہی ایک لکیر نظر آئی۔ ایلچی بہادر نے اپنے گھوڑے سے استمزاج کے لئے لگام ڈھیلی چھوڑی۔ اور گھوڑے نے اس سبز لکیر کا رُخ کیا ہی تھا کہ ایلچی بہادر نے لگام پھر پوری قوت سے کھینچ لی، اور گھوڑا غصے اور کرب سے دانت نکال کے ہنہنایا۔ اُس کی گردن تھپک کے ایلچی بہادر نے للکار کے کہا: "امیر۔ یہ کسی پرانی ندی کا کنارہ ہے۔ گھانس بھی سبز ہے، اس لئے پانی ہوگا۔ لیکن گھانس کے اُس پار کسی کے جانور چر رہے ہیں۔"

تیمور نے ریت پر سورج کی جگمگاہٹ سے بچنے کے لئے پیشانی پر ہاتھوں کی چھتری سی بنائی اور کہا۔

"مجھے تو صرف گھوڑے ہی نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے بھیڑ بکریوں کا ریوڑ قریب ہو۔ اگر ہے تو یہ جانور

ترکمانوں کے ہوں گے ۔ احتیاط سے آگے چلو۔"

کارواں فی الفور فوجی دستہ بن گیا۔ صرف بیس ٹھہرے۔ پہلے تو اسلحہ سے لدے ہوئے ٹٹو روکے گئے اور چشم زدن میں تیر سب میں تقسیم ہوگئے۔ سب نے کمانیں کڑی کیں۔ گھوڑوں کی چال بدل گئی۔ اور جنگ کے عادی گھوڑے بھی سمجھ گئے کہ اس سبز گھاس تک پہنچنے سے پہلے محنت اور زحمت ہے۔

اور پھر ایک ریلے میں اس دُھند سے گذر کے یہ بائیسوں سوار ہری ہری گھاس تک پہنچے جو گھوڑوں کے ٹخنوں کے برابر اونچی تھی۔ یہاں میلی نم مٹی اور دلدل میں درختوں اور بیلوں کا ایک جھنڈ بھی تھا، جو معلوم نہیں اس سینکڑوں فرسنگ لمبے ریگستان میں کیسے زندہ تھا۔ جن سواروں کے گھوڑے چر رہے تھے، وہ اپنے گھوڑوں کی طرف لپک کر ان پر سوار ہونے لگے اور انھوں نے بھی اپنی کمانیں کڑی کیں۔

اتنے میں اپنے تیز، چھلانگیں مارتے ہوئے، گھوڑے کی رکابوں پر تقریباً نیم استادہ ہو کر اولجائی چلائی "سلطان حسین۔ سلطان حسین۔"

کڑی کمانیں ڈھیلی ہوگئیں، ایک ملا جلا مرحبا کا شور بلند ہوا۔ گھوڑوں کی سرپٹ چال دھیمی ہوگئی۔ تیر ترکشوں میں واپس چلے گئے اور اولجائی سب سے پہلے اپنے گھوڑے سے کودکے، اپنے بھائی سے لپٹ گئی۔ اس کا جسم وزنی تھا، تیمور کو اس کی پھرتی پر حیرت ہوئی۔

اس نے سلطان حسین کو گھسیٹ کے گھوڑے سے اتارا اور چلا کے اس نے تیمور سے کہا، حالانکہ چلانے کی ضرورت نہیں تھی "میں نے کیا کہا تھا؟ میں نے کیا کہا تھا؟ کہ آج سلطان حسین سے ملاقات ہوگی۔"

تیمور کو یہ ملاقات یاد تھی۔ بہت اچھی طرح۔ اسے خیال تھا کہ سلطان حسین اسے طعنہ دے گا۔ چغتائی مغلوں سے دوستی کا۔ تیمور نے اس ملاقات کے دوران میں اپنے آپ کو جس قدر حقیر محسوس کیا۔ اس کے بعد پھر کبھی نہ کیا کیونکہ سلطان حسین نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ نہ طعنے کا۔ نہ ملامت کا۔ اسکے برعکس سلطان حسین کا بھاری بھرکم جسم جو زرہ کے نیچے اس گرمی میں بھی اطلس سے لدا تھا مارے خوشی کے ہانپ رہا تھا۔

درختوں کے جھنڈ کے پیچھے سے ایک حسینہ، اپنے رہوار کی لگام ہاتھ میں تھامے ہوئے نکلی، اور بے ساختہ اپنے گھوڑے سے کودکے اولجائی سے لپٹ گئی۔ اور اولجائی ہراتی فارسی اور ترکی کا فرق بھول کے باربار کہتی رہی۔

"شکرم۔ خواہرم۔"

یہ سلطان حسین کی ملکہ دلشاد خاتون آغا تھی۔

تیمور اور سلطان حسین کبھی ایک دوسرے سے اس قدر قریب نہیں ہوئے تھے، جیسے کہ اُس دن قزل قم کے بے پایاں طوفانی، سرخ ریگستانی سمندر کے اس ہرے بھرے نخلستانی جزیرے میں۔

تیمور کے حکم کا انتظار کئے بغیر ایلچی بہادر نے خیمے کھڑے کرنے کا حکم دیا۔ کالے کالے سمور کے گول گول خیمے، جو دور سے ترکمانوں کے خیمے معلوم ہوتے تھے اور اس لئے اس علاقے میں محفوظ تھے۔

خشک نمکین گوشت کے ٹکڑے ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیئے گئے۔ کیونکہ ابلا ہوا گوشت بہرحال خشک گوشت سے زیادہ مزے کا ہوتا ہے، اور اس طرح ہوئی دوپہر کو درختوں کے جھنڈ کے نیچے ایسی ضیافت ہوئی جس کے آگے ایران اور توران کی تمام ضیافتیں ماند تھیں۔ اس غربت میں بھی دلشاد خاتون کی جورتی میں زعفران تھا، جو چاولوں میں ڈالا گیا۔ ٹیلی ہوئی یہ لی میں اُبلے تلے تیتر جن کو ایک دن پہلے سلطان حسین نے ترکمانوں سے ایک گلے سے خریدا تھا۔ اور جب دانتوں کو مسواک کرکے، اور ہاتھوں پر لگی ہوئی چربی نرم نرم گھاس سے پونچھ کے سب نے ڈک بھر بھر کے، بلکہ چشمے سے منہ لگا کے گھوڑوں اور غزالوں کی طرح چشمے کا پانی پیا، تو یہ پانی جنت کے نہروں کے پانی کی طرح شیریں اور خوشگوار تھا۔

دلشاد خاتون آغا جب جھک کے چشمے کا پانی پی رہی تھی، تو پانی آئینہ بن گیا۔ بھورا تاجیک لبادہ، سر پر جواہرات سے لدی ہوئی کلاہ، دونوں شانوں اور سینے پر بل کھاتی ہوئی بھورے بھورے بالوں کی گندھی ہوئی دو دو لٹیں۔ پانی کے آئینے میں ایک اور حسینہ ابھری، ایک اور دلشاد، جو اس ریگستان میں ماری ماری نہیں پھر رہی تھی جو گویا اس چشمے کی پری تھی۔

[یہ سب تشبیہیں اولجائی کی تھیں۔ کیونکہ تیمور نے کبھی دلشاد کو نظر بھر کے نہیں دیکھا، اس قیامت کی طرح گرم لیکن دلفریب دوپہر کو بھی نہیں۔ اور سلطان حسین کی تو وہ بیوی ہی تھی۔ اس کے عکس کو دیکھ کے شاعری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اپنے بھائی کی تمام بیویوں میں اولجائی کو دلشاد ہمیشہ سے بہت پیاری معلوم ہوتی تھی۔ وہ مبہوت ہو کے دلشاد کو اور اس کے عکس کو دیکھتی رہی]

اور اُس دن، اُس سہ پہر کو رات کے بجائے دن ہی کو خیمے نصب ہو چکے تھے۔ خیمے میں تیمور اور سلطان حسین مستقبل کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ یہاں درختوں کی چھاؤں میں، گرم گرم لُو اور ریت کے دامن میں ٹھنڈے ٹھنڈے چشمے کے کنارے دلشاد کی آنکھ لگ گئی۔ اور اولجائی ایک پیڑ کے سہارے بیٹھ کے اونگھنے لگی۔ اور جہانگیر اس کی گود میں سر رکھ کے سو گیا۔

[ہم امیر تیمور گورگان . . . . . .

[ہم امیر تیمور گورگان جو ربعِ مسکون کو تسخیر کرکے رہیں گے، ہمیں اپنی عظمت کی قسم ہے کہ اولجائی کی یاد دل سے محو نہیں ہوتی۔ قضا و قدر پر ہمارا اختیار نہیں . . . میں فردِ واحد تیمور جس کو اس دن اس سپاہی

نے تیمور لنگ کہا تھا اور جسکو میری پیٹھ کے پیچھے ساری دنیا تیمور لنگ کہتی ہے کشادہ پیشانی، سُرخ و سفید سیاہ ریش شیر دل، میں تیمور جیسا دلیر بھائی کو یاد کرتا ہوں تو دل سینے سے باہر نکل آتا ہے، اور آج اُس کا بھائی اِس دوسرے خیمے میں میرا قیدی ہے۔ صبح تک مجھے اس کی زندگی یا اس کی موت کا فیصلہ کرنا ہے ]

ایّام کے، شب و روز کے بٹے ہوئے مُہرے، اس طرح گھوم رہے ہیں جیسے یہ میتی ہوئی بازی کسی نے ابھی تک نہ جیتی ہے نہ ہاری ہے۔

مشورہ میرا تھا۔ اور مشورہ غلط تھا۔ خوارزمیوں کا کیا اعتبار۔ اُن کا دل اس کھاری جھیل کی طرح کھارا ہے، جس میں آمو دریا اور سیر دریا گرتے ہیں، مگر اُس کی نمکینی کو کم نہیں کر پاتے۔

خوارزمیوں کا کیا اعتبار۔ اور ایک دن میں خوارزمیوں سے اُن کی بدسلوکی کا بدلہ لے کر رہوں گا۔ لیکن خوارزمی تاتارانِ زرّیں خیل کے باجگذار تھے۔ اور زرّیں خیل اور چغتائیوں میں نہ کبھی بنی ہے نہ کبھی بنے گی۔

قراقم کا کالا کالا ریگستان۔ کالے ٹیلے۔ جلتا سورج، گھوڑوں کی گردنوں پیٹھوں، رانوں سے اُبلتا ہوا پسینہ، گرد میں اٹے ہوئے خود، گرد پوش داڑھیاں، تھکے ہوئے گھوڑوں کی تھکی ماندی ہنہناہٹ۔

اور جب ہم منزلِ مقصود پر پہنچے تو محض ایک سُراب ملا۔ سُراب میں تو خیر یہی ہے کہ پانی نہیں ہوتا، ریت ہی ریت ہوتی ہے۔ خوارزم میں ریت کے اوپر ہی اوپر جال بچھا ہوا تھا۔ غلطی میری ہی تھی۔ میں نے ہی سلطان حسین کو خوارزم چلنے کی ترغیب دی تھی۔ وہ تو کابل واپس جانا چاہتا تھا کہ چغتائیوں سے پھر ایک بار اپنی کھوئی ہوئی سلطنت چھینے۔ لیکن چالیس سپاہیوں سے کہیں کھوئی ہوئی سلطنت چھینی جا سکتی ہے۔

کئی آوازوں نے چپکے چپکے ہم سے کہا، "بھاگ یہاں سے بھاگ" اور مجھے اپنا دشمن، اپنا محسن بایزید جلائر یاد آ گیا۔

خوارزم سے کئی سرگوشیاں سُنائی دیں، یہاں کی چھتیں خیموں کے کلس کی طرح نوکدار نہیں تھیں، مسطح چھتیں، جن میں مٹی اور خاشاک کے تنکوں پر سبزی جمی ہوئی تھی۔ چھوٹے چھوٹے چوبی دروازے جن پر تبریزی نقش کاری تھی۔ خوارزم کے شہر میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تورانی خاک پر ایرانی دنیا آباد ہے۔

میں نے سلطان حسین سے کہہ دیا تھا [سلطان حسین فربہ جسم، دراز قد] چنگیز کی اولادِ نرینہ کو خوارزمیوں سے مدد کی توقع تو بیکار ہے۔ لیکن ہمیں پناہ مل جائے گی۔ گرمیوں کے ایّام تک۔ اور گرمیوں میں چغتائیوں کا لشکر، پہاڑوں میں واپس چلا جائے گا۔ چغتائیوں کے سمندروں کو ایسک کول کا خنک خنک پانی پینے کی عادت ہے، اس کے بغیر اُن سے گرمیاں نہیں کٹتیں۔ چغتائی شہسواروں کے راہواروں کو خان تنگری

کے علف زاروں میں صنوبروں کے ٹھنڈے سائے کے نیچے اودی اودی گھاس چرنے کی عادت ہے، اسکے بغیر وہ گرمیاں نہیں گذار سکتے۔ میں نے سلطان حسین سے کہا تھا کہ اگر خوارزمی ہمیں پناہ دیں تو گرمیوں میں ہم پھر واپس چلیں گے، سمرقند کے جوار سے برلاسوں کو جمع کرینگے، کابل اور فرغانہ کی وادیوں سے جلائروں کے وفادار مغلوں اور ترکوں کو چنیں گے۔ اور اس کے بعد تغلوق خاں سے مقابلہ کرینگے۔

مگر خوارزم کی نیچی نیچی مسطح چھتوں کے نیچے جو مخلوق تھی، اس کے دل میں دغا اور لالچ تھی۔ اور ہم سے ایک درویش نے کہا۔

"سلطان حسین یہاں سے بھاگ۔ تیمور گورگاں یہاں سے بھاگ۔ خوارزم کے صوفیوں کے دل میں بجز دغا اور حرص کے کچھ نہیں۔ وہ اس فکر میں ہیں کہ تم دونوں کو پکڑ کے تغلوق خاں کے ہاتھ بیچ دیں۔ تمہاری عورتوں کو کنیز بنائیں، تمہارے بچوں کو غلام بنائیں۔ بھاگو، یہاں سے بھاگو"

خوارزم کے لشکریوں کے بشرے سے چالاکی ٹپکتی تھی۔ اور ان میں سے ہر ایک کی گویا چار چار آنکھیں تھیں، اور وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ ہم کتنے ہیں، کس ترکیب سے زندہ گرفتار ہو سکتے ہیں، اور پھر ہم سے کہا گیا کہ صبح کو ہمیں صوفی کے دربار میں پیش ہونا ہے۔

تب اولجائی نے مجھ سے کہا، یہاں آکر تم نے غلطی کی۔ اور دلشاد آغا نے سلطان حسین سے کہا یہاں آکر ہم نے غلطی کی۔ اور سلطان حسین نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے میری طرف غصے سے دیکھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور ہم اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ ہم خیمہ دوزوں کے محلے سے گذرے، ہم کبابیوں، اور نان خطائی بنانے والوں کے تنوروں پر گئے اور ان سے گرم گرم کباب اور نان لئے ہم نے اس طرح اپنے گھوڑوں کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں کہ کسی کو شک نہ ہو کہ ہم شہر کے باہر جا رہے ہیں لیکن جب ہم فصیل کے دروازے کے پاس پہونچے تو جھپٹ کے ہم نے سنتریوں کے سر کاٹ لئے۔ فصیل کے دروازے کھولے، اور اس عرصہ میں سارا شہر جاگ اٹھا۔ اب ہم نے لگامیں کھینچیں، اور دانتوں میں دبالیں، اپنی کمانیں کڑی کیں، اور چٹکیوں میں تیر پکڑے۔

(سلطان حسین نے یہاں سلطانی نہیں کی، جو میں نے کہا مان لیا) ہم ایک بلند ٹیلے پر چڑھ گئے، اور اندھیرے میں ہم نے مشعلوں کا ایک سرپٹ طوفان آتا دیکھا۔ کئی سو خوارزمی ہوں گے جو آگ کے طوفان کی طرح چلے آرہے تھے، جب وہ ٹیلے کے نیچے پہنچے تو ہم دونوں اور ہمارے ساٹھ ساتھیوں نے اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک دیا۔

ہم بگولے کی طرح ٹیلے کی چوٹی سے نیچے اترے، ہم نے اپنے قلب پر اپنی چھوٹی چھوٹی تورانی ڈھالیں

تان لیں۔ ہم نے اپنی دُہری طاقتور کمانیں تان لیں جن کی تانت میں ہرن کا زِرمہ تھا۔ ہم نے فولاد کی نوک والے تیروں کی ایسی بارش کی کہ کسی خوارزمی کی زرہ اُس کے آگے ٹھہر نہ سکتی تھی۔ ادھر کمان تنی، تیر چھوٹا، اُدھر ایک ثانیہ میں دوسری چٹکی میں دوسرا تیر۔

ہم پر موت کا نشہ طاری تھا، دشمنوں کے بس سے نکل کر جنگل میں ادھر سے اُدھر اس طرح گھومتے، اور پھر باہر نکلتے جیسے فرزیں مقابل کے پیادوں کے بیچ سے۔ جب ہم خوارزمیوں کے درمیان دور تک گھس جاتے اور وہ ہمیں گھیرنے کی کوشش کرتے تو ہم اس طرح صاف بچ کر نکل جاتے جیسے قصاب کی چھری دُنبے کی ران کے گوشت میں۔ ضرورت ہوتی تو ہم اپنی تمدار جری تلواریں نکال لیتے، اور باہر آکے پھر تلواروں کو نیام کرکے چٹکیوں میں تیر پکڑتے اور کمان کھینچتے۔

پھر میں نے دیکھا، ایلچی بہادر کا گھوڑا گرا اور وہ اس صفائی سے کود کے الگ جا کھڑا ہوا کہ میں نے کہا "مرحبا" وہ آسانی سے ذرا پیچھے ہٹ کے کسی اور گھوڑے پر سوار ہو سکتا تھا۔ کتنے گھوڑے تھے، جن کے سوار گر چکے تھے۔ دونوں طرف۔ لیکن وہ اُسی طرح ٹیلے کے ایک بڑے پتھر کے پیچھے سے تیر چلاتا رہا، یہاں تک کہ خوارزمیوں نے اُسے گھیرنا شروع کیا، اور یہ دیکھ کر کہ ایلچی بہادر میں شجاعت زیادہ ہے، اور عقل کم۔ میں نے جھپٹ کے اپنی تلوار سے اُس کی کمان کی تانت کاٹ دی۔ اُس نے اپنی خون میں ڈوبی ہوئی سیاہ داڑھی کے بال اپنے دانتوں میں چبائے، اور وہاں سے ہٹ کے اُس گھوڑے پر سوار ہو گیا تھا، جو پاس ہی اپنے خوارزمی آقا کی لاش کے پاس، دونوں پیر اٹھائے ہنہنا رہا تھا۔

پھر میں نے سلطان حسین کو دیکھا۔ خوارزم کے نائب والی کے بہت قریب۔ ایک وار میں اُس نے پرچم بردار کا ہاتھ قلم کرکے پرچم گرا دیا۔ اور دانت میں عنان پکڑے، تلوار سونتے وہ نائب والی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ خوارزمیوں نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا، میں نے جاکو برلاس سے کہا کہ وہ اولجائی کے قریب ہی رہے۔ مجھے اولجائی کے چہرے پر ہراس کی شکنیں اچھی طرح یاد ہیں۔ پھر میں نے بسم اللہ کہہ کے اپنا گھوڑا بڑھایا، سلطان حسین کا رہوار تنگ سے حلقے میں چکر کاٹ رہا تھا اور چاروں طرف تلواریں چمک رہی تھیں۔ میں نے . . . . . .

خیر میں اُسے خوارزمیوں سے چھڑا لایا۔

اور پھر میں نے ہم میں سے جتنے کچھ بچے تھے، اُن کو یلغار کا حکم دیا، اور پھر ایک بار ہم نے اپنے آپ کو خوارزمیوں میں جھونک دیا۔

مجھے یاد ہے، مجھے یاد ہے کہ سلطان حسین کا گھوڑا تیر کھا کے گرا مجھے یاد ہے کہ تڑپ کر دلشاد خاتون آغا

اپنے گھوڑے سے اتر پڑی، اور اپنا گھوڑا سلطان حسین کو دے دیا۔ دلشاد کا چہرہ گرد اور پسینے میں اٹا ہوا تھا، اور اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ بجلی کی سی سرعت سے سلطان حسین اس گھوڑے پر سوار ہوا اور چشم زدن میں وہ میرے ساتھ تھا۔ اور میں نے سوچا کہ جب تک نائب والی کا کام تمام نہ ہو ہمارے مٹھی بھر ساتھیوں کی زندگی کی کوئی صورت نہیں۔ میں نے کمان کڑی کی، اور آنکھ کے پاس جا کے نشانہ لگایا۔ نائب والی کے عین اسی جگہ تیر لگا۔ آنکھ کے نیچے، رخسار پر۔ اور وہ اپنے گھوڑے پر اس ضرب کی شدت سے جھک گیا میں نے پنی دین جھکے، رکاب پر پورا زور ڈال کے ایڑ لگائی، اور چلتے چلتے پوری طاقت سے نائب والی کے سینے پر نیزہ جھونک دیا جو آر پار ہو گیا۔

نائب والی کے گرتے ہی خوارزمی تتر بتر ہو گئے۔ اور جو اس کی لاش اٹھانے کے لئے ٹھہرے تھے انہیں ہم نے تیر برسا کے بھگا دیا۔

ٹیلے پر دلشاد پیدل کھڑی کانپ رہی تھی، اور اس کے پاس اولجائی تھی، اس کی کمان برابر کھنچی رہتی اور اس کا نشانہ کسی اور تاتاری سے کم نہیں تھا۔ میں نے دلشاد کو اولجائی کے گھوڑے پر سوار کرایا۔ اور رات کے تاریک پردے میں ہم نے خوارزم کے جنوب کا رخ کیا۔

ہم آٹھ آدمی تھے۔ سات آدمی تھے جو خوارزمیوں کے ہاتھ زندہ بچے تھے۔ میں اور اولجائی اور جہانگیر۔ سلطان حسین اور دلشاد خاتون آغا۔ جاکو برلاس اور ایلچی بہادر۔ اور اس رات اس چشمے کے کنارے ہمیں سلطان حسین کے تین بدخشانی سپاہی اور ملے، مگر وہ تین گھوڑے چرا لے گئے۔

ہم نے یہ تصفیہ کر لیا کہ ساتھ ساتھ رہنا موت کو دعوت دینا ہے۔ سلطان حسین اور دلشاد کے ساتھ میں نے جاکو برلاس کو بھیجا۔ اور طے یہ ہوا کہ ہم کابل اور بامیان کی پہاڑیوں میں پھر ملیں گے، مگر الگ الگ راستوں سے سفر کریں گے۔ ہمارے تین گھوڑے تو بدخشانی سپاہیوں نے چرا لئے تھے۔ ایک گھوڑا میرے پاس رہ گیا جس پر میں نے اولجائی کو سوار کیا، اور اپنے ہاتھوں میں اس کے گھوڑے کی لگام تھامی۔ ایلچی بہادر نے ایک خچر پر کھانے پینے کا سامان، جو کچھ نقد و جواہر رہ گیا تھا وہ سب لادا اور اس کی لگام تھامی، اور ہم دونوں چلے۔ اس زمانے میں میں کئی فرسخ پیدل چل سکتا تھا۔ میں لنگڑا نہیں ہوا تھا۔

[میں لنگڑا نہیں ہوا تھا . . . . . .]

میں نے اولجائی کی طرف دیکھا اور اولجائی نے میری طرف۔ اب صبح ہو رہی تھی اور صبح کی روشنی میں ریت چمک رہی تھی۔ ریت کی ایک بے پایاں دنیا تھی۔ میں نے اولجائی کی طرف دیکھا اور اولجائی نے میری طرف۔ میں کہیں ٹخنوں ٹخنوں تک ریت میں دھنس جاتا تھا، اور یہ دیکھ کر اولجائی کھلکھلا کے

ہنس پڑی۔

اور میں نے بھی اُس کی ہنسی سے متاثر ہو کے قہقہہ لگایا۔

اور پھر ریگستان اور صبح کے نور کے درمیان میں نے عہد کیا کہ ایک دن میں خوارزم کے صوفیوں سے اس غداری کا بدلہ لوں گا۔ جس طرح آج اولجائی بیابان بیاباں دشت بدشت پریشان پھر رہی تھی جس طرح آج دِشاد خاتون آقا کو پیدل ہوگے، اپنی جان اور عزت خطرے میں ڈال کے سلطان حسین کی جان بچانا پڑی، اسی طرح ایک دن خوارزم کی حسین ترین خاتون میرے لشکر کے بس میں ہوگی۔ میں کسی حسین خاتون کو اپنے لئے نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے اولجائی سے محبت تھی۔ نہ ہی اپنے لشکر میں کسی اور کے لئے البتہ جہانگیر کے لئے، جاکو برلاس کے لئے.... یا شاید جہانگیر کے لئے...... کیونکہ جہانگیر چند سال میں بڑا ہو جائیگا۔

میں نے جب قہقہہ لگایا تو اولجائی نے پوچھا "کیا بات ہے ؟"

میں نے کہا" میں خوارزم کی عورتوں سے تمہارا اور دِشاد کا بدلہ لوں گا"

اس پر اولجائی غصہ ہوکے بولی" نہیں بدلہ نہ لینا۔ اُس طرح بدلہ لینے میں تمہارا فائدہ ہوگا مگر ہمارا سراسر نقصان ہے"

وہ ہمیشہ اسی طرح کی باتیں کیا کرتی تھی۔

صبح کی روشنی پھیلی تو ہمیں ایک سوکھی ہوئی چراگاہ، اور ایک سوکھے ہوئے چشمے کے کنارے کچھ ترکمانوں کے یُرت ملے۔ اِن ترکمانوں کے چرمی ملبوسوں سے ایسی سڑی بُو آتی تھی کہ اولجائی نے اپنی ناک بند کرلی۔ مگر یہ ترکمان وفادار تھے۔ انھوں نے بھیڑ ذبح کرکے ہماری دعوت کی، اور ہمارے ہاتھ گھوڑے اور دُنبے بیچے۔ اولجائی نے اُن کی غلیظ، تیل اور چربی سے لپی ہوئی عورتوں کو موتیوں کے ہار دیئے۔ اِن ترکمانوں کے گھوڑے بہت کام آئے۔

پھر تیمور نے یاد کیا۔

وہ باسٹھ دن جو ہم نے علی بیگ کی قید میں گذارے۔ میں نے اور اولجائی نے۔ اور اولجائی جو عبالائمر شہزادی تھی جس کے جدِّ امجد چنگیز نے دُنیا کو فتح کیا تھا۔ ہمارا قید خانہ مویشیوں کا اصطبل تھا۔ ہمارے کپڑوں میں کھٹمل، اور گوبر کے کیڑے اور چیونٹے جمع رہتے۔ گرمیوں میں معلوم ہوتا کہ ہمارا مغز پگھل جائے گا۔ اولجائی حسرت سے میری طرف دیکھتی، اور جب بے بسی کے عالم میں مجھے غصہ آنے لگتا تو وہ کھلکھلا کے ہنس پڑتی اور کہتی کہ میرے آقا یہ دن بھی گذر جائیں گے"

اور جس دن سلطان حسین کی دھمکی کے بعد علی بیگ نے ہمارے جواہرات لے کے ہمیں رہا کیا میں نے

خدائے عزوجل سے عہد کیا کہ میرے مولا میں انسانوں کو قتل کروں گا، یا انہیں معاف کر دوں گا لیکن انہیں قید نہیں کروں گا۔"

اور اس طرح ہم اپنے کپڑوں کے کھٹملوں، گوبر کے کیڑوں اور چیونٹوں سے رخصت ہوئے

[وہ جو آج خاک کے نیچے دبی ہوئی ہمیشہ کے لئے سو رہی ہے: اُس زمانے میں جوان تھی، زندہ تھی، اور خوبصورت تھی۔ اُس کا گداز جسم زندگی اور قہقہوں سے مالا مال تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اذیت اُسے خاموش نہیں کر سکتی، اس کی ہنسی نہیں روک سکتی۔ کبھی کبھی وہ سوچ میں پڑ جاتی اور خاموش ہو جاتی۔ مگر جب وہ تمیوُر کو اپنے سے زیادہ خاموش پاتی تو ایک نئی زندگی کی لہر قہقہہ بنکر اُسے زندہ کر جاتی]

[اور جب اولجائی قبر میں اُتاری گئی ہے تو تیموُر دُور تھا] لیکن اُس نے وہ دن یاد کیا جب اُس نے اُسے اپنے ہاتھوں قبر جیسے کنوئیں میں اُتارا تھا۔ چغتائی شہسواروں سے بچانے کے لئے۔

لال لال سنگلاخ چٹانیں۔ دُور دُور تک ہوا ریت کے لال لال ذرّوں سے سُرخ۔ جیسے لاکھوں چیونٹیاں ہوا میں منتشر ہوں۔ جیسے فضا میں روزِ نشور کی سی گرمی اور سُرخی ہو۔ اینٹوں کی بھٹی کی گرمی۔ لیکن اس گرمی کے باوجود اس سال چغتائی شہسوار نان تنگری کے ٹھنڈے ٹھنڈے صنوبروں کے سائے میں واپس نہیں گئے تھے۔ الیاس اور بکی جوک کے شہسوار ایسک کول کے کنارے کی ٹخنوں ٹخنوں اونچی گھانس میں گھوڑے نہیں چرا رہے تھے۔ اُن کے گھوڑے اب بھی ماوراالنہر کے مغرب میں تپتے ہوئے ریگستانوں میں دشمنوں کو تلاش کر رہے تھے، خود اُس کو اور سلطان حسین کو سات گھوڑوں کی نگاہوں سے کھنچی ہوئی گردنیں بحیرۂ خوارزم اور بحیرۂ خزر کے کڑوے کھارے موّاج پانی کو دیکھتیں۔ بیزاری اور پیاس سے ہنہنانے کی آواز آتی، اور نگاہیں پھر مشرق کی طرف مڑ جاتیں۔

جہاں جہاں کسی زرد رُد گھانس کی چراگاہ میں، یا کسی چشمے کے کنارے، یا کسی دریا کی وادی میں چغتائیوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے ترکمان چرواہے ملتے تیمور سے یہی کہتے "یا خواجہ، یا امیر اِدھر خطرہ ہے۔" اور ترکمان چرواہنیں اپنی پتلی پتلی لمبی لمبی آنکھوں سے گھور گھور کے اولجائی ترکان آغا کو دیکھتیں۔ اور پھر اولجائی ترکان آغا کی مسکراہٹ وبا کی طرح سب میں پھیل جاتی۔

ایک لاغر سا گھوڑا تھا، جو علی بیگ نے کھٹملوں اور گوبر کے کیڑوں والے اصطبل سے چلتے وقت دیا تھا اُس پر تیمور سوار تھا، اور ایک اونٹ تھا جس کی کھال جابجا لٹک رہی تھی، اور خارش سے جسم پر کیڑوں کے گچھے جمع ہوئے تھے، اس پر اولجائی سوار تھی۔

لال لال سنگلاخ چٹانیں، اور ہوا میں ریت کی لالی، قزل قسم کی بے حد و انتہا سُرخی۔ اور سُرخی میں مجزے کہیں کھارے پانی کے چشمے، جن کو دیکھ کر گھوڑا ہنہنا کر پسینے سے شرابور گردن پھیر لیتا۔ اور رونگٹوں کی طرح اُس کی ایال کے بال کھڑے ہو جاتے۔ اور اونٹ بے بسی سے بلبلا کے دوسری طرف دیکھنے لگتا۔ اور کہیں کہیں معجزہ کے طور پر میٹھے پانی کا ایک کنواں۔

اِس کنویں کا اس ماحول سے کوئی تعلق نہ تھا، دُور دُور تک کہیں سبزی کا کوئی پتہ نہ تھا، اس کا امکان کم تھا کہ دشمن کے سوار یہاں تک آئیں۔ یہ ایک معجزہ تھا اِن سنگلاخ چٹانوں کے درمیان تہ بہ تہ، اِن کراری چٹانوں کو کاٹ کر کبھی زمانے میں کسی نے انسانوں کے لئے یہ کنواں کھودا ہو گا۔ اب کئی کئی فرسخ تک کوئی آبادی نہ تھی، ترکمانوں تک کے خیمے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ لیکن تیمور کو معلوم تھا کہ کسی زمانے میں یہاں سے قریب ہی ندی یا بہتا تھا، جو سیحوں کے پانی کو جیحون کے پانی سے ملاتا تھا۔ یہاں آبادی تھی، لوگ رہتے تھے۔ جو وحشی قبیلوں، مغلوں اور ریگستان کی نذر ہو گئے۔ جن کو مٹے صدیاں گذر گئیں۔

اور اس کنوئیں کے کنارے چار جانداروں نے رات گذاری۔ تیمور نے، اولجائی ترکان آغا نے، لاغر گھوڑے نے اور خارش زدہ اونٹ نے۔

اور جب رات اندھیری تھی تو تیمور نے کہا "شکرم"

اولجائی ترکان آغا کی آنکھیں گرم گرم نیند سے بند ہوئی جاتی تھیں۔ اُس نے سوتے جاگتے میں کہا "ہوں"

بستر کے نیچے ریت سخت اور تکلیف دہ تھی۔ تیمور نے کہا "شکرم۔ اِس طرح تو قزل قُم کا یہ ریگستان ہمیں کھا جائے گا۔ ہماری ہڈیاں تک یہاں بھوک اور پیاس سے سفید ہو جائیں گی اور کسی کو خبر نہ ہو گی۔ اور اس ریگستان میں بھی چغتائی ہر جگہ ہمارا پیچھا کر رہے ہیں۔"

اولجائی نے ہنس کے کہا "اچھا اب سو جاؤ۔ صبح کو اٹھ کے سوچیں گے، رات کو نیند نہ آئے گی تو صبح کو بادیہ میں سفر کرنے کی طاقت کہاں سے آئے گی"

تیمور نے کہا "شکرم۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ کرنا چاہئے۔ اِس ریگستان سے نکلنا چاہئے۔ اگر میرے پاس صرف چند رفیق اور ہوتے۔ اگر میں اس قدر تیز سفر کر سکتا کہ ان رفیقوں کو پا سکتا جو خوارزم کے قریب کے دیہاتوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ جیسے امیر سیف الدین جس کے ساتھ ہمارا جہانگیر ہے۔ اور آق بوغا اور ایلچی بہادر اور جاکو برلاس ہے۔ یہ اگر میرے ساتھ ہوتے، یا میں ان کے پاس پہنچ سکتا، یا میں انہیں پا سکتا۔ میں اتنا تیز سفر کر سکتا یا اکیلا سفر کر سکتا"

اولجائی چونک کر اٹھ بیٹھی۔ اوپر نیلگوں آسمان تھا جس سے دن کی اُڑی ہوئی سُرخ خاک کے ذرے آہستہ آہستہ غیر مرئی طور پر برس رہے تھے۔ اُن سے اُوپر چمکتے ہوئے ستارے تھے، کہکشاں، اور لال تارے، اور سُنہرے ستارے، اور ایک سبزی مائل تارہ۔ اور نیچے دُور دُور تک لال لال چٹانوں، اور ریت کی ہڈیوں اور پسلیوں جیسی شکلیں تھیں۔

اس جلائر شاہزادی نے اس سنگلاخ زمین، اور اس دور دراز آسمان کی طرف دیکھا اور چشم زدن میں فیصلہ کر لیا۔ اُسنے تیمور کے دونوں ہاتھ اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں دبوچ لئے اور کہا: "اچھا آپ اکیلے جائیے اور انہیں ڈھونڈیئے۔"

"اولجائی۔ اولجائی میں تجھے اس ریگستان میں تنہا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔۔۔۔۔"

اولجائی نے جواب دیئے بغیر ایک سوال کیا: "یہ بتاؤ تمہیں یہاں واپس آنے میں کتنے دن لگیں گے؟"

"اگر زندہ رہا تو دو ہفتے" تیمور نے کہا۔ اور اب وہ بھی اٹھ بیٹھا۔

اولجائی نے اُس کے چوڑے مضبوط شانے پر سر رکھا، اور اپنے زار و قطار اُمڈے ہوئے آنسو روکے اور کہا: "تیمور مجھے اس نیلگوں آسمان سے ڈر نہیں لگتا، جسے مغل پوجتے ہیں۔ مجھے اس سنگلاخ زمین سے ڈر نہیں لگتا جس پر کوسوں تک ایک سبز پتا نہیں۔ لیکن اگر تیرے جانے کے بعد جغتائی یہاں آ پہنچے۔ اور میرا وہی حشر ہوا جو چنگیز کی بیوی بورتے تی کا ہوا تو میں تیرے پاس کبھی واپس نہیں آؤں گی۔ میں اپنی جان دے دوں گی۔"

تیمور کی داڑھی کے کالے گھنے بال، اس کی دوہری زلفوں میں اُلجھ رہے تھے۔ تیمور نے اُس کے رخساروں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: "اولجائی۔ میں تجھ سے ہمیشہ سے کہتا آیا ہوں کہ راویوں سے فضول داستانیں نہ سُنا کر۔ میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ زندہ رہیں گے تو دونوں زندہ رہیں گے۔ اور اگر قسمت میں ہوگا تو رفیق چل ہی جائیں گے۔"

اولجائی نے اُس کے ہاتھوں کو اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے لگایا: "تجھ پہ سے میری ایسی ہزار جانیں قربان۔ مجھے اس کنوئیں میں اُتار دے۔ اگر دشمن کے سپاہی آئیں گے بھی تو میں چٹانوں کے نیچے چھپ جاؤں گی۔ اور اُوپر سے ڈول ڈال کے پانی لے جائیں گے۔ لیکن اس طرف شاید ہی کسی کا گذر ہو۔ لیکن اپنا وعدہ یاد رکھیو۔ اور پندرہ دن بعد آکے مجھے لے جائیو۔"

تیمور نے کہا: "نہیں میں تجھے اس لق و دق بیابان میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"

اولجائی ذرا سہٹ کے بیٹھ گئی اور استقلال سے اُس نے کہا: "کیسے نہیں ہو سکتا۔ یہی تقدیر ہے۔ اور یہ ہو کر رہے گا۔ مگر پندرھویں دن آجانا۔"

دوسری صبح کو تیمور نے دُور بے جاکر خارش زدہ اونٹ کو ذبح کیا۔ اور اُس کا کچھ گوشت اولجائی کے ساتھ کنوئیں میں اتارا۔ آگ جلانے کے لئے گھوڑے کے کھانے کی سوکھی ہوئی گھانس دی۔ اس آوارہ گردی کے زمانے میں آدھ کچا اور آدھا پکا گوشت کھانے کی ان دونوں کو عادت ہو گئی تھی۔ اپنے لئے ایک روٹی رکھی اور باقی ساری روٹیاں اولجائی کے لئے کنوئیں میں اُتار دیں۔ آگ جلانے کے لئے چقماق کے پتھر دیئے۔ ایندھن کے لئے اونٹ کا محل دیا۔ اور پھر کنوئیں کے کنارے سے جھانک کے اُسے دیکھا۔ پانی تہ میں آئینہ کی طرح چمک رہا تھا۔ اور کنارے کی چٹان پر جس کا رنگ پانی کی ریت سے سُرمئی ہو رہا تھا۔ اولجائی کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، اور دونوں چوٹیاں سینے پر گندھی ہوئی پڑی تھیں، اُس کی آنکھیں خشک تھیں، اور ایک بے پایاں محبت اور قربانی کی چمک سے جگمگا رہی تھیں۔ اور اُس کے ہونٹوں پر اُمید اور بے ہراسی کی وہ مسکراہٹ تھی جس نے سخت سے سخت مصیبت میں بھی تیمور کا دھیان بٹائے رکھا۔

"اولجائی فی امان اللہ۔"

"فی امان اللہ۔ آج سے پندرھویں دن۔" اولجائی کی آواز اور صدائے بازگشت کنوئیں میں گونج گئی۔

"پندرھویں روز۔"

اور پندرھویں دن جب وہ واپس آیا، اپنے بیٹے جہانگیر کے ساتھ۔ اور سیف الدین، اور جاکو برلاس اور آق بوغا، اور ——— قاضی زین الدین کے ساتھ۔ اور اُسنے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا۔.....

..... تو وہ جو کنوئیں میں اتاری گئی تھی، جونکی تک نہیں۔ اُسنے گردن اٹھا کے یہ معلوم کرنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ گھوڑوں کی ٹاپ دشمنوں کے راہواروں کی تھی یا تیمور کی۔ ان دو ہفتوں میں اس کنوئیں کی زندگی نے اُسے عارضی طور پر اندر سے تسخیر کر لیا تھا، یہاں سے آسمان کا صرف ایک حصہ نظر آتا تھا، وہی حصہ جسے کنوئیں کے منہ نے معیّن کیا تھا، اور دو ہفتہ تک شب بہ شب، ساعت بہ ساعت وہی ستارے اُسی جگہ نظر آتے تھے۔ دن کو پرچھائیں، اُسی جگہ پڑتی اُسی جگہ سے کھسکتی۔ اور شام کے اژدہے جیسے دھندلکے میں جذب ہو جاتی۔ اوپر آسمان تھا۔ اُس کے نیچے زمین، اور یہ جگہ زمین سے بھی نیچے تھی۔ ایک دو دن تک

نہیں۔ جہاں راتوں کو آسمان پر ستارے بھی نہیں چمکتے۔ صرف انسان ہوتا ہے اور اُس کا خدا۔

اور وہ کیفیت جو سالہا سال کی ریاضت سے پیدا ہوتی ہے، ساعت بہ ساعت اولجائی ترکان آغا کے دل میں پیدا ہوتی گئی۔ یہ کہ یہ سب ہیچ ہے۔ یہ زمین۔ یہ آسمان۔ یہ زندگی۔ دشت بہ دشت، قریہ بہ قریہ، کو بکو۔ یہ کہ وہ خود ہے، جب تک زندہ ہے، ہے۔ اور اُس کے سوا صرف خدا ہے، جو ہر جگہ ہے۔ باقی جو کچھ ہے غولِ بیابانی ہے۔ ریگستان کے غیر مرئی جن اور عفریت ہیں خواہ وہ سپاہی ہوں۔ دوست ہوں یا دشمن ہوں، خون کے پیاسے ہوں یا چاہنے والے ہوں سب کے سب لاحول کے مستحق ہیں۔ ان تمام صحرائی آسیبوں، ان غولِ بیابانی کے خوف کو اُس نے سب سے بڑے خوف کے سپرد کر دیا۔ اس کا خوف جس کا بنایا ہوا نیلگوں آسمان تھا، جہاں اکیلی راتوں میں تاروں کی قندیلیں جلتی تھیں جس کا بنایا ہوا اس کنویں کا ٹھنڈا پانی تھا جسے اس سُرخ ریگستان کی گرم ہوا خشک نہیں کر سکتی تھی۔ اور یہ خوف ایک طرح کی محبت بھی تھی۔ جیسے تیمور سے اُسکے رشتے میں محبت اور خوف دونوں منسلک تھے۔

اس کنویں میں جب دوسرا دن گذرا، اور دوسری رات ہوئی تو رات کو اس خوف کے دامن میں جو رحمت بھی تھا، جو سہارا بھی تھا اولجائی نے پناہ لی۔ اسنے جب وضو کیا، تب بھی اسے شک تھا کہ یہ محض رسمی عبادت ہے یا کچھ اور بھی ہے، لیکن جب اس نے عشا کی نیت باندھی تو اس اندھیری اکیلی رات میں، اس سنسان صحرا، اس سنسان آسمان میں اُس کے اور کسی اور کے درمیان ایک ایسا رشتہ بندھ گیا جو ہر طرح کی رسمی عبادت سے بالاتر تھا۔ اُسے یاد نہیں رہا کہ اُس نے کتنی رکعتیں پڑھیں، کتنی دیر تک قرآن کی آیتیں پڑھتی رہی اور کون کون سی آیتیں پڑھتی رہی، وظیفہ میں کیا کیا پڑھا اور کیوں پڑھا۔ اور اس حالت میں کب سو گئی۔

تیسرے دن جب وہ سو کر اٹھی تو آفتاب اس کنویں پر اس طرح طلوع ہوا جیسے گھر کے صحن میں، جیسے خانہ باغ کی روش پر طلوع ہوتا ہے۔ اب اس دشت، اس بادیہ، اس گرمی، اس تنہائی، اس زمین، اس آسمان سے اُس کی صلح ہو چکی تھی۔ کوئی اور اُس کے ساتھ تھا۔ وہ جو ہر جاندار سے زیادہ جاندار تھا۔ اُس نے سڑے ہوئے اونٹ کے گوشت کو دُور پھینک دیا، اور کنویں کے ٹھنڈے پانی میں بھگو کے سوکھی روٹی کا ٹکڑا کھایا۔ اور پھر کنویں کی دیوار کی چھاؤں میں اُس بے وقت کی نماز کی نیت باندھی، اور ساری دُنیا سے غافل ہو گئی اور اسی طرح دن گذرتے گئے۔ سوکھی روٹیاں کم ہوتی گئیں وہ کمزور ہوتی گئی۔ پندرھویں دن جب تیمور نے کنویں کے سرے پر آکے آواز لگائی "اولجائی اولجائی" تو اس نے گردن تک نہیں اٹھائی۔ لیکن جب تیمور کے قریب سے جہانگیر نے اُسے پکارا "انا۔ انا" تو وہ چونک پڑی۔ گویا وہ کڑی جو ان دو ہستیوں میں اس دنیا سے، اس تنہائی میں ٹوٹی تھی، پھر جُڑ گئی۔ وہ ماں بن گئی ایک خانعانہ جذبہ تھا جو بیدار ہوا، اور اُس نے سر اٹھا کے اوپر دیکھنا چاہا کہ کنویں کی دیواریں، اور محدود آسمان

کا حدود اربعہ دست و گریبان ہو کے گھوم گیا، اور وہ بیہوش ہو گئی۔

"بیٹی ایسا ہوتا ہے۔" بابا زین الدین نے کہا، "کبھی کبھی ایسی جھلک دکھائی دے جاتی ہے۔ کبھی سر راہے فقیر کو وہ نعمت عطا ہو جاتی ہے جو زاہد کو عمر بھر کی ریاضت میں نہیں ملتی۔ کیونکہ جہاں امتحان ہے وہاں زحمت ہے، اور جہاں زحمت ہے وہاں اطمینان ہے۔ زندانِ چاہ بھی ایک مقام ہے، جس سے گذرنا ضروری ہے۔ کیونکہ جو اس سوئی کے ناکے سے ہو کر نہ گذرے، وہ قلبِ ضمیر سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور یہ نعمت ہر ایک کو میسر نہیں آتی۔"

اولجائی سر جھکا کر سنتی رہی۔ پھر اُس نے کہا "مگر بابا زین الدین میرا دل پھر اب پہلا سا ہو گیا۔ اب مجھے نماز میں حضورِ قلب میسر نہیں آتا۔ مجھے اب پھر اپنے بیٹے اور اپنے خاوند سے ویسی ہی محبت ہے، اس دن جب میں نے جہانگیر کی آواز سنی، جس نے مجھے ماں کہہ کے پکارا تو معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی خواب تھا، جس سے میں یکلخت بیدار ہوئی۔ جیسے اصل حقیقت یہی دنیا تھی جس میں تیمور ہے، جہانگیر ہے، میں ہوں اور وہ دنیا.... وہ محض کنوئیں کی دنیا تھی۔"

زین الدین بابا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا: "بیٹی یہ راز تیری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تجھے جس کام کے لئے پیدا پیدا کیا گیا ہے وہی کام کر۔ اپنے شوہر کا خیال رکھ۔ اپنے بیٹے کی پرورش کر۔ اور صرف یہ سمجھ لے کہ جس طرح تو جہانگیر کو پالتی ہے جیسے تو نے اُسے اُس وقت پالا جب وہ تیرے پیٹ میں تھا، اسی طرح تجھے اس نے پالا اور اپنی ذات میں سمیٹ لیا جو اُس کنوئیں کا مالک ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اگر میں بتا سکتا ہوں تو یہ کہ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اس کنوئیں کے امتحان کے بعد تیرے اور تیمور کی زندگی کے دن بدل گئے۔ خاص طور پر تیمور کی زندگی کے ......"

"بابا زین الدین۔ کیا میری زندگی کے دن نہیں بدلیں گے؟"

"بدلیں گے ضرور بدلیں گے۔ لیکن تیمور کی زندگی کے دن بہت بدلیں گے۔ کیونکہ چاہِ کنعان اور زندانِ مصر دونوں کی صعوبت یوسف نے اٹھائی، لیکن یعقوب اور اسحاق کی جانشینی یوسف کے حصے میں نہیں آئی، یہودا کو ملی جو وہ تھے اُن سوتیلے بھائیوں میں سے تھا جنہوں نے یوسف کو قید کیا تھا، اور یہودا عیاش تھا لیکن یوسف پاکدامن تھا۔"

ہراساں ہو کے اولجائی نے کہا: "بابا زین الدین میں آپ کی بات نہیں سمجھی۔ کیا آپ کا مطلب ہے تیمور مجھے چھوڑ دے گا یا تیمور دوسری شادی کرے گا۔ میں نے اُسے کبھی منع نہیں کیا لیکن اُس نے آج تک کسی اور عورت کی طرف آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھا۔"

بابا زین الدین نے قدرے صبری سے کہا "او لجائی بیٹی۔ اور سب عورتوں کی طرح تیری عقل کچی ہے۔ وہ تو کنوئیں کا مالک ہی بہتر جانتا ہے کہ تو تیمور کو پہلے چھوڑے گی یا تیمور تجھے پہلے چھوڑے گا۔ لیکن ایک بات جو تو شاید

سمجھ لے یہ ہے کہ اُس نے تیمور کو نہیں، تجھے چاہ میں اسیر کیا۔ اور اُس کا کوئی کام دانش اور مصلحت سے خالی نہیں۔ مگر اِن باتوں کو، اِس خیال کو چھوڑ۔ یہ دنیا چار دن کی ہے۔ اپنے شوہر اور اپنے بچے کے ساتھ خوش رہ۔"

اولجائی کے جانے کے بعد بابا زین الدین نے سوچنا شروع کیا۔ کڑیاں تھیں کہ جڑتی ہی چلی جاتی تھیں۔ حالانکہ ان کڑیوں کو جوڑنا گستاخی تھی بہت سے کنویں سچے ہوتے ہیں اور بہت سے جھوٹے۔ چاہِ کنعان سچا کنواں تھا، اور چاہِ بابل، چاہِ نخشب جھوٹے کنویں تھے۔ آنکھ کا کنواں سچا ہے، اور نرگس کا جھوٹا۔ حالانکہ نرگس آنکھ سے زیادہ پرانی ہے۔ آنکھ کے چشمے میں نظر کا موتی ہے اور نظر کے چشمے میں سراب ہی سراب ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ کس چشمے کا پانی کھارا ہے، اور کس کا میٹھا۔ یہ تو وہی جانتا ہے جس نے میٹھا اور کھارا پانی بنایا ہے۔

بابا زین الدین کو کازغان کی اِس نواسی، اِس جلائر شہزادی پر رشک آرہا تھا جس کنویں میں وہ تھی، اس میں کیا شک ہے کہ وہ کنواں کھرا کنواں تھا۔ سچا کنواں تھا، یوسف کا نظر کا، امتحان کا، تزکیۂ نفس کا کنواں۔ وہ زندان جس سے رہائی ملتی بھی ہے تو انعام نہیں ملتا، کیونکہ اُس کا انعام اتنا زیادہ ہے کہ وہ اس دُنیا میں دیا نہیں جا سکتا۔ یوسف کا انعام مصر کی حکومت نہیں تھی۔ اصل انعام تو وہ تھا جو یہودا کو ملا۔ دانشِ انسانی ہیچ در ہیچ ہے۔ اور دانش بُرہانی ہی جانتی ہے کہ کیوں امتحان یوسف کا لیا جائے اور اس کا انعام یہودا کو ملے۔ کیوں اولجائی کنویں میں اتاری جائے اور تیمور کی قسمت کا ستارہ چمکے۔ اس مفروضے کا کوئی منطقی ثبوت نہ تھا۔ لیکن یہ بغیر منطق کے ظاہر اور ثابت تھا۔ اور اس رات قاضی زین الدین نے تیمور سے کہا۔

"امیر! میں نے تم سے کہا تھا کہ تغلق خاں سے اور چغتائیوں سے صلح نہ کرنا کیونکہ چٹان سے دودھ نہیں نکل سکتا۔ لیکن تم نے میری بات نہ مانی۔ خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب تمہیں سمرقند کی اُن بیٹیوں کی قسم ہے جو مغلوں کے اصطبلوں میں بھیڑوں کا دودھ دُہتی ہیں، اور راتوں کو اُن کے ساتھ بیسواؤں کا گناہ کرنے پر مجبور ہیں کہ جاؤ اور چغتائیوں کا مقابلہ کرو۔ اب مجھے امید ہو رہی ہے کہ خدا تمہیں ظفریاب کریگا......"

تیمور نے کہا: "قاضی زین الدین۔ میرے پاس لشکر نہیں۔ فوج نہیں۔ دولت نہیں۔ صرف چند ساتھی ہیں جو میری اور اپنی جان کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ لیکن چغتائیوں سے مقابلہ کرنے کا تو بہر حال میں نے، اور سلطان حسین نے عہد کر ہی رکھا ہے۔ کیوں کیا آپ کو میری فتح کی بشارت ہوئی ہے؟"

بابا زین الدین نے ارشاد کیا: "امیر تیمور گورگان میں صُوفی نہیں۔ کیونکہ میں نے کبھی صوف نہیں پہنا۔ میں نے کچھ دن تک تمہارے والد تارگائی کا زاویہ اور تکیہ سنبھالا تھا۔ لیکن وہ روشنی جو باطن سے آتی ہے، جو اندر سے روشن ہوتی ہے، مجھے نصیب نہیں ہوئی کیونکہ جو راستہ میں نے شروع سے اختیار کیا وہ شریعت کا تھا طریقت کا نہیں تھا۔ میرا سوز و گداز اخلاق کی حد سے آگے نہیں بڑھ پایا۔ میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے بشارت ہوئی

ہے کیونکہ میں بشارت کا اہل نہیں۔ جو زمین بنجر یا شور ہوتی ہے اس پر سبزہ نہیں جم سکتا۔ نہیں مجھے ایسے ہی خیال تھا۔ دنیا اور اہلِ دنیا اور اہلِ دنیا کے دلوں کو دیکھتے دیکھتے مجھے خیال ہوا کہ بعض اشارے ایسے ہوتے ہیں، بعض نشانیاں ایسی ہوتی ہیں جن سے آنے والی باتوں کی خبریں مل سکتی ہیں۔ اولجائی ترکان آغا نے دریا کے قریب چاہ میں جو ایک ہفتہ گذارا وہ ایک نشانی تھا۔ اور دوسری نشانی یہ ہے کہ اس قیدِ چاہ کا اصلی ڈانڈہ تم کو پہنچے گا۔ امیر گورگاں یہ سب قیاس ہی قیاس ہے۔ اس سے زیادہ مجھ سے کچھ اور نہ پوچھنا۔ اس سے زیادہ میں خود اور کچھ نہیں جانتا۔"

اب گویا تیمور کی یادداشت سب کی یادداشت تھی مگر نظام الدین شامی نے بین السطور یہ لکھا۔

"میری آنکھوں نے دیکھا کہ سات مینار تھے، کٹے ہوئے سروں کے مینار، کئی قدِ آدم اونچے، مصر کے اہرام کی طرح نیچے کی طرف پھیلے ہوئے اور پھر اوپر ان کا قطر کم ہوتا جاتا۔ اور میری آنکھوں نے دیکھا کہ یہ سات مینار سروں کے بنے ہوئے تھے۔ مردوں، عورتوں، بچوں، جوانوں، بوڑھوں کے سروں کے بنے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے باہر کی طرف چنے ہوئے تھے۔ کسی کٹے ہوئے ماہ طلعت چہرے کی زلفیں کسی اور کٹے ہوئے چہرے کی حنائی ریش سے الجھی ہوئی تھیں۔ کہیں کئی کئی بچوں کے چہرے ایک ساتھ چنے ہوئے تھے، جیسے کسی بڑی عمارت میں بڑی بڑی اینٹوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی اینٹیں چنی گئی ہوں۔ میں نے ریشمی لٹوں کے پہلو میں گنجے سر دیکھے، میں نے نیلی نیلی آنکھیں دیکھیں جو مردہ چہروں سے جھانک رہی تھیں، اور میں نے ایسے چہرے دیکھے جنہیں خنجر کی ناہنجار چمک نے موت کے لحظے میں حیوانوں کی صورت کی طرح مسخ کر دیا تھا۔ لیکن میں نظام الدین شامی قرار کرتا ہوں کہ ان بیس ہزار کے چہروں کے متعلق میں نے کچھ نہیں لکھا۔ حالانکہ میں بھی اسی شہر حلب کا رہنے والا ہوں۔ کیونکہ امیر صاحب قراں نے بیس ہزار کو موت دی اور مجھے زندگی دی، اس لئے کہ میں امیر کی ظفریابی کی داستان لکھوں۔ لیکن جب میں حلب کے قلعے کو یاد کرتا ہوں، اپنے بلاد اپنے شہر کے حصار کو، تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شیطان میرا گلا گھونٹ رہا ہے اور میرا گلا کسی طرح گھٹ نہیں چکتا۔ کیونکہ اپنے بچپن سے مجھے یہ حصار یاد ہے۔ جو ایک سنگلاخ چٹان پر بنا ہوا تھا، اور جہاں کہیں ڈھلوان مٹی تھی وہاں اسے اینٹوں سے چن دیا گیا تھا میرے حصار کی بلندی سنگین تھی۔ ڈھلوان کے نیچے خندق تھی، اور خندق سے لامتناہی سیڑھیاں شروع ہوئی تھیں۔ اس کے بعد پہلا دروازہ آتا تھا جو حصار کا نہیں چٹان کا دروازہ تھا۔ اس کے برجوں پر کئی سو سال تک ترک اور شامی افرنگ کے صلیبیوں سے اور افرنگ کے صلیبی ترکوں اور شامیوں سے لڑ چکے تھے، اور پھر لامتناہی سیڑھیوں کے بعد حصار کا اصلی دو منزلہ دروازہ تھا۔ . . . . . اور دروازہ کے قریب ایک چوکور مینار اونچا اونچا کھڑا تھا جسے خالد بن ولید

سے بہت پہلے رومیوں نے بنایا تھا۔ . . . .

میں ایسی سوچ میں تھا اور محو تھا۔ شاید میرے چہرے پر رنج والم کے بڑے گہرے آثار ہوں گے میں اپنے آنسوؤں کو ضبط کر رہا تھا لیکن اگر میری صورت پر غم کا غبار تھا تو یہ میری کوشش کے باوجود تھا۔ اور اس عالم میں اپنے تاتاری ساتھیوں کے قہقہے سے میں یکلخت چونک پڑا اور میں نے ہنسنے کی کوشش کی۔

میرے میزبان الحاج امیر سیف الدین نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا۔ اسنے کہا: میرے ساتھیو۔ ہمارا یہ مہمان نظام الدین شامی بڑا سخت جان ہے۔ جب میر صاحب قران نے بغداد فتح کیا تو یہ پہلا آدمی تھا جو فصیل سے اترا، اور اس نے جان کی امان پائی، لیکن جب امیر صاحب قران نے حلب کے حصار کا محاصرہ کیا تو یہ پھر حلب کے حصار میں محصور تھا۔"

اور اس کے بعد منگنی بوغلتے لکڑی کا چمچہ میری طرف بڑھا دیا" جو ضیافت کے دستر خوان کے اطراف گردش کر رہا تھا، میری باری آئی تو میں نے چمچہ بھر روغن اور بادام سے تربتر شوربہ پیا۔ اور چمچہ اپنے بائیں ہاتھ کی طرف بڑھا دیا۔

لیکن امیر سیف الدین پر سرور کا عالم طاری ہو رہا تھا۔ شام سے وہ کھائے کو میس کے جسکا وہ عادی تھا لبنان کے میووں کی بنی ہوئی فرنگی شراب پی رہا تھا جسے اس علاقے میں صلیبیوں نے رائج کر رکھا تھا، اور اُن پر خدائے تعالیٰ کا عذاب نازل ہو۔

امیر سیف الدین نے الف لیلے کے راویوں کے لہجے کی نقل کرتے ہوئے کہا" یا نظام الدین شامی۔ تم جو آج اسقدر ملول ہو اور محزون ہو، گویا عزرائیل تمہاری گردن پر سوار ہے، جیسے تمہارے کانوں میں صورِ اسرافیل پھونکا جا چکا ہے، تمہارے اس ملال میں ضرور کچھ نہ کچھ بھید ہے۔ ضرور یہ کسی حلبی دوشیزہ کا غم ہے۔ جو تمہارے سفید گنجے سر اور تمہاری حنائی داڑھی کو اپنی انگلیوں سے مروڑتی ہو گی . . . . . ." اور جب تاتاری ایک قہقہہ لگا چکے اور ایک نے میری پشت پر زور سے ایک ہاتھ جمایا۔ مزاحاً۔ تو امیر سیف الدین نے اُسی انداز سے کہا" نظام الدین ہمیں بھی اُس حسینہ، اُس مُہ وشینہ، اُس لیلے، اُس لعبتِ، اس مجبوبہ، اُس مطلوبہ، اس قتالِ عالم کا نام بتاؤ، تاکہ ہم اُسے تمہارے لئے حلب کی گلیوں سے ڈھونڈھ لائیں۔"

میں نے اپنے دل میں کہا: شاید اُس کا سر لیتے آؤ۔ سروں کے مینار سے۔"

اور اُس وقت مجھے خیال آیا، ایک داستان کا جو میں نے قاہرہ کی گلیوں میں سنی تھی۔ اس زمانے میں قاہرہ کے طعام خانوں میں الف لیلہ ولیلہ کی ہزار کہانیوں کا بڑا چرچا تھا، جن میں ایک سند باد جہازی کی کہانی تھی۔ جس نے سات سفر کئے، اور ہر سفر میں ایک نئے ملک میں گیا اور ایک نئی مصیبت سے دوچار ہوا، میں ابھی تک

اپنے ہی ملک میں تھا، مگر ایک پیر تسمہ پا کی ٹانگ تھی۔ کہ میری گردن کو جکڑے ہوئے تھی۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر زندہ رہنا ہے تو عقل کی تلوار کو تیز کر۔

تاتاریوں کے قہقہوں کی میں نے پروا نہیں کی۔ سب کی طرح میں نے اپنی انگلیاں گرم گرم چربی دار گوشت میں گاڑ دیں جو بادام اور پستوں، اور دوسری مغزیات میں دفن تھا جس سے لونگوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ اور میں نے امیر سیف الدین سے کہا۔

"خدا کی رحمت ہو امیر سیف الدین پر۔ میں نے ایسا لذیذ گوشتابہ اپنی عمر میں کبھی نہیں کھایا۔ اور یا امیر سیف الدین جس طرح آپ نے میری محبوبہ کی تعریف کی۔ اسے لیلیٰ اور لبنیٰ اور بثینہ سے تشبیہہ دی تو مجھے کچھ شک یہ ہوتا ہے کہ عنفوانِ شباب کے زمانے میں جب آپ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے تھے تو وہاں سے نجد بھی گئے اور مجنوں اور قیس عامری اور جمیل کی خلعت پہن لی کیونکہ آپ ماشاء اللہ سے زندہ دل نوجوان ہیں۔"

اب تاتاری ساتھیوں نے میرے ساتھ اپنے میزبان پر قہقہہ لگایا۔ اور الحاج امیر سیف الدین بھی خوش دلی سے ہنس پڑا۔

اور تب گفتگو کا موضوع بدلنے کے لئے میں نے کھنکھار کے کہا "یا امیر سیف الدین۔ اللہ تعالےٰ نے امیر صاحب قراں کے امیروں میں آپ کو کئی لحاظ سے ممتاز کیا ہے۔ وہ عزیز ہے اور اُس نے آپ کو عزت دی، وہ شکیل ہے اور اُس نے آپ کو وجیہہ شکل و صورت عطا کی۔ وہ عقیل ہے۔ اور اُس نے آپ کو فراست اور ذکاوت بخشی۔ اور کئی لحاظ سے اُس نے آپ کو فضیلت دی۔ آپ کو امیر صاحب قراں کے پہلے شاہزادے مرحوم جہانگیر کا ہم سبق ہم رکاب، ہم پیالہ، ہم نوالہ بنایا . . . . ."

میں نے دیکھا کہ جب میں نے جہانگیر کا ذکر کیا تو امیر سیف الدین نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اس کی آنکھوں سے مسخری کی جھلک رخصت ہو گئی۔ میں کہتا گیا۔

"آپ کو عزت بخشی، دولت بخشی، شجاعت بخشی، آج میں آپ کے دسترخوان پر آپ کا نمک کھا رہا ہوں اور خوش ہوں . . . . ."

امیر سیف الدین نے دفعتاً بات کاٹ کے مصنوعی عربی بلاغت کے ساتھ کہا "یا نظام الدین شامی یہ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ یہ سارا نمک خدائے ذوالجلال کا بنایا ہوا ہے جسے اُس نے کچھ ہمیں کھانے کے لئے عطا کیا، اور کچھ محبوبوں کے چہروں پہ تقسیم کر دیا تاکہ ہم اُن کی طرف اس طرح مائل ہوں جیسے اچھے کھانے کی طرف۔ اور میں اور آپ سب امیر صاحب قراں کے نمک خوار ہیں اور کسی کے نہیں۔"

"سچ ہے۔ سچ ہے" تاتاری مہمانوں نے کہا۔

میں نے کہا: "یا امیر سیف الدین یہ آپ کی بلند حوصلگی ہے۔ یہ شاہزادہ جہانگیر کے ساتھ کا اثر ہے کہ رحمتِ بران تربتِ پاک باد۔ یا امیر سیف الدین امیر صاحب قراں نے مجھے آپ کے سپرد فرمایا ہے کہ میں ایک ظفر نامہ کی صورت میں امیر صاحب قراں کی عالمگیر فتوحات کا حال لکھوں۔ اور آپ میری مدد کریں۔ ایک مسئلہ جو مجھے پریشان کر رہا ہے یہ ہے کہ امیر صاحب قراں اور امیر حسین میں اتنی محبت تھی، اتنی دوستی تھی، عزیزداری بھی پھر یہ کیا غضب ہوا۔ کس طرح منافرت بڑھی، کس طرح اس کا انجام جو ہونا تھا وہ ہوا۔ یا امیر سیف الدین کیا محض اتنی ہی بات تھی جسے شیخ سعدی شیرازی نے یوں بیان کیا ہے کہ دو سلطان در اقلیمے نہ گنجند؟"

میری طرح اور سب تاتاری سردار ہمہ تن گوش بن کے امیر سیف الدین کا جواب سننے لگے۔ اور امیر سیف الدین جو اس سے پہلے حجاز اور مصر اور شام اور عراق کی سرزمینوں سے گذر چکا تھا۔ اس وقت الف لیلۂ لیلہ کے سحر سے محفوظ نہیں تھا۔ کچھ شراب کے اثر سے، کچھ تصنع سے وہ معمولی سی بات بھی اس طرح بیان کرتا تھا گویا یہ ایک معمہ ہو۔ اور ہر تجربہ یوں ظاہر کرتا تھا گویا یہ کوئی عجوبہ ہو۔

"یا نظام الدین شامی۔ یا میرے رفیق بوغایان و بہادران۔ امیر حسین اور امیر تیمور صاحب قراں کی مخالفت کا قصہ اس زمانے کا ہے جب میں کم سن اور کم شعور تھا۔ لیکن جو کچھ میں نے دیکھا اور جو کچھ میں نے سنا ہے وہ ایسا ہے کہ سوئی کی نوک سے آنکھوں کے پپوٹوں کے اندر تحریر کیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

"یہ کہ اے فاضل و کامل مردِ شامی میں نے دیکھا ہے کہ اس سرائے فانی میں جب کوئی واقعہ ہونے والا ہوتا ہے تو وہ حکیم وہ خالق جس نے مجھے اور تجھے پیدا کیا ہے اس کا کوئی نہ کوئی سبب تصنیف کرتا ہے۔ اور یہی سبب تقدیر ہے۔ یاد ہے جب چغتائیوں سے لڑائی ہو رہی تھی تو تغلق تیمور کے انتقال کی خبر آئی اور الیاس خواجہ اوغلان کو اپنے باپ کا تخت سنبھالنے کے لئے ماوراء النہر سے مراجعت کرنی پڑی۔ نہ یہ واقعہ پیش آتا نہ اتنی آسانی سے اہلِ سمرقند چغتائیوں کے خلاف بغاوت کرتے۔ نہ امیر حسین کو اتنی آسانی سے ماوراء النہر پکے ہوئے پھل کی طرح مل جاتا۔ نہ اس میں اتنی لالچ ہوتی۔ نہ اس سے اور تیمور گورگاں سے مخالفت ہوتی۔ اور نہ وہ ہوتا جو ہوا۔ لیکن جو کچھ ہوا وہ اس قابل ہے کہ لوحِ دل پر عبرت کے قلم سے منقش کیا جائے۔"

"بے شک بے شک" اور میں نے نصرانی شراب کا ساغر الحاج امیر سیف الدین کی جانب بڑھا دیا۔

امیر سیف الدین نے اپنی پتلی سی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ شراب کا جام اٹھا کے سر ہلایا اور افسانوی انداز ترک کر کے کہا: "میں تمہیں بتاؤں امیر حسین کے زوال کا باعث کیا تھا۔ ایک محض ایک۔ لالچ۔ لالچ۔ لالچ۔ وہ شیخ سعدی کی فرمائی ہوئی بات غلط تھی کہ دو سلطان در اقلیمے نمی گنجند۔ یہ بات نہیں تھی۔ امیر تیمور کو سلطان حسین کا

تورا ہونا، چنگیزی ہونا، سلطان ہونا منظور تھا۔ قطعاً منظور تھا۔ وعدہ کرتا ہوں بالکل منظور تھا۔ لیکن سلطان حسین کی فطرت میں داد و دہش کو دخل نہیں تھا۔ دار و گیر کو دخل تھا، اور یہ ہم تاتاریوں، بربادوں، جلادوں کا عسکری نعرہ ہے۔ دار و گیر۔ دار و گیر۔ لوٹتے جاؤ۔ جمع کرتے جاؤ۔ جمع کرتے جاؤ۔ لوٹتے جاؤ۔ اور جب پرائے نہوں تو اپنے ہی

"اے مولانا نظام الدین شامی، آپ کے اس شہر حلب میں بڑے باصفا آئینے بنتے ہیں۔ لیکن جب آئینوں میں بال پڑ جائے، ذراسی بھی درز آجائے، تو صورت صاف نظر نہیں آتی۔ یہی حال دلوں کا ہوتا ہے انسانوں کے دلوں کا۔ اسی طرح دلوں میں کدورت در آتی ہے جس سے ایک دوسرے کی شکل صاف نظر نہیں آتی۔ اور یہی حال سلطان حسین اور امیر صاحب قراں کا ہوا"

اور پھر امیر سیف الدین نے مزاحیہ تصنع سے افسانہ خوانوں کی نقل شروع کی۔

"جب بہار کی فصل آئی، اور سمرقند کے باغوں میں لالوں کے تختے کھلے، جب اناروں کی ڈالیاں سرخ سرخ پھولوں سے لد گئیں، جب گلاسوں کے درخت سفید سفید اور گلابی گلابی پوشاکوں میں عروسوں کی طرح جگمگا اٹھے تو سبزوار کے سربداروں نے سمرقند میں سر اٹھایا۔ یہ سربدار بڑے سرپھرے لوگ ہوا کرتے تھے۔ اپنا نام ہی انہوں نے یہ رکھا تھا کہ ان کا سر گویا پھانسی پر لٹکا ہوا تھا۔ بڑے بگڑے دل لوگ تھے۔ مگر بڑے ظالم، بڑے سفاک۔ اور سمرقند میں تین سربدار تھے جنہوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی، چغتائیوں کی حکومت سے کم شہر آشوب نہ تھا۔ اور ان تین سربداروں کے نام میرے ان تاتاری مہمان سرداروں کو یاد ہوں گے۔ ایک تو مولانا زادہ سمرقندی تھا۔ یاد ہے اس کا ٹھنگنا سا قد تھا، اور چھوٹی چھوٹی چمک دار آنکھیں پھیلی ہوئی ناک۔ دوسرا مولانا خُردک بخاری تھا۔ اس کی داڑھی بڑی تھی، مگر قد مولانا زادہ سے بھی چھوٹا تھا، اور اسی لئے وہ خُردک کہلاتا تھا۔ کبھی کبھی اُسے خِردک بھی کہا کرتے تھے، کیونکہ عقل بھی اس کی ذرا چھوٹی ہی تھی۔ مگر جتنی بھی تھی شر ہی شر سے لبریز تھی۔ اور تیسرا ابوبکر مذاق تھا جس نے مذاقی چھوڑ کے سپہ سالاری شروع کی تھی۔ سمرقند کے کسی گھر کی آبرو ان تین مردکوں کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی۔ کسی کا مال و اسباب محفوظ نہ تھا۔ تاجروں نے چین سے فرنگ جانے کا راستہ بدل دیا تھا۔ اور سمرقند کے سید اور خواجے یہ کہتے تھے کہ ان سربدار قزاقوں سے تو الیاس خواجہ اوغلان اور بکی چوک کے چغتائی مغل ہزار درجے اچھے تھے۔

"سلطان حسین نے سمرقند کا رُخ کیا تو اہلِ سمرقند نے فصیل کے دروازے کھول دیئے۔ تینوں سربدار گرفتار ہوئے۔ خُردک بخاری کو بڑی اونچی سی پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ جہاں سے اُس کا چھوٹا سا قد اور لمبی سی داڑھی بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ ابوبکر مذاق کو شہر کے مذاقوں کے ہاتھ اتنا پٹوایا گیا کہ وہ قیمہ قیمہ ہو گیا۔ اور اُس کا قیمہ چیلوں اور گِدھوں کے حوالے کیا گیا۔ لیکن مولانا زادہ سمرقندی کی امیر تیمور صاحب قراں نے

سفارش فرمائی۔ کیوں؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔ اور نہ اس زمانے کے حالات مجھے ٹھیک ٹھیک یاد ہیں"
"لیکن مجھے یاد ہے کہ جہاں مصیبت نے سلطان حسین اور امیر تیمور کو رفیق بنا رکھا تھا، سلطنت اور امارت نے انہیں ایک دوسرے سے دور کرنا شروع کیا۔ جب سلطان حسین نے سرداروں کو گرفتار کیا تو ان کی دولت پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور اس کے بعد سرداروں کی یہ صفت سلطان حسین کی سیرت میں حلول کر گئی کہ دولت جس قدر ہو، جتنی ہو، کافی نہیں۔ سلطان حسین کی لالچ بڑھتی گئی۔ جن سرداروں نے اُن کے لئے سر کی بازی لگائی تھی، اُن سے متنفر ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ہم لوگوں کی باری آئی۔ مجھ سے کہا گیا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہو محصل کے حوالے کر دو۔ اسی طرح آق بوغا۔ ایلچی بہادر۔ دولت شاہ بہادر اور امیر تیمور گورگاں کے دوسرے جانباز سردار قید کر دئے گئے کہ اتنا اتنا محصول ادا کرو۔ میرے رفیق محصول میرے پاس کہاں سے آتا۔ آق بوغا اور ایلچی بہادر چغتائیوں کے ہاتھوں لُٹ چکے تھے۔ ہماری زمینیں کئی سال تک دشمنوں کے ہاتھ رہ چکی تھیں، ہمارے دہقانوں کے پاس بونے کے لئے بیج تک نہ تھے، ہمارے چرواہوں کے پاس مویشی تو کہاں مویشیوں کی کھال تک نہ تھی۔ اور اس پر جب ہم نے امیر صاحب قراں سے فریاد کی تو امیر تیمور نے سلطان حسین سے عرض کی کہ میرے امیروں کے پاس باقی کیا رہا ہے کہ وہ محصول ادا کریں۔ اُن کے پاس جو کچھ تھا وہ آپ پر نثار کر چکے یا چغتائیوں نے لوٹ لیا یا غارت کر دیا۔ اگر حکم ہو تو اُن کی طرف سے میں محصول ادا کر دوں۔

"اس پر بھی سلطان حسین نے محصول معاف نہ کیا۔ اور امیر تیمور کو ہماری طرف سے محصول ادا کرنا پڑا۔ اُن کے پاس بھی جمع خزانہ کہاں سے آتا۔ یا مولانا نظام الدّین جو میں عرض کرنے والا ہوں وہ حقیقت ہے، اور وہ حقیقت ایسی ہے کہ صحیفۂ دل پر بصیرت کی روشنائی سے تحریر کی جائے۔ امیر تیمور گورگاں نے ہم لوگوں کے ذمہ جو محصول تھا اُس کو ادا کرنے کے لئے اپنی بیوی آغائے معظمہ اولجائی ترکان آغا کا سارا زیور، سارا زر و جواہر، جملہ گوشوارہ و دستیارہ سلطان حسین کے نذر کر دیا۔ اور سلطان حسین جس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ اس کی اپنی بہن اولجائی ترکان آغا کا زیور و گوشوارہ ہے اس زیور کو لینے سے بھی انکار نہ کر سکا۔ اور اس واقعہ کے بعد اولجائی ترکان آغا کا دل ٹوٹ گیا۔ اور انہیں اپنے بھائی سے نفرت سی ہو گئی۔ سلطان حسین نے یہ نہ جانا کہ حرص اور دُون ہمتی اور سرداری اور بادشاہی ایک جگہ جمع نہیں ہوتے . . . ."

ایک لمحہ کے لئے امیر سیف الدّین نے دم لیا اور دونوں ہاتھوں سے نصرانی شراب کا ساغر اٹھایا۔ تس پر ہیں نے کہا۔

"حکیموں نے کہا ہے کہ کوئی مقام ایسا نہیں جہاں بخل ہو، اور حسرت اُس کے ساتھ ہم آغوش نہ ہونے پائے۔ اور کوئی دروازہ ایسا نہیں کہ طمع اُس سے ہو کے گذرے اور ذلّت و خواری جاگردوں کی طرح اُس کے

ساتھ ساتھ نہ جائیں "

تاتاری سرداروں نے خوش ہوکے سر ہلایا۔ اور امیر سیف الدین نے کہا: القصہ جتنا کچھ محصول امیر صاحب قراں ہم لوگوں کی طرف سے ادا کرسکتے تھے، ادا کیا۔ لیکن تین ہزار دینار پھر بھی باقی رہ گئے۔ اس رقم کے بدلے امیر تیمور نے اپنے خاصے کے گھوڑے پیش کئے۔ معلوم نہیں کہاں سے سلطان حسین کے دل میں عزتِ نفس کا شرارہ بھڑک اٹھا۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ گھوڑے امیر تیمور کو جان سے زیادہ عزیز ہیں۔ اُس نے یہ گھوڑے واپس کردیئے۔ اور کہا کہ میں سالی سرائے جاتا ہوں۔ مجھے زرِ نقد کی ضرورت ہے۔ جو تین ہزار دینار مجھے ادا کرنے ہیں وہ ادا کر کے میری مدد کرتا کہ میں یہ پیشگی زرِ مہر کی صورت میں خوارزم بھیجوں۔ کیونکہ سلطان حسین صوفی کے عزیزوں میں ایک چہاردہ سالہ دُخترِ نیک اختر ہے جس کا نام خوان زادہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ اُسے اپنے نکاح میں لاؤں۔

[اور درشاد آغا نے انہیں خوارزمیوں سے جنگ کے دوران میں اُسے اپنا گھوڑا دیا تھا اور اپنی جان ہلاکت میں ڈالی تھی]

" اس پر امیر صاحب قراں نے لبیں دیپش کی۔ اور عرض کی کہ مال جمع کرنے کی تو تدبیر کرتا ہوں لیکن آپ کی ہم رکابی سے جُدا نہ ہوں گا۔ آپ کے ساتھ سالی سرائے چلوں گا۔ کیونکہ جب کوئی رفیق اپنے سلطان کی نظروں سے دُور ہوتا ہے تو دشمنوں کو اس کی مجال ہوتی ہے کہ موقعہ پاکے جھوٹ کو سچ کا لباس پہنائیں، اور سلطان کا دِل اُس کے رفیق کی طرف سے پھیر دیں۔ اس کی مجھ میں طاقت نہیں۔ اور اگر مجھے ہم رکابی اور مصاحبت کی اجازت نہیں ملتی تو پھر یہ اجازت ہو کہ یہ چاکر خانۂ بیت اللہ کا ارادہ کرے۔ اور وہاں اپنے سارے گناہوں کی تلافی میں باقی عمر گزار دے۔ سلطان حسین نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ خود سالی سرائے کا رُخ کیا۔ اور شہرِ سبز کی سرداری کا پروانہ امیر تیمور گورگاں کے نام تحریر کیا۔ اور . . . . .

جرعہ جرعہ شراب پی کے الحاج امیر سیف الدین خاں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں نظام الدین شامی سے کہا۔

" اور . . . . . اور . . . . . امیر موسیٰ نے والی نخشب کو حکم دیا کہ بہ لطائف حیل امیر تیمور گورگاں کو اسیر کرے "

اور پھر ذرا سرُود کے انداز میں سر ہلا کے، قہقہہ لگا کے امیر سیف الدین نے نخشب کا ذکر چھیڑا۔
" چاہِ نخشب، ماہِ نخشب، شاہِ نخشب "

اس پر اس خاکسار ہیچ میرز نظام الدین شامی نے عرض کی "سبحان اللہ سبحان اللہ یا امیر سیف الدین آپ کی تلوار میں ذوالفقار کا سا جلال ہے، لیکن آپ کی زبان میں وہ فصاحت وہ شیرینی ہے کہ راویوں کا کمال اس کے آگے زوال آمادہ ہے۔ لیکن شرح اس اجمال کی، اور تفصیل اس حوال کی عنایت ہو تا کہ میں اسے قلبند کر سکوں۔

اور مجھ کمبخت نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا وہی لکھا جو امیر تیمور گورگاں چاہتا تھا کہ میں لکھوں]

بڑے پُراسرار انداز میں امیر سیف الدین نے اپنے ہونٹوں کو نصرانیوں کی انگوری شراب سے تر کیا اور اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر الحمدللہ کہا اور پھر یوں گویا ہوا۔

"بوغایان و بہادران۔ تم میں سے بہتوں نے نخشب کو دیکھا ہے۔ یہ وہی حصار ہے جسے ہم کم علم تورانی قرشی کہتے ہیں۔ اور جہاں ہمارے پرانے رفیق امیر موسیٰ نے ہم سے الگ راستہ اختیار کیا۔ جب ہم سب نے امیر تیمور گورگاں کی رفاقت کا عہد باندھا تو اُسنے بجائے نکلتے سورج کے ڈوبتے چاند سلطان حسین جلائر کا ساتھ دیا اور بوغایان وبہادران یاد ہے کہ بوڑھا امیر موسیٰ بڑا حُسن پرست تھا، اُس کا جیسا حرم شاید ہی تم میں سے کسی نے جمع کیا ہو۔ ختن کے غزال اور نجد کی لیلائیں، سُرخ بالوں والی تُغلبی مرتعائیں، نیلی آنکھوں والی یونانی کنیزیں سب اُس پیرِ مرد کے پاس جمع تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ حکیم جالینوس کی لکھی ہوئی کوئی قرابادین اُسے کہیں لوٹ میں مل گئی تھی۔ جس میں بڑی نادر نادر دواؤں اور حیرت انگیز اکسیروں اور طلاؤں کے نسخے تحریر تھے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ محض بوالہوس تھا حسینوں کو اپنے پنجرے میں بند دیکھ لیتا اور خوش ہو لیتا۔ لیکن بوڑھے شہباز کے پنجے میں طاقت نہیں تھی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

عبرت کی داستان یہ ہے کہ سلطان حسین کا خون سفید ہو گیا اور اُسنے سلطان موسیٰ کو حکم دیا کہ ملطائف الجمیل امیر گورگاں کو قید کرے۔ اور اُس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اے بوغایان دبہادران آپ سبکو معلوم ہے

اور اس پر بوغایان اور بہادروں نے سر ہلایا۔ "اں امیر سیف الدین"

"تمہیں یاد ہے کہ جب امیر موسیٰ کے دستے ہم پر جھپٹتے، ہم کوہ و دشت و دریا میں منتشر ہو جاتے اور پھر سمٹ کر اس طرح حملہ کرتے جیسے فاختاؤں کے گروہ پر شاہین۔ یہاں تک کہ امیر موسیٰ کو معلوم ہو گیا کہ کمند اُس کے نہیں امیر تیمور کے ہاتھ میں ہے اور جب گلا گھٹنے لگا تو وہ نخشب کی چار دیواری میں جا چھپا۔

"اور نخشب میں اس کا دم گھٹنے لگا"

امیر سیف الدین نے قہقہہ لگایا۔ میں نے عرض کی "یا امیر سیف الدین تفصیل اس اجمال کی مرحمت ہو"

جس پر امیر سیف الدین نے کہا۔

اُس سال گرمی سارے توران میں اس غضب کی تھی کہ شاید روئے زمین پر کبھی دیکھی گئی۔ یہ سُنی گئی عزرائیل علیہ السلام نے امیر حسین کے زوال کے لیے جہنم کے طبق زمین پر روشن کر دیئے تھے۔ جھاڑیوں میں تیتر بریاں ہو جاتے تھے۔ اڑتے ہوئے پرندے کباب بنکر گرتے تھے۔ اور نخشب پر تو خاص عذاب نازل تھا۔ امیر موسیٰ حصار میں محصور تھا۔ اُس کی حرم سرا میں اُسکے حرم کی نازنینیں محصور تھیں۔ ہر ایک کا گرمی سے بُرا حال تھا۔ سُرخ بالوں والی تقلبی مرتفائیں جو قپچاق کے مغرب کے دیاروں سے آئی تھیں، گرمی سے غش کھا جاتیں، ایک کا دماغ چل گیا، دوسری نے اپنی جان شیطان کے سپرد کی۔ نیلی آنکھوں والی یونانی کنیزیں دن بھر حوضوں میں ننگی ہوکے جا بیٹھتیں، تین خواجہ سرا اُن کو نظر بھر کر دیکھنے کے جرم میں قتل کئے گئے۔ ختن کے غزال گرمی سے بے حال تھے۔ نجد کی لیلاؤں کی زبانیں نکلی پڑتی تھیں۔ امیر موسیٰ ان کے قریب پھٹک نہ سکتا تھا۔ کیونکہ گرمی سے سب پسینے میں شرابور تھیں۔ اور پسینے کی عفونت عود اور عنبر اور عبیر اور مشک پر بھاری تھی۔ ایک چینی سوداگر جو فرنگ کو تیتے ریشم کا سامان لے جا رہا تھا ہمارے ہاتھ پڑا اور اُس نے نخشب کی گرمی کی یہ سرگذشت امیر صاحب قراں سے بیان کی۔ اور اُس پر امیر صاحب قراں نے اپنے خیمے میں ہم سب کو طلب کیا۔ مرحوم ایلچی بہادر کو، اور جاکو برلاس کو، مجھے اور معاذہ اور آق بوغا کو اور کہا۔ " یہ بڑا ستم ہے کہ ہم سخت جان سپاہی آمو دریا کی ٹھنڈی وادیوں، اور بدخشاں کے خُنک پہاڑوں کی ہوا کھائیں، اور ہمارے ڈرسے امیر موسیٰ کے حرم کی نازنین اور حسین عورتیں حرم سرا کی بند دیواروں میں جھلسیں۔ میرا ارادہ ہے کہ امیر موسیٰ اور اسکے حرم کی دلنشیں عورتوں کو حبشیوں کی ٹھنڈی وادیوں کی سیر کرائی جائے۔

" ہمیں جو کاروان ہرات سے آتے ملے، ہم نے ان کی خاطر مدارات کی۔ امیر گورگاں نے جتنا مال خریدا اس سے دُگنا انعام دیا۔ کاروان کے تاجروں کے سامنے ملک ہرات کے سفیروں کو باریاب کیا اور ہرات آنے کی دعوت قبول کی۔ تاجر بہت خوش تھے۔ اُن کے کاروان نے نخشب کا راستہ سنبھالا۔ اور ان کی نظروں کے سامنے ہم ہرات کے راستے پر ہو لئے۔ ہمارے گھوڑے مرغات کے کنارے کنارے دونوں طرف جنوب کی جانب بڑھنے لگے۔ اور کاروان کے تاجروں نے امیر موسیٰ کو جاکے یہی اطلاع دی کہ امیر تیمور گورگاں اور اُس کا لشکر ملک ہرات کی دعوت پر مرغات کے کنارے کنارے ہرات اور بامیان کی سمت گرمیاں گذارنے جا رہا ہے۔

بوقاؤں نے امیر تیمور کی فراست کی داد دی اور کہا " ماشاءاللہ "

امیر سیف الدین نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ خادموں کو دسترخوان بڑھانے کا اشارہ کیا، اور سب سے پہلے منہ میں انگلی ڈال کے دانت صاف کئے، کُلی کی، غرارہ کیا، اور ترکی رومال سے ہاتھ پونچھ کر یوں گویا ہوا۔

" جب آفتاب عالم تاب نے قزل قسم کی لال پہاڑیوں میں منہ چھپا لیا۔ تو ہم نے اپنے گھوڑوں کی راسیں کھینچیں اور ان کا رُخ موڑ دیا۔ ہمارے جاسوسوں نے آکے خبر دی کہ تاجروں نے جو دیکھا تھا امیر موسیٰ سے عرض کر دیا اور

امیر موسیٰ اپنے حرم کی سنہرے بالوں والی اور سرخ بالوں والی اور سیاہ بالوں والی۔ دو زلفوں والی، ایک زلف والی اور کئی زلفوں والی۔ غزالی چشم والی اور سیاہ پتلیوں والی اور نیلی آنکھوں والی چینی ناک والی اور یہودی ناک والی حسیناؤں کے جمِ غفیر کے ساتھ سردآب کے نخلستان میں عشرت کی داد دے رہا ہے نخلستان بہشت بن چکا ہے جہاں حوریں بجا اور تو قند کے قالینوں پر دراز ہیں اور دودھ اور شہد کی نہریں بہہ رہی ہیں جو مرد ہیں مخمور ہیں عورتیں اس ٹھنڈے چشمے کے قریب نخلستان اور بادیہ کی ٹھنڈی ہوا سے مسرور ہیں۔ قریب کے نخلستان میں امیر موسیٰ کے دوسرے ساتھی ہیں اور کاشی کے جھلتے ہوئے در و دیوار امیر صاحب قراں پر نثار ہونے کے انتظار میں سرِ راہ ہیں۔

"ہم نے تیزی سے یلغار کیا۔ امیر صاحب قراں کا قدم سب سے تیز تھا۔ انہوں نے جاکو برلاس کے ساتھ پُل کے سائے سائے چھپ کر خندق کو پار کیا۔ میرے خیال میں امیر صاحب قراں نے اس روز ذرا زیادہ کومیس پی لی تھی۔ سرور کے عالم میں انھوں نے دروازے پر دستک دی۔ لیکن امیر موسیٰ کا بیٹا، اور محصور دستہ یا تو گرمی سے بیہوش تھے، یا غفلت کی نیند سو رہے تھے۔ اُن کے سروں پر قضا کھیل رہی تھی۔ امیر صاحب قراں نے فصیل کا معائنہ کیا، رخنہ کے لئے مقامات کی نشان دہی کی اور دوبارہ خندق پار کی۔ اب کے جاکو برلاس، آق بوغا میں اور بہت سے جانثار ان کے ساتھ تھے۔ ہم نے کمندیں لگائیں، دیواروں پر چڑھ گئے۔ محصور دستے میں سے کچھ نیک بختوں نے اطاعت کے لئے گھٹنے ٹیک دیئے، اور اپنے میان سے تلواریں نکال کر امیر صاحب قراں کے قدموں پر ڈال دیں، جو کمبخت لڑے انہیں ہم نے تہہ تیغ کیا جو قلعہ میں مقابلے کے لئے جمع ہوئے ان پر ہم نے آتش نفط برسائی اور انھوں نے بھی اطاعت کرلی۔ ایک رات میں نخشب اس طرح ہمارے ہاتھ آیا جیسے کوئی کھیل کھیلتا ہے۔ امیر موسیٰ کے حرم کی کچھ معتوب عورتیں تھیں جنہیں وہ اپنے ساتھ سردآب کے نخلستان نہیں لے گیا تھا۔ امیر صاحب قراں نے ان عورتوں کو خواجہ سراؤں اور مجرب طلاؤں کی شیشیوں کے ساتھ امیر موسیٰ کے پاس اسی رات بھجوا دیا، اور اس طرح اُسے نخشب کے چھن جانے کا پتہ چلا۔ اور بہت جلد سلطان حسین کو بھی اس کا علم ہوگیا۔"

پھر الف لیلے کے افسانہ گو کے انداز میں امیر سیف الدین نے مجھے مخاطب کیا "اے پیرمرد شامی۔ یہ داستان عجیب ہے۔ لیکن سچ ہے۔ کیونکہ کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں جو افسانوں سے زیادہ عجیب ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں چاہِ نخشب اور ماہِ نخشب کا افسانہ افسانہ ہے اور یہ حقیقت ہے . . . . ."

میں نے عرض کی "یا امیر سیف الدین ایک تو امیر صاحب قراں کا زمانہ اور پھر آپ کا سحر بیان۔ اس کا لفظ لفظ میں کبھی نہ فراموش کروں گا۔"

لیکن داستان سرائی سے ابھی امیر سیف الدین کا جی نہیں بھرا تھا اُسنے دیبا کے گاؤ تکیہ کا سہارا لگا کے پاؤں پھیلا دیئے "لیکن واضح رہے اے مولانا نظام الدین شامی کہ مقنع کے ماہِ نخشب کا افسانہ روایت کے لحاظ سے

مگر دو سہی، آنکھوں دیکھی بات نہ سہی، لیکن دلچسپ ہے۔ ہمیں یاد ہے۔ اُسی رات کو جب ہم نے نخشب فتح کیا۔ امیر صاحب قراں کا جی چاہا کہ تازہ کومیس پی جائے، ہمارے پاس جو کومیس تھی وہ کئی دن پرانی تھی۔ میں نے امیر صاحب قراں سے عرض کی نخشب میں قراسرائے کی کومیس مشہور ہے، تاشقند تک اس کی شہرت ہے۔ اور امیر نے گھوڑے کو ایڑ لگا کے کہا چلو۔ ہمارے سپاہی شہر میں لوٹ کھسوٹ کر رہے تھے اور اس فتح کے بعد امیر کا وہی حال تھا جو اکثر ہوا کرتا ہے، جیسے کوئی شطرنج کی بازیاں جیتتے جیتتے اکتا جاتا ہے، اور لات مار کے بساط بکھیر دیتا ہے۔"

اور امیر سیف الدین نے قالین کے فرش پر اس طرح لات ماری گویا وہ کسی بساط کو بکھیر رہا ہے۔

پھر امیر سیف الدین نے کہا "سرائے میں بھی ہمارے سپاہی مسافروں کو لوٹ رہے تھے۔ امیر صاحبقراں کی للکار سُنتے ہمارے سپاہی تو کھسک کے نکل گئے۔ میں نے سرائے کے مالک کی کمر پر لات جمائی۔ وہ دُہرا ہو گیا۔ میں نے کہا امیر تیمور گورگاں کے لئے فرش بچھا۔ راویوں کو بُلا، تازہ کومیس قدحوں میں بھر بھر کے نکال چشم زدن میں اُس نے حکم کی تعمیل کی معلوم نہیں کہاں سے ایک اندھے راوی کو پکڑ لایا۔ مگر اُس کا طرز بیان بڑے غضب کا تھا۔ اور اس راوی نے امیر صاحب قراں کی فرمائش پر مقنّع کے ماہِ نخشب کا قصہ سنانا شروع کیا۔

اور امیر سیف الدین نے آنکھیں بند کر لیں، گویا وہ اندھے راوی کے ٹھیک ٹھیک الفاظ یاد کرنے اور دُہرانے کی کوشش کر رہا ہے، اور پھر اُس نے کہا "اُس بد ذات، بدگہر، بدنہاد، بے بصر راوی نے امیر صاحبقراں کو مخاطب کر کے حکایت یوں شروع کی تھی . . . . . .

"اے امیر تیمور صاحب قراں، اے سالارِ عساکر فاتحاں۔ پہلے حمد و ثنا اُس خدائے ذوالجلال کی جس نے مجھے قوتِ گویائی بخشی، بصارت سے محروم کیا، جس نے سکندر و چنگیز کو ظفر یابی بخشی اور بصیرت سے محروم کیا۔ اس روایت کی اصلیت اُسی پر روشن ہے، اس حکایت کی حقیقت اُسی پر ظاہر ہے۔ کیونکہ وہی علیم ہے، وہی حکیم ہے وہی خبیر ہے، وہی صاحب تدبیر ہے۔ اُسی نے دریا بہائے، پہاڑ اٹھائے، بادل برسائے، انسان بنائے۔ اُسی نے انسانوں سے کنویں کھدوائے۔ اور اے امیر صاحب قراں ایسا ہی ایک کنواں اس شہر نخشب میں بھی ہے جس کی روایت یہ راوی بیان کر رہا ہے، جس کی حکایت میں حکمت کا رمز ہے، جسے جو صاحب فہم ہے، خدا کرے سمجھے، جو ادراک سے محروم ہے خدا کرے نہ سمجھے۔

"اے امیر کارواں، امیر گورگاں کنویں کنویں کا بھید الگ ہے۔ چاہ چاہ کی بات اور ہے، ایک ہے چاہِ ذقن جس میں شاعر کا دل ڈوبتا ہے۔ ایک تھی چاہِ بابل جس میں ہاروت اور ماروت کو نظر بند کیا گیا، جو پہلے فرشتے تھے، ایک رنڈی کے فریب میں آ گئے، آنکھ کا دھوکا کھا گئے۔ اُس کے ہو بیٹھے، عقل سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اور

اُس رنڈی پر اُس کریم کو رحم آگیا، اُسے چمکتا ہوا ستارہ بنا دیا۔ اے میرے آقا چاہِ بابل چھوٹا کنواں ہے۔ کوئی کوئی کنواں سچا ہوتا ہے جیسے چاہِ کنعاں۔ اس میں اللہ کے پیاروں کی تربیت ہوتی ہے، ہدایت ہوتی ہے عجیب شیریں حکایت ہوتی ہے۔ چاہِ کنعاں سے ماہِ کنعاں یوسف کو پیغمبری ملی۔ چاہِ نخشب سے المقنع کا ماہِ نخشب طلوع ہوا، جو اے میرے آقا چھوٹے کنویں کا چھوٹا چاند تھا۔

اے میرے آقا یہ امامِ تلبیس، یہ شاگردِ ابلیس المقنع الکندی ننگِ عرب، شرمِ عجم اس شہرِ نخشب میں خدائی کا دعویدار تھا۔ خلق کو اُس کے دعوے پر اعتبار تھا۔ کیونکہ اس چاہِ باطل، اس چاہِ نخشب سے ہر اندھیری رات اُس کے اشلوکے سے ایک چاند طلوع ہوتا، اور آسمان پر بلند ہوتا جاتا، فضا بقعۂ نور ہو جاتی، چاندنی کا نور ظہور ہوتا۔ ارض سے سما تک سفید روشنی پھیلتی سب اس معجزے سے حیران تھے، دلوں میں ایمان ویران تھے۔ کوئی کہتا کہ یہ معجزہ ہے، جو صاحبِ ایمان ہوتا اپنے دل میں کہتا کہ یہ شعبدہ ہے، کوئی روایت کرتا کہ مقنع اصل میں بڑا ماہر کیمیاگر ہے، کیمیاگری سے ایک طبق روشن کو زمین اور آسمان کے درمیان معلق کرتا ہے، ساری دنیا کو اوہام میں مستغرق کرتا ہے۔ کوئی کہتا کہ یہ نظر بندی کا کھیل ہے، نظر کا دھوکا ہے۔ بصارت جھوٹی ہے، بصیرت سچی ہے۔

غرض مقنع کی شہرت دُور دُور پہنچی۔ اُس کے دربار میں تاجر آئے، شاعر آئے، سپاہی آئے، درباری آئے، سردار آئے، سربہ دار آئے۔ اے امیر باتدبیر ایک دن اُس کے دربار میں ایک حسین جوان آیا، تیغ سے تیر سے ترکش سے، خود سے، جوشن سے، زرہ سے آراستہ۔ بلند بالا، اُس کی پیشانی پر حوصلے کا ستارہ چمکتا تھا اُس کی آنکھوں میں شجاعت کا شرارہ دمکتا تھا۔ اُس کا نام توقلش تھا۔ وہ توقند کا رہنے والا تھا، لیکن سچ دیکھیں تو تورانیوں سے نرالا تھا۔ جب مقنع نے اُسے اپنے دربار میں دیکھا، اور اپنا معتقد پایا تو دل میں یہ خیال لایا۔ یہ ہے وہ نوجوان جو میری فوجوں کی سالاری کرے گا، یہ وفاداری سے میرے عساکر کی سرداری کر سکے گا، لیکن اس کی وفاداری مکمل ہونی چاہیئے۔ اور اُس نے سوچا کہ اُسے ایک ایسی نازنین طناز، محبوبۂ عشوہ ساز سے منسلک کیا جائے کہ پھر یہ نخشب کے دربار سے ہلنے نہ پائے۔

مقنع نے کہا اے نوجوان تو توقند کا رہنے والا ہے، نوجوان نے کہا ہاں، مقنع نے کہا تو نے اتنے سال خراسان میں گنوائے، نوجوان نے کہا ہاں۔ مقنع نے کہا پھر تو بغداد گیا جہاں چھوٹا خلیفہ رہتا ہے جس کا علَم سیاہ ہے، نوجوان نے کہا ہاں۔ مقنع نے کہا، پھر تو دمشق آیا، جہاں تو نے ایک نصرانی کنیز خریدی جس کا نام نائلہ تھا، اور تجھے اس کنیز سے عشق تھا۔ نوجوان نے حیران ہو کر کہا ہاں۔ مقنع نے کہا پھر تجھے لڑائی میں رومی سپاہی انطاکیہ کے قریب پکڑ کے لے گئے اور تو نے چار سال قسطنطنیہ میں گنوائے جو قیصر کا دیار ہے، اور جو دو سمندروں اور دو زمینوں کے درمیان آباد ہے، نوجوان توقلش نے حیران ہو کے کہا ہاں۔ تجھ پر میرا

سب عیاں روشن ہے۔

اُس وقت مقنّع کا جھوٹا چاند اِس شہر قرشی، اِس شہر عرغی، اِس شہر نخشب، اِس شہرِ منتخب پر چمک رہا تھا تو قلمش کی آنکھیں اُس کی ضو سے خیرہ تھیں، باطن کی نظریں تیرہ تھیں۔ مقنّع نے کہا مجھے سب معلوم ہے کیونکہ میں وہ روح ہوں جو زندہ ہے، میں قوّتِ تخلیق ہوں جو تابندہ ہے، یہ ارض و سما میرے ہیں، یہ مُرغ و سمک میرے ہیں۔ میں نے تجھے اور تجھ جیسوں کو پیدا کیا ہے۔ اس جسم میں، اور اس سے پہلے کے ہر جسم میں۔ میں نے تجھے جمادی، نباتی بنایا، میں نے تجھے حیوان انسان بنایا۔ میں نے تجھ کو اور نائلہ کو حبیب اور محبوب بنایا۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں آدم اور حوّا بنایا تھا، سلیمان اور بلقیس، ملکۂ سبا بنایا تھا، قیس و لیلیٰ بنایا تھا۔ میں نے تیرے امتحان کے لئے تجھے رومیوں کے ہاتھ قید کیا، پھر ایمان کی شمع تیرے دل میں جلائی اور بغداد، تبریز، ترشیز سے تجھے اپنی خدمت میں نخشب کھینچ بلایا۔ تیرے ہاتھ کو طاقت تیری تلوار کو تیزی بخشی تاکہ تو اُسے عربوں کے خدا عجمیوں کے خدا کے خلاف میری حمایت میں کھینچے۔ جا آج رات میں تیری نائلہ کو تیرے سپرد کر دوں گا۔

"اے امیر صاحب قراں یہ نصرانی کنیز نائلہ عجب نعمۂ جاں و پیکر تھی۔ اس کا وطن لبنان تھا، اس کی نظروں میں ایک طرح کا وجدان تھا۔ جب اس کا عاشق رومیوں کے ہاتھ اسیر ہوا، اُس سے دُور ہوا، جب کتابِ تقدیر میں یہ مذکور ہوا، تو یہ اُس کے عشق میں حیران و سرگرداں ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے سرشکِ خون جاری ہوا۔ اس پر ایک طرح کا جنون طاری ہوا، اس عالم میں یہ گھر سے باہر نکلی۔ ایک بردہ فروش نے اسے پھر سے اسیر کیا۔ اس کے جنون کا وہی عالم تھا، کیونکہ جنونِ عشق ہجر میں کم نہیں ہوتا، جنوں کا سلسلہ بے وصالِ محبوب برہم نہیں ہوتا۔ اے امیر اس بردہ فروش کے ساتھ وہ بیروت سے دمشق آئی۔ دمشق سے بغداد آئی، بغداد سے تبریز آئی، تبریز سے ترشیز آئی، ترشیز سے نخشب آئی۔ در نخشب میں مقنّع کے خواجہ سراؤں کو معلوم ہوا ایک ماہِ آسمانِ خوبی، ایک بدرِ سمائے محبوبی، ایک بتِ آفتاب طلعت، ایک لعبتِ تصویر صورت بازار میں بک رہی ہے، اور انہوں نے مقنّع سے عرض کی، اور مقنّع نے اُسکو خریدنے کا حکم دیا۔

"اے آقا جب مقنّع نے اُسے اپنے حضور میں بلایا تو چاہِ نخشب آسمان پر چمک رہا تھا۔ ارض و سما کا ذرہ ذرہ دمک رہا تھا۔ مقنّع کے چہرے پر نقاب تھی۔ یہ نقاب اُس کا دائمی حجاب تھی۔ کسی نے مقنّع کی صورت نہ دیکھی تھی وہ خدائی کا دعویدار تھا۔ کس کی مجال تھی کہ چہرۂ الوہیت بے نقاب دیکھے، اس جلوۂ باطل کو جو جلوۂ حق ہونے کا دعوے دار تھا بے حجاب دیکھے۔ کسی نے مقنّع کی صورت نہ دیکھی تھی۔ اُس کے چہرے پر ہمیشہ سفید سی نقاب پڑی رہتی۔ اور اُس کے پیروؤں کو اعتقاد تھا کہ جس دن مقنّع کے چہرے سے نقاب اٹھے گی، یہ دُنیا اس کے جلوۂ بے حجاب کی تاب نہ لائے گی۔ ساری خلق مر جائے گی، خاکستر ہو جائے گی۔

"جب یہ لبنانی کنیز نائلہ مقنع کے حضور میں آئی تو بہکی بہکی باتیں کرتی تھی۔ اپنے پرانے آقا، اپنے محبوب تو قلمش کو یاد کرتی تھی، روتی جاتی تھی، جان کھوتی جاتی تھی۔ تب اُس سے مقنع نے کہا: اے کنیز تو جانتی ہے تو کون ہے؟ تو عورت کا حسن ہے۔ میں نے تجھے پیدا کیا، تیرے محبوب تو قلمش کا عشق عشقِ مجازی ہے۔ جو ابتدا ہے، انتہا نہیں جو مرحلہ ہے مدعا نہیں، اے کنیز نائلہ ہوش میں آ۔ دیکھ میں نے یہ چاند بنایا جو اس چاہ سے نکلا ہے۔ اور جس سے آسمان جگمگا رہا ہے۔ دیکھ میں نے تجھے چاند جیسا حسن عطا کیا۔ تاکہ تو میرا عشق پہچانے اے کنیز، اے نائلہ کیا تجھے دمشق کے حکیموں نے، بیروت کے دیروں نے نہیں بتایا کہ عشقِ مجازی پہلی منزل ہے، اور عشقِ حقیقی آخری منزل۔ اور میں مقنع ہوں، خدائے خراسان جس کے نقاب کے پیچھے اُلوہیت کا جاہ و جلال ہے۔ اے کنیز اللہ تو عشقِ مجازی سے نجات پا میں نے تجھے نجات بخشی۔ اے کنیز اللہ، اور عشقِ حقیقی سے حیات پا۔ میں نے تجھے حیات بخشی۔

"اے امیر صاحب قراں کچھ جھوٹے چاند کی چمک تھی، کچھ جھوٹے لفظوں کی دمک۔ وہ کنیز اس جادو میں، اس طلسم، اس طلسمات، اس ظلمات میں پھنس گئی۔ اُس کا جنون جاتا رہا۔ اُسے ہوش آگیا: جو جنوں سے بدتر تھا۔ اُسنے مقنع کی صورت نہیں دیکھی تھی مگر وہ اس پر فریفتہ ہوگئی۔ اسنے نصرانی مذہب چھوڑا، اس امام تلبیس کے عشق کا دامن پکڑا۔ وہ اس کے عشق میں اس درجہ گرفتار ہوئی کہ جس کی نہ کوئی حد تھی نہ کوئی انتہا۔

"یہاں تک کہ مقنع کا دل اُس سے بھر گیا۔ مقنع کا جوش اتر گیا۔ نئے نئے بردہ فروش آئے، چین سے، فرنگ سے، روس سے نئی نئی کنیزیں لائے۔ کچھ کالی، کچھ پیلی، کچھ سفید۔ لیکن نائلہ اب بھی ضد کرتی کہ اس خدائے نخشب کی اصلی محبوبہ وہی ہے۔ وہی اُس کی مریم ہے، وہی اس کے عشق کے لئے حسن ہے، وہی اسکے جلال کا نسوانی جمال ہے۔ اور مقنع کا دل اس کی طرف سے سرد ہوتا جاتا۔

"اے امیر با تدبیر جب تو قلمش کی قسمت اُسے نخشب کھینچ لائی، تو مقنع جو اُس کا قصہ پہلے ہی نائلہ کی زبانی سن چکا تھا، جو پہلے ہی تدبیر کا جال بُن چکا تھا۔ چاہتا تھا کہ سانپ مرے اور لاٹھی نہ ٹوٹے۔ نائلہ سے نجات ملے، اور تو قلمش اُس کے ذریعے بندھا رہے، ملنے نہ پائے، جانے نہ پائے، اُس کی خدمت میں جان گنوائے۔

"مقنع نے سرِ شام نائلہ کو طلب کیا۔ کہا کنیزک سن۔ سن اور کہنا مان۔ ہم نے اپنی قدرت سے تیرے محبوب کو مدعیوں کے چنگل سے چھڑایا ہے، ہم نے تو قلمش کو اپنے قدموں میں جانثاری کے لئے نخشب بلایا ہے۔ یہ ہماری مرضی ہے، یہ ہماری مشیت ہے، یہ ہمارا حکم ہے یہ ہماری حکمت ہے۔ یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ ہم آج سے تجھے پھر اُس کے سپرد کرتے ہیں۔

کنیزک یہ سُنکر دم بخود ہوئی۔ اس کا رنگ زرد ہوا، اس کی نبض سرد ہوئی۔ اُسنے عرض کی اے خداوند،

اے ماہِ نخشب کے خالق، اے چاہِ نخشب کے مالک۔ تو نے مجھے عشقِ مجازی کے بحران سے، عشقِ مجازی کے بحران سے نجات دلائی۔ تو نے مجھے عشقِ حقیقی میں قبول۔ میں نے تیرے جمالِ نقاب پوش سے عشق کیا، عقد کیا۔ اب یہ رجعت کیسے ممکن ہے؟ عشقِ حقیقی کے بعد تو عشقِ مجازی کی منزل نہیں آتی۔ یہ مراجعت کیسے ممکن ہے!

"قصہ مختصر اے امیر صاحب قراں جوں جوں مقنع اُسے سمجھاتا وہ اور بضد ہوتی جاتی، روتی جاتی۔ وہ کسی طرح اپنے پرانے محبوب کی طرف مائل نہ ہوتی۔ عشقِ مجازی کی سائل نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ مقنع نے اُس سے کہا۔ اے کنیزک بے خرد یہ راستہ جو میں نے تجویز کیا ہے میری مصلحت ہے۔ میں تجھے اپنے اور اس نوجوان تو قدمش کے درمیان واسطہ بنانا چاہتا ہوں، کیونکہ میں اسے اپنے لشکر کا سردار بنانا چاہتا ہوں۔ اس پر وہ کنیز نائلہ ازلیس کہ عورت تھی محبت کرنے لگی اے خداوند تیرا کام رحمت ہے، زحمت نہیں۔ تجھے لشکر کی کیا ضرورت۔ تجھے جنگ حرب کیا واسطہ۔ تیرا کام تو معجزوں کا ظہور ہے، تو اور سورج اور چاند بنا، اور مجھ سے محبت کرتا رہ۔ اُس کنیزک نے اُسے طعنہ دیا کہ تو کیسا خدا ہے جو انسانوں کی طرح لشکر فراہم کرنا چاہتا ہے، اپنی نقاب اٹھا اور دنیا کو درہم برہم کر دے۔

"اس پر مقنع کو طیش آ گیا۔ اور اُس نے اپنی نقاب کھینچ کر اتار دی۔ کنیزک نائلہ چیخ مار کر پرے ہٹ گئی۔ کیونکہ اے امیر صاحب قراں، اے سالارِ عساکر فاتحان مقنع کا چہرہ ابلیس کا غولِ بیابانی کا بھیانک چہرہ تھا، اس کی ناک پر ایک بڑا سا سوراخ تھا، جس سے حلق تک کا گوشت صاف نظر آتا، اس کے ہونٹ گردوں کے برابر موٹے تھے، اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔

"طیش کے عالم میں مقنع نے کنیز نائلہ کے بال کھینچے، اور اُس کی صورت اپنے گھناؤنے چہرے سے قریب کی۔ اُس نے کہا دیکھ کنیزک دیکھ۔ یہ صورت خدا کی نہیں شیطان کی ہے۔ تیرے خدا نے، بغدادیوں کے خدا نے میری صورت کیسی بنائی، اور اس لئے میں نے اُس سے بغاوت کی۔ میں نے خدائی کا دعویٰ کیا۔ میں نے غولِ بیابانی کے ہاتھ روح بیچی، میں نے سحر سیکھا، میں نے جادو کیا، میں نے کیمیاگری کی، تاکہ میں اُس کے خلاف بغاوت کروں، لشکر جمع کروں اور اُس کی مخلوق کو قتل کروں، غارت کروں، تباہ کروں، تاراج کروں..... میں اُس سے اپنی بدصورتی کا بدلہ لوں.....؟

یہاں تک راوی کا بیان سنتے سنتے امیر سیف الدین نے یکلخت کہا۔ وہ بدنہاد، بدگہر راوی یہ کہتا جاتا تھا، اور اپنے دونوں ہاتھ آگے پھینکتا جاتا تھا۔ گویا وہ امیر صاحب قراں کی اُس ٹانگ کی طرف اشارہ کر رہا تھا جو سجستانیوں سے جنگ میں خدنگ جستہ میں بسمل ہوئی تھی..... میرا ہاتھ تلوار کے قبضے

پر پڑا۔ مگر امیر صاحبقراں نے مجھے اشارے سے روک دیا کہ راویوں کو قتل نہیں کرتے ۔۔۔۔۔

نصرانی شراب کا ایک اور جام خالی کر کے امیر سیف الدین نے نخشب کے راوی کی حکایت پھر یوں شروع کی:۔

"القصہ اے امیر صاحب قراں غصہ میں مقنع وہ سب کچھ بیان کر گیا، وہ ساری حقیقت عیاں کر گیا، جو اُسے پوشیدہ رکھنی چاہئے تھی۔ نائلہ نے کپڑے بدلے، سنگھار کیا، اور دیبا و اطلس کے ایک شامیانے میں پھولوں کی سیج پر تو قلمش کا انتظار کرنے لگی۔

"جب تو قلمش دیوانہ وار اُس کی طرف بڑھا، بے قرار اُس کی طرف بڑھا، تو اُس نے اپنا نقاب اُلٹ دیا۔ تو قلمش نے دیکھا کہ اُس کے ابرو نڈھال ہیں، اُس کے شانے بے حال ہیں۔ اُس کا رنگ زرد ہے، اُس کی سانس سرد ہے۔ گویا وہ اُس کی نائلہ نہیں کوئی اور ہے۔ بس کوئی اور کچھ عجیب ہی طریق، عجیب و غریب طور ہے۔

"اس نے نائلہ کو پیار کیا تو اُس کے ہونٹ ٹھنڈے تھے، اُس نے اُس کی نبض ٹٹولی تو نبض سُست تھی۔ اُس نے کہا "اے نائلہ خدائے نخشب نے ہمیں اکٹھا کیا لیکن تیرے دل میں میری محبت مر چکی ہے۔"

"نائلہ نے تڑپ کر کہا، پیچ و تاب کھا کے کہا "نہیں اے میری جان، اے میرے محبوب مجازی، اے میرے واحد محبوب یہ بات نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے تیرے سوا کسی سے محبت نہیں کی کسی سے الفت نہیں کی۔ مگر میں تجھے اُسی محبت کی سوگند دیتی ہوں کہ بھاگ یہاں سے بھاگ۔ مقنع کی نقاب کے پیچھے خدا نہیں، ایک جھوٹا اژدہ ہے۔ جو خلق خدا کا خون پینا چاہتا ہے، بھاگ۔ اور سچے خدا کے ملک کو سدھار۔ نخشب کا خدا جھوٹا ہے۔" اور پھر نائلہ نے مقنع کی اصلی شکل و صورت تو قلمش سے بیان کی، ساری بات بتائی۔ ساری حقیقت سنائی۔

"اے امیر صاحب قراں، جب امیر المومنین مہدی العباسی خلیفۂ بغداد نے نخشب کا محاصرہ کیا جب ماہ نخشب تمام ہوا۔ اور چاہ نخشب سے نکل نہ سکا۔ تو خلیفہ کا سپہ سالار یہی تو قلمش تھا۔ جب تو قلمش نے نخشب کے حصار میں رخنہ کیا، اور اندر گھس آیا تو اس نے ایک نقاب پوش پیکر دیکھا۔ جانا کہ یہی مقنع ہے، یہی ساحر نخشب ہے، یہی جادوگر نخشب ہے، یہی کیمیا گر ہے، یہی انسانوں کی جان اور ایمان کا دشمن ہے اُس نے کمان کڑکی کی تیر چلایا، اور نقاب پوش پیکر زمین پر گرا۔ تو قلمش نے جھپٹ کر اُس کی نقاب اتاری۔ یہ مقنع نہ تھا۔ یہ اس کی اپنی کنیز تھی، اپنی مطلوبہ، اپنی محبوبہ تھی۔ یہ اُس کی نائلہ تھی۔

"اے امیر۔ تو قلمش نے اپنے بال نوچے، اپنی زرہ اُتار پھینکی اور بین کرنا شروع کیا کہ ہائے یہ میں

نے کیا کیا۔

نائلہ نے اس سے کہا: "اے میرے مطلوب سُن، اے میرے محبوب سُن۔ حُسن جب ظالم کے قبضے میں آتا ہے، تو حُسن نہیں رہتا۔ عاشق کے کام کا نہیں رہتا۔ . . . . . . . . جہاں ظلم ہے وہاں جمال جمال نہیں، کمال کمال نہیں، وصال وصال نہیں۔ اس لئے اے محبوب میں جو ہمیشہ تیری ہوں، تیری نہیں ہوسکتی۔ لیکن تیرے ہاتھوں مرنے میں جو لذت ہے وہ تیرے ساتھ زندگی بسر کرنے میں نہیں۔"

"اور جب امیرالمومنین مہدی نے اس مجبور عاشق، اور اس مجروح معشوق کو دیکھا، تو اے امیر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اسنے پوچھا: "اے کنیزِ باوفا یہ بتا کہ مقنّع کہاں گیا۔"

"کنیز نے کہا: "اے امیرالمومنین ماہِ نخشب میں تیزاب بھرا تھا۔ اسی تیزاب کا ایک گولہ چاند بنکر ہر شام طلوع ہوتا تھا۔ جب نخشب کا حصار ٹوٹا تو مقنّع بھی تیزاب کے کنویں میں کود کر ڈوب گیا۔ اُس کی ہڈی ہڈی گل گئی ہوگی۔ . . . . . . اے مہدی دین پناہ، دجّال جو سارے عالم کے لئے وبال ہوتا ہے۔ اُس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ رہ گیا میرا محبوب تو قلمش تو یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔ اپنا اپنا نصیب ہے۔ کسی کا نصیب رنج گنج شایگاں کسی کا نصیب گنج رنج رائیگاں . . . . . ."

راوی کی بے بصر آنکھوں نے پھر امیر صاحب قرآں کی طرف اس طرح دیکھا گویا وہ خدانخواستہ، خدانخواستہ مقنّع کو اُن سے تشبیہہ دے رہا ہے۔ میرا ہاتھ پھر تلوار کے قبضے پر پہنچا۔ امیر صاحب قراں نے مجھے پھر اشارے سے روکا کہ اتنے میں ایک سیاہ پوش سوار، گردسے اٹا ہوا، گھوڑے سے اُترا، اور سر بسجدہ ہو کے عرض کرنے لگا۔

"میں شہرِ سبز سے ایک منحوس خبر لایا ہوں، اگر جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں۔"

ہم سب کا دل بیٹھنے لگا۔ امیر گورگاں نے اجازت دی۔ اور قاصد نے اپنا عمامہ اتار کے امیر کے قدموں پر ڈال دیا، اپنے بال نوچے اور عرض کی۔

"شہرِ سبز میں اولجائی تُرکان آغا بیمار تھی . . . . . اُس کا انتقال ہوگیا۔"

امیر تیمور پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ بدبہاد راوی بول اٹھا: "اپنا اپنا نصیب۔ کسی کا نصیب رنج گنج شایگاں کسی کا نصیب گنج رنج رائیگاں۔"

## ۶

آج فتح حلب سے بہت پہلے . . . . .

لیکن الیاس خواجہ اور غلان کی یورش کے بہت بعد، حاجی برلاس اور بایزید جلائر کی موت کے بعد، اُس نخلستان میں سلطان حسین اور دلشاد آغا سے اچانک ملاقات کے بعد، خوارزمیوں کی غداری اور تعاقب کے بعد، علی بیگ کی قید کے بعد، ویران اندھے کنویں میں اولجائی ترکان آغا کے اتارے جانے کے بعد، خدنگ جستہ سے لنگ آنے کے بعد، قرشی کی لڑائی اور فتح کے بعد....... اور ماوراءالنہر کے افسانہ کے صدیوں بعد، اولجائی ترکان آغا کی موت کے بعد......

ویران مینار کی سیڑھیوں پر جس شکست خوردہ تاجدار کو انجام کا انتظار تھا، وہ اسیر تھا۔ اور رات کے آخری تارے گن رہا تھا۔ آج کی رات ساری جھلملاتے تاروں کی چھاؤں میں نہیں گذاری تھی۔ اور آج وہ المالیک سے سمرقند تک تنہا سفر نہیں کر رہا تھا۔ اردو میں اُس کا پستہ قد ٹٹو اطمینان سے اس کے خیمے کے پاس بندھا بھیگا ہوا چنا کھا رہا تھا۔ اولجائی ترکان آغا، دور شہر سبز میں، آق سرائے کے ہرے بھرے باغ میں صنوبروں کے گھنے سائے میں زمین کے نیچے آرام کی دائمی نیند سو رہی تھی۔ آج ڈوبتی ہوئی رات کو چیر چیر کر آنے والے دن کی آوازیں پھیلتی جا رہی تھیں۔ کتوں کے بھونکنے اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ یاد کی بساط پر پٹے ہوئے مہروں کی بازی ختم ہو چکی تھی، اور اب صرف ایک سوال تھا جس کا جواب دینا تھا۔ قاضی زین الدین کا سوال۔ جبر یا عدل۔ جبر یا عدل۔

کیونکہ پٹے ہوئے مہروں نے گواہی دی تھی کہ سلطان حسین اُس کا رفیق بھی تھا۔ عزیز بھی تھا۔ دونوں نے ساتھ مل کے مغلوں کا مقابلہ کیا۔ سلطان حسین جو جلائر تھا، تاجدار تھا، اب تاج چھوڑ کر خانہ کعبہ ہجرت کے لئے جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا یقین تھا کہ پھر یورش کرے گا۔ پھر غداری ہوگی۔ پھر حقیر اور بیچارہ دشمن خروج کرے گا.........

یہاں تک تو عقل نے راستہ دکھایا۔ اور اس کے بعد تیمور نے قالین پر لیٹے لیٹے گاؤ تکیہ کے سہارے اپنی لنگڑی ٹانگ پھیلائی۔

اس جنگل میں کوئی کسی کا بھائی نہیں تھا۔ کوئی کسی کا عزیز نہیں تھا۔ کیا کہا تھا قاضی زین الدین نے کہ عدل میں سازش کا مقام نہیں.......

تیمور کی پیشانی کی تینوں لکیریں گہری ہوئیں۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ بے آواز قہقہہ لگایا اور نقیب کو حکم دیا کہ بلخ کے امیر کیخسرو کو اُس کے خیمے سے جگا کے بلا لائے۔

اور اس سے تیمور نے کہا: "میں تمہیں کوئی حکم نہیں دیتا۔ نہ قصاص کا نہ خوں بہا کا۔ میں اس مقدمہ کا کوئی تصفیہ نہ کروں گا۔ اس کا تصفیہ میرا نہیں تمہارا معاملہ ہے...."

امیر تیمور کی آنکھ میں ایک چھوٹی سی چمک پیدا ہوئی۔ جسے دیکھ کر کیخسرو کی دونوں آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے امیر کے لبادۂ شب خوابی کا دامن چوما، اور پھرتی سے خیمے کے باہر نکل گیا۔

بابا زین الدین نے تہجد کی نماز سے منہ پھیرا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ یہ کیخسرو تھا جو تیزی سے تیمور کے خیمے کی طرف جا رہا تھا، اُس کے ہاتھ میں کسی کا کٹا ہوا سر تھا۔ وہ اسے اس طرح اٹھائے ہوئے تھا کہ داڑھی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اس بے حرمتی سے تو کٹے ہوئے دُنبے کا سر کوئی قصائی بھی نہیں اٹھاتا۔ قاضی زین الدین نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ ——— اور خدا سے ساری دُنیا کے لئے دعا مانگی۔ اُن شہروں کے لئے جنہیں اب تک مسمار نہیں کیا گیا تھا، اُن شہریوں کے لئے جن کا قتلِ عام نہیں ہوا تھا۔ اُن عورتوں کے لئے جن کی عصمت دُنیا بھر کے مکانوں میں محفوظ تھی، ان بچوں کے لئے جو یتیم نہیں ہوئے تھے، اور غلام نہیں بنے تھے۔ اور جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو کوئی اُس کے دل سے چپکے چپکے کہہ رہا تھا۔ یہ سب بیکار ہے' یہ سب بیکار ہے۔

کیونکہ وہ دونوں آنکھیں آہن پوش ہو چکی ہیں۔

---

# حدِّ فاصل

بلونت سنگھ

# میں

میں یوں تو یو۔پی کا رہنے والا ہوں یا یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ میرے آبا و اجداد یو۔پی کے رہنے والے تھے میں بچہ ہی تھا جب میرے والدین امرتسر میں آکر آباد ہو گئے۔ زمانہ گزر گیا میرے والدین اللہ کو پیارے ہو چکے اور میں اللہ کو پیارا ہونے کو ہوں۔ کیونکہ میری عمر اسّی کے لگ بھگ ہے۔ دھیان کیجئے پچھلی صدی کی پیداوار ہوں، ۱۹۴۷ء آن پہنچا ہے۔

میری والدہ تو کابل والوں سے ناطہ جوڑا کرتی تھیں شاید اسی رعایت سے میرے والد خشک میوہ جات کا کاروبار کرتے تھے۔ انھوں نے خوب روپیہ کمایا، جائداد پیدا کی۔ مجھے تعلیم دلائی۔ اتفاق سے مجھے پڑھنے لکھنے سے دلی لگاؤ تھا والدین نے کبھی دخل نہیں دیا چنانچہ میں نے اعلےٰ تعلیم پائی۔ گورنمنٹ کی ملازمت اختیار کی اللہ اپنی دو بیٹیوں کی شادیاں کرکے انھیں اپنے اپنے گھر بسایا۔ ایک لڑکا ہے وہ سرکاری ملازمت کرتا ہے . . . .
اور میں، اپنے آبائی مکان میں اپنی چھوٹی بیوہ بہن کے ساتھ رہتا ہوں۔ وہ بھی کافی ضعیف ہے۔ مجھ سے آٹھ ہی برس چھوٹی ہوگی۔

یہ سب تفصیلات بے کیف ہیں، اور کسی حد تک غیر ضروری بھی۔ اسی لئے میں نے اس قدر اختصار سے کام لیا ہے نیز دیگر رشتے داروں کے نام گنوانے سے احتراز کیا ہے۔

ہمارے مکان میں ایک ہی خوبی ہے جو مجھے پسند ہے یعنی اس کی کشادگی! محلہ ایسا کہ مکان ایک دوسرے میں بری طرح سٹے ہوئے ہیں۔ ہمارا وسیع مکان بھی متعدد گھروں سے سٹا ہوا ہے لیکن ان کا دور تو باہر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اندر بس ہم ہیں اور ہمارا مکان۔ میرے والد صاحب نے اسے چالیس برس پہلے بنوایا تھا اکثر کہا کرتے تھے کہ جب مکان بنواؤں گا تو ایسا کہ نوابوں کے محل رشک کریں۔ ہمارے مکان تک پہنچ کر گلی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لئے ہمارے مکان کے ایک جانب تو گلی ہے اور دوسری جانب کھلا میدان۔ جہاں جا بجا کوڑے کرکٹ کے

ڈھیر تو ضرور نظر آتے ہیں لیکن پھر بھی میدان تو ہے۔ شہر کے کچھ لڑکے وہاں کرکٹ، فٹ بال یا ہاکی وغیرہ کھیلنے کو جمع ہو جاتے ہیں۔ اور آگے پانی کا جوہڑ ہے۔ اور بھی پرے سکھ بھائیوں کا چھوٹا سا گوردوارہ ہے۔

ہمارے صحن میں گائے بندھی رہتی ہے جس کی ساری خدمت میں خود کرتا ہوں۔ جانور کی نگہداشت ایک انسان سے بھی زیادہ کرنی پڑتی ہے۔ مجھے اس کام سے دلچسپی بھی ہے ایک تو میری ورزش ہو جاتی ہے۔ آخر اس بڑھاپے میں ڈنڈ پیلنے سے تو رہا۔ البتہ دودھ دینے والی بے زبان گائے کی نگہداشت کرنے میں جسمانی فائدے کے علاوہ دل کو بھی اطمینان سا ہوتا ہے۔ ہمارے صحن میں خاصی رونق رہتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں گوشوں پر دو کنویں بنے ہوئے ہیں۔ ایک ہندو کا اور ایک مسلمان کا۔ یہ تقسیم ایک پڑھے لکھے انسان کو بے ہودہ سی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں بظاہر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ بس اس کی حیثیت ایک رواج کی سی ہے۔ بے ضرر رواج۔ لطف یہ ہے کہ دونوں کنویں ایک مسلمان کے بنوائے ہوئے ہیں۔ یعنی میرے والد صاحب کے۔ سب انہیں سائیں دے کھوہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو مسلمانوں کو پانی کے معاملے میں پرہیز نہیں ہے۔ جب مسلمان کنویں پر بھیڑ ہوتی ہے تو مسلمان ہندو کنویں کا پانی بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ گو وہ کنویں پر نہیں چڑھتے، کوئی ہندو ہی پانی ڈال دیتا ہے۔ مسلمان ہندو کی الگ پانی والی ضد پر پیار سے صاد کر دیتے ہیں۔ سکھ بھی ہندو کنویں کا پانی پیتے ہیں۔ تو کیا ہوا یہ بھی داڑھی دار ہندو ہی تو ہیں۔ آپ ان کنوؤں کی رونق کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں۔ ان چاروں طرف سے ڈھکے ہوئے کنوؤں کا پانی بہت صاف ستھرا اور میٹھا ہوتا ہے۔ عورتیں، بچے جوان سب یہاں پر جمع ہوتے ہیں۔ کنوؤں کے آہنی چرخڑوں کی آواز ہوتی تو بے ہنگم ہے لیکن پھر بھی فضا مترنم سی ہو جاتی ہے۔ وہاں پر جو شور و غوغا اٹھتا ہے وہ بھی بے تکا ہی لیکن انسان ان بے ضرر آوازوں سے دُور رہ کر بھی تو پریشان ہو جاتا ہے۔

یہاں سب لوگ مجھے سائیں جی کہتے ہیں حالانکہ میں گنڈے تعویز نہیں مانتا۔ لیکن وہ مجھے احترام کے مارے اس نام سے پکارتے ہیں۔ میرا لباس بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ ململ کا کرتا، سبز یا نیلے رنگ کا تہبند۔ پاؤں میں چپل، ہاتھ میں لمبا موٹا ڈنڈا۔

شاید آپ سوچیں کہ شامِ زندگی کے دھندلکے میں ایک انسان کے لئے اس دُنیا میں کیا رہ جاتا ہے ...... لیکن ذاتی طور پر میں زندگی کے اس دور کے ایک ایک لمحہ سے لطف اندوز ہوتا ہوں ایک ایک ذرّے کو زندگی کا جو سمجھ کر اس کے مزے لُوٹتا ہوں۔ درست ہے کہ اب وہ شباب کی سی تیزی نہیں۔ حسین صورتوں کو دیکھ دل اچھل اچھل نہیں پڑتا۔ مزاج میں وہ تندی نہیں جو فلک بوس پہاڑوں سے ٹکر لینے پر اکسائے لیکن وہ نرمی ضرور ہے جو قدرت کے ہر آن بدلتے ہوئے ہر رنگ کو چوم

چوم لیتی ہے۔ بڑھاپے میں، اگر انسان مریض بنکر نہ رہ جائے تو دماغ جوانی کے جوش و جنون اور جسم شباب کی تیزی و طراری سے محروم ہو کر عجیب ہلکے پن کا احساس کرتے ہیں۔ میرا تجربہ یہی ہے کہ ایک سنبھلا ہوا بڑھاپا بعض لحاظ سے جوانی پر فوقیت رکھتا ہے۔

میں اپنی عمر کے اعتبار سے خاصہ تندرست ہوں۔ میری بازوؤں میں وہ طاقت اور دماغ میں وہ جودت نہیں ہے لیکن زندگی کسی لحاظ سے بھی ناقابلِ برداشت نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ میں اب اداکار سے زیادہ تماشائی ہوں، لیکن فی الحقیقت تماشائی ہونا بھی اتنا بُرا تو نہیں ہے۔

میں چھوٹے موٹے کام کاج میں لگا رہتا ہوں۔ کبھی تصنیف و تالیف کا شوق تھا اب صرف پڑھتا ہوں لکھتا ہوں تو محض خطوط۔ رشتہ داروں کو ہی نہیں بلکہ اپنے دوستوں کو بھی۔ رشتہ داروں کو تو رسمی خطوط لکھنے ہوتے ہیں لیکن دوستوں کو خطوط لکھنے میں مجھے خاص طور سے بہت مزہ ملتا ہے۔

اوپر کی منزل کا ایک کمرہ میں نے اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے۔ اس کی دو کھڑکیاں گلی کی جانب کھلتی ہیں اور دو مکان کے پچھواڑے والے میدان کی طرف۔ اگر مجھے میدان کے مناظر سے لطف اندوز ہونا ہوتا ہے تو میں بازو والی اونچی کرسی پر تکیوں کے سہارے نیم دراز ہو کر ٹانگیں کھڑی کر پاؤں کھڑکی میں ٹکا دیتا ہوں۔ اور اگر مجھے گلی کی ہنگامہ آرائیوں کا مزہ لینا ہو تو میں ایک نیچی سی کھڑکی کے قریب ایک دبی دبی سے طویل آرام کرسی پر دراز ہو جاتا ہوں۔ اکثر آنکھیں موندے رہتا ہوں کیونکہ گلی کے ہر مکان، ہر موڑ، ہر اینٹ غرض ہر منظر سے بخوبی واقف ہوں۔ سب مرد، عورتوں، بچوں بوڑھوں کو جانتا ہوں۔ ہندو سکھ مسلمان۔ ان میں سے شاید میرا ہم عمر ایک بھی نہیں۔ محلے کے اکثر بوڑھے بھی مجھ سے بیس بائیس برس چھوٹے ہیں۔ میں ان سب کی صورتیں اور آوازیں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ سارا سارا دن گلی محلے میں جو جو کچھ ہوتا ہے میں اس سے سالہا سال سے واقف ہوں۔ نیچے گلی میں زیادہ تاک جھانک کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ اور ضرورت بھی کیا ہے۔ میں آواز سنکر بتا سکتا ہوں کہ کون بول رہا یا بول رہی ہے۔ ان کی کارآمد اور بے کار باتیں، ان کے پیار اور لڑائیاں، ان کے دُکھ اور سُکھ سبھی سے میں واقف ہوں۔ نہ جانے کیسے اور کیوں؟ کبھی کبھی تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سب میرا ہی خاندان ہے۔ ہندو، سکھ اور مسلمان۔ عورتیں مرد، بچے، بچیاں۔ ان کے دکھوں اور سُکھوں، سبھی میں میرا ساجھا ہے۔ چنانچہ گلی والی کھڑکی کے قریب جب میں آنکھیں موندے گلی محلے والوں کی باتیں سنتا ہوں تو کبھی آپ ہی آپ مسکرانے لگتا اور کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں سنہ ۱۹۴۷ء کا آغاز ہے۔ ماہ فروری کی چار تاریخ کو میں اسّی برس پورے کروں گا۔ موت کو، ایک ساتھی، ایک مونس، ایک غمخوار کی طرح بہت قریب پاتا ہوں۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے

آج یا کل گلے لپٹائے۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے اور دس بارہ برس آزاد چھوڑ دے۔ خواہ کچھ بھی ہو، میں چاہتا ہوں کہ میں اس محلے کو، اپنے اس خاندان کو، اپنے اس قبیلے کو اسی طرح ہنستے بولتے، چہکتے، گاتے دیکھتا رہوں.... آخری دم تک۔ اس وقت تک کہ جب ایک سچ ہندو کنویں اور مسلمان کنویں پر جمع ہونے والی عورتیں ناک پر انگلیاں رکھ کر ایک دوسرے سے کہیں" اری - نا، اپنے سائیں جی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دنی جنے کی بے بے ۔" یا کوئی اکھڑ سکھ دوسرے سکھ سے کہے" وہ جی اپنے سائیں جی، ریاں دے سانجھے سائیں جی، اکال چلانا کر گئے نے جی.... " ـــــــ لیکن کیا اس بڈھے کی یہ چھوٹی سی تمنا پوری ہو جائیگی ہر تمنا کتنی چھوٹی سی ہوتی ہے، نرم ونازک، رنگین لاچار.... ایک تیتری کی طرح، لیکن کچلے جانے پر یہی ننھی سی تمنا کتنا بڑا المیہ بن جاتی ہے۔

ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو اتو پھر؟ ملک کی فضا مکدر ہو رہی ہے۔ ہندوستان بھر میں ایسے ایسے واقعات پیش آرہے ہیں جو پہلے کبھی سنے نہ دیکھے۔ مدت سے میں نے اخباری ہنگاموں سے دل کو ہٹا رکھا ہے لیکن آج کل اس قدر شور وغل مچا ہوا ہے کہ پھر اخبارات کا بالتفصیل مطالعہ شروع کر دیا ہے۔ فسادات کی خبریں ملک کے کونے کونے سے آرہی ہیں .... تاہم ہمت ہارنے کی کیا ضرورت ہے اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔

امرتسر میں بھی کشیدگی روز بروز بڑھ ہی رہی ہے اندر ہی اندر کھچڑی پک رہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہنگامہ ہو۔ لیکن پھر بھی زیادہ سے زیادہ کیا ہو گا۔ جذبات کا یہ وقتی ابال دب جائے گا۔ ملک تقسیم ہو گیا ہے اس بات پر طرفین قریب قریب متفق ہو چکے ہیں۔ اب اختلاف کس بات پر۔ جب راضی نامہ ہو گیا تو جھنجٹ کس بات کا۔ رہی عوام کی ہنگامہ آرائی تو وہ کب تک۔

شام کا وقت ہے۔ سورج لبِ افق کو چوم رہا ہے۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے کوئی ایسی چیز نہیں جو منظر کو حسین بنا سکے لیکن مجموعی طور پر اس وقت یہ منظر دلچسپ اور دلکش معلوم ہو رہا ہے۔

وسیع میدان میں ہندو، سکھ، مسلمان لڑکوں کے ٹولے مل جل کر مختلف کھیل کھیل رہے ہیں۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر ننھی ننھی پہاڑیوں کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ ارد گرد بیری کے اکا دکا پیڑ، دور کھیت، گدلے پانی کا جوہڑ اور وہ چھوٹا سا گوردوارہ۔ اس کی برجی پر لہراتا ہوا بوسیدہ جھنڈا۔ آسمان پر تیتر کے پروں کی سی بدلیاں یا جیسے سمندر کے سارے کنارے پھیلی ہوئی ریت۔ اس پر کئی رنگ آپس میں گھل مل رہے ہیں۔......

اتنے میں سامنے والے مکان کی ایک کھڑکی قدرے کھلتی ہے...... اور بس کھلی کی کھلی رہ

جاتی ہے۔ کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ حالانکہ عام حالات میں کوئی چہرہ نظر آنا چاہئے۔ اب یا تو کھڑکی ہوا کے زور سے کھلی ہے یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوتا ہے کہ ضرور کوئی کھڑا ہے جو سامنے نہیں آرہا۔ اس سے میری دلچسپی میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ میں اپنی کھڑکی سے دور کھڑا ہوں سوچتا ہوں کہ آگے بڑھوں کہ اتنے میں ایک نوخیز زنانہ چہرہ دکھائی دیتا ہے۔

یہ چہرہ رضیہ کا ہے۔ وہ حاجی صاحب کی لڑکی ہے۔ حاجی صاحب اپنے آبائی مکان میں رہتے ہیں کاروبار میں خاصہ روپیہ پیدا کیا ہے۔ خوش خلق و ملنسار واقع ہوئے ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں جو انہیں کے ساتھ مل کر کاروبار میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ تین لڑکیاں ہیں جن میں ایک کی شادی ہوچکی ہے اور دوسری کی منگنی۔ رضیہ سب سے چھوٹی ہے اس کی ابھی منگنی بھی نہیں ہوئی۔

رضیہ! ــــــــ ایک عام نام ہے۔ اس کی شکل و صورت رنگ روپ میں بھی کوئی خاص بات نہیں۔ یعنی معرکے کی بات نہیں ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ خوب صورت دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی صورت بہت پیاری ہے۔ میرے سامنے ہی کی بات ہے جب وہ ننھی بچی تھی میں نے اسے بارہا گود میں کھلایا تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ بڑی ہوگئی۔ یہاں تک کہ پردے میں رہنے لگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بال اور آنکھیں خاص طور سے دل کش ہیں۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر اس وقت ہماری ننھی رضیہ کس خیال میں یہاں کھڑی ہے۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا لیکن میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنی دانست میں سنگھار کر رکھا ہے آنکھوں کی گوشوں میں سے سرمے کی دھاریاں نوک سناں کی طرح آگے بڑھ آئی ہیں۔ منہ دھلا دھلایا ــــ شاید پوڈر کی ہلکی سی تہہ جمنے بوجھل بال ڈھیلے ڈھالے جن میں سرخ رنگ کا پھول اڑسا ہوا اسے رضیہ نے ایک ہاتھ سے تھام رکھا ہے شاید اس خیال سے کہ اگر گھر کا کوئی فرد ادھر آنکلے تو وہ جلدی سے پھول کو کہیں چھپا سکے۔ مجھے اس کی اس طفلانہ حرکت سے عجب لطف کا احساس ہوا۔ سولہ برس کی اس عمر میں یہ الھڑپن بلکہ بے تکا پن بھی اس کے حسن میں چار چاند لگا رہا ہے۔

اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں بھی شرارتی بچے کی طرح ہٹ کر ایک جانب کھڑا ہوں۔ جہاں سے میں اسے بآسانی دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن وہ چاہے بھی تو مجھے نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن اس کا دھیان میری طرف تو تھا ہی نہیں۔ اس کی نیم وا آنکھیں تجسس سے میدان کی طرف دیکھ رہی ہیں رفتہ رفتہ آنکھیں پورے طور سے کھل جاتی ہیں ان میں مسرت کی چمک پیدا ہوجاتی ہے ہونٹوں پر کلیاں چٹکنے لگتی ہیں اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا ہے۔ پھر حیا کی سرخی کا غازہ رخساروں پر پھیل جاتا ہے دانتوں کی دمک کے باعث یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا

منہ نایاب موتیوں سے لبریز ہو۔ بال اور نیچے کو ڈھلک آئے ہیں سرخ پھول ترچھا ہو گیا ہے اس کے پپوٹوں نے آنکھوں کو اپنے دامن میں چھپا لیا ہے جیسے وہ اس کی سرکش چھاتیوں کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ گریبان کے بٹن بے پروائی سے ادھ کھلے چھوڑ دیئے گئے ہیں لیکن اس کے سینے میں طلاطم سا پیدا ہوتا ہے تو چھاتیوں میں سمندر کی تیز و تند لہروں کا سا مدو جذر نظر آنے لگا تو اس نے چندری کا پلو ڈال کر اس طوفانی کیفیت کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہے اس کے سبک نتھنے پھڑک اٹھتے ہیں۔

مجھے خیال آتا ہے کہ آخر دیکھوں تو اس طوفان کو اٹھانے والا ماہتاب ـــــ یا اس ماہتاب کو عالم تاب بنانے والا آفتاب کون ہے . . . . . . یہ سوچ کر میں دبے پاؤں میدان کی سمت کھلنے والی کھڑکی کی جانب بڑھتا ہوں چپکے سے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتا ہوں تو ایک نوجوان دکھائی دیتا ہے جو کمال بے فکری اور انہماک سے اپنی نظر عالم بالا پر جمائے ہے۔ کئی سیکنڈ گزر جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ ذرا رخ پھیرتا تو مجھے دیکھ لیتا لیکن عشق کتنا الھڑ کتنا معصوم ہوتا ہے۔ عشق کو کبھی اس امر کا احساس نہیں ہوتا کہ غیروں کی نگاہیں اس کو تاڑ رہی ہیں۔

میں دلچسپی سے اس نوجوان کو دیکھتا رہا۔ معاً وہ ایک قدم پیچھے ہٹتا ہے اور پھر دیوار کی اوٹ میں ہو جاتا ہے۔ وہ مجھے نہیں دیکھ پاتا۔ لیکن غالباً معشوقہ کی کھڑکی میں ہی کوئی چیز ایسی نظر آتی ہے جس کی وجہ سے وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ اب میں چند قدم ہٹ کر رضیہ کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ وہاں موجود نہیں ہے اور کھڑکی بدستور سابق بند ہے۔

اس کے بعد میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کئی منٹ تک ٹہلتا رہتا ہوں یہاں تک شب نے زلفیں بکھیر دیتی ہے اور اس کی اداس دھندلاہٹ میں ستارے ٹمٹمانے لگتے ہیں۔

آخر کار تھک کر میں میدان کی جانب کھلنے والی کھڑکی کے قریب ایک اونچی بازو دار کرسی پر بیٹھ جاتا ہوں ٹانگیں کھڑکی کی چوکھٹ پر ٹکی ہیں۔

کھیت سیاہ دھبوں کی طرح دکھائی دے رہے ہیں۔ اور ملگجی روشنی میں ہر شے پر اسرار سائے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ خود میرے ذہن میں خیالات سایوں کی طرح متحرک ہیں۔

محبت کا یہ ننھا سا ڈرامہ دفعتاً ہی میرے سامنے کھیلا گیا ہے۔ رضیہ کی صورت کبھی چار چھ ماہ بعد دکھائی دے جاتی تھی۔ لیکن مجھے اس محبت کا علم نہیں تھا . . . . . . اور پھر یہ محبت کیا شے تھی جو ایک خود رو پودے کی طرح ہر نوخیز دل میں از خود اُگ آئی تھی۔

محبت ـــــ ذوقِ نمو کے سوا اور کیا ہے؟ لیکن انسان نے کتنی آلائشیں اس کے ساتھ

سپیٹ ڈالی ہیں۔ کیسے کیسے نازک اور اُمنگوں بھرے دل کھلا کر رہ جاتے ہیں۔ زندگی سے بھرپور ہر ترنگ کی راکھ سی بکھر ہوا میں اڑ جاتی ہے۔

کہتے ہیں شیر، سانپ، ہاتھی اور گینڈے وغیرہ بہت سخت جان جانور ہوتے ہیں لیکن انسان سے زیادہ سخت جان کون جاندار ہو سکتا ہے اس کی ذہنی اور روحانی کلفتوں کا شمار بھی نہیں کیا جا سکتا جسمانی معذوریاں اور لاچاریاں تو ہیں ایک طرف۔ قدم قدم پر نوخیز دلوں کو بھی وہ وہ مصائب سہنے پڑتے ہیں کہ ان کے بھدے نقوش ان کی معصوم زخموں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نقش ہو کر رہ جاتے ہیں۔

. . . . یہی ذوقِ نمو، کیسے ایک دلکش راگنی کی طرح معصوم دل میں جنم لیتا ہے۔ قدرت کے اونچے آدرشوں میں رنگ بھرنے کے لئے . . . . .

یہ جذبہ تو تصویرِ معصومیت ہے سر بسر نغمہ ہے۔ روح پاکیزگی ہے . . . . لیکن ہمارا سماج اسے کبھی اس کا مقام دینے پر آمادہ نظر نہیں آتا . . . .

یکایک مجھے خیال آیا کہ نہ جانے آج کے ڈرامے کا ڈراپ سین کیسے ہو؟ دل میں شبہ پیدا ہوا کہ کہیں رضیہ رنگے ہاتھوں پکڑی تو نہیں گئی۔ ایسا تو نہیں ہوا کہ بھائی یا باپ اوپر سے پہنچ گیا ہو۔ یہ بات اور زیادہ خطرناک تھی . . . . . . بچاری بُری طرح سے ماری پیٹی گئی ہوگی۔ اب شاید کسی کال کوٹھڑی میں بند کر دی گئی ہو . . . . . .

میرے دل کی بے چینی بڑھنے لگتی ہے۔ مانا رضیہ سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اور نہ اس اجنبی نوجوان سے . . . . لیکن یہ دونوں ہم مذہب تو ہیں۔ ایک طرف اگر رضیہ ہندو یا سکھ لڑکی ہوتی تو بھی مجھے اس سے وہی ہمدردی ہوتی۔ آخر سالمحہ مجھے اپنا ہی کنبہ تو معلوم ہوتا تھا۔

اس خیال کے آتے ہی میں پھر اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور بے چینی سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا ہوں آخر اس بات کا پتہ کیسے چلے میں اسی کھڑکی کی طرف گیا تو دیکھا کہ وہ جُوں کی توں بند ہے۔ جیسے وہ صدیوں سے اسی طرح سے بند ہو۔ جیسے اس کی چوکھٹ پر کوئی حسین جمیل شبیہ کبھی مسکرائی نہ ہو ہنسی نہ ہو، لجائی نہ ہو۔

رات بھر بے چینی سی رہی۔ رہ رہ کر لڑکی کی معصوم صورت آنکھوں کے آگے گھومتی رہی۔ خدشہ یہ تھا کہ نہ جانے یہ معاملہ بالآخر کیا صورت اختیار کرے۔ نہ معلوم کیوں مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر دونوں کا رشتہ ہو جائے تو اچھا ہی ہے۔ میرے پاس اس کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ رضیہ اپنے محلے کی لڑکی تھی لیکن اس کے بارے میں اور اس کے خیالات اور افتادِ طبع کے بارے میں میرا علم محدود تھا۔ اور لڑکے کے بارے میں تو مجھے سرے ہی سے کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ کون تھا کیا کرتا تھا تعلیم کہاں تک ہے خاندان وغیرہ مجھے ان باتوں کے

بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ پھر بھی دل کہتا تھا کہ ان کے دل کی دُنیا برباد نہ ہونے پائے۔ شاید میں جذباتی ہو رہا تھا۔

میں یہ جاننے کے لئے بے قرار تھا کہ رضیہ کو کیوں دفعتاً کھڑکی کے آگے سے ہٹنا پڑا۔ رات ہی میں نے اپنا ملازم ان کے گھر حاجی صاحب یا ان کے لڑکوں میں سے کسی کو بلانے کو بھیجا۔

نوکر نے آکر جواب دیا کہ گھر پر کوئی مرد موجود نہیں ہے۔ مجھے اطمینان ہوا۔ اب یہی امکان باقی تھا کہ شاید اس کی امی نے اسے دیکھ لیا ہو یا محض کسی کی آہٹ پا کر وہ پیچھے ہٹ گئی ہو۔ پہلی صورت بھی خطرناک تھی اور دوسری تو خیر بالکل بے ضرر تھی۔

اگلی صبح کے وقت گلی اور کنوؤں کے گرد وہی مانوس سا شور تھا۔ میں نے بہت چاہا کہ کسی طرح رضیہ کی صورت دکھائی دے جائے تاکہ میں اندازہ لگا سکوں کہ حالات کس حد تک خراب ہیں۔ لیکن رضیہ دکھائی نہ دی۔ شام کو حاجی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کی حرکات و سکنات اور گفتگو سے ہرگز پتہ نہیں چلتا تھا کہ گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا ہے۔

میرے دل میں آئی کہ حاجی صاحب سے میں ہی اس بات کو چھیڑ دوں۔ لیکن پھر سوچا کہ کہیں جلد بازی غلط فہمی نہ پیدا کر دے۔ اور پھر مجھے لڑکے کے بارے میں بھی کچھ علم نہیں تھا اگر بعد میں کوئی غیر موافق بات ہوئی تو سب کچھ میرے سر تھتے آئے گی یوں حاجی جی جہاندیدہ اور کسی حد تک ضدی انسان تھے اگر الٹ گئے تو بات سنبھالنی مشکل ہو جائے گی۔

ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ رضیہ مجھے اپنا راز داں سمجھے تو شاید میں اس کی مدد کر سکوں۔ لیکن کیا میں ایک غیر معمولی بوڑھا نہیں ہوں آخر کوئی سنے تو کیا کہے۔ اور پھر رضیہ مجھے اپنا راز داں کیسے بنا سکتی ہے۔ ایک بزرگ صورت سائیں جی کو جس سے وہ کبھی ڈرتی تھی۔ اور بعد میں جس کا وہ احترام کرنے لگی تھی۔ ناممکن ناممکن . . . . . . البتہ لڑکے سے راہ و رسم پیدا کرنے میں کسی خاص مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ حالانکہ لڑکا بھی راز داں بنانے پر جلدی سے آمادہ نہیں ہو گا لیکن پھر بھی میں اسے بہلا سکتا ہوں کسی بہلانے سے، باتوں باتوں میں اس کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتا ہوں۔ اگر ہر طرح معاملہ تسلی بخش معلوم ہو تو کسی نہ کسی طرح حاجی جی کو بھی ڈھب پر لایا جا سکتا ہے۔

اس عمر میں جب کہ میں قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ دو دلوں کو ملانے کا یہ عمل میرے من کو بہت بھلا سا لگ رہا تھا۔ ہم عبادت و ریاضت کی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ لیکن ہمارے ارد گرد کتنے معصوم دل اور نیک روحیں موجود ہیں جنہیں سہارا دیکر ہم نئی دُنیا کو جنم دے سکتے ہیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کرتے ـــــ

نہیں کر سکتے۔ سالہا سال کی عبادت ہمارے ذہن میں اتنا سا نور پیدا کرنے سے قاصر ہے مگر میں یہ نھی سی دنیا برباد ہونے سے ضرور بچاؤں گا۔

سوال یہ ہے کہ میرے الجھے ہوئے خیالات کو عملی جامہ کیسے پہنایا جاسکتا ہے۔ دن گزرتے جا رہے ہیں۔ رضیہ کا دکھائی دینا تو درکنار اس کی جھلک تک ایک فسانہ بنکر رہ گئی۔ ایک خواب . . . . . جو شاید میں نے دیکھا بھی تھا یا نہیں۔ اور تو اور وہ لڑکا تک نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اسے ایک ہی بار دُور سے دیکھا تھا پھر بھی اگر وہ میرے سامنے آئے تو میں اسے ضرور پہچان لوں۔ نہ جانے وہ بھی کیوں نہیں آتا۔ شاید وہ لڑکوں کی ان متعدد ٹولیوں میں وہ بھی شامل ہو۔ مگر اتنے فاصلے سے میں اسے کیونکر پہچانوں؟

ایک شام میں پھر میدان کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا۔ اب میں مایوس ہوتا جا رہا تھا کیونکہ اتنے دن بیت جانے کے بعد بھی نہ تو رضیہ کی صورت دکھائی دی نہ لڑکے کی۔ آخر اس پُر اسرار پردے کے پیچھے کیا گل کھلا تھا۔ میں اس سے ناواقف تھا۔

میں بے معنی نظروں سے میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک نوجوان میری سمت کو بڑھا۔ میں سمجھا دیوار کے پاس پیشاب کرنے کو آرہا ہے۔ جب وہ قریب آگیا تو یوں لگا جیسے وہ وہی لڑکا ہے۔ لیکن وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اتنے دنوں میں میرے ذہن میں اس کے غیر واضح نقوش اور بھی زیادہ دھندلا گئے تھے۔

قریب پہنچ کر وہ رُک گیا۔ اس کی نظر رضیہ کی کھڑکی پر جمی ہوئی تھی۔ یہ دونوں کا راز داں تو ہو نہیں سکتا اس لئے غالباً وہ وہی لڑکا تھا۔ کچھ دیر تامل کے بعد اس نے جیب میں سے کاغذ کا پرزہ نکالا۔ اور اسے ایک پتھر باندھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ رضیہ کی کھڑکی کھلی ہے لیکن وہاں کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ لڑکے نے ہاتھ تول کر پتھر کھڑکی کی جانب پھینکا۔ اوپر پہنچ کر کاغذ پتھر سے جدا ہوگیا اور ہوا کے جھونکے سے اڑ کر ——— اڑ کر میری کھڑکی کی ایک دراڑ میں پھنس کر زخمی پرندے کی طرح پھڑپھڑانے لگا۔ اور پھر زور کی آواز ہوئی۔ دیکھا کھڑکی بند ہو چکی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ رضیہ کھڑکی کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ اُدھر لڑکا بھی بھاگ نکلا . . . . . . میں اس کاغذ کی طرف چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا تھا . . . . . . لمحہ بھر کو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ عقل نے بھی کام نہیں کیا۔ مجھے چاہئے تھا کہ بڑھ کر کاغذ کو پکڑ لیتا۔ کیونکہ اگر وہ گلی میں جا گرتا تو نہ جانے کس کے ہاتھ لگ جاتا۔

خوش قسمتی سے میرے آگے بڑھنے سے پہلے ہوا کے زور دار جھونکے سے کاغذ دراڑ میں سے نکل کر پھڑپھڑاتا ہوا میرے قدموں پر آن گرا، اور میں نے جھک کر کانپتی ہوئی انگلیوں سے اسے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔ اور میرے

دھیرے اس کی تہیں کھولنے لگا۔

اٹھا کر دیکھا تو ایک نہیں دو پرزے تھے۔ ایک رضیہ کا رقعہ تھا اور اس کے جواب میں حیدر کا۔ دونوں رقعے ہیں تو پریم پتر لیکن اس قدر سادہ کہ ہنسی آئے اور پُر اثر اتنے کہ آنسو بھر آئے۔

رضیہ نے لکھا تھا:۔

"آپ سے جدا ہو کر ہم مر جائیں گے۔ ضرور مر جائیں گے جی۔ تاکید ہے بار بار تاکید ہے"

بس یہ رضیہ کا پریم پتر تھا۔ اردو کے حروف ٹیڑھے میڑھے۔ لیکن ایک دل سے دوسرے دل تک پیام پہنچانے کے لئے یہ الفاظ ضرورت سے کہیں زیادہ تھے۔

حیدر نے جواب میں پنسل سے لکھا تھا:۔

"ہم بھی ——— ہم خوب روئے آپ کا رقعہ پڑھ کر ———"

معلوم ہوتا ہے دونوں کو ایک دوسرے کی سننے کی بہت جلدی ہوتی ہے۔ محبت کے خطوط لکھنا نہیں جانتے یا قلم جذبات کا ساتھ نہیں دیتا۔

خطوط پڑھ کر معاملہ صاف ہونے کے بجائے اور الجھ گیا ہے۔ یا الٰہی! یہ تو اس باب میں بالکل الھڑ ہیں یہ تو بس مر جائیں گے۔

اب تو میرے ہاتھ پاؤں پھول رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ان کی محبت نقطۂ عروج پر ہے۔ اس میں حسب معمول عقل کو قطعاً کچھ دخل نہیں ہے۔ کیا کیا جائے۔

اتنا تو پتہ چل گیا کہ لڑکے کا نام حیدر ہے۔ حیدر! ——— بالکل عامیانہ نام ہے۔ ہر قصبے، گاؤں اور شہر میں اکثر حیدر نام کے لڑکے ہوتے ہیں۔ اب اتنا تو ہو سکتا ہے کہ اگر اب وہ ہماری کھڑکی کے قریب آئے تو میں اسے حیدر کہہ کر بلا سکتا ہوں ——— اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہوں۔

لیکن اس سے بھی ضروری بات یہ ہے کہ رضیہ کو اس کے خطوط پہونچا دیئے جائیں۔ اس کی جان خشک ہو رہی ہو گی۔ رقعوں کا حشر اس کے خیال میں یہی ہو سکتا ہے کہ یا وہ گلی میں گر کر کسی کے بھی ہاتھ لگ جائیں اور سارے محلے میں بدنامی ہو جائے یا وہ میری نظر پڑ جائیں اور میں ان کے والد کو بلا کر رقعے ان کے حوالے کر دوں اور کچھ اپنی طرف سے بھی نمک مرچ لگا دوں ——— وہ نہیں جانتی کہ ان میں کوئی بات نہیں ہوئی ——— پھر بھی اس کے ڈر اور دہشت کی کوئی حد نہیں ہو گی۔ اس وقت نہ جانے خوف دہراس کی اس کیفیت میں وہ نہ جانے کیا کر لے ——— کسی نہ کسی طرح سے اسے بات کی خبر پہونچانی چاہئے ——— لیکن کیسے؟

وہ کھڑکی اکثر بند رہتی تھی۔ میں نے تجویز سوچ کر ہر دوپہر ڈھلے اس پر پتھر مارنے شروع کر دیئے ہیں ــــ وقفے سے دو تین پتھر۔ خود چھپ کر دیکھتا رہتا۔ اول تو کوئی شخص بند کھڑکی کو کھولتا نہیں۔ ایک بار ان کی ملازمہ کی دس سالہ لڑکی نے کھولی تو میں چھپا رہا ــــ لیکن دل میں مناتا تھا کہ کاش رضیہ ادھر آ نکلے۔ حیدر کا اشارہ سمجھ کر دروازہ کھول دے۔

تیسرے ہی دن میری مراد پوری ہو گئی۔ رضیہ کھڑکی کھول کر میدان کی جانب دیکھنے لگتی ہے۔ میں رقعے پتھر سے باندھ کر تیار کھڑا ہوں۔ کھڑکی کے پٹ کھلتے ہی نشانہ باندھ کر رقعوں والا پتھر پھینکتا ہوں جو سیدھا اندر جا گرتا ہے۔ اس پر رضیہ گھبرا کر میری طرف دیکھتی ہے۔ مجھ سے آنکھیں ملتے ہی اس کا چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ میں دبی زبان میں کہ آواز صرف اسی تک پہونچے کہتا ہوں۔

"رجی بٹیا گھبراؤ نہیں۔۔۔۔ تم۔۔۔۔"

# تُم

تُم سائیں جی کو اپنے سامنے پا کر گھبرا گئیں۔ تمہارا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ تمہارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پھر چونک کر تم نے کھڑکی کے پٹ زور سے بند کر دیئے ۔۔۔۔۔ اور بند کھڑکی سے پیٹھ ٹکا کر تم نے اپنے دونوں ہاتھ سینہ پر رکھ لئے۔ تمہاری ٹانگیں تک لرز رہی تھیں تمہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے چکرا کر فرش پر گر پڑو گی۔

ڈرو نہیں۔ اب گھبراؤ نہیں عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ سائیں جی محلے کے بزرگ ہیں۔ تمہارا شرمانا بھی درست ہے کیونکہ تم جب پیدا ہوئیں اس وقت بھی وہ بوڑھے انسان تھے۔ تم ان کی گود میں کھیلی ہو۔ واقعی شرم تو آ ہی جاتی ہے انسان کو۔ پھر تمہارے جیسی لڑکی کو جو پنجرے کے پنچھی کے مانند ہے۔ ہائے اللہ! اب کیا ہوگا؟ درست۔ لیکن جو ہونا تھا سو ہو چکا اور جو ہونا باقی ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اب خواہ مخواہ جی چھوڑنے سے کیا فائدہ؟ ــــ کب تک سینہ پہ ہاتھ رکھے یوں کھڑی رہو گی۔ دل تو چھاتی کے اندر

ہوتاہے۔ باہر سے تھا منے سے یہ قابو میں تھوڑے ہی آئے گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مگر دیکھو۔ وہ کاغذ کا گولا سا کیا ہے۔
یہ اسی کے رقعے تو نہیں۔ جلدی سے اٹھا کر دیکھو۔ ایسا نہ ہو اوپر سے کوئی آجائے۔ کسی اور نے رقعے دیکھ لئے
تو آفت ہی آجائے گی۔ مرنے تک کے لئے جگہ نہیں ملے گی اٹھاؤ۔ یہ لو۔ تمہارا رقعہ بھی ہے اور اس کا رقعہ بھی۔
—— اوئی اللہ! اب کیا ہوگا۔ سائیں جی نے دونوں رقعے پڑھ لئے ہوں گے۔ ان کو سب کچھ پتہ چل گیا۔
وہ ضرور ابا سے شکایت کر دینگے۔ ہائے ہائے۔

رضیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رضیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم ایک معمولی لڑکی ہو۔ غیر معمولی نہیں —— تم شیلا ہو سکتی
تھیں تم امرجیت کور ہو سکتی تھیں۔ —— تم جو کچھ بھی ہوتیں رضیہ کی رضیہ ہی رہتیں۔ دیکھو رضیہ تم نے
کوئی ان ہونی بات نہیں کی۔ کوئی گناہ، کوئی پاپ نہیں کیا۔ یہ بالکل قدرتی امر ہے۔ آخر تم نے کسی مرد
کو اپنانا چاہا۔ تم ماں بنو گی، تمہارے صحن میں معصوم بچوں کے قہقہے گونجیں گے۔ تم گھر بساؤ گی، تم نئے جیون
کو جنم دو گی۔ تم زندگی دینے اور اسے جاری رکھنے والی ہو۔ تم پر ہزار ہزار سلام۔ تمہیں سدا نمسکار۔ تم نہیں
جانتیں یہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس دنیا میں۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے ارد گرد لوگ دھرم، انصاف اور نیکی کے نام پر
کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں۔ یہ چھٹیاں! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ چھٹیاں جلا دو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں جلا ہی دو۔ انہیں
چھپانے سے کیا حاصل؟ ۔ ۔ ۔ ۔ شاید کسی کے ہاتھ لگ جائیں اور مصیبت نازل ہو۔ اب تو انہیں جلا ڈالنا
ہی بہتر ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چلو جلدی چلو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آواز، کوئی آواز۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کس کی آواز ۔ ۔ ۔ ۔ چلو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھر میں کام ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ چٹھیاں چھپا لو قمیص کے اندر
انگیا میں ٹھونس لو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں بس ٹھیک ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی بات نہیں۔ چولہے کے قریب بیٹھنے کا موقعہ
تو ہر وقت ملتا ہی رہتا ہے۔ رقعے جلا دینے میں کیا وقت لگتا ہے۔

"پراٹھے پکاؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ رضیہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم کہاں رہ جاتی ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ اماں کی آواز ہے۔ اس بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ چپکے سے چولہے کے پاس بیٹھ رہو۔
آٹے کے پیڑے بناؤ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پراٹھے تیار کرو۔ کام میں مگن ہو جاؤ۔ موقعہ ملتے ہی رقعے جلا دینا۔

یہ تو شمن بھی آگئی۔ اس کی عمر تیرہ برس کی ہو چکی ہے چودھواں لگا۔ مگر وہ ان کی مہری کی بیٹی ہے۔
غریب لوگ ہیں اس لئے وہ ماں کا ہاتھ بٹانے کے لئے گھر گھر جاتی ہے۔ بھلے گھر کی لڑکی ہوتی تو کبھی کی پردے
میں بیٹھ گئی ہوتی۔ کالی کلوٹی ناک میں نتھلی لٹکائے سارا سارا دن دوڑنگے لگاتی پھرتی ہے۔ گھاٹ گھاٹ
کا پانی پئے ہے اور تو اور بولتا بائیسکوپ بھی تو کئی بار دیکھ چکی ہے۔ موقعہ ملنے پر فلمی کہانیاں سناتی ہے
تو تم بڑے انہاک سے سنتی ہو۔ تم بھی تو بائیسکوپ دیکھنا چاہتی ہو، لیکن ابھی نہیں دیکھ سکو گی جب

تمہاری شادی ہو جائے گی تو اپنے شوہر کے ساتھ جایا کرو گی۔

شمن اس کی سہیلی ہے۔ حالانکہ گھر کے لوگ اس بات کو پسند نہیں کرتے اور دونوں اپنی دوستی ان پر ظاہر بھی نہیں ہونے دیتیں خصوصاً تم کو اس امر کا پورا پورا خیال رہتا ہے۔ تم اوروں کے سامنے اس سے بات کرتے وقت مسکراتی تک نہیں لیکن تم اسے دل سے چاہتی ہو۔ سیدھی سی وجہ یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی اور تمہیں باہر کی دنیا کی باتیں نہیں سنا سکتا۔ باہر کی دنیا کی ہر بات تمہارے لئے الف لیلیٰ کی کہانی سے کم نہیں ہوتی کتنے چاؤ، کتنے اشتیاق سے تم اس کی باتوں کو سنتی ہو۔ تم نے تو سوائے اپنے گھر کے پچھواڑے کے میدان کے سوا کیا دیکھا ہے۔ بچپن اپنے محلے کی گلی میں گزرا۔ . . . . . .

شمن پاس بیٹھی ہے لیکن گھر کے اور لوگ، اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں۔ شمن کو آٹھ دس آلو دے دو۔ وہ خود بھی ان باتوں کو سمجھتی ہے دیکھو کیسے چپ چاپ آلو چھیلے جا رہی ہے، دبی نظروں سے تمہیں دیکھ بھی لیتی ہے۔ مسکرا بھی دیتی ہے لیکن تم مسکراتیں بھی نہیں اچھا ہے . . . . . . . معاً تمہارے ذہن میں پھر وہی خیال . . . . . . سائیں جی والا خیال ابھرتا ہے۔ سارا واقعہ بار بار ایک فلم کی طرح تمہارے ذہن کے پردے پر اپنا عکس ڈالتا ہے۔ تم اب سوچ رہی ہو . . . . . سوچ رہی ہو کہ انہوں نے وہ دونوں چٹھیاں تمہیں واپس کر دی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی سنسنی کی ایک لرزش تمہارے سر سے پاؤں تک پھیل جاتی ہے مگر رضیہ یہ بھی تو سوچو کہ اگر وہ چاہتے تو یہ چٹھیاں تمہارے ابا کو دکھا دیتے۔ لیکن انہوں نے وہ تمہیں واپس کر دی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں کسی سے کچھ نہ کہیں۔ اگر ابا سے کہنا ہوتا تو رقعے واپس کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ رقعے تو ایک پکا ثبوت مہیا کر سکتے تھے . . . . . . تم بار بار اس منظر کو اپنی آنکھوں کے سامنے لاتی ہو . . . . . سنو رضیہ! سائیں جی کچھ کہنا بھی تو چاہتے تھے۔ ہاں ہاں وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے لیکن تم نے ہی گھبرا کر کھڑکی بند کر دی۔ تم نے کچھ نہیں سنا۔ لیکن تمہیں ان کی بات سن لینی چاہئے تھی . . . ہائے اللہ! گھبراہٹ میں کچھ نہیں سوجھا . . . . ٹھیک ہے نا؟

مگر . . . . مگر . . . . . سائیں جی کیا کہنے کو تھے شاید ڈانٹتے۔ کہتے رضیہ بیٹی! تمہیں شرم محسوس ہونی چاہئے۔ تم یہ کیا کر رہی ہو۔ تم خاندان کی آبرو خاک میں ملا دو گی۔ تمہارے ماں باپ بھائی بہن کہیں منہ دکھلانے کے قابل نہ رہیں گے . . . . . تو کیا ہوتا . . . . . ایسی باتیں سن کر کتنی شرم محسوس ہوتی . . . . . لیکن یہ بھی تو سوچو رقعے واپس کر کے انہوں نے تم پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اولاً یہ رقعے اگر ان کے مکان میں گرنے کے بجائے کہیں گلی یا کسی اور مکان میں جا گرتے تو اب تک سارے محلے میں بدنامی ہو گئی ہوتی . . . . . مگر یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ سائیں جی نے رحم کھا کر رقعے تو واپس کر دیئے ہوں

لیکن شام تک آپا سے مل کر انہیں اشارتاً کچھ ہدایت کریں۔ اس کا نام نہ بھی لیں تو آپا ان کا مطلب تو پا ہی جائیں گے اور پھر گھر میں اس پر اور زیادہ پابندیاں لگ جائیں گی۔ آگے ہی دم مارنے کی فرصت نہیں ملتی ........

..... خیر جو ہو سو ہو ـــــ اب تو سوا انتظار کرنے کے کوئی چارۂ کار نہیں ـــــ اور ہاں وہ رقعے !! اب موقعہ ہے ڈال دو آگ میں .... ۔ آگ قدرے بھڑک اٹھتی ہے۔

"کیوں جی! یہ کیا جلایا جا رہا ہے"

یہ شمن کی آواز ہے۔ شیطان کہیں کی۔ کیسے کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہے۔ نتھنی لرز رہی ہے۔ روکھے سوکھے بالوں کی لٹوں نے اس کی ایک آنکھ ڈھانپ رکھی ہے۔ سپید سپید دانت جھلملا رہے ہیں۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں"

"ہم سے چالاکیاں ..... ہماری بلی ہمیں سے .... "

"خدا کے واسطے شمن! چپ رہو"

"تو بتاؤ نا؟"

"کیا بھئی"

"یہ کیا جلا رہی تھیں"

"بھئی یونہیں کاغذ سے تھے"

"خوب جانتی ہوں کاغذ نہیں چٹھیاں تھیں چٹھیاں۔ تمہارا کلیجہ حلق میں آن اٹکتا ہے"

"چٹھیوں کی بچی ..... چپ رہ نا"

"بتا دو نا" شمن تمہیں تنگ کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ بڑی چنٹ لڑکی ہے۔ اس سے پیچھا تو چھڑانا ہی ہوگا کسی نہ کسی طرح سے ......

"تو بتا دو نا"

"ابھی کیسے بتا دوں"

"تو پھر بتا دو گی نا"

"ہاں"

"وائی دا"

"ہاں وعدہ"

" پکا وائی دا "

" ہاں پکا وعدہ —— آلو کہیں کی "

اب آلو کہو یا شمن —— وہ تمہارا پیچھا نہیں چھوڑنے کی۔ تم نے ایک طرح سے اعتراف کر لیا ہے کہ دال میں کالا ضرور ہے۔ اب راز بتانا ہوگا . . . . کیسے چھپاؤ گی . . . . . . تو پھر بتا ہی دینا . . . . عاشقوں کے ہمراز اکثر ہمدرد ہوتے ہیں۔ یوں بھی تمہیں شمن پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ سیانی اور ہوشیار ہے۔ بڑے بڑوں کے کان کترتی ہے اپنی ہمراز بنانے سے ممکن ہے تمہیں اس سے کافی مدد ملے۔

دوپہر ہو چکی ہے۔ گھر کے لوگ کھا پی چکے ہیں۔ بکھری چیزیں سمیٹنی باقی ہیں جو تم کرو گی۔ برتن مانجھنے دھونے کا کام شمن کرے گی اس کی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں، اس لئے وہ پہلے ہی سے گھر چلی گئی ہے۔ کام ختم ہونے کے بعد تم دونوں کو اتنی ہی فرصت مل جائے گی کہ وسیع حویلی کے کسی گوشے میں بیٹھ کر بات چیت اور ہنسی ٹھٹھول میں وقت بتا سکو۔

شمن کی طرف کیا دیکھ رہی ہو۔ سوچتی ہو کہ اسے بتاؤں یا نہ بتاؤں لیکن یہ اب ناممکن ہے کیوں کہ وہ دل ہی دل میں بے چین ہو رہی ہے۔ اس کے ہاتھ آج کس قدر تیزی سے چل رہے ہیں۔ کیسے بار بار وہ پُر معنی نظروں سے تمہاری جانب دیکھنے لگتی ہے۔ مردود! کہیں یہ ساری داستان اِدھر اُدھر پھیلا نہ دے۔ . . . . . لیکن کیا کیا جائے اُدھر سائیں جی کو بھی تو پتہ چل چکا ہے۔ شام کو اگر مردانے میں آکر اباجان سے کچھ کہہ کر چل دیئے تو تمہیں کیسے پتہ چلے گا۔

لو کام دھام ختم ہوا شمن سائے کی طرح تمہارے ساتھ ساتھ ہے وہ ڈرتی ہے کہ کہیں تم دغا نہ دے جاؤ۔ چلو اوپر کی چھت پر —— میانی میں بیٹھ کر بات چیت کرو۔ پیچھے گھوم کر کیا دیکھ رہی ہو۔ شمن آ رہی ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ آج تمہیں آنکھوں سے اوجھل ہونے دے گی . . . . . . بس یہ میانی ٹھیک ہے۔ اچھی جگہ ہے۔ چٹائی بچھاؤ۔ اے لو شمن بھی آن پہنچی۔

"رجی! تم مجھ سے چھپنا چاہتی ہو"

"نہیں شمن! بلکہ میں تو پیچھے پیچھے دیکھتی چلی آ رہی تھی کہ . . . . . "

"کہ کہیں شمن تو خدانخواستہ پیچھا نہیں کر رہی ہے۔"

"وحت! الٹی بات کہتی ہو . . . . . بیٹھو نا چٹائی پر بیٹھ جاؤ"

"اے لو یہ بیٹھ گئے۔ اب بتاؤ وہ گل پیام کون ہے جس کی چٹھیاں سینہ سے لگئے

پھرتی ہو ...... ؟

"سچ تم تو بڑی ہی منہ پھٹ واقع ہوئی ہو کیسی کیسی بے شرمی کی باتیں بے روک ٹوک منہ سے نکال دیتی ہو ...... "

"اری منہ پھٹ نہیں —— ہم تو کھری کھری سنانے والے آدمی ہیں ... سمجھیں .... "

"ہائے اللہ! چھوٹا سا منہ اور یہ بڑی بات "

"بات بڑی ہوئی تو کیا ..... حرکت بڑی تو نہیں ہماری —— خیر! رجو! سچ تم نے اندر ہی اندر بڑا ہاتھ مارا ہے "

"بغیر کچھ جانے بوجھے یہ ہاتھ مارنے کی بھی خوب کہی ..... سچ تم میں اور پوری عورت میں کیا فرق ہے۔ سب باتیں جانتی ہو، سب سنتی ہو، اور سب کچھ دیکھتی ہو ...... "

"ہاں وہ تو ہے .... اچھا اب سنا ڈالو اپنا کچا چٹھا "

"اونہوں "

"یہ اونہوں کیا۔ اب شرمانے سے کیا ہوگا اور پھر اس وقت ..... تو شرمائی نہیں۔ اب شرمانا کیا معنی؟"

"اس وقت کب؟"

"جب آنکھ سے آنکھ لڑی تھی "

"ہٹ بے شرم کہیں کی ...... "

"کیا کھری بات کہنا بے شرمی کی بات ہے؟ بھلا آنکھ مٹکائے بغیر یہ عشق چلا کیسے ہوگا "

"نہیں ...... ایسی کوئی بات نہیں ہوئی ...... یہ ٹھیک ہے کہ .... کہ ...."

"وہ تو ٹھیک ہے کہ ..... کہ ..... لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ شروع کب ہوا .... ذرا سوچ کر جواب دینا ...... سوچ رہی ہو نا؟"

"شاید چار مہینے سے "

"ٹھیک ٹھیک بولو "

"ہاں تخمیناً! چار دن آگے یا پیچھے کی شرط نہیں ہے "

"کہاں تک پہنچی ہو؟"

اس پر تمہارا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے۔ محبت ایسے نازک مسئلے پر ایسی کھلم کھلا گفتگو کرنے میں

تمہیں جھجک محسوس ہوتی ہے۔ لیکن شمن ٹھہری شیطان کی خالہ۔

"بولو نا! کہاں تک پہنچی ہو۔"

"منزل سے تمہارا مطلب؟"

"بتاؤں؟ پھر کہو گی بے سری کرتی ہو؟"

"منزل ونزل کوئی نہیں ..... بات تک ہوئی نہیں ....."

"بات بھی نہیں ہوئی؟ ..... پھر گلے لگنے اور چوما چاٹی کا تو ذکر ہی بے کار ہے۔"

اس پر تمہاری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں تم دیر تک چہرہ اوڑھنی میں چھپائے رکھتی ہو۔

اچھا ہٹاؤ پردہ چہرے سے ..... اب ایسی بات نہیں ہوگی ..... یہ تو بتاؤ رقعے لانے لے جانیکا کام کس کے سپرد ہے؟

"کوئی بھی تو نہیں ....."

اے ہے ــــ ہمیں چراتی ہو؟"

"سچ کہتی ہوں۔"

"تو ــــ قاصد بغیر بھلا رقعے کیسے آ جا سکتے ہیں؟"

"ہم نے اور ہی ترکیب نکال رکھی ہے۔"

"کیا؟"

اب تم تامل کرتی ہو شمن کے اصرار پر تم بولنے پر مجبور ہو جاتی ہو۔

"ایک پتھر سے بندھ کر رقعہ مجھ تک آ جاتا ہے اور اسی پتھر سے بندھ کر میرا رقعہ اُدھر چلا جاتا ہے ....."

"آہا ــــ سبحان اللہ! تم تو اس معاملے میں بس کھان دانی معلوم ہوتی ہو۔"

اس پر تمہارے ماتھے پر بل آ جاتا ہے۔

"منہ سنبھال کر بولو۔"

شمن تمہارے احتجاج کو ایک قہقہے میں اڑا دیتی ہے۔ اور پھر سوال کرتی ہے۔

"اچھا تو آج رقعے کو جلانے کا مطلب؟"

تم سوچتی ہو کہ یہ بتانا تو ذرا ٹیڑھی کھیر ہے لیکن معاملہ اس قدر نازک ہے کہ شمن کو رازداں بنا لینا ہی بہتر معلوم ہوتا ہے۔

"دیکھو شمن! تم میرا بھید لے رہی ہو لیکن کسی اور سے ذکر نہ کرنا۔"

"نہیں بھئی! تم بھی کس الجھن میں پھنسی ہو۔"

"قسم کھاؤ۔"

"کران کسم۔ اللہ کسم۔"



"قران پاک کہا کر وگمن چپکر کہیں کی۔"

"کران پاک قسم۔"

اب پھر تم تامل کرتی ہو لیکن کچھ کہے بغیر چارہ کار بھی کیا ہے۔

"شمن بھئی! یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا تھا ..... "

"چھپی رستم کہیں کی۔" شمن ٹوکتی ہے۔

"کل غضب ہو گیا۔ اس راز کا سائیں جی کو بھی پتہ چل گیا ہے۔"

"اوئی اللہ۔ وہ کیسے؟"

"کچھ دن پہلے اُدھر سے رقعہ آیا ..... لیکن پتھر الگ ہو گیا اور رقعہ اُڑ کر سائیں جی کے اوپر والے کمرے میں جا گرا ..... "

"اوئی میّا۔"

"میں تو بوکھلا گئی ...... یعنی اس وقت تو اتنا بھی پتہ نہیں چلا کہ رقعہ سائیں جی کے وہاں گرا ہے۔ میں سمجھی بیٹھی تھی کہ گلی میں گرا ہے اور کسی کے ہاتھ لگتے ہی محلے بھر میں بدنامی ہو جائے گی۔ ..... یقیناً ایسا ہی ہوتا اگر ..... اور پھر اس رقعے کے ساتھ میرا رقعہ بھی تو تھا۔ کیسی خطرناک بات تھی۔ معلوم ہوتا ہے سائیں جی نے کسی سے اس کے بارے میں اب تک کچھ نہیں کہا ورنہ بات تو پھیل جاتی ..... "

"ہاں یہ تو ہے ..... اور سائیں جی سے یہ رقعے تمہیں کیسے ملے؟"

"میں کھڑکی کے آگے کھڑی تھی انہوں نے خود ہی پھینک دیئے ..... "

"کچھ کہا بھی انہوں نے۔"

"نہیں۔"

"بالکل کچھ بھی نہیں ..... "

"ہاں ..... نہیں ..... اوہ ..... وہ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن تم جانو میرے تو حواس ہی گم ہو گئے تھے۔ اس بوکھلاہٹ میں میں نے کچھ نہیں سنا ..... بلکہ کھڑکی بھی بند

کردی . . . . . "

"سنتیں تو ہو کہتے کیا ہیں . . . . . "

"کہانا . . . . . میرے حواس . . . . . "

"اب کیا ہو گا . . . . . "

"نہ جانے "

"شاید وہ تمہارے ابا سے شکایت کریں "

"ہو سکتا ہے ـــــ لیکن شکایت کرنی تھی تو اب تک کر چکے ہوتے "

"پھر کیا تمہیں کچھ انعام دینگے ؟"

"دھت تری کی "

"یہ کیا ؟"

"ـــــ ٹھنڈے دل سے سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ ابا سے شکایت تو نہ کریں لیکن کسی طریقے سے ایسا اشارہ کریں جس سے ابا ذرا خبردار ہو جائیں . . . . . "

"اچھا رجی بھئی ! ہمیں تو تمہیں سے ہمدردی ہے ۔ اگر ہماری مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ "

"میں کیا بتاؤں . . . . . پر سنو ہو سکتا ہے سائیں جی ابا سے ملنے آئیں کبھی ۔ آئیں گے تو رات ہی کو آئینگے جب ابا دوکان سے لوٹتے ہیں . . . . . اگر ـــــ "

"بولو۔ بولو اگر کیا ؟"

"ـــــ دیکھو نا ! میری وہاں تک پہونچ ہو نہیں سکتی ۔ اگر تم قریب چھپ کر سنتی رہو تو ان کے ارادوں کا پتہ چل سکتا ہے ۔ تمہیں کہو منظور ہے ؟"

شمن سینہ پر ہاتھ مار کر کہتی ہے "میری جان مَن جُو رہے "

شام کے وقت سائیں جی آتے ہیں تمہارے ابا کے پاس بیٹھے ہیں ۔ تم گھبرائی گھبرائی پھر رہی ہو ، کام کر رہی ہو لیکن دھیان کہیں اور ہے ۔ آخر گھبرانے کی کیا بات ہے ۔ سائیں جی اکثر آتے ہیں ۔ گھنٹوں تمہارے ابا سے گپ ہانکتے ہیں ۔ کوئی نئی بات ہے نہیں . . . . . . پر دل کے چور کو کون سمجھائے ۔ اور شمن . . . . . . نہ جانے کہاں مر کے رہ گئی ۔ کیسے کیسے دعوے کرتی تھی ۔ یوں کروں گی یاں کروں گی موقعہ پڑا تو غائب ۔ آج ہی اس کمبخت کو کام سوجھنے تھے دنیا بھر کے ۔ مردود کہیں کی ۔

نہ جانے سائیں جی کی ابا سے ملاقات اس قدر طول کیوں پکڑ گئی ہے ۔ سچ مچ ؟ ہو سکتا ہے گھبراہٹ

میں تم ایسا سمجھ رہی ہو۔ اُدھر وہ اپنی دنیا بسائے موج سے باتیں کر رہے ہیں بلکہ بے پر کی اڑا رہے ہیں۔ حقّے کے دھوئیں کے ساتھ ساتھ قہقہے اڑا رہے ہیں۔ ادھر تم اپنی چھوٹی سی دنیا میں بے چین و بے قرار ہو۔ ابھی تمہاری زندگی کی صبح ہو رہی ہے۔ ہر شے نئی نئی ہے۔ دنیا کی ہر ادا حسین نظر آتی ہے۔ تمہارے دل میں خلوص اور پیار کے سوا کیا دھرا ہے۔ سچ پوچھو تو یہ دُنیا تمہارے ایسی لڑکیوں کے رہنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر تم پر گھر والوں کا سایہ نہ ہو تو نہ جانے کون بھیڑیا تمہیں ہڑپ کر جائے۔ مگر تمہیں یہ بات کون سمجھائے۔ اور اگر سمجھائے بھی تو تمہارا حسن پھیکا نہیں پڑ جائے گا۔ تمہاری آنکھوں میں چمکنے والے ستارے بجھ نہیں جائیں گے؟ . . . . . . . . . . . . تمہارے رخسار و لب کے گلاب مرجھا نہیں جائیں گے؟ . . . . . . اس لئے جیو رضیہ! جیو! اس وقت تک جیو جب تک اس دُنیا کی حقیقت تم پر ظاہر نہیں ہو جاتی۔ یہ حادثہ نہ جانے کب ہو جائے ــــــ اس کے بعد تم زندہ نہیں رہ سکو گی . . . . . . یاد رہے آنکھوں کا جھپکنا اور ہاتھ پاؤں کا چلنا زندگی نہیں ہے . . . . . . . . اس طرح کے زندہ مردے تمہیں ہر طرف دکھائی دیں گے۔ وہ زندہ نہیں زندہ لاشیں ہیں۔ یہ جینا دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک وہ لوگ جو اپنی دانست میں بڑے معرکے مارتے ہیں۔ آس پاس کے انسانوں کا ، الّو ، بنا کر اپنا الّو سیدھا کرتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتے ہیں۔ جدھر کوئی لہر بہا کے لے گئی بہہ گئے ــــــ لیکن ان دونوں صورتوں میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی ــــــ زندگی سے وہ آنکھ مچولی کی سی کیفیت ــــــ جو اب تمہاری زندگی میں موجود ہے . . . . . . جب تک خدا کو منظور ہے . . . . . . سچ پوچھو تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ دُنیا خدا کی رچائی ہوئی نہیں ہے۔ خدا کی اس قدر کمل ذات اس دنیا کا سا ادھورا اور بے معنی کھیل رچائے ہے ــــــ مجھے یقین نہیں آتا ــــــ یہ تو دیوتاؤں کی رچائی ہوئی دنیا معلوم ہوتی ہے۔ دیوتا ــــــ بیکوقت ارفع بھی ہیں اور اپنے احساسات کے غلام بھی ــــــ لیکن بھئی یہ تو اپنے اپنے ایمان کی بات ہے اس لئے میں اس سلسلے میں اور کچھ نہیں کہوں گا۔ میں تو دیوتاؤں . . . . . . یا خدا سے دُعا کر سکتا ہوں کہ رضیہ کو جب تک خوش رکھ سکتے ہو رکھو . . . . . . اسکی دُنیا چھوٹی سی ہی رہنے دو . . . . . . ایک ننھی سی پھلواری کی طرح . . . . . . .

تم ــــــ تم کیا جانو کہ تمہارے گھر کی چار دیواری کے باہر کیا ہو رہا ہے۔ کتنا بڑا دیش ہے تمہارا۔ . . . . . کتنی تعداد میں لوگ رہتے ہیں یہاں . . . . . . کیسی کیسی بولیاں بولتے ہیں وہ۔ کیسی کیسی چوٹیاں، کیسی کیسی ڈاڑھیاں اور کیسے کیسے بھیس رکھتے ہیں یہ لوگ۔ کیسے کیسے نبی، کیسے کیسے گورو، کیسے کیسے اوتار پیدا

ہوئے ان لوگوں کو گناہوں سے بچانے کے لئے ........ اب ان سچائیوں کو بچانے کے لئے کیا کیا جتن کر رہے ہیں یہ لوگ کیسے کیسے سیاست داں ہیں ان کے سرپرست ـــــ ان کے ناخدا بنے ہوئے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے دفعتاً انہیں ایک دوسرے سے عظیم خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اور ایک دوسرے کی بوٹیاں اڑانے کے لئے کیا کیا منصوبے باندھے جا رہے ہیں۔ ....

..... لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ..... نئی بات تو تمہارے ایسی لڑکیوں کا وجود ہے۔ پھر مشکل یہ ہے کہ بالکل تمہاری ایسی لڑکیاں ہندو بھی ہوتی ہیں سکھ بھی۔ پارسی بھی، عیسائی بھی امریکن بھی۔ جاپانی بھی۔ روسی، افریقی بھی ـــــ غرض کہاں تک گنوایا جائے ....... کوئی حد ہی نہیں۔

یوں پوچھو تو کسی کو تمہاری اس محدود دنیا پر اعتراض نہیں ہے۔ آخر کسی کا کیا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود ...... اس کے باوجود ایسی ننھی منھی دنیائیں ضرور برباد کی جائیں گی۔ ان پر ایٹم بموں سے بھی زیادہ خطرناک بم گرائیں گے۔ خوب خوب خون بہایا جائے گا۔ خوب خوب روس کی دنیائیں برباد کی جائیں گی۔ مقصد؟ منزل؟ ان چیزوں کا کچھ پتہ نہ ہو گا کسی کو۔ کیوں کہ اصل چیز ہو گی خون، بربادی، تباہی اور بس۔

"اے رجو بٹیا! توے پر روٹی ڈالو۔ تمہارے ابا آ رہے ہیں مردانے سے ....." یہ تو تمہاری امی کی آواز ـــــ آواز جا رہی ہے۔" اور موئی شمن کہاں گئی ـــــ کلو نہی"

اے لو ـــــ موئی یا کلو نہی شمن بھی آ گئی۔ جیسے پیڑ سے بیر ٹپک پڑے۔

دیکھو تو کیسی بھیگی بلی بنی تمہارے ساتھ سمٹ کر بیٹھی ہے۔ کہتی ہے۔

"اجی رجو بہن سلام کہتی ہوں"

تم دبی آواز میں ڈانٹتی ہو" ذرا دھیرے سے ـــــ طوطا چشم کہیں کی"

"کیوں جی! کیا طوطا چشمی کی ہے ہم نے"

"واہ دا بڑی بھولی بنتی ہو"

"بھولے تو ہیں ہی ہم"

"کیوں نہیں، بس دو چار تمہارے ایسے بھولے سارے شہر کو لے ڈوبیں"

"ٹھیک ہے تمہارے منہ سے نہ پھیے گی تو کس کے منہ سے پھبے گی یہ بات"

"ہاں ہاں میرے لئے بڑی جان جوکھوں میں ڈالی ہے تو نے ..... ذرا آج کام پڑا ..... تو غائب"

"غائب؟ ..... غائب کہاں"

"تیری جانے جوتی"

"ہاں جی ٹھیک ہے تمہاری جوتی ہی تو جانے کہ کدر کو کچھ مالوم جو نہیں"

"معلوم کیا نہیں"

اس پر شمن کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کر گرنے لگتے ہیں۔

"یہ آنسوے بہانے کا مطلب"

"تمہیں مطلب؟"

"آخر پتہ تو لگنا چاہیے"

"تمہاری جوتی سے"

"خیر جو بھی ہو رونا بند کرو اتی نے دیکھ لیا تو بس ....."

"ٹھیک ہے چت بھی میری پٹ بھی میری ...... جبر جبت مارے رونے بھی نہ دے"

"کبھی تم تو سر کے بالوں کو آتی ہے آخر بت ذکی کیا بھید ہے۔ یہ کیا پہیلیاں بجھا رہی ہو؟"

"مار دو گھنٹے تک چھپے باتیں سنتے رہے سائیں جی کی اور انعام دیا، بے گم جی نے یہ"

"اری سچ! ..... سچ باتیں سنی تو نے"

"اور نہیں تو کیا"

"ہائے قربان جاؤں، صدقے جاؤں تجھ پرسے۔ ے اب رونا دھونا بند کر .. ... بتا میری بات بھی ہوئی کوئی؟"

"ہوئی"

"میرا تو کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا ہے ...... بتا دے کیا کہا انہوں نے"

"ڈرو مت کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی"

"جیسی بھی ہوئی ہو بولو کہہ ڈالو"

"سائیں جی نے تمہاری بات چھیڑ کر کہا۔ حاجی صاحب بٹیا کی شادی کر ڈالو"

"ابا کیا بولے"

"بولے ہاں کر دینگے پر کوئی لڑکا بھی تو ملے"

پھر سائیں جی نے کیا کہا؟"

"بولے ..... بٹیا کے لئے لڑکوں کی کیا کمی؟"

"اچھا تو آبا کیا بولے"

"کہا سائیں جی آپ ہی مدد کیجئے"

"ارے رے رے ..... تو سائیں جی ...."

"سائیں جی کچھ نہیں بولے چپ چاپ حقہ گڑگڑاتے رہے ......"

اس گفتگو کو دو ہفتے گزر چکے ہیں لیکن تمہاری حالت میں انقلاب سا آ گیا ہے۔ تم سخت مایوس ہو چکی ہو۔ اب تم کھڑکی کھول کر میدان کی طرف کبھی نہیں جھانکتیں۔ حالانکہ شمن تمہیں اکثر بتاتی ہے کہ وہ میدان میں کھڑا ہے لیکن تم سمجھ چکی ہو کہ یہ عشق وشق بے کار ہے۔ نہ تمہارے اندر اتنا دم ہے کہ تم اسے محبت کے سلسلے کو جاری رکھ سکو کیونکہ تم جانتی ہو ....... کہ ....... تمہارا وہ، تمہارا نہیں ہو سکتا۔

تم اکثر فرصت کے وقت اسی کمرے میں گزارتی ہو جہاں محبت کی نشانی وہ کھڑکی ہے جس میں سے جھانک کر تم اپنے پیارے کے درشن کیا کرتی تھیں۔ ایسی ہی یہ ایک دوپہر ہے شمن اور تم دونوں چارپائی پر بیٹھی ہو۔ تم چپ ہو، گال زرد، آنکھوں کے تلے گڑھے، ہونٹ خشک۔

کھڑکی پر کھٹ کھٹ لگنے کی آواز آتی ہے، شریر شمن فوراً اٹھ کر کھڑکی کے پٹ کھول دیتی ہے .....

وہ ...... اوہ ..... سامنے سائیں جی کے مکان کی کھڑکی میں ....... تم اداس آنکھیں اٹھا کر دیکھتی ہو ...... تمہاری کمزور سی آواز نکلتی ہے "کون؟"

شمن شوخی سے کہتی ہے "اری وہی ..... تمہارے وہ!"

# وہ

وہ! ...... وہ حمید تھا۔

اس نے کھلی کھڑکی میں سے رضیہ کو دیکھا، اور ابھی جی بھر کر دیکھ بھی نہ پایا تھا کہ وہ آگے بڑھی ...

.... ایسے جیسے وہ نیند کی حالت میں چل رہی ہو ..... پہلے وہ سمجھا کہ رضیہ آگے بڑھ کر اس سے

کچھ کہنا چاہتی ہے۔ لیکن اس نے بغیر کچھ کہے سنے کھڑکی کے پٹ بڑے زور سے بند کر دیئے . . . . خدا خدا کرکے اس کھڑکی کے پٹ کھلے تھے . . . . . مگر . . . . . .

آخر یہ کیا معمہ ہے۔ وہ سوچنے لگے۔

کیا رضیہ بدل گئی ہے . . . . . . کیا اس کی شادی کہیں اور طے ہوگئی ہے۔ لیکن رضیہ ! بے وفا رضیہ !! اتنی جلدی بھول جانے والی رضیہ !!! . . . . . تم حیدر کو بھلا بھی دو تو کیا حیدر بھی تمہیں بھلا سکے گا ؟

مگر نہیں ـــــ حیدر نے سوچا۔ اس قدر جلد بازی سے کام لینا مناسب نہیں ہے۔ سائیں جی نے پرسوں ہی تو کہہ رہے تھے کہ رضیہ کی شادی کہیں طے نہیں ہوئی ـــــ رضیہ بے وفا نہیں . . . وہ مجھے ہرگز نہیں بھلا سکے گی . . . . . .

کون جانے ، رضیہ ایک نوعمر معصوم پردہ دار لڑکی کن مصائب میں گرفتار ہے۔ اور پھر مجھے یہ اس سائیں جی کے مکان میں دیکھ کر بھی تو وہ بوکھلا گئی ہوگی۔

حیدر کمرے میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس کے ذہن میں خیالات بہجوم در ہجوم چلے آرہے تھے۔ وہ خود پریشان تھا کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔

اتنے دنوں بعد رضیہ کی صورت نظر آئی تھی لیکن اب اس کی شکل کس قدر بدل گئی تھی . . . . .
وہ کس قدر کمزور، اداس، اور مضمحل سی نظر آتی تھی . . . . . اور وہ ایک لڑکی ، . . . . . وہ لڑکی کون تھی لباس اور صورت سے تو نوکرانی ہی دکھائی دیتی تھی . . . . . .

بہتر ہو کہ میں اسے ایک چٹھی لکھ ڈالوں۔ اور یہ چٹھی کسی نہ کسی طرح وہاں تک پہنچ ہی جائے گی . . . . .
سارے حالات جاننے کے بعد وہ بھی جواب دے سکے گی۔

یہ سوچ کر حیدر اسی وقت تپائی کے قریب بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کاغذ سامنے رکھا اور قلم کے سرے سے پیشانی بجانے لگا۔ اور پھر لکھنا شروع کیا۔

میری رضیہ

پیار

دفعتاً سائیں جی کے کمرے میں دیکھ کر تم یقیناً گھبرا گئی ہوگی تمہاری گھبراہٹ ایک قدرتی امر تھا۔ مگر پہلے میں تمہیں جلدی سے بتا دوں کہ میں یہاں کیسے پہونچا۔

میں یہاں خود بخود نہیں آیا بلکہ لایا گیا ہوں۔ کیسے ؟ تم حیران رہ جاؤ گی۔

پچھلے دنوں جب تمہاری کھڑکی سدا بند رہنے لگی تو بھی میری آمد و رفت بدستور جاری رہی۔ اگرچہ میں حیران تھا کہ آخر اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔

ہاں ان چٹھیوں کے بارے میں بھی میں بہت پریشان ہوں ...... آخر تمہیں بتانا تو چاہیئے تھا کہ تم پر کیا گزری۔ اس طرح خاموش ہو جانا تو سچ مچ بڑی حماقت کی بات تھی۔

خیر جیسا کہ میں نے کہا کہ میں ہر روز آتا اور گھنٹوں کھڑکی کے آگے ٹہلا کرتا۔ مگر تم نے تو گویا قسم ہی کھالی کھڑکی نہ کھولنے کی۔

پانچ روز پہلے کی بات ہے کہ میں حسبِ معمول ٹہل رہا تھا کہ سائیں جی نہ جانے کہاں سے وہاں آپہنچے انہیں دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے میں نے یونہیں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانی شروع کر دی۔ قریب پہونچ کر سائیں جی نے پوچھا بیٹا! کچھ گم ہو گیا ہے؟ جی ہاں — میری میز کا ایک پیپر ویٹ گر گیا ہے۔ وہ بولے۔ یہ سامنے کا مکان میرا ہی ہے۔ نوکر نے اسے کھڑکی میں رکھ دیا۔ نہ جانے کب گر گیا ہے تو پیپر ویٹ مجھ کسی نے بطور تحفہ دیا تھا۔ اس لئے اسے تلاش کرنے کے لئے اِدھر چلا آیا ہوں۔"

میں نے بھی اپنی خدمات پیش کر دیں۔ ان کے ساتھ مل کر پیپر ویٹ تلاش کرنے لگا۔ جو ہمیں ملا نہیں۔ خوش قسمتی سے، انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ میری کیا شے گم ہو گئی تھی۔ باتوں باتوں میں تکلف دُور ہو گیا۔ کچھ سیدھی باتیں چھڑ گئیں۔ تم جانتی ہو میں مسلم لیگ کا سرگرم کارکن ہوں۔ انہیں میری ذات سے دلچسپی سی پیدا ہو گئی۔ مجھے کہنے آئے۔ میں نے بھی موقعہ غنیمت جانا اور جلد ہی ہماری گاڑھی چھننے لگی۔ سائیں جی بڑے بھولے بادشاہ ہیں۔ کچھ نہیں سمجھتے۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے تمہارے بارے بھی ان سے معلومات حاصل کیں۔

قیاس کہتا ہے کہ تمہارے گھر والوں کو ان چٹھیوں کی کچھ خبر نہیں ہے۔ اور نہ تمہاری شادی وادی ہی نہیں ہو رہی ہے۔

اچھا اب تم سارا حال لکھو۔ تم پر کیا گذری۔ اور مجھ سے ایسی بے رخی کی وجہ کیا ہے۔
دیکھو کتنی لمبی چٹھی لکھی ہے۔ تم بھی ذرا تفصیل سے لکھنا۔

ہمیشہ تمہارا

حیدر

اس نے چٹھی کورے لفافے میں بند کر کے رکھ دی۔ اب اسے رضیہ تک پہونچانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اس کے لئے حیدر کو دو دن انتظار کرنا پڑا۔ کیونکہ کھڑکی کھلی نہیں۔ ایک ذریعہ وہ لڑکی ہو سکتی تھی جو رضیہ کے

ساتھ کمرے میں کھڑی تھی۔ وہ دن میں بار بار اس محلے میں جاتا۔ سائیں جی سے ملاقات کا سہارا تو مل ہی چکا تھا۔ لیکن وہ لڑکی (شمن) کہیں نظر نہ آئی۔

تیسرے دن وہ کنویں پر کھڑی دکھائی دی۔ پہلے تو حمید ادھر اُدھر ٹہل کر یہ جاننے کی کوشش کرتا رہا کہ آیا وہ وہی لڑکی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ غلطی سے کسی غیر کے ہاتھ چٹھی پڑ جائے۔

خاصی دیر تک جانچنے کے بعد بھی اسے پورا اطمینان نہیں ہوا۔ پھر دفعتاً لڑکی نے اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دی۔ اس سے اسے یقین آ گیا کہ ضرور لڑکی نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اور یہ وہی لڑکی ہے۔ کنویں پر ایک آدھ بار لڑکی کا نام بھی پکارا گیا۔ تو اب وہ اس کے نام سے بھی واقف ہو گیا ——— کچھ دیر بعد شمن پانی کی بالٹی لئے گلی کے نکڑ پر پہونچی تو حمید نے آواز دی۔

"شمن"

اپنا نام سن شمن بہت گھبرائی لیکن رُک گئی حمید نے چپکے سے لفافہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے جلدی سے سرگوشی میں کہا۔

"رضیہ کے لئے ہے۔ کوئی اور کھونے نہ پائے" یہ کہہ کر وہ تو آگے بڑھ گیا ......

... اور شمن گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ مگر خیریت گزری۔ کسی کی توجہ ادھر تھی ہی نہیں۔

وہ چٹھی چھپائے رضیہ کے پاس پہنچی وہ اس وقت انگیٹھی میں ڈالنے کے لئے پتھر کے کوئلے توڑ رہی تھی۔

شمن نے قریب بیٹھ کر کہا۔

"اے جی"

وہ چپ رہی۔

"او جی"

وہ پھر چپ۔

"چُپ شاہ کا روزہ رکھا ہے کیا"

وہ پھر بھی نہ بولی۔ اس پر شمن نے اس کی ایک بھرپور چٹکی لی۔

"اوئی"

"جی"

"کیا ہے ...... کیوں جلی کو جلاتی ہو"

"ہم اس پر ڈالنے کے لئے کنویں سے تازا ور ٹھنڈا پانی لائے ہیں۔"

"اپنے سر پر ڈال لو نا یہ پانی۔"

"میرے سر پر ڈالنے سے تمہاری آگ کیسے بجھے گی۔"

"بیکار بیکار تنگ مت کیا کرو۔"

"ہم جب تنگ کرتے ہیں تو اس کا کچھ مطلب ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے ہم بھی تو جانیں . . . . ."

"پوچھو تو بتائیں۔"

"پھر آ گئی اپنی اوقات پر۔"

"نہیں پوچھو تو بتائیں گے بھئی۔"

"اچھا پوچھتے ہیں۔"

اس پر شمن نے تامل کیا۔ اور پھر معاً آنکھیں نچا کر بولی۔

"آپ کے وہ ملے تھے۔"

"میرے وہ . . . . . ہٹ پاجی۔"

"سچ۔"

"دُر۔"

"نہیں مانتیں؟"

"بھئی ہمیں ستایا نہ کرو۔"

"اس میں ستانے کی بات ہے؟"

"اب بکواس جو کر رہی ہو۔"

"بکواس نہیں ٹھیک بات کہہ رہے ہیں۔"

"ہٹ۔"

"پھر ہٹ؟ اگر ثبوت پیش کر دیں تو۔"

"ثبوت؟"

"ہاں پکا ثبوت۔"

اب رضیہ کے ہاتھ رُک گئے۔

" دیکھ اب پٹے گی میرے ہاتھ سے "

" کون جانے ——— ہو سکتا ہے پٹنے کی بجائے مٹھائی کھلانی پڑے تم کو ———"

" اچھا تو کھلاؤں مٹھائی ؟"

" کھلاؤ "

رضیہ نے کوئلے توڑنے والا ڈنڈا اوپر اٹھایا تو شمن نے لفافہ اس کے آنکھوں کے آگے نچا دیا۔

" یہ لفافہ کیسا ہے "

" مٹھائی کھلاؤ "

" بتاؤ نا بھئی "

" اچھا پہلے یہ ڈنڈا نیچے کرو "

" یہ لو نیچا کر دیا "

" تو یہ لو ثبوت تمہارے ہاتھ میں پہونچ گیا "

رضیہ نے لمحہ بھر تک لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اوپر والے سنسان کمرے کی طرف دوڑ پڑی۔

مارچ ۱۹۴۷ء میں لاہور فرقہ وارانہ فسادات کا شکار ہو گیا۔ اب یہ آگ امرت سر کے بہت قریب آن پہنچی تھی۔

حیدر مسلم لیگ کا ایک سرگرم کارکن تھا۔ حالاں کہ وہ عمر کے لحاظ سے نوجوان ہی تھا۔ لیکن اس کے سیاسی خیالات خاصے سلجھے ہوئے تھے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ مسلمانوں کے لئے الگ پاکستان بننا ہی چاہئے۔ اس کے حق میں وہ کئی دلائل پیش کر سکتا تھا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ اگر ہندو مسلمان الگ الگ حصوں میں رہیں تو ان کے تعلقات بہتر ہو سکیں گے۔ اس طرح سے وہ اپنے کلچر کو ابھار سکیں گے، اور ہمیشہ کے لئے دو اچھے ہمسایوں کی طرح ایک دوسرے سے ہمدردی اور پیار کریں گے۔ اس کے سینہ میں ایک پُر خلوص سادا، اور معلوم دل دھڑکتا تھا۔ وہ ان فسادات اور جھگڑوں کے حق میں نہیں تھا۔ لیکن اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر پاکستان کے حصول کی راہ میں ہندو یا سکھ اس حد تک مزاحمت کریں کہ لڑائی ناگزیر ہو جائے تو مسلمانوں کو اس کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے۔

لاہور سے بُری بُری خبریں آ رہی تھیں۔ امرتسر میں بھی باہمی کشیدگی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ اور نہیں کہا کہا جا سکتا تھا کہ کس وقت کیا ہو جائے۔

رضیہ کا محلہ ہندو، سکھ اور مسلمانوں کا ملا جلا محلہ تھا۔ لیکن حیدر خالص اسلامی محلے میں رہتا تھا۔ ہر چند

جانب افواہیں پھیل رہی تھیں کہ فلاں قوم فلاں پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ ہندو، سکھ اور مسلمان اپنے اپنے محلوں میں خفیہ جلسے منعقد کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کی طاقت کے جائزے لئے جا رہے تھے۔ حالاں کہ پبلک کے ذرائع محدود تھے۔ لوگ بندوقیں یا اور خطرناک قسم کے ہتھیار حاصل نہیں کر سکتے تھے پھر بھی جو کچھ بن پڑا۔ انہوں نے اکٹھا کیا مثلاً لاٹھیاں، چاقو، بھالے، تیزاب، گھروں کی چھتوں پر اینٹیں وغیرہ۔

حیدر کے لئے یہ بڑی مصروفیت کے دن تھے۔ اسے بار بار رضیہ کا خیال آتا تھا۔ اس کی معصومیت کا خیال آتا تھا۔ بھلا وہ غریب ان سب باتوں کو کیا سمجھے؟ لیکن یہ سب پیچیدہ مسائل یہ فسادات یہ نفرت، یہ کشمکش ——— ان میں سچ پوچھے جانے کی کوئی بات بھی ہے۔ کبھی وہ اپنی محبت پر غور کرنے لگتا۔ دو دل دنیا میں کتنی کم جگہ چاہتے۔ کس قدر کم مانگیں ہیں ان کی ——— دو دلوں کی دُنیا کس قدر سادہ، مختصر ——— اور پھر کس قدر وسیع ہے . . . . . اونہہ یہ سب جذباتی باتیں ہیں۔ خیالی اڑانیں . . . . . لیکن یہ سیاسی کشمکش، یہ تہذیب اور تمدن کے نام پر باہمی لڑائیاں . . . . . کیا یہ بہت اونچی چیزیں ہیں۔ کیا یہ جذباتی چیزیں نہیں ہیں؟ . . .

فرض کیا دو گروہوں میں شدید اختلافات ہیں ہی تو اس سے زیادہ سادہ حل اور مبنی بر انصاف فیصلہ کیا ہو سکتا ہے کہ وہ دو گروہ الگ الگ رہنے پر رضامند ہو جائیں . . . . . مگر ہندو اور سکھوں کے دماغ میں یہ بات گھس ہی نہیں پاتی تھی۔ یہی لوگ فتنے پر فتنے کھڑا کئے جا رہے ہیں

اس طرح گھنٹوں اس کا دماغ ان مسائل کی پیچیدگیوں میں گم رہتا، وہ اپنی عقل اور سوجھ بوجھ کے مطابق انہیں سمجھنے کی کوشش میں لگا رہتا . . . . . حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اب اس کا شہر کے ہر محلے میں بے دھڑک آنا جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اگر اسے رضیہ کی چٹھی کا انتظار نہ ہوتا تو وہ جان خطرے میں ڈال کر ان کے محلے کے چکر نہ لگاتا۔

ایک روز جب کہ وہ سائیں جی کے گھر میں اکیلا بیٹھا تھا۔ سائیں جی ذرا بھینس کو تھپتھپا رہے تھے ——— شمن آئی اور بڑی ہوشیاری سے ایک رقعہ اس کے قریب پھینک کر چلتی بنی۔

وہ بہانہ کر کے سائیں جی سے رخصت لے کر اپنے گھر پہونچا اور تنہائی میں رقعہ پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔

آپ ادھر محلے میں نہ آیا کریں۔ شہر میں گڑبڑ ہے اس رقعے میں سب کچھ لکھے دیتی ہوں لیکن وعدہ کیجئے کہ جب تک ہنگامہ ہے تب تک آپ ادھر کا رُخ نہ کریں گے۔

- آپ کہتے ہیں کہ سائیں جی بڑے بھولے بادشاہ ہیں لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ وہ سب

کچھ جانتے ہیں۔ کیونکہ وہ دو رقعے جو آپنے ہماری کھڑکی میں پھینکے تھے وہ انہیں کے گھر میں جا گرے تھے ۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ انہوں نے وہ رقعے ضرور پڑھے ہوں گے۔ اور پھر خاص بات یہ ہے کہ انھوں نے دونوں رقعے ہماری کھڑکی میں پھینک دیئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا یہ ارادہ نہیں تھا کہ میرے والدین کو اس امر کا پتہ چلے ۔ اتنے دن گزر گئے انہوں نے اگر والد صاحب سے اشارہ کیا ہوتا تو مجھ پر قیامت آجاتی ۔ لیکن ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ اس لئے میں نے تو یہی نتیجہ نکالا ہے کہ انہیں ہم سے ہمدردی ہے۔

مجھے تو یہاں تک شک گزرتا ہے کہ آپ کی بھی ان کی راہ ورسم محض اتفاقیہ نہیں ہے انہوں نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے۔ اس لئے میری تو رائے یہی ہے کہ آپ ان سے راز کی بات کہہ دیں۔ وہ ہمدرد بھی ہیں اور بزرگ بھی ممکن ہے کہ ان کی مدد اور دعا سے ہمارا بیڑا پار لگ جائے۔

یہ جھگڑے رگڑے جو پنجاب میں چل رہے ہیں مجھے ان سے کچھ دلچسپی نہیں ہے۔ میں کم عقل ہوں غالباً ان معاملات کی تہہ کو نہیں پہونچ سکتی۔ لیکن مجھے ہندو سکھوں سے قطعاً کوئی نفرت نہیں ہے۔ وہ بھی تو اللہ کے بندے ہیں۔ انہیں بھی اللہ نے پیدا کیا ہے۔ وہ بھی ہماری طرح کے انسان ہیں۔ ہو سکتا ہے میں بڑی ناسمجھی کی بات کہہ رہی ہوں لیکن میری عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ آخر سب لوگ چاہتے کیا ہیں مجھ سے کوئی پوچھے تو میں کہوں گی کہ میں آپ کو چاہتی ہوں میں چاہتی ہوں ہم دونوں کا ایک گھر ہو۔ ہمارے اڑوس پڑوس بے شک ہندو بھی ہوں سکھ بھی رہیں یا کوئی اور بھی رہے۔ ہم اپنے طریقے سے رہیں وہ اپنے طریقے سے رہیں۔ ہم ایک دوسرے سے محبت کریں۔ ایک دوسرے سے ہمدردی رکھیں۔ ..
..... لیکن اور لوگوں کو اس طرح رہنے کا شوق نہیں ہے ؟ ——— اور اگر ہندو مسلمان ایسا محسوس کرتے ہیں وہ لوگ الگ الگ وطن بنانا چاہتے ہیں۔ تو سب اسی پر رضامند کیوں نہیں ہو جاتے۔ آخر اس لڑائی بڑائی اور خون خرابے سے حاصل کیا ہوگا ....... ؟ آپ بڑے سیاست داں بنے پھرتے ہیں۔ جھگڑے ٹنٹے نپٹانا آپ کا کام ہے۔ نہ جانے آپ لوگوں کی سیاست کیا کہتی ہے اس باب میں ———

آج تو میں بہک سی گئی ہوں۔ اب اور زیادہ نہیں بہکوں گی۔ اس لئے چٹھی ختم کرتی ہوں اور آپسے درخواست کرتی ہوں کہ آپ یونہیں بلا وجہ بے دھڑک نہ گھوما کریں۔ مجھے ہر وقت اس کی فکر لگی رہتی ہے۔ بہتر ہے اگر آپ اس وقت تک کہ جب تک شہر میں دھاندلی مچی ہے ادھر ادھر آنا جانا ترک کر دیں۔

ہمیشہ آپ کی

رضیہ

بھلا حیدر کوچۂ جاناں میں جانے بغیر کیوں کر رہ سکتا تھا۔ اسی شام وہ سائیں جی کے ہاں پہونچا۔ اسے رضیہ کی تجویز پسند آئی تھی کہ وہ سائیں جی سے اس معاملے پر گفتگو کرے حالاں کہ اسے بڑی شرم محسوس ہو رہی تھی کہ گفتگو کا آغاز کیونکر پائے گا۔ سارے حالات معلوم ہو جانے کے بعد اسے یقین سا آ گیا کہ ضرور سائیں جی کی نیت بخیر ہے، اور وہ ان دونوں کے ہمدرد ہیں۔

سائیں جی کے پاس پہونچ کر اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔

اس وقت سائیں جی چلم تازہ کئے ایک بیچوان حقے سے شغل فرما رہے تھے۔ اُدھر دھواں فضا میں پیچ و تاب کھاتا اڑ رہا تھا اور اِدھر دل میں کچھ کہنے کہہ ڈالنے کی امنگ پیدا ہوتی اور کلبلا کر رہ جاتی۔ اتنے میں سائیں جی بول اٹھے۔

"کہو برخوردار رقعہ پڑھ چکے ؟"

حیدر چونکا۔ دیکھا کہ سائیں جی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ اسے حیرت اس امر پر تھی کہ جس وقت شمن نے اسے رقعہ دیا تھا۔ اس وقت سائیں جی ان کی طرف پشت کئے گائے کو تھپتھپا رہے تھے۔ تاہم حیدر نے انجان بنکر سوال کے جواب میں سوال کر دیا۔

"کیسا رقعہ ؟"

"وہی جو تمہیں ملا تھا۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

"جو شمن نے لا کر دیا تھا۔"

"شمن نے ؟"

اس پر سائیں جی نے اسے اپنے پاس بٹھلاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو صاحب زادے! اب تم اس منزل پر پہنچ چکے ہو جہاں پر تمہیں ایک خضرِ راہ کی ضرورت ہے ..... اس لئے ہوشیار۔"

یوں تو حیدر بھی ٹھانے ہوئے تھا کہ سائیں جی کو دل کا حال کہہ سنائے گا۔ لیکن اس اچانک حملے نے اسے بوکھلا دیا تھا۔ جو بات وہ ہیر پھیر سے کہنا چاہتا تھا اس کا اس قدر کھلم کھلا اعتراف کرنے میں اسے تامل ہو رہا تھا لیکن سائیں جی کے دستِ شفقت کے زیرِ اثر وہ کچھ اور کر بھی کیا سکتا چنانچہ اس نے سر جھکا کر کہا۔

"سائیں جی آپ اصل ماجرا بھانپ چکے ہیں .... آپ کے سامنے اس امر کا اعتراف کرنے میں جھجک محسوس ہوتی تھی۔"

"ہاں بیٹا۔ حیدر! بھانپ تو گیا ہوں۔ بلکہ بہت مدت سے اس راز سے واقف ہوں۔ لیکن میں نے دخل نہیں دیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ البتہ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ میرا دخل دینا ضروری ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھ سے کچھ پردۂ راز میں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں تم دونوں کی بہتری و بہبود چاہتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ کیونکہ اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ بزرگ لوگ ان باتوں کو بہت بُرا سمجھتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"درست ہے یہ راستہ ایسا نہیں جس پر چلنے کی سب کو کھلی اجازت دی جا سکے۔ لیکن تم دونوں کے معاملے میں میں نے محسوس کیا ہے کہ تمہاری محبت تو ذوق نمو کی علامت ہے۔ رضیہ میرے ہاتھوں میں پلی آنکھوں کے سامنے بڑھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمہارے بارے میں میں کچھ نہیں جانتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی لئے میں نے تم سے تعلقات پیدا کئے اور تمہاری شخصیت اور تمہارے حالات کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں تمہارے دل میں بھی ایک حقیقی جذبہ کارفرما ہے۔ تم دونوں کے دل میں جیون ساتھی بننے کی خواہش کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور نہ اس میں شرمانے کی بات ہے۔ یوں آج کل کے عشق باز لونڈے اس جذبے کی پاکیزگی اور طہارت سے واقف نہیں ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہی ایک جذبہ انسان کو تہذیب و تمدن کی راہ پر ڈالنے والا ثابت ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ایک چھوٹا سا گھر بساتا ہے۔ وہ گھر جس میں مثبت اقدار جنم لیتی ہیں۔ وہ گھر جسے بنانے اور سنوارنے کے لئے اوتار اور نبی پیدا ہوئے۔ وہ گھر جو ایک قصبے اور شہر کا حصہ ہوتا ہے۔ وہ شہر جو ایک ملک اور انسانی تہذیب و تمدن کا حصہ ہوتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ برخوردار! انسان کی خوشیاں نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں پر پنہاں ہوتی ہیں۔ ہم ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو محسوس کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو حاصل کرنے اور پھیلانے کے اصول بھی ننھے ننھے ہیں جنہیں اپنانے سے ہم سدا انکار کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ پُرشور نعرے گھڑتے ہیں۔ اونچے اونچے نصب العین اپنے سامنے رکھتے ہیں جنہیں پورا کرنے کے لئے ہم بزعم خود بڑی بڑی قربانیاں دیتے ہیں۔ شہید اور غازی کہلاتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور شیرخوار بچے کی سی معصوم انسانیت کا ان جنگوں میں دم گھٹ کر رہ جاتا ہے۔ ہمیں دوست اور دشمن کا پتہ نہیں چلتا۔ زندگی اور موت کا راز ہم سے منہ چھپا کر دُور بھاگ جاتا ہے ——— یہ انسان کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔"

حیدر کچھ دیر تک چُپ رہا پھر بولا "سائیں جی آپ کو عمر تجربے اور علم کے اعتبار سے مجھ پر فوقیت حاصل ہے۔ اس لئے میرا اس سلسلے میں کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی۔ میں آپ کے خیالات سے زیادہ تر متفق ہی ہوں لیکن آپ ذرا دُور چلے گئے۔ آپ جب کہتے ہیں کہ ہم بڑے بڑے نعرے گھڑتے ہیں اور اونچے نصب العین مقرر کر کے

غلطی کرتے ہیں تو اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہی وہ موقعے ہوتے ہیں جب انسان کے جوہر کھلتے ہیں۔ جب قومیں کروٹیں بدلتی ہیں۔ جب تہذیب و تمدن پرانی منزل چھوڑ کر نئی منزل کی راہ پر گامزن ہو جاتے ہیں۔"

سائیں جی مسکرا دیئے۔ اور پھر بڑی مدھم آواز میں بولے۔ "مجھے اس بات کا قطعاً رنج نہیں ہے کہ تم مجھ سے ہر بات میں اتفاق نہیں رکھتے۔ ایسے موقعوں پر میں ایک شخص کو براہ راست زندگی کے تجربے سے نتائج اخذ کرنے کی پوری پوری آزادی دے دیتا ہوں۔ اگرچہ میں اپنے دل میں قائل ہو چکا ہوں کہ توہمات کے ڈھکوسلے کے دن تمام ہو چکے۔ اور ہر نئی منزل کی جانب گامزن ہونے کے یہ فرسودہ طریقے ہر طرح سے بے کار ہو چکے ہیں۔ پھر دیکھنا یہ ہے کہ حضرتِ انسان کب تک اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں۔ کب تک وہ ان طریقوں کو خیرباد نہیں کہتے۔ —— ہمارا زمانہ بیت چکا اب یہ تمہارا زمانہ ہے۔ کبھی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر محبت کے اس جذبے پر غور کرو سوچو اور سمجھو ...... اس بوڑھے نے تو بس یہ چاہا تھا کہ اس کی ارتھی کو کندھا دینے والوں میں ہندو، سکھ عیسائی، مسلم سبھی شامل ہوں۔ میری یہ چھوٹی سی خواہش شاید بہت بچکانہ ہے۔ شاید خودغرضانہ ہے —— جو کچھ بھی ہو تمہاری دُنیا نے اس ضعیف و نزار انسان کو شکست دے دی۔ لیکن میرا ایمان ہے کہ یہ شکست عارضی ہے ..... یہ بوڑھا جوانوں کے دلوں میں ایک بار پھر زندہ ہو گا ...... اور اس کے بعد یہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔"

اس پر دونوں طرف خاموشی طاری ہو گئی جو بہت دیر تک مسلط رہی۔ بالآخر سائیں جی نے مہرِ سکوت کو توڑا۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو —— میں نے سوچا یہ ہے کہ اُدھر رضیہ کے والد صاحب سے مل کر اور اِدھر تمہارے والد صاحب سے مل کر یہ معاملہ طے کروا دوں۔ کہو منظور ہے؟"

حیدر نے جھینپ کر جواب دیا "منظور ہے۔"

شہر کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ یہاں تک دن دہاڑے چھرے بازی لڑائی دنگے کی وارداتیں ہونے لگیں۔ حیدر کے والدین نے اسے اپنے محلے سے باہر جانے سے منع کر دیا......

ان کے محلے سے ملا ہوا ہندو سکھوں کا محلہ تھا۔ اُن کی گلی ختم ہوتی تھی اور ان کی شروع ہو جاتی تھی۔ دونوں طرف سے خوب زور و شور سے نعرے لگائے جاتے۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا۔ پولیس اور فوج کا غیر جانبدارانہ رویہ بھی اب بدل رہا تھا۔

اس افراتفری میں سائیں جی حیدر کے باپ سے ملے۔ سب حالات معلوم کئے۔ اُدھر حاجی صاحب سے

بھی انہوں نے حیدر اور اس کے خاندان کی تعریفیں کیں۔ دونوں باپوں کو ملا دیا یہاں تک کہ دونوں بچوں کی منگنی طے ہو گئی۔ سائیں جی کو بہت خوشی ہوئی۔ حیدر اور پھر رضیہ کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔

حیدر خوش تھا لیکن اس وقت اس کی توجہ کچھ بٹی ہوئی بھی تھی۔ شہر میں مسلمانوں پر جو زیادتیاں ہو رہی تھیں اس سے اس کا خون کھولتا تھا۔ یوں تو ہر مذہب والے اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے تھے۔

کچھ مسلمان نوجوان حیدر کے ساتھ تھے۔ حالاں کہ وہ کوئی ناجائز حرکت کرنا نہیں چاہتے لیکن وہ ڈرتے بھی نہیں تھے اور مقابلہ پڑنے پر دشمن سے بھڑ جانے میں ایمان رکھتے تھے۔

اسی اثنا میں حاجی جی نے کچھ انتظام کیا اور امرت سر سے راولپنڈی کو روانہ ہو گئے۔ رضیہ بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ وہ عارضی طور سے گئے تھے۔ یہ سوچ کر کہ حالات موافق ہونے پر لوٹ آئیں گے ........ سائیں جی امرت سر میں ہی رہے۔ حاجی جی اپنا مکان اور دوکان انہیں کو سونپ گئے تھے۔

اب مختلف محلوں کی آپس میں لڑائیاں بھی ہونے لگیں۔ لوگوں پر ایک پاگل پن سوار تھا۔ ——— ایک دوسرے کی زیادتیاں دیکھ دیکھ اور خون کھولتا ہے ہے اور زیادہ بربریت سے کام لیا جاتا۔

حیدر کے جی میں آتا تھا کہ ایک لشکر تیار کرے اور ہندو سکھوں کو روندتا ہوا ہند کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچے۔ وہ کہتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کلچر اور تہذیب بنیادی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس لئے ان کا ایک جگہ رہنا ہی ناممکن۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کے مخالفین جان بوجھ کر قیام پاکستان کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ یہ تلخی بڑھتے بڑھتے اب نفرت کا روپ دھار چکی تھی۔

ان کے محلے کی بھی دوسرے محلے سے جھڑپیں ہو چکی تھیں۔ بعض اوقات انہوں نے ایک دوسرے کو سخت چوٹیں بھی پہنچائیں۔ ایک روز ان کے محلے کا ایک مسلمان بہت سے زخم کھا کر آیا۔ زخموں اور خون کی بہتات کے مارے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

یہ نظارہ دیکھ کر ان سب کا خون کھول اٹھا۔ اتفاق سے ادھر سے تین ہندو گزرے انہوں نے ان پر حملہ بول دیا۔ مارنے والے بہت سے تھے۔ ممکن تھا کہ وہ تینوں مارے جاتے لیکن اتفاقاً وہاں پولیس کی لاری آ گئی اور سپاہیوں نے فسادیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اور متعدد آدمیوں کو گرفتار کر کے لے گئے۔
ان میں حیدر بھی شامل تھا۔

# ۴

اگست ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں جو فسادات اور خون خرابے ہوئے ان کی کچھ کچھ خبریں حیدر کو جیل میں ملتی رہیں۔ اس کے ساتھی جو گرفتار ہوئے تھے۔ اس کے ہمراہ نہیں رکھے گئے۔ رفتہ رفتہ نفرت اور بربریت کی آگ کچھ دھیمی پڑی تو دونوں حکومتوں کے مابین صلح، صفائی کی باتیں ہونے لگیں۔ قیدیوں کا تبادلہ ہونے لگا۔ جو لوگ حیدر اور اس کی پارٹی کے ہاتھوں زخمی ہوئے تھے۔ وہ مرے نہیں بچ گئے، اور پھر دنگے فساد میں پورا مجمع حصہ لے رہا تھا۔ اس لئے وہ نظر بند رہے۔ اور ان کا معاملہ یونہیں کھٹائی میں پڑا رہا۔ یہاں تک کہ قیدیوں کے تبادلے کی خبریں بھی ان کے کانوں تک پہونچنے لگیں کچھ قیدی بھی ان کی جیل سے ہٹائے گئے، حیدر کو ادھر اُدھر کی افواہوں سے یقین ہونے لگا کہ وہ جلد آزاد ہو جائے گا۔

وہ دن آپہونچا۔ حیدر اور کچھ اور قیدیوں سے کہا گیا کہ انہیں ایک ہفتے کے اندر اندر تبادلے میں پاکستان کی سرحد تک پہونچا دیا جائے گا۔

حیدر کا دل ناچ اٹھا۔ وہ تقریباً آٹھ مہینے سے جیل میں بند تھا۔ اب وہ اپنے خوابوں کی دُنیا میں پہونچنے والا تھا۔ اس کا پاکستان! پیارا پاکستان! دُنیا کی سب سے نئی اسلامی سلطنت۔ وہ پاکستان جس کے لئے انہوں نے اتنی قربانیاں دی تھیں۔ وہ سرزمین جہاں اسلام کی بہترین روایات کو زندہ کیا جائیگا جہاں خالص اسلامی تہذیب کی نشو ونما ہوگی۔

پھر وہاں رضیہ ہوگی۔ ہر خطرے سے محفوظ۔ وہ اس کی راہ تکتی ہوگی اس کی آنکھیں اس کے گھر نظر آنے والی ہر راہگذر پر بچھی ہوں گی۔ حیدر نے سوچا کہ اب وہ سیاست کی بڑی دنیا کو ترک کر کے رضیہ کی چھوٹی سی دُنیا میں اپنا جھونپڑا بنائے گا۔ اس کی گھنی پلکوں تلے مچلنے اور لجانے والی مسکراہٹوں کو چوم چوم لے گا۔

آخر کار انہیں ملٹری کی لاری میں بٹھا کر واگہ لے جایا گیا۔ وہاں انہیں پاکستانی پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پاکستانی پولیس نے معمولی قانونی کاروائی یہ کی اس کے والدین کا پاکستان میں پتہ وغیرہ لکھ لیا تاکہ

ضرورت پڑنے پر اس سے پوچھ گچھ کی جاسکے۔ اس کے خلاف کوئی ایسی فردِ جرم بنتی نہیں تھی کہ جو پاکستانی پولیس کے نزدیک قابلِ گرفت ہو۔ اس لئے لاہور میں حیدر کو مکمل آزادی مل گئی۔ زمین پر اسے کچھ پرانے ساتھی بھی مل گئے جنہوں نے اسے مجبور کیا کہ راولپنڈی (کہ جہاں پر اس کے والدین بھی موجود تھے) جانے سے پہلے وہ چند دن ان کے ساتھ لاہور ہی میں گزارے۔

دوستوں کے ساتھ اس نے جی بھر کر لاہور کی سیر کی۔ شہر کا ذرّہ ذرّہ اسے تابناک نظر آتا تھا۔ گو ہندوؤں اور سکھوں کی یکسر غیر موجودگی ذرا عجیب سی معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ کبھی کبھی تو اس پر اس کا دل کچھ دکھی سا بھی ہو جاتا تھا۔ . . . . . . .

لاہور ہی میں اچانک رضیہ کے بھائی سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ کسی کام سے لاہور آیا تھا۔ اس نے اسے فوراً اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ لیکن دوستوں کے منت سماجت کرنے پر اس ارادے سے باز آیا۔ تاہم اس نے کہا کہ وہ راولپنڈی پہونچ کر سب کو یہ خوشخبری سنائے گا۔ انہیں حیدر کی خیر و عافیت کی خبر مل گئی تھی۔ صرف یہ پتہ نہ چلتا تھا کہ اسے قید سے کب رہا کیا جائے گا۔ ورنہ اس کے والدین اسے لینے کو لاہور تک چلے آتے۔ حیدر نے کچھ شرما کر اور رُک رُک کر رضیہ کی خیریت پوچھی . . . . . . آخر وہ اس کا منگیتر تھا۔ . . . . . جواب کافی حوصلہ افزا تھا۔ سالے صاحب نے گھر کا پتہ دیتے ہوئے کہا بھئی! رضیہ کو براہِ راست لکھ ڈالو۔ وہ بہت فکرمند رہتی ہے۔ اپنے گھروں کی لڑکیاں تم جانتے ہی ہو بے زبان ہوتی ہیں۔ دل کی بات زبان تک لاتے ہوئے شرماتی ہیں۔

حیدر نے چٹھی لکھنے کا وعدہ کیا . . . . . . پھر کچھ سوچ کر کہا کہ آپ میرے والدین اور اُس کے لئے دستی رقعے لے جایئے سر دست . . . . . اس نے رضیہ کے نام اور والدین کے نام دو رقعے اپنی خیر و عافیت کے بارے میں لکھ کر کورے لفافے میں الگ الگ بند کر کے ان کے حوالے کئے۔

آٹھ دن بعد دوستوں سے بمشکل اجازت لے کر وہ گاڑی پر سوار ہوا۔ دوست اسے اسٹیشن تک چھوڑنے آئے۔ انھوں نے اس کے گلے میں پھولوں کے ہار پہنائے۔ گاڑی چلنے کے بعد دیر تک رومال ہوا میں ہلتے رہے۔ ریل گاڑیوں کا انتظام بھی درہم برہم ہو رہا تھا۔ غالباً گاڑیاں کم تعداد میں چل رہی تھیں، اسی لئے ہر گاڑی میں بلا کا رش نظر آتا تھا۔

لاہور سے چونکہ گاڑی چلتی ہی تھی اس لئے اسے بیٹھنے کی مناسب سیٹ مل گئی۔ لیکن گوجرانوالے سے آگے جا کر اسے گاڑی بدلنی پڑی تو دوسری گاڑی کا رش دیکھ کر اس کے حواس گم ہو گئے۔ گھر پہنچنے کی بے قراری میں وہ بھیڑ بھاڑ کو خاطر میں نہ لایا۔ اور پھر گاڑیوں کا تو یہی حال تھا۔ چنانچہ وہ ایک ڈبے میں زبردستی گھس گیا۔

حالانکہ ڈبہ ٹھسا ٹھس بھرا ہوا تھا۔ جیسے وہ انسان نہ ہوں اناج کے بورے ہوں۔ بیٹھنا تو درکنار کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ تھی۔

ڈبے میں اونچے لمبے بلوچیوں کی تعداد کافی زیادہ تھی۔ ان کے اونچے قد، لمبے بازو، اور ستواں ناکیں انہیں باقی سب سے الگ اور منفرد بناتی تھیں۔ دیہاتی پنجابی مسلمان بھی تھے۔ حیدر ان کے مقابلے میں ایک کمزور سا لڑکا تھا وہ چھچھوندر کی طرح آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے اس طرح آگے ہی آگے بڑھنے سے کچھ آدمیوں کا پارہ اوپر چڑھنے لگا۔ وہ ان کے بیچوں بیچ پھنس گیا۔ اس کی پسلیاں چرچرانے لگیں۔ زبان باہر نکل آئی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے چشم زدن میں وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گا اور مر جائے گا۔ اس نے ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح بری طرح سے ہاتھ پاؤں ملانے شروع کئے جس سے دیگر لوگوں کو اور زیادہ جھنجھلاہٹ ہوئی۔

"مجھے آگے جانے دو۔" حیدر نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"اوئے آگے کِدر اے۔"

"اگے کوئی جگہ نہیں۔" دوسرے نے کہا۔

حیدر نے ملتجیانہ نظریں ادھر ادھر دوڑائیں۔ "بھائیو! میں رفیوجی ہوں....."

"رفیوجی ہوں..... ارے رفیوجی ہیں تو ہم کیا کریں...."

دوسرا بولا۔ "یار ان رفیوجیوں نے بھی تو ناک میں دم کر رکھا ہے جو آتا ہے کہتا ہے میں رفیوجی ہاں۔ رفیوجی ہو تو کیا ہمارے سر پر ناچو گے؟"

اب حیدر پچھتا رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ اس ڈبے میں گھس آیا۔ کاش کوئی اسے باہر ہی نکلنے دے۔ لیکن اب تو اس کے پاؤں بھی زمین سے اوپر اٹھ گئے تھے۔ وہ لمبے لمبے آدمیوں میں اس بری طرح سے پھنس گیا تھا کہ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اگر اور کچھ دیر یہ حالت رہی تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے گی۔ چنانچہ اس نے ایک بار زور مارا۔ اس پر دوسروں نے بھی اسے کہنیاں مارنی شروع کر دیں۔ کسی نے ایک آدھ دھموکا بھی جڑ دیا۔

اس دھینگا مشتی میں وہ دو سیٹوں کے بیچ میں جا گرا۔ سیٹوں پر لوگ بری طرح سے سٹے ہوئے تھے۔ کچھ کھڑے بھی تھے لیکن گر کر وہ ایک سیٹ کے نیچے کی طرف لڑھک گیا۔ اسنے نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا۔ کسی چہرے پر ہمدردی دکھائی نہیں دی.... لیکن سیٹ کے نیچے اسے سانس لینے میں سہولت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ نیم بیہوشی کی حالت میں ہانپتے کانپتے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ متعدد میلے دیسی جوتوں کی سڑاند سے اس کا دماغ پھٹنے لگا۔ اسنے بغل میں دبی ہوئی کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھڑی کو بطور

تکیہ اپنے سر کے تلے رکھ لیا۔ اور منہ پھیر کر نتھنے پھلا پھلا کر اپنے پھیپھڑوں میں ہوا بھرنے لگا۔

اس وقت اس کی آنکھیں نیم وا تھیں لیکن سیٹ کے نیچے کی غلیظ فضا بھی فردوس سے کم نہیں تھی وہ آنکھیں نہیں کھولنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے اردگرد دنیا بھر کے جوتوں کی گرد بکھری ہوئی ہے تھوک کی پچکاریوں اور ناک ایزش سے فرش اٹا ہوا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسنے سنا تھا کہ رفیوجیوں کو مسلمان بھائی حلوہ، پوریاں اور پھل وغیرہ کھلاتے تھے۔ لیکن اب دھیرے دھیرے وہ جوشِ خدمت بھی ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ تھے اور اُن کے روز بروز کے مسائل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روز بروز کی بھوک، ضروریات اور بکھیڑے۔

پھر اس کی آنکھیں نیم وا ہوئیں تو اس نے اپنے قریب ایک اور نوجوان کو دیکھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسی کی طرح شہری ٹائپ کا۔ ذرا نازک بدن۔ دبلا پتلا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اسی کی طرح سب کی ٹھوکریں کھا کھا کر وہاں پناہ گزیں ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ چہرے کی کیفیت سے ظاہر تھا کہ اسنے بہت دکھ بھوگے ہیں۔

حیدر فطرتاً ہمدرد واقع ہوا تھا۔ اس حالت میں بھی اس کے لبوں پہ مسکراہٹ پیدا ہوئی اس نے پوچھا۔ "تم بھی رفیوجی ہو؟"

اجنبی نے منہ سے کچھ نہیں کہا البتہ اثبات میں سر ہلا دیا۔

حیدر نے دیکھا کہ نووارد کی ٹانگیں سیٹ سے باہر تھیں جنہیں بار بار ٹھوکریں لگ رہی تھیں۔ حیدر نے پیچھے ہٹ کر اس کے لئے جگہ بنا دی اور اسے آگے کھسک آنے کو کہا۔ وہ گھسیٹ کر آگے بڑھ آیا وہ ملائم بھورے بالوں والا سر اس کے بہت قریب آ گیا۔ حیدر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ ننھا شیر خوار بچہ ہو۔ مین اس وقت حیدر کی نگاہ اس کے بازو پر پڑی جو اس وقت ننگا ہو رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس پر اردو حروف میں "اوم" لکھا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حیدر چونکا۔ اس کی آنکھیں پھٹی سی گئیں اس نے قریب قریب چلا کر کہا "تم ہندو ہو؟"

نووارد کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہونٹ نیلے سے پڑ گئے اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے پھر بھی منہ سے کچھ نہیں کہا صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

اب کچھ دیر کے لئے سکوت طاری ہو گیا۔

شور کی وجہ سے کسی اور نے حیدر کی آواز نہیں سنی۔ ۔ ۔ ۔ پھر اجنبی نے لرزتے ہوئے ہونٹوں اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں رفیوجی ہوں"

گاڑی چلی جارہی تھی۔ حیدر کی آنکھیں پھر بند تھیں۔ اجنبی چپ چاپ اس کے قریب .... اس کے بہت قریب لیٹا تھا...... اوندھے مُنھ ......

نہ جانے وہ دونوں کیا سوچ رہے تھے۔

گاڑی کسی اسٹیشن پر رکی تو حیدر نے اس کا بازو تھام لیا سیٹ کے نیچے سے بمشکل نکلا اور اجنبی کو اپنے پیچھے پیچھے کھینچتا ہوا ریلے کے ساتھ گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

ذرا الگ تھلگ گوشے میں پہنچکر اس نے جلدی سے رضیہ کے نام ایک چھٹی لکھی۔

ڈیر رضیہ !

میں تمہارے پاس آرہا تھا لیکن راستے میں ایک ضروری کام پڑ گیا۔ اس لئے اب شاید دو چار دن کے بعد پہونچوں گا۔

رضیہ ! آج مجھے سائیں جی یاد آرہے ہیں نہ جانے ان کا کیا حشر ہوا ہے لیکن مجھے آج وہ بہت قریب محسوس ہو رہے ہیں۔

اب تک مجھے یہ تو معلوم تھا کہ ایک ہندو اور مسلمان، یا مسلمان اور سکھ میں کتنا بُعد ہے۔ لیکن انسان انسان کے درمیان کتنا فاصلہ ہے اس کا مجھے آج ہی پتہ چلا ہے۔

تفصیلات ملنے پر ! اس وقت یہی سمجھ لو کہ ایک کا فرکو واگہ پار کرانے کا بیڑا اٹھایا ہے میں نے۔

تمہارا

حیدر

---

# سوتے جاگتے

ابوالفضل صدیقی

مغرب کے بہار کے سورج کی مرتی ہوئی سنہری روپہلی دھوپ اور مشرق سے جنگل کی شام کے دبے پاؤں سرکتے چپکے چپکے بڑھتے قرمزی سُرمئی سایوں میں رومانٹک سی آویزش ہونے لگی۔ بسیرے کے وقت کی چڑیوں کی مخصوص آواز جنگل کے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے سناٹے کے ساتھ مربوط ہونے لگی۔ جذبات تو خیر تازہ تھے۔ مگر جسم دو راتوں کا مارا ہوا تھا۔ تمام دن ڈاک بنگلہ کی مسہری پر نرم نرم گدے میں دھنسے رہنے کے باوجود تھکن باقی تھی۔ اُس وقت تو خیر شب بیداری اور تکان کے مارے رگ رگ دکھ رہی تھی، آنکھیں بند کیں، نیند کو منانا چاہا تو الٹی بے کلی سی ہوگئی، محسوس ہوا کہ جوڑ جوڑ ہلا ہوا ہے، جیسے بے خوابی، تکان اور شاید ناکامی نے جھنجھوڑ سا دیا ہے، کروٹیں بدلیں، پڑے پڑے نہ معلوم کتنی کروٹیں لگا گیا، مگر جتنی سونے کی کوشش کی نیند سے دور ہوتا گیا۔ پیشانی سے ہلکا ہلکا سناٹا سا اٹھ کر دونوں جانب کنپٹیوں میں ہوتا سر کے پچھلے حصہ میں کو جانے لگا، اور جب آہستہ آہستہ کراہنے کو جی چاہا۔ کسی کے خراٹے کی آواز پر ذرا تعجب کے ساتھ آنکھیں کھولیں، چوبی ڈاک بنگلہ کے وسیع کمرہ میں تھکی تھکی خمار آلود نگاہیں ڈالیں۔ ایک گوشے میں چوکی پر میاں مسلم گہری نیند سو رہے تھے۔ ان کی نیند پر رشک سا آیا، بغیر ہی بستر کے یوں ہی ہاتھ کا تکیہ رکھے خالی تختوں پر دراز تھے ہوں، صبح ناشتہ کرنے کے بعد اک ذرا کے ذرا چوکی پر آکر بیٹھے تھے کہ حضرت جہاں کے تہاں چت ہو کر رہ گئے۔ بستر تک بھی نہ پہنچ سکے! اور کروٹ نہیں بدلی ہے، اور میں نے پھر سونے کی کوشش کی، جیسے مسلم کی نیند سے سبق سا لیکر۔ مگر مسلم کی نیند تکان پر غالب تھی۔ اور میری نیند پر تکان غالب تھی۔ پیشانی کی سنسناہٹ ہلکے ہلکے درد میں تبدیل ہونے لگی، اعصابی بے چینی بڑھتی محسوس ہوئی۔ برابر اسٹول سے ساریڈان کی ٹکیہ اٹھا کر نگلی اور پھر لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کرلیں، جیسے سب کچھ آنکھوں میں ٹھنس گیا اور جسم کی تکان رفتہ رفتہ غائب ہونے لگی، میں نے آنکھیں ملیں، ایک دو جمائیاں انگڑائیاں لے کر چند منٹ میں چاق چوبند ہوگیا، اعصابی اور ذہنی بے چینی دور ہوگئی اور جسم و دماغ کے اندر نیند اور تکان میں جو کشمکش سی ہو رہی تھی وہ کیفیت بالکل رفع ہوگئی، نیند کو صبر آگیا۔ تکیہ کے نیچے سے کتاب نکالی اور کل پڑھتے پڑھتے جس جگہ سے چھوڑی تھی وہیں سے پڑھنا شروع کردی۔ مکمل دماغی یکسوئی تھی۔ کتاب بڑی دلچسپ معلوم ہو رہی تھی، لفظ لفظ ذہن میں بیٹھتا محسوس ہو رہا تھا

جیسے آہستہ آہستہ شربت کے سے گھونٹ مغز میں اتر رہے ہیں۔ بڑے انہماک اور دلچسپی کے ساتھ بارہ بجے تک نگاہیں شاید بغیر ایک مرتبہ بھی اِدھر اُدھر اٹھے ہوئے کتاب پر جمی رہیں۔ رات تو کچھ کھایا ہی نہ تھا، صبح ناشتہ بھی یوں ہی سٹر پٹر ذرا سا کیا تھا۔ اس وقت معدہ میں مری مری سی بھوک کا احساس پیدا ہوا۔ ایک گہری سانس لیکر نگاہ کتاب سے علیحدہ کی، ساتھی بیدار ہو ہو کر اور غسل کر کر کھانے کے لئے طیار ہو رہے تھے۔ دسترخوان لگ گیا تھا اور یار لوگ اینڈا اینڈ کر کھانے کی جانب رجوع ہو رہے تھے، میں نے ایک کروٹ بدل کر اٹھنے کا قصد کیا مگر طبیعت کتاب چھوڑنے کو نہ چاہتی تھی۔ کسی نے مجھے پکارا۔ کھانے کا ماحول گرم ہو رہا تھا، اور میں نے اندازہ کیا کہ مجھ کو تیز بھوک لگی ہے، اٹھ کر سیدھا کھانے پر پہنچ گیا۔ دس بارہ ساتھی میز کے گرد جمع تھے۔ بھنے ہوئے گوشت پر بڑے زور سے دنداں آزمائی ہو رہی تھی اور میز پر میٹ مارکیٹ جیسے شور میں گپیں ہو رہی تھیں، اگرچہ میری طبیعت پر نیند نہ آنے کا افسوس سا تھا، مگر اعصاب میں اضمحلال نہ تھا۔ دماغ میں کتاب کی دلچسپی کا سرور باقی تھا: دسترخوان کی گپوں میں بہت ہی کم حصہ لیا۔ ذہن پر کتاب کے سنجیدہ موضوع کا تاثر تھا اور پیٹ میں خوب بھوک، خاموشی کے ساتھ چٹ کر گیا۔ اور نہ معلوم کیا کیا چپکے ہی چپکے صاف کر گیا۔ اور پھر بستر پر دراز ہو گیا: رگوں میں ہلکی ہلکی سنسناہٹ محسوس ہوئی، اگرچہ ارادہ کر کے لیٹا تھا کہ کتاب کے دو ایک باب اور پڑھوں گا، مگر کنپٹیوں اور آنکھوں میں سرور سا رینگنے لگا۔ کھانے کا نشہ چڑھا . . . . . . . . . شاید کچھ کھٹ پٹ سے نیند ٹوٹی، کتاب سینہ سے ہٹائی۔ سہ پہر تھی ایک لمبی انگڑائی لی اور اندازہ کیا کہ چلنے کا وقت آگیا۔ چائے لگ رہی تھی، اور یاران طریقت پکار رہے تھے۔ اور کپڑے پہن پہن کر طیار ہو رہے تھے۔

رات کے کھانے کا تو سوال ہی نہیں ہوتا ہے، اور سہ پہر کا ناشتہ بہت بھاری ہوتا ہے، چار پانچ بجے چکر میں نے پہلے سنترے کی قاشیں چوسیں اور جب سنترے کے عرق سے معدہ میں تحریک ہوئی تو خوب ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ اوپر سے دو پیالی چائے پی، اور سب ناشتہ سے فارغ ہو گئے۔ اور ذرا دیر میں بقیہ سب طیاری مکمل کر کے اپنی اپنی مخصوص جگہ کی جانب چلنے لگے۔ میں نے اندازہ کیا کہ اگرچہ چار پانچ گھنٹے بڑی بھرپور ایک نیند سو لیا پھر بھی ماندگی باقی ہے۔ کچھ عجیب سی کیفیت جسم و ذہن کی، جیسے سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود احساسات کچھ عجیب بہکے بہکے ہوئے ہیں۔ اور یہ تو مجھے خوب اندازہ تھا بلکہ اندازہ کیا میرے سامنے ہی تھا، میرا شکاری قلی رائفلوں کی جوڑی، ہوشین بکس، میرا شکاری تھیلا، آئس تھرموا اور کیا کیا سب سامان لئے بکرے کی رسی پکڑے میرے ساتھ ہے۔ میرے ایک ہاتھ میں اسٹک چیر اور دوسرے میں کتاب تھی۔ ڈاک بنگلہ سے دو فرلانگ پہنچ کر میں نے ذرا مڑ کر دیکھا، مجھے اپنے شکاری کے تیور جیسے کچھ بیگانے بیگانے سے معلوم ہوئے حالانکہ میں نے اس نیت سے اسکی جانب نہیں دیکھا تھا۔ مگر وہ سمجھا کہ رہنمائی کے لئے کہہ رہے ہیں، بکرے کی رسی کھینچتا لپک کر سامنے آگیا، اور میرے آگے آگے چلنے لگا۔

تقریباً آدھ گھنٹے میں ہم دونوں اس مخصوص تناور درخت کے تلے پہنچ کر ٹھہرے جس کی گھنی شاخوں میں دوراتوں سے میرا بسیرا تھا۔ ہم دونوں کی نظریں بیک وقت اوپر اٹھیں 'مچان بدستور تھا ـــــ ایک لمبی سانس لے کر شکاری نے لٹکتی ہوئی رسّی کی سیڑھی کو پکڑا اور لنگور کی طرح بارہوں ڈنڈے چڑھ کر مچان پر پہنچ گیا اور ہر چیز قاعدہ کے مطابق لگا کر اتر آیا۔ اشاروں اشاروں میں ہم دونوں نے بکرا باندھنے کی جگہ کا تعین کیا، اور اسنے مخصوص موقع پر ایک درخت کی ابھری ہوئی جڑ سے بکرے کی رسی مضبوطی کے ساتھ باندھ دی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے کہا "اوپر جائیے" ـــــ میں نے اشارہ میں جواب دیا "ٹھیک ہے میں چڑھ جاؤں گا۔ تم جاؤ" اور شکاری دبے پاؤں غائب ہو گیا جنگل کے تنہا ماحول میں بجائے دہشت کے اک طمانیت سی محسوس ہوئی گھڑی پر نظر کی، چاروں طرف فضا دیکھی اور اندازہ کیا کہ ابھی جلدی ہے، اس وقت سے سکڑ سمٹ کر مچان پر کیوں جا بیٹھوں، شیر تو بہر حال بہت جلد آیا تو بعد مغرب، بشرطیکہ آج اللہ سُن لے اور آئے۔ ادھر اُدھر دیکھا کہ کہیں کوئی کاغذ کا پرزہ، جلی ہوئی سگریٹ یا دیا سلائی وغیرہ تو نہیں پڑی ؛ شیر کے شکار میں یہ چیزیں بھی مچان کے اتنے قریب نہیں ہونی چاہئیں، اور پھر آہستہ سے بڑھا اور درخت کے تنے کا سہارا لے کر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ مارچ کی خوشگوار ہوا سامنے سے آ رہی تھی۔ بڑے سبک انداز میں چہرے کو چھو رہی تھی۔ میں نے پاؤں پورے تان دیئے ایک انگڑائی سی لی اور چند جمائیاں آئیں، بالکل تازہ ہو گیا۔ کسل دور ہو گیا۔۔ ۔۔۔۔۔ جنگل کی مخصوص خوشبو کا لطف لینے لگا جو غروب آفتاب کے وقت بھینی بھینی سی پھیلتی ہے اور پھیلنے نہیں پاتی کہ یک لخت غروب کے بعد معدوم ہو جاتی ہے۔ اور سورج کی آخری کرنیں بھی مُند گئیں، شفق کی روشنی سمبل کے درخت کی شاخوں سے چھن چھن کر اور سرخ کٹورا سے پھولوں پر پھسل پھسل کر بیرے اور گرد گلال اور افشاں سی بکھیرنے لگی، شام کے آثار غالب ہونے لگے۔ میں آہستہ سے اٹھا اور سیڑھی پر چڑھ گیا اور ابھی لٹکتی سیڑھی کھینچ کر اوپر مچان کے ساتھ لپیٹ کر باندھ ہی رہا تھا کہ چونک پڑا۔ میرے مختصر سے مچان پر "کوئی" تھا! ـــــ بھوت پریت کا میں قائل نہیں نہ بچپن سے اس خوف کا احساس شعور میں جاگزیں ہوا ہے، مگر میرے سینہ کے اندر تعجب سے دھک سے ہو گیا، اور شیر کے شکار کے آداب کو بالائے طاق رکھ کر میرے منہ سے ایک چیخ قسم کی بھیانک سی آواز نکل گئی " نہیں !! ـــــ اور پھر میں نے آواز سنبھالتے ہوئے کہا " کون ؟ !! اور میرا شکاری تو ابھی میرے سامنے اتر کر اور اجازت لے کر گیا تھا۔۔۔۔۔۔

اور جب میں نے حرکت دیکھی اور غور کیا تو اندازہ کیا کہ وہ میری جانب رُخ کر رہا ہے، اور متوجہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ رُخ کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ میں نے اطمینان بر دے کار لا کر زیادہ غور کیا تو اندازہ کیا کہ چہرہ جسے کہتے ہیں وہ اس کے ہے ہی نہیں، پھر بھی متوجہ ہونے کا احساس میرے دل میں پیدا ہو گیا، آنکھ ناک، مُنہ

پیشانی، سر، بال کسی چیز کا وجود نہ تھا جیسے کہ دست و پا بھی ندارد ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ستم یہ کہ چہرہ اور اعضا کی موجودگی کے باوجود ظالم کے وجود کا احساس نہایت شدید، نمایاں اور واضح ہونے کی حد تک پہنچا تھا، اور نہایت ہی متوازن اور سڈول قسم کا ۔۔۔۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس کے وجود سے خوف، یا کراہیت کے بجائے ایک قسم کی قربت اور مانوس پن سا محسوس ہو رہا تھا۔ اور میں نے سنبھل کر ایک بھرپور نگاہ ڈالی تو یہ احساس تیز تر ہو گیا، گویا کوئی ساتھی جس کی موجودگی کی خوشگوار کیفیت شعور محسوس کرے جس کے نہ صرف آنکھ ناک کان دہن، ہاتھ پاؤں سینہ پیٹ سبھی ہو بلکہ سب کچھ وجود جاذب توجہ بھی ہو۔ اور میں نے بالکل مانوس اور بے تکلف انداز میں کہا "جناب کون ہیں! ۔۔۔۔ اور یہاں کیونکر پہنچے؟"

اور جواب میں ان حضرت کے لب تو ہلتے ہی نہیں مگر میں نے گویا سن لیا "جی میں اجنبی ہوں' اور یہاں آپ کی اس نشست پر ہی نہیں بلکہ آپ کے اس کرہ میں بھی جسے زمین کہتے ہیں' ۔۔۔۔ یہاں کی سیر کو چلا آیا۔"

'کہاں سے ؟' دوسرا سوال میرے منہ سے نکلا۔ اور جواب اسی طرح غیر سماعی طریقہ سے ملا جس کا میں یہ مطلب سمجھا کہ کسی دوسرے کرہ سے تشریف لائے ہیں اگرچہ میں نے کالج میں ہیئت و فلسفہ پڑھا تھا مگر اس کرہ کا نام آج تک میرے کان میں نہیں پڑا تھا، کچھ مریخ سے ملتا جلتا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور میں نے ایک گھونٹ سا لے کر کہا "مگر حضرت ہمارے علم ہیئت میں ایسا کوئی نام نہیں ہے" جس پر اس نے ذرا تعجب کے انداز میں جواب دیا۔ "آپ کے علم ہیئت میں ہمارے کرہ کا نام نہیں ہے!؟۔ تو جناب آپ کا علم ناکمل ہے' اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے دیگر لوازم بھی ناقص ہوں گے ۔۔۔۔ مجھے اس کے اس آزادی کے ساتھ پہلی ہی ملاقات میں اتنی وسیع قسم کی تنقیص کا اظہار خیال کرتے دیکھ کر تعجب سا ہوا اور میں نے کہا "خیر ہو سکتا ہے' لیکن ذرا اپنے سیارہ کی جا، وقوع کا تعین کیجئے۔"

"ہوں، قطب ستارہ تو آپ کے علم میں ہوگا ۔۔۔۔ یہ قائم کرہ۔ اس سے سمت قائم کیجئے" اس نے شمال میں دمکتے ہوئے ستارہ کی جانب اشارہ کر کے بتایا" تو سمجھ لیجئے کہ یہ قائم کرہ خلاو بسیط میں ہمارے سیارہ سے بہت نیچے واقع ہے۔"

"کتنا نیچے ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آں' اوں بس آپ یوں سمجھئے جتنا آپ کا آفتاب آپ کے کرہ سے بلند ہے اس سے سات گنا ہم قطب ستارہ سے اونچے ہیں، بلکہ اپنی مساحت کے حساب سے اسّی درجہ طول البلد غرب کی سمت کو ہٹے ہوئے اور ستر درجہ ارض البلد جنوب کو ہٹے ہوئے ہیں۔ اور یہ ناپ میں آپ کو سمجھانے کے لئے قائم کر رہا ہوں' ورنہ یہ سب

بے اصل شے ہے، خلا ہی خلا رتے ـــــ اور ذرا رک کر کہا" ہوں، دیکھ لیجئے نا ـــــ یہاں سے تو اس وقت صاف نظر آرہا ہے۔ کوئی چیز حائل نہیں ہے۔"

"ہوں، آں، نہیں، میری بڑی دُوربین اس وقت نہیں ہے" ـــــ میں نے ادھر نظر جما کر کہا، یہ جو ہے بہت چھوٹی ہے، شکار کے مطلب کی مگر بیکار، جو فاصلہ آپ نے بیان کیا اس کے لئے تو میری بڑی دُوربین کا ذکر کیا شاید دنیا بھر میں بڑی سے بڑی دُوربین بھی کام نہ دے سکے، ـــــ بھلا نو کروڑ تیس لاکھ میل تو ہمارے یہاں سے سورج ہے، اور آپ اپنا کرہ قطب ستارے سے بھی سات گنا اوپر بتاتے ہیں، اوں ہوں ہمارے یہاں کوئی دُوربین کام نہیں کر سکتی۔"

اجنبی نے کہا" میں نہیں سمجھا، یہ دُوربین دُوربین آپ کیا کہہ رہے ہیں، یہ کیا چیز ہوتی ہے۔"

میں نے جواب دیا" جی دُوربین ایک آلہ ہے جس کو آنکھ پر لگا کر ہم دُور کی چیز دیکھ لیتے ہیں، یوں سمجھئے کہ ہم کو دُور کی چیز قریب نظر آتی ہے، ورنہ ہماری خالی آنکھ تو اتنے فاصلہ پر نہیں دیکھ سکتی۔"

"اور آنکھ کیا ؟" اس نے سوال کیا۔

یوں تو حیرت انگیز سا سوال تھا، مگر میں پہلے دیکھ چکا تھا کہ حضرت سامعہ باصرہ، شامہ ذائقہ وغیرہ کے تمام اعضاء سے بے نیاز ہیں اور آنکھوں سے بھی چوپٹ ہیں لہذا سوال ٹھیک ہی تھا میں نے اس کی طرف اچھی طرح آنکھیں پھیلا کر اور نظریں جما کر دیکھا اور دونوں انگلیوں کے اشارے سے اپنی آنکھیں دکھلائیں "یہ ہیں ہماری آنکھیں، جن سے ہم دیکھتے ہیں۔"

"اچھا، آپ ان سے دیکھتے ہیں" اور یہ کہہ کر میری آنکھوں کو ٹٹول کر دیکھنا چاہا، گویا اپنی قوت باصرہ کے ساتھ ساتھ میری آنکھیں دیکھنے کے لئے قوت لامسہ کے استعمال کی بھی ضرورت پیش آئی۔

میں یکدم جھجک کر پیچھے کو جھک گیا، ظالم میری آنکھیں پھوڑ کر اپنے ہی حلیئے پر لانا چاہتا ہے، اور اپنی دونوں آنکھیں بند کر کے ہاتھ رکھ لئے، اور بے اختیار کہا "ہیں، ہیں! کیا آپ میری آنکھیں پھوڑیں گے؟"!

"ایں، یہ آپ کے آلات بصارت جنہیں آپ آنکھیں کہتے ہیں، اتنے ناقص اور کمزور ہیں کہ چھونے سے ٹوٹ جائیں گے؟"

میں نے قدرے جھلا کر کہا حضرت آپ کو اللہ نے اس چیز سے محروم کیا ہے، بھلا آپ کیا جانیں ان کی قدر ـــــ لیکن ذرا یہ تو فرمایئے کہ آپ کیونکر دیکھتے ہیں۔ آخر آپ کے آلات بصارت کدھر ہیں؟ دیکھوں کیا وہ پتھر کے بنے ہوئے ہیں؟"

اجنبی نے بے ساختہ گویا قہقہہ لگایا، آلات بصارت کیا چیز ہوتے ہیں، باصرہ ہمارے وجود میں ہے

اور ہم اپنے ماحول کو بلا امتیاز بعد و قرب اور جلی و خفی یکساں دیکھتے ہیں، اور اسی طرح لامسہ، ذائقہ، سامعہ، شامہ ناطقہ نہایت دقیق ذکی الحسی کے ساتھ ہم میں موجود ہے، اور تمام قوتیں ہماری روح کے متعلقات میں شامل ہیں اور ان سے حسب ضرورت کام لیتے ہیں۔ اور شاید آپ کو سونگھنے کا بھی کوئی آلہ ملا ہوگا؟ میں نے اپنی ناک واضح کی اور نتھنوں کو حرکت دی۔ "جی دیکھئے تا یہ ناک۔"

"کیا اسے چھو کر دیکھ سکتا ہوں یا یہ بھی آپ کے آلات بصارت کی طرح چھوئی موئی کا بنا ہوا ہے۔"

اور میں کہ یہ کہتے ہی "نہیں جناب یہ تو خاصہ مضبوط ہے۔" اجنبی نے بے دھڑک میری ناک کا ٹیوا پکڑ لیا جس پر مجھے ہنسی بھی آئی اور جھنجھلاہٹ بھی، اس کے بعد گویا اجنبی صاحب نے میرے چہرے کا غائر جائزہ لے کر پوچھا "اور کیوں صاحب اور آپ سنتے کا ہے سے ہیں؟"

میں نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھے۔ تو حضرت مشاہدہ کو کافی نہ سمجھ کر مزید تحقیق کے لئے میری گوشمالی کرنے لگے، میں نے جھٹ سے چہرہ نیچا کر لیا اور دل میں کہا "یہ جرأت!" اور پھر مخاطب ہو کر کہا "معاف کیجئے دائرہ تہذیب میں رہئے، کیا پچیس سال بعد مکتب کی پرانی رسم تازہ کرنا چاہتے ہیں۔"

اتنی بک جھک کے بعد مجھے پیاس سی معلوم ہونے لگی، میں نے آئس تھرمو کھول کر چند گھونٹ گلاس میں اسکوائش کے نکالے اور آہستہ آہستہ سے پینے لگا۔ اور آئس بکس سے ایک سنترہ نکال کر چھیلا اور قاشیں چوسنے لگا، ساتھ ہی نووارد کو بھی پیش کئے، لیکن اسنے کوئی چیز نہ لی البتہ میری تمام حرکات بغور دیکھتا رہا اور پھر کہا، یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"کرتا کیا کھا پی رہا ہوں، کیا آپ اس سے بھی مبرا ہیں، ایں!؟"

"نہیں میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان حرکات کی غائت کیا ہے، آخر یہ کثیف چیزیں اپنے جسم میں کیوں بھرے چلے جا رہے ہیں۔" اسنے کہا اور میں نے دل میں کہا "اندھے کے آگے روو ے، اپنے بھی نین کھوئے —— کس سے پالا پڑا ہے" جناب ان حرکات کی غائت، ان چیزوں کو کھانا، اس لئے کہ ان سے میرے بدن کی پرورش ہوتی ہے اور اسی سے زندگی قائم ہے، کیا آپ کے یہاں کھانے پینے کی ضرورت نہیں ہوتی؟"

"کیوں نہیں، مگر اس طرح نہیں جیسے آپ منہ چڑا چڑا کر یہ ٹھوس چیزیں اپنے اندر ٹھونس رہے ہیں۔"

عجیب بدتمیز آدمی ہے" تناول فرمانے سے گئے" "نوش جان سے گئے" رہے سہے" کھانے سے گئے کہتا ہے "ٹھونس" رہے ہیں" خیر تو ہاں آپ کس طرح کھاتے پیتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"اس طرح" اسنے کہا، اور گلاس میں بھرے ہوئے شربت اور برف میں جمے ہوئے سنتروں پر جو میں اسکو پیش کرنے کے لئے نکالے تھے ایک نظر سی ڈالی۔ اور کہا "بس فارغ ہو گئے کھانے پینے سے۔"

میں نے شربت اور پھلوں پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "یہ تو جوں کا توں رکھا ہوا ہے، اور آپ کہتے ہیں کھا پی لیا:"

"اس کی روح اپنے اندر پیوست کرلی، اور یہ چیزیں تو اب نظر ضرور آرہی ہیں مگر خالی ہیں"۔ اور غذا ان کی روح ہے نہ کہ ان کی یہ ٹھوس مادی شکل، یہ تو خول ہے، اس روح کی جو غذا ہے اور اب خالی ہے۔"

"خالی سے کیا مطلب؟"

"اب یہ صرف دیکھنے کی ہیں، اور کوئی چیز باقی نہیں ہے نہ مانیں امتحان کرلیں اور اپنے طریقہ پر چکھ کر دیکھ لیں۔"

میں نے شربت کا ایک گھونٹ لیا، نہ اس میں شیرینی تھی نہ برودت، حتےٰ کہ رطوبت تک کا احساس نہ تھا، گھونٹ لینے سے یہ محسوس ضرور ہوتا تھا کہ ہونٹ اور حلق سے کوئی چیز شاید گزری، مگر کیا۔ یہ کچھ پتہ نہیں اور یہی چیز پھلوں میں پائی" میں متحیر ہوگیا اور خاموش، اجنبی نے گویا خاموشی توڑتے ہوئے کہا "آپ جس سوراخ سے یہ چیزیں اپنے اندر پہنچاتے ہیں ذرا وہ تو مجھے دکھائیے، کیا وہ اس سنترے اور گلاس کے برابر قطر میں ہے یا بڑا؟ اور آپ کو یہ حرکت کیوں کرنی پڑتی ہے؟"

اور میں نے اپنے اس ناخواندہ مہمان کو اپنی زبان دانت اور حلق وغیرہ منہ پھیلا پھیلا کر دکھایا اور سب کے FUNCTIONS سمجھائے، اور خاص طور پر زبان باہر نکال نکال کر دکھائی اور بتایا کہ یہ آلہ قدرت وہ عطیہ ہے جو دو کام انجام دیتا ہے یعنی گویائی اور ذائقہ، اس نے قدرے تحیر کے ساتھ دیکھا اور میں نے کہا "ارے صاحب آپ ہماری ان معمولی چیزوں کو حیرت کے ساتھ دیکھتے ہیں مگر میں خیر اس کی شکل صورت پر تو متعجب تھا ہی، اب مجھے آپ کی ان عجیب قوتوں پر حیرت ہورہی ہے، بلکہ کوئی اور ہوتا تو شاید ڈر جاتا لیکن آپ کے اندر مجھ کو ایک کشش اور خلوص کا احساس ملتا ہے اور کہنے کو آپ ضرور اجنبی ہیں مگر مجھے آپ کے اندر اجنبیت محسوس نہیں ہورہی ہے، لیکن اب مجھے آپ سے سچ مچ ڈر سا معلوم ہونا چاہئے ذرا یہ بتائیے کہ آپ نے یہ شربت اور پھل بغیر چھوئے ہوئے صرف دیکھ کر ہی کیسے بیکار کر دیئے۔ بلکہ یوں کہئے کھا لئے۔"

اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ فطری تقاضے کے بموجب میں نے ان اشیاء سے استفادہ کرنے کی خواہش کی، اور ان کی روح کو جو صحیح معنی میں تغذیہ ہے اپنے اندر جذب کر لیا۔"

"خوب، تب تو آپ بڑے سستے چھوٹتے ہونگے، حلوائی کی دکان، نانا جی کی فاتحہ۔ ——— کسی میوہ فروش حلوائی، نانبائی کی دکان پر پہنچے اور نظر ڈالی اور خوانچے کے خوانچے سمیٹ لئے۔"

"حلوائی، نان بائی کون اور دکان کیا؟ — معاف کیجئے میں آپ کی اصطلاحات سمجھنے سے قاصر رہ جاتا ہوں۔"

میں نے دکان اور دکاندار کی تشریح کی اور مجملاً تجارت کا اصول سمجھایا، اور پھر سوال کیا "یہ فرقے آپکے یہاں نہیں ہیں؟"

"بالکل نہیں، اور نہ اس طریقہ تبادلہ کی ضرورت، ہمارے جملہ ضروریات زندگی فطری حالت میں ہر ایک کے لئے عام ہیں، اور ہر شخص آزاد ہے کہ اپنی ضرورت کے موافق جس طرح چاہے اپنے تصرف میں لائے۔ لہٰذا جو شئے دوسرے کے قبضہ اور تصرف میں ہے اس کی جانب ہماری توجہ مبذول ہونا ناممکن ہے اور غیر فطری کیونکہ جس پر ایک کی قوتِ ارادی کام کر رہی ہے وہ دوسرے کی قوت دسترس سے باہر ہے۔"

"جناب آپ کی تو ہر بات بے اچنبے کی ہے، آپ کی آواز ہوا میں نہیں گونجتی۔ مگر کان تو کان دل سنتا ہے، اور آپ کے کان دکھائی نہیں پڑتے لیکن آپ شیر سے بھی زیادہ باریکی کے ساتھ سن رہے ہیں، آنکھیں مغز میں نہیں معلوم ہوتیں مگر دوربینیں گرد ہیں آپ کی بینائی کے آگے، اور ستم یہ کہ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت، اور نہ منہ ہی، اور سنترے اسکوئش سب کچھ کھاپی برابر کیا۔ آخر بغیر بیرونی اعضاء کے یہ تمام افعال کیونکر انجام پا جاتے ہیں؟"

"دیکھیے تو یہ بیرونی اعضاء تو نہایت ہی بھدا اور موٹا ذریعہ ہیں اس قوت ارادی کی انجام دہی کا جو ہڈی کی طرح کے اندر کام کرتی ہے، تو سمجھ لیجئے کہ قوت ارادی کی حرکت تو شاید ہمارے اور آپ کے اندر یکساں طور پر کارفرما ہے، غالباً فرق صرف اتنا ہے کہ اس کے ساتھ ہمارے اندر اس کی تکمیل کا ذریعہ اسی طرح مضمر ہے جس طرح قوتِ ارادی خود، لہٰذا ہماری قوت ارادی میں ہی تکمیل مضمر ہے، کیا آپ کی قوتِ ارادی کی بھی کوئی مادی تشکیل آپکے جسم میں نظر آتی ہے؟" اور اسنے جیسے میرے وجود کا غائر جائزہ لیتے ہوئے میرے جسم میں شاید قوتِ ارادی کی حرکت کا کوئی عضو تلاش کیا۔

میں نے گھونٹ سا لیا، اور ذرا سنبھل کر جواب دیا "مگر نفسیات اور فلسفہ کی قدیم تحقیقات کے مطابق ہمارا دماغ جملہ قوتوں کا منبع ہے، ہر طاقت کا خزانہ دماغ کے اندر مختلف خانوں میں علیحدہ ہے، اور اسی کو اسکا عضو متعلق سمجھنا چاہیے جس کے ذریعہ اس عمل کی تکمیل ہوتی ہے۔"

"نفسیات اور فلسفہ کیا؟" اسنے سوال کیا۔ اور پھر مستفسرانہ انداز میں سلسلہ کلام جاری رکھا "یہ بھی کوئی دکان وغیرہ کی چیزیں ہیں؟"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، اور میں نے ایک قہقہہ لگا کر سنجیدگی کے ساتھ کہا "یہ علوم ہیں، علم النفس،

فلسفہ، سائنس، طب، ریاضی، ہندسہ، ہیئت، کیمیا، طبعیات وغیرہ وغیرہ ہمارے یہاں بے شمار اقسام کے علوم رائج ہیں اور درس و تدریس کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری ہے۔ آپ کے یہاں تعلیم کا کیا طریقہ ہے؟ مدارس میں کتابوں اور دیگر ذرائع سے تعلیم دی جاتی ہے؟ اور اساتذہ اور ماہرین تعلیم دیتے ہیں اور ہر شعبۂ علوم فنون کی کتابیں ہیں؟"

"کتابیں کیا ہوتی ہیں؟" اجنبی نے نہایت ہی بھولے پن سے سوال کیا، میں اچھل سا پڑا، اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا "افسوس! ای۔ آں۔ آپ کتاب نہیں جانتے! اور آپ کے یہاں تعلیم و تدریس ہے؟"

"بالکل ہے۔ لیکن ہم کتاب نہیں جانتے کیا چیز ہوتی ہے"

میں نے کتاب کی وہ جلد سامنے کر دی جو میرے پاس رکھی تھی "دیکھیے یہ کتاب ہے"

اس نے اس کو بڑے غور کے ساتھ دیکھا، اور کہا مگر اس چیز سے اور تعلیم و تدریس سے کیا علاقہ، کیا آپ اس کے اندر جو باریک باریک نقوش ہیں ان سے کچھ کام لیتے ہیں اور تعلیم و تدریس میں امداد حاصل کرتے ہیں"

میں نے کہا "بالکل، انہیں نقوش کے ذریعہ تو وہ موضوع جس سے یہ کتاب متعلق ہے ظاہر کیا گیا ہے اور اس کی معلومات محفوظ کر دی گئی ہیں اور جو ان نقوش کو دیکھے گا ان معلومات سے مستفیض ہوگا، یہ مقررہ نقوش ہیں اور ہر شخص جو ان کی شکل سے واقف ہے ان کو دیکھ کر ان کا مفہوم سمجھ سکتا ہے"

"تو یوں کہیے کہ جس طرح آپ کی اور سب قوتیں بغیر مادی ذرائع کے اپنا کام نہیں کر سکتیں اسی طرح آپ کی تعلیم و تدریس بھی بغیر خارجی اشیاء کے نہیں ہو سکتی، معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی دماغی قوتیں ناقص ہیں اور فہم و ادراک یا تو بہت ہی نیچے درجہ کی ہے یا پھر آپ ان سے کام نہیں لینا چاہتے"

میں نے ذرا جھلا کر سنجیدگی سے کہا "دماغی قوتوں کے نقص کا فتوے تو جھٹ سے صادر کر دیا لیکن آپ نے اس پہلو پر بھی غور فرمایا کہ جو تعلیم کتاب یا آلات کے ذریعہ ہوتی ہے وہ مصنف کتاب یا موجد آلہ کے بعد بھی یعنی اس کی زندگی ختم ہونے کے بعد بھی نسلاً بعد نسلاً فائدہ پہنچاتی رہتی ہے، جب آپ کی دنیا میں کتابوں کا رواج نہیں ہے تو بندہ نواز آپ کے یہاں علم کے تحفظ کا بھی انتظام نہیں"

"آپ بہت نیچی بات کہہ رہے ہیں اور بڑی موٹی —— جناب فطرت اور مظاہر فطرت ہماری کتابیں سمجھیے جو ہمیشہ سے ہمارے سامنے کھلی ہوئی ہیں، اور ہر وقت ہمارے اندر تحقیقات اور معلومات کا ایک سمندر سا ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے، اور از خود ایک محقق سے دوسرے محقق میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور اس کام سے ہم میں کا ہر ایک اپنی جگہ اس سے یکساں فیضیاب ہوتا رہتا ہے۔ اور آپ نے جو یہ زندگی ختم ہونے والی بات کہی یہ میں نہیں سمجھا۔ کیا آپ کی زندگی فانی ہے؟"

"اور نہیں تو کیا، اور آپ شاید آب حیات پئے ہوئے ہیں" میں نے طنزاً کہا۔ "اور کبھی نہ مریں گے"

اس نے میرے طنز کو سمجھ کر کہا "فانی تو خیر ہم بھی ضرور ہیں، اور شاید سب کائنات فانی ہے، لیکن ہماری زندگی اس وقت ختم ہو گی جس وقت ہمارا کرہ اور شاید یہ سب کائنات ختم ہو گی، اور آپ کی زندگی شاید آپ کی دنیا کے ختم ہونے سے پیشتر ختم ہو جائے گی؟ ایں؟" اسنے بہت ہی سادگی کے ساتھ کہا۔

میں سراپا تحیر بنا اس کا منہ تک رہا تھا اور میں نے کہا "میاں دنیا ختم ہونے سے قبل مجھ جیسی نہ معلوم کتنی زندگیاں ختم ہو چکیں گی اور اب تک نہ معلوم کیسی کیسی عظیم ہستیاں اور پھولوں سے وجود اس مٹی نے نگل لئے۔ بقول کسے "خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔" لیکن بھائی اس میں شک نہیں کہ آپ موت جیسے خطرہ سے محفوظ ہیں۔ بڑی بات ہے، امر ہیں، لیکن یہ خیر بلا امتزاج شر نہیں۔ آخر آپ کے یہاں جب پیدا ہی ہوتے ہیں اور مرتے نہیں تو زندگی کا یہ بڑھتا ہوا سیلاب آپ کا کرہ کیسے اٹھاتا ہے؟ اور تناسب آبادی و ذرائع پیداوار و دیگر معمولات کیونکر متوازن رہتے ہیں؟ اور سوسائٹی کا نظم و نسق کیسے برقرار رہتا ہے؟"

اجنبی نے جواب دیا "تولید و تناسل سے ہمارے یہاں کوئی اس قسم کا اضافہ نہیں ہوتا جو ہماری زندگیوں میں خارج ہو، حتٰی کہ ادنےٰ سی بھی قباحت کا احساس ہو، ایک خاص وقفہ کے بعد سلسلہ تولید کی عام تکرار ہوتی ہے اور جس وقت یہ نئی تعداد افراد کی زیادتی کو محسوس کرانے کے قابل ہو فطری طور پر توازن ہو جاتا ہے۔"

"کس طرح، یعنی بغیر مرے ہوئے توازن کیسے ہو جاتا ہے؟"

"وہ یوں کہ جوں جوں ہماری عمریں بڑھتی جاتی ہیں ہم رفتہ رفتہ قید زمان و مکان سے آزادی کی جانب ترقی کرتے جاتے ہیں اور یہاں تک کہ ایک وقت وہ آتا ہے کہ بالکل بے نیاز ہو جاتے ہیں۔"

"خیر وہ زندگی اگر اسے زندگی کہا جائے کس قسم کی ہوتی ہے ذرا ایسے سمجھائیے کہ مجھ اسفل مخلوق کی نگاہ میں بھی اس کا کچھ تخیل قائم ہو سکے۔"

"ایں! وہ زندگی!! زندگی کی معراج ہے۔ آپ اور باتیں تو کیا سمجھیں گے مگر یوں سمجھ لیں کہ اس بلند مقام پر ہمارے قیام و سکونت کے لئے بحر و بر کی تمیز نہیں رہتی عناصر کی قید سے آزاد ہوتے ہیں، تغذیہ اور مسکن مثال کے طور پر صرف ہوا پر رکھ سکتے ہیں یا روشنی، رطوبت، جہاں چاہیں ——— "پھر کچھ ٹھہرا اور جیسے کچھ ماحول کا جائزہ لینے لگا اور کہا "ہوں۔ آپ کا مسکن تو شاید یہ درخت ہے، لیکن یہاں آپ کا کوئی ہم جنس نہیں ہے؟"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی، "میرا مسکن یہ درخت ہے! ———" اور میں نے ہنستے ہوئے کہا "بندہ نواز آپ نے بھی مجھے کوئی الو، چمگادڑ سمجھ لیا۔ یہ میرا مسکن نہیں ہے البتہ دو راتیں اسی کھنڈرے پر بسر کر چکا ہوں۔"

"کیوں؟"

"میں یہاں شکار کے لئے آیا ہوں۔"

"کس چیز کا شکار؟"

"جی شیر کا شکار، اور آج یہ تیسری رات ہے۔"

"آپ کس طریقے سے شکار کرتے ہیں؟"

میں نے اپنے رائفلوں اور کارتوسوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ میرے ہتھیار ہیں اور میں ان سے مارتا ہوں۔"

"کیسے؟" اس نے گہرا جائزہ لے کر کہا۔

میں نے پہلے تو اسے رائفل کی ساخت کے متعلق مختصر سے الفاظ میں سمجھایا، پھر کارتوسوں کے اجزا کی تفصیل، دو سے تعلق پر گولی کی طاقت اور پھر ضرب کا اصول سمجھایا جو ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔ اور رائفل میں کارتوس بھر کر چلانے کا طریقہ بتایا اور نشست لینے کا انداز دکھایا۔

اس نے ہر چیز کو خوب سمجھ لیا، اور حقارت کے ساتھ ہونٹ بچکا کر کہا "ہوں، بالکل مادی اور کثیف دنیا، خارجی اشیاء کے غلام مخلوق، اور دل بہلا ایک ذرا سے مشغلہ کے لئے لوہا، لکڑی، پیتل، سیسہ، اور نہ معلوم کیا کیا دنیا بھر کے مصالح۔ اور پھر بھی سب کچھ نہایت ہی ناقص اور بھدا۔"

بھلا میرا بائی ولایتی کارڈائٹ انگلش رائفل! اور جدید ترین ساخت کے کارتوس۔ یہ مسخرہ تو کوئی چیز دھیان میں نہیں لاتا، بڑا تیس مار خاں بنا پھرتا ہے میں نے گردن ترچھی کر کے کہا "اور آپ کسی کو ہلاک کرنا چاہیں تو کیسے کرتے ہیں؟"

اجنبی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ سامنے کی جھاڑیوں میں کچھ سرسراہٹ ہوئی، بکرے کی آواز بند ہو گئی اور سہم کر مرغی کے برابر رہ گیا۔ چاندنی خوب چٹکی ہوئی تھی، اور سامنے شیر اپنی مخصوص جبلت کے مطابق بکرے پر جست کرنے کے لئے جسم چرا کر، آہستہ آہستہ دم لہرا کر رینگتا ہوا بڑھ رہا تھا، قاعدے کے مطابق مجھ کو اس وقت فیر کرنا تھا جب شیر بکرے کو دبوچ کر اطمینان کے ساتھ کھانے بیٹھ جاتا۔ مگر مجھے اس وقت اجنبی کو اپنی نشانہ بازی اور چابک دستی بھی دکھانا تھی لہذا پیشتر اسکے کہ شیر بکرے پر حملہ کرنے پائے میں نے تیزی کے ساتھ رائفل اٹھایا اور نشست لے کر ایک ہی نشانے پر دن، دن دونوں فیر کر دیئے۔ دونوں گولیاں اتنی کاری پڑیں کہ شیر آخری آواز بھی نہ نکال سکا اور الٹ کر جا پڑا، اور دم لہرا کر زمین پر پٹخ دی، یہ شیر کے شکار میں مرنے کی آخری اور یقینی علامت ہوتی ہے۔ خوشی میں بھرائی ہوئی آواز میرے منہ سے نکلی "وہ مارا" ——— اور ایک ساعت اپنے ساتھی کی تحسین و مرحبا کی مخصوص آواز کا انتظار کیا ——— اسے چپ دیکھ کر دل میں خیال آیا کہ عجیب "ان اسپورٹمنگ" مخلوق ہے، میں نے بکرے کے KILL کے شکار کا بہترین مظاہرہ کیا کہ شیر کو بکرے تک پہنچنے بھی نہ دیا اور چت کر دیا،

لیکن اسکے چھوٹے منہ سے "ویل شاٹ" "گڈ" کا کلمہ تو درکنار چہرہ پر کوئی EXPRESSION بھی نہ پیدا ہوئی۔ ذرا دیر متوجہ رہنے کے بعد میں نے فخریہ کہا: "دیکھا آپ نے ہمارا شکار!؟ ——— اور ہمارے ہتھیاروں کی ضرب!؟ ۔ ملک الموت کا طمانچہ ہے ہماری گولی"

"جی دیکھا" جیسے اس نے نہایت ہی معمولی بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"میں نے فخریہ کہا" اب آپ اپنا طریقہ شکار بتائیے"

"بتانے کے بجائے میں کل طریقہ سے دکھاتا تو بہتر تھا۔ اگر آپ اسے نہ مار دیتے تو مار کر دکھاتا۔ اب کیا مار کر دکھاؤں" اور وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ سامنے جھاڑیوں میں پھر سرسراہٹ ہوئی اور یک دم ایک بھری ہوئی شیرنی سامنے تھی، اور شیر کے شکار کے تجربہ میں یہ پہلا موقع تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ دو ہاکوں کے بعد اور شیر کے مرنے کے بعد شیرنی غصے میں بپھری ہوئی انتقام کے جذبہ میں شکار کے میدان میں جست لگا کر آگئی۔ ابھی حیرت سے چھٹکارا نہ ہونے پایا تھا اور دوسرا بھرا ہوا رائفل پیش کر کے اجنبی کو چانس دینے کا خیال میرے دل میں آیا ہی تھا کہ شیرنی نے غوں کر کے دوسری جست لگائی، اور سیدھی مچان پر جھپٹی، غیض و غضب میں بھرپور جست لیکن مچان سائنٹیفک طریقہ پر بندھا ہوا تھا، ایسا کہ زمین سے پچھلے پاؤں پر کھڑی ہو کر اچک کر شیرنی پہنچ نہ سکے اور غصہ میں جست لگائے تو اونچی نکل جائے، اور یہی ہوا شیرنی اپنی جست میں مچان سے اونچی پہونچی اور ہم لوگ بال بال بچ گئے اور شیرنی ہمارے داہنے ہاتھ پر زمین پر جا گری اور ایک ساعت ٹھہر کر بڑی ہولناک گرج نکالی۔ پہلی جست پر قاعدہ کے مطابق مدافعت کے لئے میں نے اپنا آٹومیٹک پستول نکال لیا تھا۔ جو خدا بچائے ایسے ہی موقعوں پر مدافعت کا نہایت ہی اچھا اور کمزور ذریعہ ہوتا ہے، شیرنی کے زمین پر پہنچتے ہی میں نے دوسرا رائفل اجنبی کو پیش کیا مگر دوسرے ہی سیکنڈ میں شیرنی نے زمین سے پھر اڑان کسی لی، اب کی مرتبہ حملہ شدید تر تھا اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارے مچان سے اور بھی زیادہ اونچی نکلی چلی گئی! اور پھر بائیں جانب زمین پر آگری ؛ اور گرتے ہی پھر جست کی، ——— اور یہاں تک کہ پیہم حملوں کا تار باندھ دیا، اور مجھے اپنی موت سامنے متحرک نظر آئی اور ایک دو مرتبہ میرے اتنے قریب اچھلتی اوپر کو نکلی چلی گئی اس کے کھلے ہوئے جبڑوں کی بھاپ میرے چہرے پر محسوس ہوئی شست لینے کا وقت نہ دیتی تھی، میرے رائفل، میری قادر اندازی اور چابکدستی سب کچھ ان موت میں غلطاں ثانیوں کے اندر مفلوج ہو کر گرد ہو رہی تھی۔ بے اختیار خوف میں بھرائی ہوئی آواز میرے حلق سے بلند ہوئی "اگر کچھ کر سکتے ہو تو کیجئے ورنہ ہم دونوں کی خیر نہیں۔

میرے ان لفظوں پر جیسے اجنبی نے ایک غائر نظر بھر کر شیرنی کو دیکھا جب کہ وہ عین حملے کے عالم میں زمین سے چودہ فٹ بلند مچان کے محاذ پر جست کی حالت میں تھی اور جیسے شیرنی کی جست کٹ گئی اور وہ الٹ

کر زمین پر جا گری، بے حس و حرکت اور میں نے انداز ہ کیا کہ اس کی روح تو زمین پر گرنے سے پیشتر ہی الٹی قلا بازی کھاتے وقت شاید وہیں ہوا میں ہی پرواز کر گئی تھی۔ جیسے جست میں ہی بجلی نے مار دیا میں نے حیرت و خوف کے ملے جلے انداز میں کہا۔

"ایں! یہ کیا ہوا!!!؟" اور شیرنی کو بغور دیکھنے لگا کہ دم نکلتی ہے یا نہیں، کیونکہ مجھے یقین نہ تھا کہ یہ مرگئی۔ مگر وہ تو مرنے کے مراحل جست اور قلا بازی میں ہی طے ہو چکے تھے۔

"ہوا کیا، ختم ہوگئی۔ اور وہ تو پہلے ہی حملے کے وقت ختم کر دیتا کیونکہ فطری طور پر مجھے اس کے شکار کا حق پہلے ہی حملہ پر پہنچتا تھا مگر میں آپ کی حرکات سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔"

مجھے یقین نہ آتا تھا کہ یہ ختم ہوگئی، لیکن جب میں نے اپنی ٹارچ اٹھا کر اس کی آنکھوں پر جمائی تو یقین ہوا شیرنی واقعی مردہ تھی۔ مجھے اس پراسرار وجود سے خائف ہونا چاہیئے، کوئی جادوگر، الف لیلیٰ کی کہانیوں والا —— یا پھر مسمیریزم کا بڑا مشاق عامل، —— ورنہ کوئی بڑا سائنٹسٹ جس کے پاس ایٹم بم کے قبیلہ کا کوئی مہلک ترین مربع ہتھیار چھپا ہوا ہے —— لیکن میں باوجود کوشش کے بھی، اس سے خائف ہونا تو درکنار اپنے دل میں اجنبیت بھی پیدا نہ کر سکا اور اس کی بجائے ایک مزید انسیت کا جذبہ جنم لینے لگا جیسے اس کی زندگی میں منشاء فطرت کے مطابق ہے، یہ بے ضرر مخلوق ہے، کاش ہم بھی اس جیسے پیارے آدمی ہوتے۔ اور اسنے کہا۔

"ہم اس قوت کو بہت سخت ضرورت کے وقت استعمال کرتے ہیں، اور یہ تو خیر شدید ضرورت کا وقت تھا، ویسے وہاں پر استعمال کر سکتے ہیں جہاں آپنے اپنا رائفل استعمال کیا اور اپنے بکرے کی جان بچائی لیکن آپ اس پر بار بار روشنی کیوں ڈالتے ہیں، کیا اسے پھر سے زندہ کرنا چاہتے ہیں؟"

"نہیں صاحب بھلا اسے اب کون زندہ کر سکتا ہے، میں اسے یوں ہی دیکھ رہا تھا، وہاں پر چاندنی نہیں ہے، اندھیرے میں پڑی ہے نا۔"

"ایں! تو کیا آپ کے یہ آلات بصارت جنہیں آپ آنکھیں کہتے ہیں وہاں دیکھنے کے لئے بھی کافی نہیں؟" میں نے کہا "نگاہ تاریکی میں کام نہیں کر سکتی نا۔"

"چہ چہ چہ کس قدر ناقص! —— اور اتنے ناقص آلات سے دیکھنے کا اہم کام" اور اسنے میری آنکھوں کو بغور دیکھا، اور کہا "یہ آپ انہیں بار بار کھولتے اور بند کیوں کرتے ہیں؟"

"جی ہم اسکو اصطلاح میں پلک مارنا کہتے ہیں، یہ نہایت نازک ہیں، اور انہیں بالکل کھلا نہیں رکھ سکتے۔ ان میں مستقل رطوبت رہتی ہے اور گویا پلک مار مار کر ہم انہیں پچارے سے صاف کرتے رہتے ہیں جیسے آئینہ صاف رکھا جاتا ہے۔"

"آئینہ کیا؟" اجنبی نے پوچھا۔

میں نے جیب سے پاکٹ آئینہ نکال کر دکھایا "یہ آئینہ ہے، آنکھ کے محاذ میں جو چیز نہیں ہوتی وہ نظر نہیں آتی ایسی صورت میں ہم اس کا عکس اس میں دیکھ لیتے ہیں۔ دیکھئے نا۔"

"ہوں تو گویا یہ اور نقص معلوم ہوا آپ کی آنکھیں صرف محاذی میں دیکھ سکتی ہیں، ایسی صورت میں آپ بجز سامنے کے اور ہر سمت اندھے رہتے ہیں، اور شاید تاریکی میں بالکل بیکار ہیں۔"

"جی ہاں" میں نے سست سا ہو کر کہا اور پھر کہا "اور آپ کی بصارت شاید آگے پیچھے ہر سمت کام کرتی ہے۔"

"جی ہم مکمل بصیرت ہیں۔ یہ آپ کا آئینہ جس طرح آپ کے عکس کو آپ کی آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے اسی طرح ہم خود اپنا چہرہ اپنی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔"

"تو شاید آپ کی قوتِ بصارت لامحدود بھی ہوگی۔"

"جی ہم اپنی ضرورت کے مطابق دور اور قریب یکساں دیکھتے ہیں، اندھیرے اجالے میں بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

میں نے کہا "افسوس کہ آپ سے میری ملاقات یہاں تنہائی اور جنگل میں ہوئی۔ کچھ دوست ہوتے تو اس کا لطف بہت زیادہ ہوتا، کہیں گھر پر ہوتی۔"

اجنبی نے کہا "تو یہ تو آپ کی عارضی جائے قیام ہے، یہاں کب تک رہیں گے؟"

"میں نے ابھی عرض کیا نہیں یہاں تو میں شکار کے لئے بیٹھا تھا وہ ہو چکا اور اب تجربہ ہوا کہ آج تک کسی بنی نوع انسان کو نہ ہوا ہوگا، آپ کی شخصیت ہی کیا کم حیرت میں ڈالنے والی تھی اور پھر آپ کا یہ شیرنی ملنے کا کارنامہ!۔ اور میں نے ایک لمبی سانس لی، العظمت للہ، کیسی غضبناک شیرنی تھی، اور ذرا دیر میں قلم کردی آپ نے!" اور پھر ایک لمبی سانس لی۔

"آپ پر کیا اب بھی کچھ خوف طاری ہے، یہ ایک مسلسل حرکت مجھے آپ کے سینہ اور پیٹ پر محسوس ہوتی ہے جو شیرنی کے حملے کے وقت زیادہ تیز تھی اور اب بھی کسی کسی وقت نمایاں ہو جاتی ہے۔ اور مستقل طور پر موجود ہے۔"

میں نے ہنس کر کہا "جی یہ تو میں معمولی سانس لے رہا ہوں۔"

"سانس لے رہا ہوں، یعنی کیا؟"

اور میں نے مزید تشریح کی کہ ہم کو قیام حیات کے لئے مسلسل ہوا کی ضرورت ہے، ہم اپنی ناک اور منہ کے راستے ہر وقت سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے ہوا داخل کرتے اور چھوڑتے رہتے ہیں۔

سینہ میں پھیپھڑے اس ہوا کو یے کر ہمارے خون کو متوازن رکھتے ہیں اور زندگی چلتی ہے، اس کو سانس لینا کہتے ہیں اسکے بغیر زندگی ممکن نہیں "

"ہوں، چہ بہ چہ، عالم اسفل کا مکین، مجبور انسان، اگر ہوا دم بھر نہ سنبھلے تو الٹ کر اوندھے منہ جا پڑے اسنے ایک گونہ رحم کے ساتھ میرے سینہ پر نظر کرتے ہوئے کہا میں ذرا مرعوب تھا لہذا مخصوص انداز میں کہا "شاید آپ کی دنیا میں سانس لینے کی یہی معانی ہے" اور بغور اس کی جانب دیکھا اور کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ سانس نہیں لے رہے ہیں"

اجنبی نے کہا "نہیں یہ بات تو نہیں، ہوا کی ہم کو بھی ضرورت ہے، مگر ہم ہوا کے غلام نہیں، ہمارا نظام تنفس آپ سے زیادہ بڑھا ہوا ہے، آپ اپنی فکر و استعداد کے مطابق یوں سمجھ لیں کہ ہوا ہمارے مسامات کے ذریعہ پہنچتی ہے اندر خون کا توازن بغیر کسی مخصوص عضو کے ہوتا رہتا ہے اور ایک مرتبہ حسب ضرورت لینے کے بعد ہمارے جسم کو ایک مدت کے لئے اسکی ضرورت نہیں ہوتی۔

"خوب ـــــ! یعنی پھر تو آپ کے یہاں روای چین ہی چین لکھتا ہے، لیکن یہ تو بتایئے جس وقت سے آپ ہمارے کرہ میں آئے ہیں آپ کو سانس لینے کی ضرورت پیش آئی" میں نے کہا۔

"جی نہیں، ابھی تک تو نہیں، البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر زیادہ دیر تک ٹھہرا تو ضرورت ہو گی اور شاید تھوڑی سی وقت کے بعد سانس لے سکوں گا، کیونکہ چھو کر اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے کرہ کی ہوا اتنی لطیف نہیں ہے جتنی ہمارے کرہ کی، لہذا ممکن ہے کہ اس سے مستفیض ہوتے میں تھوڑی قباحت ہو تاہم میں سمجھتا ہوں کہ کام نکال لوں گا"

"ایسا تو نہ ہو کہ آپ کا دم گھٹ جائے" میں نے نیم مذاقیہ انداز میں کہا۔

اسنے سنجیدگی سے جواب دیا "نہیں، اور اگر زیادہ قباحت ہوئی تو میں اپنی دنیا کو چلا جاؤں گا"

"بہر حال واپس جانے میں بھی آپ کو کچھ وقت لگے گا"

"واپسی میں ـــــ ہوں، وقت، نہیں ایسا کتنا وقت لگے گا، آپ کے وقت کے اندازہ کے موجب سیکنڈوں سے بھی کم وقت میں پہنچ سکتا ہوں"

"ارے صاحب نہ معلوم کس وقت اٹھ کر چل دیں، اور میرے اندر تو سوالات کا پورا ایک سمندر موجزن ہے، مجھے آپ معاف کریں آپ میرے سوالات سے اکتا تو نہیں جائیں گے"

"آپ بڑے اطمینان سے پوچھئے نہ میں یک دم اٹھ کر چل دوں گا۔ اور نہ آپ کے سوالات سے اکتاؤں گا، اور پھر میں تو آپ کے یہاں سیاحت کے لئے آیا ہوں، اگر آپ بہت سے سوال کر رہے ہیں تو میں

میں تو پوچھ گچھ رہا ہوں اور دیکھ بھال رہا ہوں، پوچھئے، پوچھئے، بڑی پُرلطف صحبت ہے۔"
"ہاں تو یہ ضروری سوال — ہوں آپ یہاں کس سواری پر تشریف لائے، راکٹ پر شاید؟"
"جی ہمارے یہاں ایک ہی ذریعہ آمد و رفت ہے، بس روشنی، سب سے زیادہ تیز رفتار، اور ہلکا، بہ آسانی قابلِ استعمال، بلا امتیاز رخ کے جدھر چاہو ہمہ وقت لے جانے کو طیار۔"
"تو آخر آپ اس سے کیسے کام لیتے ہیں" میں نے بڑے اشتیاق کے ساتھ پوچھا۔
"شعاعوں پر سفر کرتے ہیں۔"
"میں نہیں سمجھا، مثال کے طور پر آپ اپنے کرہ سے یہاں تک کس طرح پہنچے، ذرا اپنے اس دور دراز سفر کی مختصر سی روئداد سنائیے۔" میں نے کہا۔
"ہمارے کرہ سے براہ راست قطب ستارہ پر شعاعیں پڑ رہی تھیں جس وقت میں نے عزم سفر کیا، میں ان پر چل کر قطب تک آیا، دیکھا تو قطب کی شعاعیں چاند سے مل رہی تھیں لہٰذا وہاں سے قمر میں پہنچا، عجیب کُرہ ہے، وہاں جی نہ لگا اور نظر کی تو آپ کا کرہ چاندنی سے جگمگا رہا تھا، بس چاندنی کی شعاعوں سے آپ کے یہاں پہنچ گیا۔"
"لیکن آپ کا یہ وجود جو بظاہر جسم معلوم ہوتا ہے میں نہیں سمجھ سکتا کہ کیونکر روشنی کے ساتھ منتقل اور متحرک ہو سکتا ہے۔" میں نے اجنبی کی طرف بغور دیکھ کر کہا۔
"جی بالکل آسانی کے ساتھ۔ یہ جو آپ میرا جسم کہہ رہے ہیں یہ ہمارا لباس ہوتا ہے، اور ہم اسکو اپنی ضرورت کے مطابق تبدیل کر سکتے ہیں، کیا آپ اس پر بالکل قادر نہیں۔"
"معاف فرمائیے، ہمارے یہاں دیوتاؤں اور فرشتوں کی یہ صفتیں لکھی ہوئی ہیں، ذرا سی صحبت میں ہی میں نے بہت سی مافوق الفطرت چیزیں آپ کے اندر دیکھ لیں۔ . . . ."
"مافوق الفطرت! ایں آپ فطرت اور میری دونوں کی توہین کر رہے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ عین مطابق فطرت" اسنے کہا۔
"خیر عین مطابقِ فطرت سہی، مگر ایک ذرا سی تکلیف دینا چاہتا ہوں — معاف فرمائیے، میں کسی جادو کے تماشہ کی فرمائش نہیں کر رہا ہوں، لیکن آپ کا قالب بدلتا دیکھنا چاہتا ہوں مجھے آپ کی بات پر بالکل یقین ہے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں آپ کو جھوٹا خیال کرتا ہوں لیکن ایسی باتوں پر کذب بیانی کا شبہ ہوتا ہے لہٰذا یہ چیز صرف اپنی معلومات کے لئے جاننا چاہتا ہوں۔ اور یہ تو مسلم ہے کہ ہم ارضیوں پر آپ کو فوقیت ہے۔"
"کذب بیانی خلاف فطرت ہے اور ہم اس پر قادر ہی نہیں ہو سکتے اور نہ یہ چیز ہمارے یہاں قابل عمل ہے"

ہم چشم زدن میں حسبِ مرضی قالب بدل سکتے ہیں اور حسبِ ضرورت مختلف اشکال میں نمایاں ہو سکتے ہیں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں آپ کے سامنے مختلف قالبوں میں ظاہر ہوؤں آپ کو اس کا اصول سمجھا دوں، نہایت سادہ اور عین مطابق فطرت۔ دیکھیے تو ہمارا اور شاید آپ کا بھی سب کا وجود پانچ اجزا کا مرکب ہے، خاک، ہوا، پانی، آگ اور پانچواں سب سے زیادہ لطیف ایتھر ہے۔ ان میں سے تین پہلے والوں کا تجزیہ ہو چکا ہے۔ چوتھے آگ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ طاقت ہے، لیکن آپ سب میں بلکہ شاید آپ کے کل کرہ میں پانچویں کا احساس نہیں ہے یا اگر ہے تو برائے نام، لیکن ہمارے یہاں یہ جز سب پر غالب ہے۔ یہاں تک کہ ہم اس پر اس درجہ قادر ہیں کہ بقیہ اول الذکر چاروں عناصر کو وقتِ ضرورت اس کی قلب ماہیت کر سکتے ہیں۔ آپ کے یہاں خاک کا عنصر غالب کر لیا ہے یہاں تک کہ آپ اپنے آپ کو خاکی کہتے ہیں سمجھتے بھی ہیں اور خاک ہی میں زندگی کاٹ کر شاید خاک ہی میں مل جاتے ہیں، حالانکہ قدرت نے ہر چیز آپ کو یکساں بخشی ہے۔ اب اس وقت آپ کے ماحول کے مطابق میں خود بھی خاکی ہو رہا ہوں، لیکن آنِ واحد میں اگر اپنے نفس کو ہوائی جانب مائل کر دوں تو آپ کے کرہ کی اس کیفیت ہوا کی لہروں میں مدغم ہو سکتا ہوں، پھر شاید آپ کی آنکھیں مجھے دیکھ بھی نہ سکیں یا چاہوں تو پانی کی لہروں میں اپنا وجود مدغم کر سکتا ہوں۔ بہ ضرورت پانچوں میں سے کسی ایک عنصر کا قالب اختیار کر سکتا ہوں اور میری شخصیت جوں کی توں رہتی ہے۔ سیاحت کا شوق اٹھا، ہمارا کرہ قطب تارے پر شعاعیں پھینک رہا تھا، روشنی میں گم ہو کر وہاں پہنچا اور جیسا کہ میں نے بیان کیا چاندنی میں ہوتا آپ کے یہاں چلا آیا۔ اور چونکہ چاندنی آپ کے کرہ پر آ کر ختم ہو جاتی ہے لہذا یہاں پہنچ کر ٹھہرنا پڑا، یہاں پہنچ کر اندازہ کیا کہ یہ عالمِ اسفل ہے لہذا جیسا دیس ویسا بھیس اس درخت کی پھنگیوں سے تصادم سا ہوا، پھر آپ کے اس کھنڈوے سے ہلکی ٹکر ہوئی نیچے دیکھا تو خالص مٹی تھی لہذا اور نیچے اترنے کے بجائے اسی کھنڈوے پر بیٹھ گیا، ذرا دیر بعد آپ اوپر آئے تو لیجیے ملاقات ہو گئی۔"

"اب آپ انہیں شعاعوں پر واپس جائیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں چاندنی میں تو انہیں پر پلٹوں گا۔"

"اور اگر دن نکل آیا تو؟"

اس نے نہایت ہی معمولی سی بات کرتے ہوئے کہا "تو پھر سورج کی شعاعوں پر جاؤں گا۔"

"لیکن بندہ نواز سورج کی شعاعوں کی تمازت کے آپ متحمل ہو سکیں گے؟"

"کیوں نہیں، ہم اپنے مرکب شعاعوں کی حرارت کے مطابق قالب اختیار کرتے ہیں۔ اگر دن میں سفر کریں گے تو سورج کی شعاعوں کی جتنی گرمی ہوگی اتنی ہمارے قالب کی۔"

میں نے ازراہ مذاق کہا "کیوں صاحب ابھی تو رات بہت باقی ہے اور ساری رات کی چاندنی ہے، کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ اس ٹھنڈی ٹھنڈی لطیف بہار میں چاندنی میں مجھے بھی اپنے ساتھ لے جا سکیں۔"

مگر اجنبی کچھ سوچ میں پڑ گیا اور سنجیدگی سے میرے جسم کو پڑتال کر جواب دیا "ہوں، آں، وہ — اس وقت تو یہ بہت مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن میرا اندازہ ہے کہ ہم میں اور آپ میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ صرف یہ کہ آپ نے ابتدائے آفرینش سے اپنے آپ کو بگاڑنا شروع کر دیا ہے، اور ہم جوں کے توں خالص ہیں کچھ عرصے اگر آپ ہماری تربیت میں رہیں اور اپنے آپ کو ہمارے اوپر چھوڑ دیں تو بالکل ممکن ہے۔"

"یعنی کتنی مدت میں؟"

"ہوں، تو آپ ہی کے وقت کے مطابق تخمینہ لگا کر مجھے بتانا چاہئے۔ آپ کا یہ کرہ تین سو پینسٹھ چکر دن میں سورج کے گرد پورا ایک چکر پورا کرتا ہے، ہوں اور آپ اسکو ایک سال کے نام سے پکارتے ہیں، تو اس حساب آپ کو ہمارے جیسا پورا عادی بننے میں یہی دس بارہ سو سال لگیں گے۔"

"خدا کی پناہ! — آپ مذاق کرنے لگے اتنی مدت میں تو ہماری نہ معلوم کتنی نسلیں خاک ہو چکی ہوں گی، بندہ نواز ہماری عمر کا اوسط چالیس سال ہے، بھلا ہزار بارہ سو سال میں کیسے زندہ رہ سکتا ہوں!"

"لیکن یہ معمولی بات ہے، اگر وہاں پہنچ کر آپ کچھ دنوں وہاں کے ماحول کے عادی ہوئیں تو پہلا اثر یہ ہوگا کہ آپ کی عمر چالیس سال کے بجائے چار سو سال ہو جائے گی۔ فطری صلاحیتوں میں آپ ہمارے ہم پلہ ہیں مگر فرق صرف اتنا ہے کہ آپ جب سے عالم وجود میں آئے اسی روز سے آپ نے اپنی صلاحیتوں کو مسخ کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک ان حالوں کو پہنچ گئے، اب بھی اگر وہاں پہنچکر اپنی زندگی اصولِ فطرت کے مطابق بنا لیں تو ہم جیسے ہو سکتے ہیں۔"

"لیکن شاید شروع میں ہمارے لئے وہاں کچھ خطرات ہیں، ایں صاحب؟" میں نے کہا۔

"خطرہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن تھوڑی تکلیف اور کچھ قباحتوں کا سامنا ضرور ہوگا۔ اور یہ چیز تو بالکل معمولی ہے، شاید آپ اپنے اس کرہ میں بھی ادھر سے اُدھر جاتے ہوں گے تو کچھ دقتیں پیش آتی ہونگی چہ جائیکہ ایک کرہ سے دوسرے کرہ کا سفر، اگر آپ چلنے کے لئے طیار ہوں تو میں انتظام کر دوں۔"

"آپ کیا انتظام کرینگے" میں نے جیسے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"پہلے تو مجھے یہاں گاہے گاہے آنا پڑے گا اور آپ کی تربیت اپنے اصولوں پر کرنی پڑے گی، پھر آپ کو ماحول سے علیحدہ کر دیا جائے گا اور کچھ عرصہ آپ کو اپنے کرہ سے کچھ اوپر زندگی گزارنی ہوگی۔ اور جب آپ اس کرہ کے تعلقات اور ماحول کو فراموش کر دینگے تو پھر آپ کو رفتہ رفتہ اپنے کرہ میں لے جانے کی صورت پیدا

کی جائے گی۔ غرض ممکن ہے، اور میں طیار ہوں۔"

مجھے پہلی مرتبہ اس وقت اس اجنبی سے ذرا سی جھجک محسوس ہوئی، اگرچہ میرا دل اس سے ڈرنے کو نہ چاہتا تھا۔ لیکن اعصاب جیسے کچھ سکڑنے سے لگے: "ہوں! معلوم ہوتا ہے حضرت عزرائیل جیسی زندگی ہبکا کر بے موت مارنے کے لئے اغوا کرنا چاہتے ہیں، میں نے بات بدلتے ہوئے کہا "ہاں تو مجھے آپکو شعاعوں پر سفر کرتے دیکھنے کا بے حد اشتیاق ہے۔"

"لیکن سفر آپ کیا دیکھ سکیں گے، خیر کچھ اندازہ میرے قلب ماہیئت ہونے کا کر سکیں شاید لیجئے۔" اور جیسے وہ مجسمہ پتیوں اور شاخوں میں سے چھنتی ہوئی چاندنی میں حل سا ہو گیا۔ اور ابھی اسکے غائب ہونے کا پورا پورا ردعمل میرے محسوسات پر طاری نہ ہونے پایا تھا کہ نیچے زمین پر چاندنی میں کچھ ارتعاش سا محسوس ہوا، جیسے نم زمین سے کچھ گرد سی اٹھی اور دیکھا تو حضرت کھڑے مسکرا مسکرا کر اوپر کو دیکھ رہے ہیں اور میں اس حیرت کا جو مجھ پر طاری تھی پوری طرح احساس نہ کرنے پایا تھا کہ فرماتے ہیں "اب اوپر آجاؤں؟"

میں نے ذرا جھک کر سیڑھی کے پھندے کی جانب ہاتھ بڑھایا تاکہ یہ اوپر چڑھ سکے مگر ظالم بولا "تکلیف نہ کیجئے۔ یہ تو ایک ڈگ بھی نہیں ہے اور پلک مارتے مچان اور زمین کے درمیان کی چاندنی میں مل گیا، اور میرے برابر جیسے کسی نے مٹھی بھر دھول سی اڑائی اور اسی نظر دیکھتا ہوں کہ مچان آہستہ سے چرچرایا اور حضرت اپنی جگہ پر براجمان ہیں: ـــــ "کیا شعبدہ بازی ہے!" میں نے دل میں کہا اور جب گھڑی پر نظر کی تو ابھی سیکنڈ کی سوئی آدھا راستہ بھی نہ طے کر پائی تھی، مسکرا کر فرمایا" میں نے سوچا ذرا براہ راست آپ کی زمین کی چھاتی بھی ٹٹولتا چلوں، سو اتر کر نیچے تک چلا گیا۔"

اشرف المخلوق اور خلیفۃ اللہ کا پندار خودی میرے دماغ سے نکل گیا، میں بے حد مرعوب تھا، میرا حلق دفور حیرت سے بند تھا، اجنبی نے شاید میری حالت کا اندازہ کر کے کہا "کہئے آپ چپ کیوں ہیں، ہمارے جہان چلنے کا ارادہ ہے؟"

میں نے منٹھار کر کہا "ہوں، نا۔آں، ہاں نے، وہ ابھی یوں نہیں ذرا مشورہ کر لوں، دیکھا جائے گا، اور ابھی تو آپ سے بہت سی باتیں پوچھنی ہیں۔"

"ضرور، ضرور، مجھے بتا کر بھی اتنی خوشی ہوتی ہے جتنی معلوم کر کے۔"

اور اب سے ذرا دیر پیشتر تو میرے اندر سوالات کا ہجوم تھا مگر اب جیسے حیرت نے سب کچھ میرے اندر سے سلب کر لیا تھا۔ ذرا طبیعت پر قابو پا کر میں نے اسی عمل سے متعلق سوال کیا جو شعبدہ کی صورت میں ابھی اس نے میرے سامنے پیش کیا تھا، میں نے سنبھل کر کہا "کیوں حضرت یہ قمر کی شعاعیں زمین کی جانب آرہی تھیں۔

آپ ان پر اتر آئے اور جیسا کہ آپ نے فرمایا کہ اپنے کرہ سے قطب تک مگر تک لیکن یہ شعاعیں تو اُدھر سے اِدھر کو آرہی تھیں لہٰذا آپ تو آئے اب ان پر آپ واپس کیسے جائیں گے۔"

ابھی آپ کو تجربہ ہوا، دیکھئے آپ اپنی سیڑھی کی گرہ کھولتے ہی رہے اور میں زمین سے آپ کے مچان تک پہنچ گیا، زیادہ نہیں ہمیں روشنی پر یا متحرک پانی کی رفتار یا ہوا کی لہر میں ضم ہو کر چلنے میں الٹے اور سیدھے کی کوئی دقت نہیں ہوتی۔ البتہ رفتار میں ذرا سا فرق پڑ جاتا ہے، اور وقت کچھ زیادہ لگتا ہے۔"

"مثلاً کتنا زیادہ، ابھی تو آپ کا کل سفر پچیس سیکنڈ کا ہوا۔"

"ہوں آپ کے یہاں کا سب سے چھوٹا جز سیکنڈ ہے۔"

" جی ہاں" میں نے اپنی کلائی بڑھاتے ہوئے گھڑی کی سیکنڈ والی سوئی کی حرکت دکھائی۔ اجنبی نے بغور دیکھا اور کہا" ہمارے وقت کا آخری جز آپ کی اس ایک حرکت کا دس ہزارواں حصہ ہے۔"

"اوہو! لیکن آپکے یہاں یہ اتنی دقیق کیوں ہے" میں نے پوچھا۔

"ہمارا ماحول اس کے مطابق ہے اور یہ ہمارے ماحول کے مطابق، ہماری دنیا میں نقل و حرکت اتنی سریع ہے کہ وقت کا پیمانہ اتنا ہی دقیق ہونا چاہیئے۔"

"مثلاً آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کو اس وقت کتنا وقت لگا۔"

"شاید آپ نے اپنی اس ننھی سی ناچتی ہوئی سوئی کی حرکت دیکھ لی ہوگی جب میں روانہ ہوا ہوں۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا" آپ کی عدم موجودگی میں میری نظر مستقل طور پر جمی رہی۔"

" تو پھر آپ خود ہی حساب لگا لیجئے۔ میں نے عرض کیا نہیں کہ اس کی ایک حرکت کے دس ہزار ٹکڑے کر دیجئے۔"

میں نے دل میں کہا" استاد تمہاری کس کس چیز کا حساب لگاؤں۔ حیران ہو کر اسکے چہرہ پر نگتکی جمائے ہوئے تھا۔ اور چہرہ ہی کیا تمام وجود سڈ سنڈ تھا، لیکن کراہیت کے بجائے دلچسپی اور یک گونہ یگانگت کا تاثر پیش کرتا تھا۔ بے ساختہ میرے منہ سے ایک سوال نکلا" کیوں جناب آپ کے یہاں خوبصورتی بھی کوئی چیز ہے؟ شاید کوئی چیز نہ ہو۔"

"یہ عجیب سوال آپ نے کیوں کیا؟"

"یوں ہی" ـــــ اور پھر ذرا رکتے ہوئے کہا" ہمارے یہاں انسانی خوبصورتی بیرونی اعضاء کے تناسب کا نام ہے، اور جب آپ ان اعضاء سے ہی محروم ہیں تو خوبصورتی اور بدصورتی کا آپ کے یہاں کیا معیار ہو سکتا ہے۔"

"ہوں ـــــ واہ!" اس نے جیسے میرے طفلانہ انداز پر طنزیہ مسکراتے ہوئے کہا "آپ اتنی دیر سے دیکھ کیا رہے ہیں، ہم کو قدرت نے آپ کے بیرونی اعضاء والی صلاحیتیں بخشی ہیں، اور ہمارے ہم جنسوں میں یہ صلاحیتیں یکساں نہیں ہیں۔ بعض میں کم بعض میں زیادہ، کسی میں کوئی زیادہ قوی دوسرے میں کمزور، اور یہی ہماری سوسائٹی کی تشکیل کا معیار ہیں۔ لہٰذا ہمارے یہاں حسین ترین وہ ہے جس میں یہ تمام صلاحیتیں مکمل اور متناسب ہوں۔"

"خیر ہمارے یہاں بھی سوسائٹی کی تشکیل کا معیار تقریباً یہی ہے۔ یعنی اگر کسی فرد کے قوائے ذہنی اور جسمانی عروج پر ہوں اور اپنے افعال متعلقہ کی تکمیل پورے طور پر کرے تو ہماری سوسائٹی میں اسے ضرور فوقیت دی جائے گی لیکن ان سب کے باوجود اگر وہ کریہہ المنظر ہے تو اسے بدشکل ہی کہا جائے گا۔"

"آپ کے کریہہ المنظری اور بدشکلی کا کیا معیار ہے؟"

"بڑا عجیب سوال کر دیا آپ نے ہمارے یہاں ہر ملک و ہر قوم اور نہ صرف ملک و قوم بلکہ فرد فرد کا اپنا ایک علیحدہ معیار ہے، ایک حسین لمبی پتلی ناک اور سرخ باریک ہونٹ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں خوبصورت سمجھی جاتی ہیں تو دوسرے ملک میں پچکی صورت ــــ اس سے کم متناسب نہیں، چپٹی ناک، موٹے ہونٹ اور چھوٹی آنکھ کو خوبصورت کہا جاتا ہے۔ کوئی دھان پان سا نازک بدن پسند ہے تو کوئی گداز جسم کو فردوسِ آغوش کہتا ہے۔ کوئی سانولے سلونے رنگ پر فریفتہ ہے تو کوئی چمپئی رنگ کا متوالا ہے اور کوئی مرمریں رنگ کا دیوانہ۔ غرض جتنی آنکھیں اتنے حسن، لیکن اصل متناسب اور موزونیت کا نام حسن ہے۔"

"یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہوا۔ آپ غیر متناسب اور بدقوارہ کس کو کہیں گے یہ بتلایئے۔"

"جو شکل آنکھوں کو بھلی نہ معلوم ہو اور دل و دماغ پر خوشگوار کیفیت اثر انداز نہ کرے وہ حسنِ ظاہری سے محروم کہی جائے گی، اور اس سے بھی زیادہ وہ جو شعور پر ناگوار اثر چھوڑے اسے بدشکل و بدقوارہ کہیں گے۔"

"ہاں تو میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کون سا بشرہ یا قیافہ آپ کو اچھا معلوم ہوتا ہے" اجنبی نے کہا اور اب مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ "اس کے لئے کوئی مقررہ بشرہ یا قیافہ نہیں ہے، جو جسے اچھا لگے وہی اس کے نزدیک خوبصورت ہے، جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا۔"

"تو آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک کے نزدیک جو حسین ہے دوسرے کے نظر میں حسین نہ ہو، بلکہ یہاں تک کہ دوسرا اسے بدشکل کہے" اسنے کہا۔

"ہاں ایسا تو بالکل ہوتا ہے کہ جو ایک کے نزدیک حسین ہے اس میں دوسرے کے نزدیک کوئی دل کشی نہیں ہوتی اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دوسرا اسے بدشکل کہتا ہے۔"

"اچھا چھوڑیئے فرض کیجئے کہ ایک انسان کی آنکھ نہایت خوبصورت ہے لیکن بصارت کمزور ہے، دوسرے کی آنکھ بظاہر بدشکل ہے مگر بصارت نہایت قوی ہے تو آپ کسکو افضل کہیں گے؟"

"افضل کا سوال نہیں بات یہاں خوبصورتی بدصورتی کی ہو رہی ہے اور اس معیار پر جس آنکھ کی ظاہری ساخت دلکش ہے وہی خوبصورت کہی جائے گی" میں نے کہا اور اجنبی بے ساختہ بول پڑا۔ "اس معاملہ میں بھی آپ کی پرکھ نہایت ناقص ہوئی، یعنی ایک عضو جو اپنا پورا پورا کام کرتا ہے لیکن ظاہری ساخت میں آپ کے مقرر کردہ اصولوں پر حسین نہیں معلوم ہوتا تو وہ اس سے جو اپنا کام پورا نہیں کر سکتی لیکن حسین کہا جاتا ہے۔ افضل خیال کرتے ہیں۔ تو گویا آپ کے یہاں حسین اور افضل دو مختلف معنی رکھتے ہیں۔ پھر حسن کا بھی آپ کوئی کلیہ معیار قائم نہیں کر سکتے۔"

"جی ہاں، ہمارے یہاں حسنِ ظاہری اور باطنی صلاحیت دونوں کا معیار علیحدہ ہے۔"

"لیکن یہ تو مسلمہ ہے کہ باطنی صلاحیتوں پر آپ سب متفق ہیں، اور حسنِ ظاہری کا معیار ہر قوم بلکہ جیسا کہ ابھی آپ نے فرمایا فرد فرد کا اپنا علیحدہ ہے۔ لیکن ترجیح کس کو دی جاتی ہے؟"

میں نے ذرا سخن پروری کے انداز میں جواب دیا "یہ بھی فرد فرد کا اپنا علیحدہ ہے اور دونوں کی قدر و قیمت ضرورت اور خواہش کے اعتبار سے ہوا کرتی ہے۔"

"تو آپ کے کرہ میں ایسے کور ضمیر لوگ بھی ہیں جن کا معیارِ ترجیح صرف حسنِ ظاہری ہوتا ہے۔ مگر ایسا کیوں؟"

"ہوں، یہ اپنا فطری رجحان ہے، اور اس کے وجوہات پر روشنی ڈالنا کسی بڑے ماہر نفسیات ہی کا کام ہے۔"

"جی کیا فرمایا، فطری رجحان! ——— یوں کہئے کہ قطعاً غیر فطری، بلکہ یہ رجحان قانونِ فطرت سے بغاوت ہے۔"

"خیر آپ ایک حد تک صحیح فرما رہے ہیں، ہمارے یہاں بہت زیادہ عقلمند انسانوں کا یہی معیار ہے مگر اسے کیا کیا جائے کہ حسنِ ظاہری کی چمک دمک مزاج انسانی کو پہلی نگاہ میں ضرور متاثر کرتی ہے ہمارے بڑے بڑے عقلاء اس راہ میں اپنے ہوش و خرد کھو بیٹھے ہیں اور کیوں جناب آپ کی دنیا میں حسنِ ظاہری کوئی چیز نہیں، تو پھر آپ لوگ عشق و محبت کی برکت سے محروم ہوں گے، اور ہمارے یہاں تو اسی کے دم سے سارے ہنگامے اور چہل پہل ہے۔"

"نہیں، ہم کو آپ سے زیادہ عشق و محبت کا عنصر عطا ہوا ہے، لیکن معیار وہی ہے جو میں نے بیان کیا" لاکالی

حسن، عین تقاضائے فطرت، اور شاید آپ کے حسنِ ظاہری کی چمک دمک آپ کی ان مختصر سی زندگی میں ہی ماند بھی پڑ جاتی ہوگی، اور ہمارا حسن دوام ہے:

لیکن میرے بھولے دوست، یہ تغیر ہی تو اس کی جان ہے، اور ہم انسان کچھ ایسے واقع ہوئے ہیں یکسانیت روی اور عدم تغیر سے بہت جلد سیر ہو جاتے ہیں، اس میں شک نہیں کہ آپ کے یہاں عشق و محبت کی شاہراہ بہت سیدھی سادی اور بے غبار ہے اور مسلسل، مگر ہماری طینت یکسانیت اور تسلسل سے گریز کرتی ہے لہٰذا اگر قدرت نہ بھی دے تو بھی ہم اپنے تمام تر معمولات زندگی میں نشیب و فراز پیدا کر لیتے ہیں، یہاں تک کہ یہ چیز ہماری جسمانی ساخت کا اہم جزو بن گئی ہے اور ہماری قیام زندگی کا باعث ہے اور انہیں سے ہمارے فطری جذبات کی تشکیل ہوتی ہے:

"لیکن جذبات عشق و محبت سے لطف اندوز ہونا ——— اس کے لئے فطرت کی جانب نہایت راسخ اصول معین ہیں اور اپنے راستہ میں مشکلات پیدا کرنے سے جو استعداد پیدا ہوتی ہے اسے فطری نہیں کہہ سکتے:"

"یہاں پر میں آپ کے سامنے سرِ تسلیم جھکاؤں گا جناب۔ تقاضائے فطرت اور چیز ہے اور جذبات کی دنیا دوسری ہے۔ اگر آپ محض فطری عشق فطری حسن کے ساتھ کرتے ہیں تو معاف کیجئے، آپ کی نگاہ سے حسن و عشق کا اصل مفہوم پوشیدہ ہے، ہمارے یہاں محبت کے دیوتا کے آنکھیں نہیں، اور جس عشق میں نظر ہو وہ عشق نہیں، اور جو کچھ آپ نے اپنے کرہ کی حسن و عشق کی تشریح کی وہ ہمارے نزدیک کچھ ان جنسی تعلقات جیسی ہے جو ہمارے یہاں کے حیوانوں میں پایا جاتا ہے، ہمارا محبت کا اصل مفہوم اتنا جسمانی نہیں ہے جتنا ذہنی اور جذباتی ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ محبت آپ کے یہاں ایک سپاٹ اور مفرد احساس ہے، مگر ہمارے یہاں اس کی ترکیب میں لطیف جذبات بھی شامل ہیں" اجنبی کچھ سٹ پٹا سا گیا، اور کہا "جی مگر ہماری دنیا جذبات سے عاری نہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ محبت ایک مفرد جذبہ ہے، اور فطرتاً اسکو ویسا ہی ہونا چاہئے دیکھئے محبت ایک جنسی کشش کا نام ہے جو دو ہستیوں کے درمیان رفاقت و مواصلات پیدا کرتی ہے، اور تنہا ایک یہی کشش اس کی بانی ہوتی ہے اور دوسرا کوئی عنصر اس میں شامل نہیں ہو سکتا تو محبت بجز ایک مفرد جذبہ کے اور کیا ہوئی:"

"تو پھر انسان اور حیوان میں فرق کیا ہوا، یہ اعلٰے انسانی مقصدِ حیات کے منافی ہے کہ اسکو محض جسمانی تعلقات تک محدود کیا جائے، برادر یہ تو ایک وجدانی کیفیت ہے جس میں جنسی کشش کے علاوہ اور بہت سے عناصر کو بھی دخل ہے۔ اور فطری اعتبار سے حقیقت یہی ہے، اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر فنونِ لطیفہ، ہمارے جمالیاتی ذوق کی پیداوار شاعری اور مصوری اور لٹریچر کا سرمایہ ایک ذہنی عیاشی کے سوا اور کچھ نہیں رہتا!"

"میں آپ سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ عشق و محبت جیسے سیدھے سادے جذبہ کو کن کن عناصر کے مرکب سے متہم کرتے ہیں کیا آپکی دنیا میں لٹریچر شاعری مصوری سب پر حاوی ہے:

اور میں نے مجملاً بتایا کہ اگر محبت کی فطری کشش میں اور جذبات و محسوسات شامل نہ ہوں تو ہمارے معیار پر وہ کشش عشق کے تخیل کو پورا نہیں کرتی، مثلاً جس ہستی کو ہم محبت کرتے ہیں اسکو اپنے سے افضل تصور کرنا، اور ان خصوصیات و اوصاف کا مرکز سمجھنا جو ہماری رسائی سے بالاتر ہیں۔ اسکو اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کی جانب سے مستغنی فرض کرنا، بلکہ اپنی جانب راغب ہونے کے بجائے کشیدہ تصور کرنا اور یہاں تک کہ کسی دوسرے کی جانب مائل فرض کرنا اور اس دوسرے کے اور اپنے درمیان ایک قسم کی روایاتی رقابت اور ذہنی دشمنی قائم کرنا، اور انجام میں ناکامی و نامرادی وغیرہ وغیرہ ہمارے یہاں عشق و محبت کے تخیل کی جان ہیں، بلکہ ہمارے یہاں یک ضرب المثل ہے کہ جب وصل ہو جاتا ہے تو رومان ختم ہو جاتا ہے، ہماری دنیا میں محبت و عشق کے متعلق انہیں جذبات کے ساتھ سوچا جاتا ہے، اگر یہ عناصر ہمارے طریقہ فکر سے علیحدہ کر لئے جائیں اور ایک جنسی کشش اور وقتی ملاپ کو حاصلِ عشق سمجھ لیا جائے تو ہماری اور بہائم زندگی میں یہ فرق کیا رہا یہی جذبات جنہیں آپ شاید ہمارے مفروضے کہیں، ہماری اور بہائم کی زندگی میں امتیاز کرتے ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ انسانی زندگی کے بے کیف جمود میں سب سے بڑا محرک انہیں اثرات کے طفیل ہے۔" اجنبی نے کچھ بات کہنی چاہی اور میں تاڑ گیا کہ حضرت کیا فرمانا چاہتے ہیں لہذا میں نے جیسے اس کے منہ سے بات لے کر کہا" دیکھئے نا عرض کرتا ہوں اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارا یہ تخیل قانون فطرت کے مطابق ہے یا نہیں، اسکے متعلق میں دو لفظوں میں دلیل پیش کر دوں گا اگر صانع فطرت نے اس خصوص میں ہماری اور بہائم کی فطرت یکساں تشکیل کی ہوتی تو ہم بھی اپنی زندگی میں جانوروں کی طرح وقتی کشش اور نفرت و کشیدگی اور عدم توجہی کے دقیقے پاتے، ہم سوشل ہیں، اور ہماری سوسائٹی محبت، مواصلات اور ہمدردی کے عصبی رشتہ میں جڑی ہوئی ہے، اور مسلم امر ہے کہ اس مسئلہ میں انسان کی فطرت بہائم سے علیحدہ ہے۔"

اجنبی جیسے کچھ قائل سا ہوا مگر سنبھل کر بولا" میرا اندازہ ہے کہ آپ نے اپنی سرشت میں ایک پوشیدہ ردعملی ٹھونس لی ہے، اور سیدھے سادے فطری راستہ پر چلنے کی بجائے اپنے ہاتھوں سے بہت سے نشیب و فراز اور پیچیدگیاں پیدا کر لی ہیں، اور ان پیچیدگیوں میں انسان کو لطف آتا ہے اور انہیں زندگی کی دلچسپیوں کا نام دیتا ہے اور شاید انہیں فروعات میں الجھ کر آپ بہت سے ایسے کمالات و اکتسابات سے محروم رہ جاتے ہیں جن کا حصول آپ کی فطرت کا تقاضا ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا نصب العین اور افتاد طبع اس خصوص میں جداگانہ واقع ہوئی ہے، لہذا ایک نظریہ کے مطابق دوسرے پر کوئی محاکمہ نہیں کیا جا سکتا، کاش ہماری دنیا کی کسی پری وش پر آپ عاشق ہو جائیں، اور محبت کے عملی میدان سے دوچار ہو کر اپنے جذبات و حسیات کا اندازہ کریں، اور اس وادی کے خاروں میں الجھ کر دیکھیں۔"

"مگر ہماری ذات کسی ایسے امر میں الجھ ہی نہیں سکتی جو سیدھے سادے قانونِ فطرت کے مطابق نہ ہو۔"
میں نے ذرا پہلو بدل کر کہا۔ "آپ کی دنیا بھی عجیب ہو گی، جی چاہتا ہے کہ دیکھیں، کیا یہ ممکن نہیں؟"
اس نے جواب دیا "ہوں، بالکل ممکن ہے، کائنات کے وسیع کارنامہ میں فطرت اپنے بچوں کو بڑا احادی اور قابو یافتہ بنا کر بھیجتی ہے، اب دیکھئے میں نے چاہا تو میں آپ کے کرہ میں آ گیا بہت سے تجربات کر لئے اور شاید ابھی بہت سے باقی ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی ذرا سی رہنمائی میں اپنی سیاحت مکمل کروں گا۔"
"جی ہاں مگر آپ کی سی بے پناہ صلاحتیں ہم میں تو نہیں ہیں، مجھے تو آپ کے کرہ کی سیر اور مشاہدہ کے لئے نہ معلوم کتنی مدت درکار ہو گی۔"
آپ کتنا وقت نکال سکتے ہیں، میں بہت ہی کم مدت میں زیادہ سے زیادہ بلکہ غالباً کل تجربات و مشاہدات کرا دوں گا۔"
میں نے اتنی بڑی سیاحت کو مد نظر رکھتے ہوئے کہا۔ "جی میں اپنے کار منصبی سے تین چار ماہ کی رخصت بس کر سکتا ہوں، پھر اسی مدت میں آپ کو اپنی دنیا بھی دکھانی ہے اور آپ کے ساتھ آپ کی دنیا بھی دیکھنی ہے۔"
"خیر میرے متعلق آپ فکر نہ کریں، اپنی کہئے۔ آپ کا کار منصبی کیا، یہی شیر پر گولی لگانا، ایں؟"
میں ہنس پڑا۔ "واہ حضرت واہ" یہ بھی مجھے کوئی ابتدائی دور کا انسان تصور کر بیٹھے، میں نے دل میں کہا اور جواب دیا۔ "یہ تو ایک تفریحی مشغلہ ہے، جو کام کے زمرہ میں نہیں آیا بلکہ کھیل میں شمار کیا جاتا ہے، اور کبھی کبھی کار منصبی سے علیحدہ ہو کر وقتی طور پر اختیار کیا جاتا ہے۔ میں ملازم سرکار ہوں۔"
"میں نہیں سمجھا، ملازم سرکار کیا، یہ ایک چیز ہے یا دو؟ ملازم سرکار؟"
"یہ آپ یوں سمجھئے کہ دو چیزیں بھی ہیں اور ایک بھی، ——— شاید آپ کی دنیا خدمت کے طریقہ سے بھی محروم ہے، ہمارے یہاں جو فرد کچھ معاوضہ لے کر اپنا وقت اور قوت و صلاحیت معاوضہ ادا کرنے والے کی ضروریات کی تکمیل میں صرف کرے تو وہ ملازم کہلائے گا اور معاوضہ دینے والا سرکار، مالک یا آقا کہا جاتا ہے۔"
اجنبی اچھل سا پڑا اور حیرت سے کہا۔ "ایں تو وہ بد نصیب جو ملازم ہوتا ہے وہ اپنے سرکار یا آقا کے ہاتھ میں اپنی ذات کلیتاً دے دیتا ہے۔"
"خیر کلیتاً تو نہیں اگر اس کے احکام کا کلیتاً پابند ہوتا ہے اور خود اپنی طبیعت سے اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا، بلکہ آداب ملازمت تو یہ ہیں کہ اس سے علیحدہ سوچ بھی نہیں سکتا۔"
"آپ مجھے معاف فرمائیں، آپ بھی ملازم ہیں، لیکن شاید یہ آپ کے یہاں سب ذلیل رواج ہے یعنی اپنی مادی و ذہنی آزادی اپنے ہاتھوں خود بیچ لیتے ہیں۔"

"مگر جناب نظام کائنات تو اسی پر قائم ہے، ہماری دنیا تو بغیر اسکے نہیں چل سکتی۔"

"آپ اپنی دنیا کو کہیئے، نظام کائنات تو نہیں" اس نے کہا۔

"جی نہیں نظام کائنات اور قانونِ قدرت ہے کہ ضعیف کو قوی کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، اور کائنات کی کل مخلوق تنازع للبقا میں سرگرم ہے اور فطری نتیجہ ضعیف کا استیصال اور قوی کی بقا رہے۔ اور اس کے بُرے نتائج کو بچانے اور اسے ایک حد تک متوازن رکھنے کے لئے ہم نے ایسے دستور اور طریقہ رائج کرتے ہیں کہ ہمارا نظام جہاں تک ممکن ہے اس کشمکش سے محفوظ ہے۔ لہذا فطری طور پر اس کو بہت بڑے پیمانہ پر بچانے کے لئے تھوڑا بہت ہمیں اس کے ساتھ چلنا پڑتا ہے اور یہی چیز ملازم و سرکار، آقا و نوکر کا طریقہ مجبوراً رائج کراتی ہے۔"

اجنبی نے میری بات بڑے غور سے سنی اور کہا "اسمیں شک نہیں کہ تنازع للبقا کا عمل کائنات پر جاری ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ ہم ذرا سے معاوضہ کے لالچ میں اپنا سب سے بڑا فطری حق آزادی بیچ دیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک عرض کروں گا یہ خود منشائے فطرت کے منافی ہے، جب زبردست ہستی کمزور کے مدمقابل ہوگی تو کمزور ہستی خود ہی مغلوب ہو جائے گی۔ مگر پہلے سے ہار کر سرِ تسلیم کر دینا فطری اصول کے خلاف ہے، ممکن ہے کہ آپ کو اس میں کچھ زیادہ سہولتیں محسوس ہوتی ہوں۔"

"میں نے عرض کیا نہیں جناب اس سے ہم مسئلہ تنازع للبقا کی بڑی بڑی چیرہ دستیاں بچا جاتے ہیں کہ اپنے سے ایک قوی ہستی کے ساتھ سمجھوتہ کر کے ایک نظام تشکیل کر لیں، اور خدمت خلق کے جذبے سے ملازمت کریں۔"

"اچھا خیر وہ قوی ہستی جو آپ کی سرکار ہے وہ کون ہے؟"

"جی وہی تو ہماری گورنمنٹ ہے۔"

"جی یہی تو میں پوچھتا ہوں ــــــ آپ کی گورنمنٹ، وہ کیسی ہستی ہے اور آپ پر اسے کیا فوقیت ہے؟"

"یہ اعتبار قابلیت اور ذاتی اوصاف وہ لوگ مجھ سے برتر ہیں، اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ انہیں عوام کی کثرت رائے کا اپنے حق میں اشرف حاصل ہوتا ہے۔"

"اچھا تو گورنمنٹ ایک فرد نہیں بلکہ کئی افراد پر مشتمل ہے۔"

"جی ہاں ایک جماعت جن کو بہت سے لوگ بلکہ یوں کہیئے ملک بھر کے آدمی منتخب کرتے ہیں، اس جماعت کا ہر حکم ہر فرد پر واجب ہوتا ہے، ان کے احکامات بھی پہلے سے طے شدہ نظام کے مطابق ہوتے ہیں، جس وقت اس نظام کے قوانین کی ترتیب ہوتی ہے اس وقت تمام ملکی و سیاسی اغراض کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔"

"مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ اس سے آپ کی دنیا کو عملی فائدہ کیا پہنچتا ہے۔"

جناب ہماری زندگی کی جملہ معمولات بغیر اس نظام کے چل ہی نہیں سکتے دوسرے لفظوں میں ہمارے کرہ کا وجود ہی ایک منظم گورنمنٹ اور آئین کا نام ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کے یہاں اگر کوئی باضابطہ جمہوری حکومت کا قیام نہیں ہے تو زندگی کیسے گذرتی ہے۔"

"ہمارے یہاں ایک تنہا آئین جاری وساری ہے، اور وہ ہے قانونِ فطرت، اور بس اسی کے تحت ہم زندگی گذارتے ہیں۔"

"اور آپ کے جملہ امور زندگی اسی کے ذریعہ انجام پذیر ہو جاتے ہیں؟ - کچھ سمجھ میں آیا نہیں استاد، آخر تصادم افراد باہمی سے کیسے بچتے ہیں۔"

اجنبی نے جواب دیا "بندہ نواز قانونِ فطرت کے مطابق زندگی گذارنے میں کوئی تصادم ممکن ہی نہیں۔ اسکو توڑنے میں البتہ بہت سی قباحتیں ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو مانا لیکن بہرحال آپ کے یہاں اس کی خلاف ورزی کے تدارک کی بھی صورتیں ہوں گی۔"

"تدارک کا سوال ہی نہیں، اس کی پاداش خود اس کے توڑنے میں مضمر ہے، لہٰذا اس کا توڑنا ناقابلِ عمل بلکہ محال ہے۔" اس نے کہا۔

"تو پھر آپ کا ملکی نظم ونسق، امن واماں، صلح وجنگ جملہ امور اسی آئین کے تحت انجام پذیر ہوتے ہیں۔"

ملکی نظم ونسق کیا چیز ہوتا ہے، ہمارے یہاں کسی ملکی نظم ونسق کی ضرورت نہیں اور نہ اس کے مسلسل قیام کے لئے کوئی باقاعدہ ادارہ درکار ہے، جنگ کی نوبت نہیں آتی کیونکہ ہم انسان انسان سب برابر ہیں، نہ کسی کا کوئی حاکم ہے نہ محکوم، اور نہ افراد باہمی میں ٹکراؤ ہو سکتا ہے جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا۔ اور اگر کسی غیر فطری سبب کی دخل اندازی سے کچھ اختلاف کی صورت رونما ہوتی ہے تو قانونِ فطرت کی طاقت بروئے کار آ کر اپنے مطابق بنا لیتی ہے۔"

"خوب تو آپ کے یہاں نزاع اور باہمی اختلافات کی نوبت ہی نہیں آتی۔" میں نے کہا اور اجنبی کچھ خاموش سا ہو گیا پھر آہستہ سے بولا۔

"اچھا آپ کی ساری عمر محکومی ہی میں گذری" اور ہمدردی کے ساتھ میری جانب دیکھا۔

میں نے اس کا مطلب سمجھ کر ذرا مسکراتے ہوئے جواب دیا "جی، کچھ حاکمی، کچھ محکومی میں۔"

"مگر یہ دونوں باتیں کیونکر جمع ہوئیں۔"

میں نے جواب دیا:"جس نظام کے تحت کچھ افراد مجھ پر حکومت کرتے ہیں اسی کے تحت کچھ افراد ایسے ہیں جو میرے محکوم ہیں اور میرے اشاروں پر چلتے ہیں، مگر اسی نظام کے مطابق میں انہیں چلاتا ہوں۔"

"یعنی آپ کے ذمہ اس نظام کے تحت کیا کام ہے۔"

"میں پورے ایک شہر کی نگرانی کرتا ہوں۔"

"شہر! شہر کیا ہوتا ہے؟"

مجھے تشریح کرنا پڑی۔ اور کہا "ہم ارضی باشندے مل کر رہتے ہیں، جو رقبہ زمین ہماری سکونت کے کام میں آتا ہے وہ آبادی کہلاتا ہے۔ اس آبادی کے حسب ضرورت اور موقع کے تحت چھوٹے بڑے حصے ہوتے ہیں، سب سے چھوٹے حصے کو گاؤں کہتے ہیں، جن میں سینکڑوں اور کہیں کہیں ہزاروں آدمی آباد ہوتے ہیں۔ اسی قسم کے بڑے حصہ کو جس کی آبادی ضرورت کے تحت لاکھوں نفوس تک پہنچتی ہے شہر کہتے ہیں، تو بس ایک ایسے ہی حصہ آبادی کا جس میں نفوس کی تعداد کئی لاکھ ہے انتظام میرے سپرد ہے۔"

"تو یہ آبادیاں مستقل ہوتی ہیں؟" اجنبی نے دریافت کیا۔

"جی، سالہا سال سے مستقل۔"

"ان شہروں اور آبادیوں میں آپ کی سکونت ایسے ہی درختوں پر بندھے ہوئے کھٹولوں پر ہوتی ہوگی؟"

"جی نہیں، میں آپ کو پہلے بتا چکا کہ یہ میری عارضی جائے قیام ہے اور شکار کی ضرورت کے مطابق اسے چند روز کے لئے بنا لیا ہے، ہم مکان بناتے ہیں اور مکانوں میں رہتے ہیں۔"

"مکان! مکان کیا؟" اجنبی کا دوسرا سوال تھا۔

اب مجھے مکانوں کا نقشہ کھینچ کر سمجھانا پڑا تو اس نے سوال کیا "اور مکان آپ کس چیز کے بناتے ہیں، شاید اسی مٹی کے۔"

"جی ہاں اصل یہی ہوتی ہے، اسکو تھوڑی ترقی دے لیتے ہیں بسا اوقات بالکل خالص مٹی کے بھی بنا لیتے ہیں۔"

"آپ کے یہاں موسمی تغیرات بھی ہوتے ہیں؟" اجنبی نے سوال کیا۔

"جی نہایت شدت کے ساتھ۔"

"تو پھر یہ مٹی کے گھروندے کیسے کام دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "خارجی ذرائع سے کام لے کر ہم اپنے مکانوں کو ہر قسم کے موسم میں آرام دہ بنا لیتے ہیں۔"

اجنبی نے جیسے کچھ بیزار ہو کر کہا "مگر آپ کا ان قید خانوں میں جی نہیں گھبراتا۔"

"جی گھبرانا کیا معنی! انکے اندر جی لگتا ہے یوں کہیے، ہم ضرورت کے مطابق اپنے محلوں کے اندر روشنی اور ہوا گذرنے کے لئے اور روکنے کے لئے انتظام کرتے ہیں، باہر کے مناظر دیکھنے کے لئے دروازہ اور کھڑکیاں لگاتے ہیں، اندر دیواروں پر طرح طرح کی آرائشیں کرتے ہیں، فرش پر قالین دریاں اور کرسیاں بچھاتے ہیں، پلنگ اور مسہریاں ڈالتے ہیں ان کے اندر ہم کو موسموں کی شدت اور دشمنوں سے پناہ ملتی ہے، آپ کی دنیا شاید مکان کی نعمت سے محروم ہے لیکن پھر موسم کی شدت سے کیا بچاؤ کرتے ہیں۔"

"ہم تو موسم کے تغیرات کے ساتھ ساتھ اپنے مساکن کو تبدیل کرتے رہتے ہیں" اجنبی نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔

"بھئی وہ کیسے! اور اس پر تو بڑا صرفہ ہوتا ہوگا؟"

"نہیں میاں! ہمارے مساکن ہمارے جسم ہیں اور موسمی تغیرات کے مطابق ہم ان میں تبدیلی کرتے رہتے ہیں اور اس طرح ہر موسم کو بغیر کسی تکلیف کے معتدل ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"ذرا وضاحت کیجئے میری فہم سے باہر ہے۔"

"بہت موٹی سی بات ہے، مثلاً بارش کے موسم کے ساتھ ساتھ ہمارے جسم میں مائی عنصر غالب ہو جاتا ہے لہٰذا ہم کو بھیگنے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی، اس طرح انتہائی گرمی میں جب موسم اپنی حرارت کے ساتھ ہمارے کرہ کو تا بناک بنا دیتا ہے تو ہم اپنے جسموں کا درجہ حرارت اسکے مطابق بڑھا لیتے ہیں اور موسم معتدل اور خوشگوار معلوم ہوتا ہے۔"

"تو پھر سخت سردی میں آپ کو لباس کی بھی ضرورت نہیں ہوگی۔"

"لباس کیا چیز ہے؟"

میری تشریح کرنے پر اور اپنے کپڑے دکھلانے پر اجنبی بہت چونکا، اور تحقیر کے ساتھ کہا "سب لغو، قطعی بیکار، قانونِ فطرت کے بالکل خلاف۔"

میں نے کہا "جناب، اس میں شک نہیں کہ لباس کا استعمال ہمارے یہاں شروع شروع میں موسمی تغیرات کی بنا پر ہوا ہوگا لیکن اب تو یہ ہماری زندگی اور معاشرہ کے اہم ترین لوازمات میں سے ہے، اور ہر متمدن انسان نے اسے اختیار کر رکھا ہے۔"

"ہوں تو یہ تو میں شروع ہی سے اندازہ کر رہا ہوں کہ آپ کی زندگی اور معاشرہ تمام تر قانونِ فطرت سے بغاوت ہے۔"

"اچھا، اب یہ بتائیے کہ دن رات کا تغیر آپ کے کرہ میں ہے یا نہیں؟ میں نے یہ خیال کر کے کہ یہ تو بالکل ہی ننگا ہے بات کا رُخ بدلا۔

"بالکل ہے۔"

"تو پھر شاید آپ کا سورج یہی ہے جو ہمارا ہے۔"

"جی نہیں ہمارا سورج دوسرا ہے، اور ہمارا سیارہ دوسرے نظام شمسی سے متعلق ہے۔ اور جس طرح آپ کا کرہ اس سورج کے گرد گردش کرتا ہے اسی طرح ہمارا کرہ اپنے سورج کے گرد گھومتا ہے۔ ساتھ ہی ہمارا کرہ اپنے محور پر بھی گھومتا ہے۔"

میں نے کہا: "اچھا پہلے یہ بتائیے کہ آپ کا کرہ اپنے محور پر کتنی دیر میں گھوم جاتا ہے۔"

"دیکھیے آپ کے ایک گھنٹہ میں ہمارے دس ہزار صغرے ہوتے ہیں۔ اب آپ سمجھ گئے ہمارے یہاں سب سے چھوٹا وقفہ صغرہ ہے اور ... آپ کے یہاں ثانیہ یا سیکنڈ ہمارے سو ثانیہ سے ایک دقیقہ بنتا ہے اور سو دقیقہ سے ایک ساعت بنا گھنٹہ۔ تو ہماری ایک ساعت میں آپ کے دس ہزار ثانیے یا سیکنڈ ہوتے ہیں، اور آپ کے ایک ساعت میں؟"

"جی تین ہزار چھ سو ثانیے۔"

"اور آپ کے دن رات میں کتنی ساعتیں ہوتی ہیں؟"

"جی چوبیس ساعتیں۔"

"تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہمارے اور آپ کے ساعت میں سو اور چھتیس کی نسبت ہے اور اس حساب سے ہمارا گھنٹہ آپ کے گھنٹہ سے قریب قریب تین گنا ہے، یعنی آپ کے یہاں دن رات میں چھیاسی ہزار ثانیے ہوتے ہیں اور ہمارے یہاں کے دن رات میں دس لاکھ ثانیے ہوتے ہیں، اور ہمارے یہاں کے دن رات میں سو کی گنتی چلتی ہے اور دن رات سو ساعتوں کا ہوتا ہے اور پھر سال میں دن بھی سو ہی ہوتے ہیں، یعنی ہمارا ایک سال آپ کے دس کروڑ سیکنڈ میں پورا ہوتا ہے اور آپ کا سال؟"

میں نے کہا "تین سو پینسٹھ دن آٹھ گھنٹے میں۔"

"نہیں میں سیکنڈ میں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے دل میں کہا "آج عجیب بے ڈھب ستارے سے پالا پڑا ہے، اب یہاں سلیٹ پنسل ہو تو حساب لگا کر بتاؤں"، میں زبانی ضرب دینے کی کوشش کرنے لگا اور انگلیوں پر شمار کر کے حساب لگانے کی کوشش کی۔

"معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا طریقہ حساب بھی ناقص ہے اور شاید اس میں بھی آپ کو کچھ مادی امداد کی ضرورت

ہوتی ہے، حالانکہ یہ چیز آپ کو معلوم ہے لیکن بتا نہیں سکتے اور بتانے کے لئے کچھ ذریعہ درکار ہے خیر۔ ۰۰۔۴۸۰۷۵۶۲۱ سیکنڈ ہوئے۔ ہاں آگے چلئے، تو اس تخمینہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا کرہ آپ کے سورج سے بڑا ہے، اسی لئے ہمارے کرہ کی حرکت تیز ہونے کے باوجود دونوں سسٹم کی گردشوں میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، اور آپ کی زمین کا رقبہ نو کروڑ بانوے لاکھ مربع میل ہے۔"

"ہاں شاید ——— لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

اجنبی نے مسکرا کر کہا "اپنے مرکب کی رفتار کے حساب سے۔"

"یعنی کیا؟"

"بھئی ہم جس کرہ سے گذرتے ہیں وہاں کی ہیئت کے متعلق معلوم کرتے چلتے ہیں، اور اب آپکو معلوم ہی ہے کہ میں چاند سے ہوتا آپ کے یہاں آرہا ہوں، اور چاند آپ کی زمین کے گرد آپکے ساڑھے انتیس دن میں گھوم لیتا ہے اور مجھے چاند کی گردش کی رفتار معلوم ہے۔ لہٰذا آپکے کرہ کا رقبہ خود بخود معلوم ہو گیا۔"

"خوب، ٹھیک فرماتے ہیں، آپ نے چاند اور ہمارے کرہ کے علاوہ اور بھی کوئی کرہ دیکھا ہے؟"

"میں نے اپنے نظام کے سب کرہ دیکھے ہیں، آپکے نظام میں چاند اور قطب کے علاوہ مریخ، عطارد اور زہرہ کی سیر کی ہے، اور آج آپ کی زمین تھوڑی سی دیکھی۔ قمر اور قطب میں قیام نہیں کیا، بڑا جمود ہے، آپ کی دنیا ذرا دلچسپ ضرور ہے۔"

میں نے تواضع کے طور پر کہا "تو پھر قیام کیجئے، غریب خانہ کو رونق بخشئے، ہمارے ہم جنسوں سے ملئے۔ آپ تو ہمارے یہاں عجوبہ روزگار مخلوق ہیں۔ مافوق الفطرت ہستی۔"

"مافوق الفطرت نہیں بلکہ عین مطابق فطرت کہئے جناب، لیکن آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟"

"میں آپ کو اپنے تمدن کے بہترین نمونے دکھاؤنگا، اپنے پُر رونق شہر، اپنی خوبصورت عمارتیں، اپنی تہذیب و تمدن کے ارتقاء کی نشانیاں، اور اپنے پرتکلف مکانوں میں ٹھہراؤں، یہاں بھلا جنگل میں اس مچان پر آپ کی کیا خاطر کر سکتا ہوں۔"

"آپ کے مکان، وہی قید خانے جس میں آپ بند رہنے پر فخر کرتے ہیں، اور ان میں رہ کر اپنی زندگیاں جیتی زندگی دوزخ کرتی ہیں۔"

"اجی حضرت! ایک بار ذرا دیکھ لیں تو باہر نکلنے کو جی نہ چاہے، ذرا ایک شام ہمارے کراچی لاہور کی دیکھیں تو پتہ چلے، ایک سینما یا بال روم میں گھس جائیں تو معلوم ہو کہ دنیا کیا ہے۔"

"جی مگر ہوں گے یہ سب تصنعات ہی شاید ——— فطرت کی دلکشی کا منہ چڑانے کی کوشش!

معاف کیجئے جہاں تک میں نے اندازہ کیا ہے ابتدائے آفرینش سے آپ نے فطرت کے ساتھ جنگ کی ہے اور اپنی دنیا میں فطری نعمتوں کو بگاڑا ہی بگاڑا ہے اور اسے تہذیب، تمدن، معاشرہ نہ معلوم کیا کیا لقب دے کر خود کو دھوکا دیا ہے، ہوں، اور یہ آپ کی ناقص تقدیر کا قصور ہے۔ شاید آپ کے کل کرہ کی یہی کیفیت ہے:

"جی ہم سب ایک ہی فطرت میں ڈھلے ہوئے ہیں۔"

"جی کیا کہنے آپ کی فطرت کے سانچے کے! یوں کہئے ایک ہی بغاوت کے ڈھلے ہوئے ہیں۔" اس نے طنزیہ کہا اور پھر ذرا ٹھہر کر بولا "اچھا آپ نے مریخ بھی دیکھا ہے۔"

"جی نہیں۔" میں نے مرعوب ہو کر کہا۔ اس نے برجستہ سوال کیا۔ "تو آپ نے نظام کے کون کونسے کرہ دیکھے ہیں؟"

"جی نظام کے کرہ تو درکنار میں نے اپنا یہ کرہ بھی پورا نہیں دیکھا ہے اور دوسرے کروں تک پہنچنا تو ہمارے نزدیک محال ہے۔"

اجنبی نے کہا "اوہو! تو آپ کی سیاحت اتنی نامکمل ہے! افسوس کہ ایسی ناقص ہستیاں بھی کائنات میں موجود ہیں جنہوں نے اپنا کرہ بھی نہیں دیکھا ہے، خیر اپنے کرہ میں تو پہنچنا آپ کے لئے ممکن ہی ہو گا، مگر شاید اس ملازمت کی وجہ سے وقت نہ ملا ہو گا۔ لیکن آپ نے جو یہ فرمایا کہ دوسرے کروں تک پہنچنا آپ کے لئے محال ہے یہ کیوں؟"

"ہمارے یہاں کا علم ہیئت اور جغرافیائی حالات بتاتے ہیں ہم اپنے کرہ سے باہر جا کر زندہ نہیں رہ سکتے پھر ابھی ہمارے پاس آمدورفت کے ذرائع نہیں ہیں کہ ہم اپنے کرہ سے نکل سکیں۔ اور باہر نکلنا تو درکنار ہم اپنے کرہ کی فضائے بسیط میں بھی زیادہ دور نہیں جا سکتے۔"

"ہاں میں آپ سے یہ پوچھنے والا تھا کہ آپ کے ذرائع آمدورفت کیا ہیں۔" اجنبی نے کہا۔

میں نے واجد بکرماجیت کے زمانے کی ایجاد بیل گاڑی سے لے کر جدید ترین ہوائی جہاز تک کا نقشہ سمجھایا، اس نے کہا "افسوس آپ مٹی میں نہیں بلکہ کیچڑ اور دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں لطافت اور روحانیت سے کوسوں دور۔ اور اس پر خلیفۃ اللہ اور اشرف المخلوق کے دعویدار ہیں!"

میں اس اجنبی سے مرعوب ضرور تھا، لیکن استادانہ قسم کا توہین آمیز تبصرہ سننے کے لئے طیار نہ تھا، میں نے سنبھل کر کہا "یہاں ویران جنگل میں بیٹھ کر معاف کیجئے آپ مفت میں ظنیات قائم کر رہے ہیں اور شاید ہماری دنیا کا بالکل غلط اندازہ لگا رہے ہیں اگر آپ ہمارے جلیل القدر ہم جنسوں کو دیکھیں اور ہمارے

کرہ کی سیر کریں تو پتہ چلے کہ ہم نے آپ کی کائنات میں کیا کیا تصرفات کئے ہیں اور کس کس طرح فطرت کی نعمتوں کو سنوارا ہے۔"

اجنبی نے کہا آپ سے جو کچھ معلومات حاصل کی ہیں ان سے تو اسکے برعکس اندازہ ہوتا ہے۔ اور اگر انکے علاوہ کوئی اور کارنامہ ہو تو بیان فرمایئے۔"

"جناب اب بیان کرنے کا موقع نہیں ہے، دیکھئے اور دل میں انصاف کیجئے، چلئے عزم سفر کیجئے، اور اسی لئے میں نے کہا تھا کہ کچھ روز میرے ساتھ قیام فرمایئے۔"

"اچھا خیر آپ آزردہ نہ ہوں، آپکے کرہ کا بہترین اور قابلِ دید حصہ کونسا ہے، جسے دیکھ کر آپ کی ترقی کا اچھی طرح اندازہ ہو سکے۔"

"یوں تو آپ کے دکھانے کے لئے ہر حصہ کچھ نہ کچھ خصوصیات کا حامل ہے، مگر فی زمانہ جس حصہ میں ہماری عقل کے نتائج منتہائے کمال پر ملیں گے۔ وہ یورپ اور امریکہ ہے" اور خیر اب بھی اس حصہ میں جس میں آپ اس وقت موجود ہیں ترقی یافتہ کہہ سکتے ہیں اگرچہ اس بیچارے کو ابھی بڑا شدید دھکا پہنچ چکا ہے۔"

"اچھا تو پھر میں ان حصوں کو دیکھ لوں۔"

"لیکن آپ بغیر میرے تنہا کیا دیکھیں گے۔ اور میں آپ کو ہوائی جہاز سے سیر کراؤں گا۔"

"وہی اڑنے والی سواری جس کا آپ نے ابھی تذکرہ کیا تھا، مگر وہ تو بہت ہی ناقص اور سست رفتار اور سخت مادی ہے۔"

"تو پھر آپ اپنے مرکب پر مجھے ساتھ لے لیجئے۔ دیکھیں گے تو آپ ہی، مگر میں آپ کو POINT-OUT تو کر سکوں گا، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ آپ اپنی رائے مشکل سے تبدیل کرینگے۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے اگر آپ مجھے کوئی چیز قرین فطرت دکھائیں گے تو میں ضرور پسند کرونگا یا اپنے ہاں اس کی ترویج کردوں گا۔"

"تو پھر آپ کا ہم سفر ہونا میرے لئے ممکن ہے؟"

"بالکل ممکن ہے۔ آپ کے خاکی جسم کو میں اپنے جسم کے خاکی عنصر میں ضم کروں گا اور پھر خود کو چاند کی شعاعوں کی قدرت میں ثابت کروں گا۔ بسم اللہ چلئے۔ رہنمائی آپ کی اور نظر میری، اور پھر ابھی پلٹ کر یہیں ہم آپ گفتگو کرینگے۔ اطمینان کے ساتھ۔"

"ابھی پلٹ کر یہیں ہم آپ گفتگو کریں گے، کون مخلوق ہے، چھلاوہ! ایں یہ کیسے ممکن ہے ساری دنیا کی سیر کے بعد پھر اس مچان پر ہی آئیں گے۔"

"نہیں صاحب! یہاں کیسے۔ پھر میں آپ کو اپنے گھر لے چلوں گا۔"
"خیر وہ بعد کی بات ہے دیکھا جائے گا، جیسی وقت میں گنجائش ہوئی۔"
"اچھا تو چلنے سے پیشتر میں اپنا پروگرام بناؤں۔"

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

چاندنی کی شعاعیں پوری تابناکی کے ساتھ ہمارے جسموں پر پڑ رہی تھیں، میں سراپا حیرت بنا دل میں غور کر رہا تھا۔ یہ کون مخلوق ہے! فی الحقیقت کسی دوسرے کرہ کا باشندہ ہے۔ بچپن سے لیکر اب تک جنوں، بھوتوں، پریوں، فرشتوں کا جو تخیل میرے شعور میں جاگزیں تھا دوسری روایات اس کی حقیقتوں کے سامنے گرد تھیں، اور پھر وہ سنی سنائی باتیں جن پر ایمان داری سے پوچھئے تو بچپن میں بھی یقین نہ رکھتے تھے۔ اور یہ تو سب کچھ سامنے تھا۔ ہم دونوں خاموش ایک دوسرے سے آغاز کلام کے منتظر بیٹھے تھے۔ اور میں نے گھڑی پر نظر کی تو ہمارے پورے سفر میں دس منٹ لگے تھے۔

"ہوں کتنا وقت لگا آپ کی اس گھڑی کے حساب سے" اس نے سلسلۂ کلام جاری کیا۔

"جی دس منٹ" میں نے آہستہ سے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا تھک گئے؟" اس نے ذرا ایسی ہمدردی کے انداز میں پوچھا جیسے کسی بچے سے سوال کیا جاتا ہے۔

"جی ہاں، نہیں تو ــــــ تھک تو نہیں گیا مگر ذرا سنسناہٹ سی ہے بدن میں۔"

"ہوں ممکن ہے، مگر وہ آپ کے لئے لازمی امر ہے۔ مجھے چلتے وقت آپنے نہیں بتایا تھا آپکے کرہ کے نصف حصہ پر اس وقت دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ خیر یہ ادھر کا تو ہم نے سب چاندنی میں دیکھ لیا اب اس طرف جو پہنچیں تو یکدم سورج کا سامنا ہو گیا۔ خیر تو مجھے درجۂ حرارت بڑھا کر سورج کی شعاعوں پر چلنا پڑا۔ اور میرا تو خیر کچھ نہیں اس غیر متوقع تبدیلی میں ذرا وقت زیادہ لگ گیا ورنہ سات منٹ میں فارغ ہو جاتے لیکن شاید آپ کا یہ جسد خاکی سردی گرمی کی اس غیر متوقع یکایک تبدیلی کو برداشت نہ کر سکا اور سنسناہٹ اسی لئے ہے" اس نے کہا اور میں نے غور کیا کہ علاوہ اعصابی سنسناہٹ کے شدید زکام کی کیفیت بھی ہے۔

"جی ہاں ملکہ علالت سی ہے، یا یوں کہئے علالت کی علامت"۔

"نہیں کچھ دقت مجھ کو بھی پیش آئی، سورج کے ماحول کے مطابق ہیئت سابقہ کی جانب رجعت کرنی پڑی، اس میں وقت بھی خراب ہوا"۔

یوں تو جو کچھ ہوا تھا میری آنکھوں کے سامنے ہوا تھا۔ مگر جوں جوں وقت گذر رہا تھا میں حیرت کے مارے جامد سا ہوتا جا رہا تھا، کوئی بات نہیں ہے، ہماری دنیا میں سینکڑوں ہستیاں آج ایسی ہیں جنہوں نے کل کرۂ ارض کے سفر کا ریکارڈ بیٹ کیا ہے بلکہ بعض منچلے پیدل اور سائیکل وغیرہ پر نکل کھڑے ہوئے ہیں، مگر اپنی گھڑی پر یقین نہ آتا تھا، میں نے اسے لندن اور پیرس جیسے شہروں کی اتنی مکمل سیر، دہلی اور آگرہ کراچی لاہور کا چپہ چپہ کیسے دکھا دیا، جاپان، روس، چین اور مصر کی تمام مشہور چیزیں اور جگہ جگہ کے نظام حکومت کیسے سمجھا دیے۔ ایں یہ کہیں دوسرے دن یا اللہ توبہ دوسرے مہینے بلکہ دوسرے سال میں تو گھڑی نہیں چل رہی ہے، مگر ستم ہے کہ مچان پر میری ہر چیز جوں کی توں لگی تھی۔ جتنا شربت پیتے پیتے میں نے گلاس میں چھوڑا تھا وہ جوں کا توں تھا اور میں نے چھو کر دیکھا تو جیسے کا تیسا ٹھنڈا۔ اور اوپر سے بدستور نم، اور غور کیا تو مچان کے جس حصہ پر میں بیٹھا تھا اس پر اوس بھی نہ تھی اور بقیہ ادھر ادھر کھلا ہوا حصہ۔ اور پٹیاں بدستور بھیگی ہوئی تھیں۔ اور درخت کی پتوں پر آہستہ آہستہ شبنم کے قطرے ڈھلک رہے تھے۔

چند گہری سانسیں اور ایک دو انگڑائیاں، جمائیاں لیکر میں درست ہو گیا۔ اور کہا "دیکھئے میں نے حتی الوسع آپ کو اپنی دنیا کا ہر شعبہ دکھانے کی کوشش کی اگرچہ وقت بہت کم تھا، زیادہ تفصیل میں جانے کی گنجائش نہ تھی۔ صرف اشارہ ہی کر سکتا تھا، لیکن مجھے آپ کے فہم و ادراک سے امید ہے کہ آپنے ایک موٹا موٹا سا آئیڈیا ہماری دنیا کا قائم کر لیا ہوگا"۔

"موٹا موٹا سا آئیڈیا نہیں جناب آپ کی ذراسی مدد سے میں نے نہایت دقیق مطالعہ کیا۔ اور میں نے عرض کیا نہیں وقت بہتیرا تھا اگر وہ تبدیلی ہیئت کا سورج والا چکر درمیان میں نہ آجاتا تو بہت پہلے شاید آدھے سے کچھ زیادہ وقت لگتا"۔

"اچھا خیر سفر میں تو موقع نہ تھا جو آپ کی رائے معلوم کرتا، اب بتائیے کہ آپنے ہم ضعیف ہستیوں کے متعلق کیا رائے قائم کی؟"

"آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپنے میری سیاحت مکمل کرادی، اپنی شاندار بستیاں، بحری و بری اور ہوائی ذرائع آمد و رفت دکھائے، اسباب تفریح اور مشاغل عیش کی سیر کرائی۔ اور کیا کیا، ایک غلط فہمی بھی دور کرائی یعنی یہ کہ جس چیز کا آپ نے سفر پر جانے سے پیشتر تذکرہ کیا تھا آپ کی اور سب چیزوں

کی طرح وہ بھی ایک کھیل ہے۔ اور کھیل بھی نہیں بڑا موٹا جھوٹ "

"یعنی کیا؟"

"یعنی آپ کی جمہوریت۔ کیا آپ کا کل کرہ ایک واحد نظام جمہوریت کے تحت نہیں ہے۔"

"جی نہیں آپ نے دیکھا نہیں میں نے آپ کو سارا ایشیا کل یورپ اور تمام امریکہ آسٹریلیا وغیرہ سب ہی گھما دیا۔ یہ ہمارے کرہ کے بڑے بڑے حصے ہیں جنہیں سمندر علیحدہ کرتا ہے اور ان بڑے بڑے حصوں میں چھوٹے چھوٹے حصے ہیں جہاں مختلف اقوام کے لوگ بستے ہیں اور ہر جگہ اپنی ضروریات اور ماحول کے مطابق ہر قوم نے اپنی اپنی طرز حکومت کی تشکیل کر لی ہے۔"

"خیر بہر حال یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ کا کرہ بہت سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے لیکن یہ امر تو مسلم ہے ہر جگہ جمہوریت ہے"

"جی تقریباً۔ بلکہ یوں کہئے کہ کلیتاً ہماری تمام دنیا میں جمہوری نظام رائج ہے"

"اور جمہوریت کا اصول تو ایک ہی ہے یعنی مساوات"

"جی" میں نے ذرا فخریہ کہا۔

"لیکن میں تو آپ کی دنیا کے چپہ چپہ پر گھوم آیا اور کہیں پر مساوات کا وجود بھی نظر نہ آیا اور ایک چھچلتی سی نگاہ میں اندازہ ہو گیا کہ بعض حصوں میں بلکہ اکثر و بیشتر حصوں میں آپ کی جمہوریت کے اصول ہی غلط ہیں اور کچھ حصوں جہاں ایک حد تک صحیح ہیں وہاں عمل میں بالکل بد دیانتی ہے۔ لہٰذا نتیجہ ایک ہی ہے"

"یہ کیونکر کہہ سکتے ہیں"

"دیکھئے آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ سب سے پہلے آپ کے یہ ڈربے جنہیں بڑے فخریہ انداز میں آپ اپنے فن تعمیر کے طور پر پیش کرتے ہیں گواہ ہیں، اگر مساوات ہے تو یہ سب ایک ہی سے کیوں نہیں ہیں۔ بعض ان میں بڑے اچھے، اونچے، روشن ہوادار اور وسیع ہیں اور مٹی کو اچھی شکل دے کر تعمیر کئے گئے ہیں اور بعض نہایت ہی گندے تاریک کمزور اور یوں ہی مٹی اوپر تلے چپکا کر بنا دیئے ہیں، ان میں بھی تو آدمی ہی رہتے ہیں یا لنگور بندر وغیرہ کوئی مخلوق؟"

اور میں نے کچھ جواب دینے کی کوشش کی مگر اس نے سلسلہ کلام جاری کیا" اور پھر یہ پتلی پتلی جھلی سی جو آپ نے اپنے بدن پر منڈھے ہوئے جسے آپ نے کیا بتایا تھا کپڑا، لباس؟ یہ سب یکساں نہیں، اور بعض بعض بلکہ اکثر تو ایسے نظر آئے جو بیچارے ستر پوشی کے لئے اس کی نہایت ہی خستہ میلی تہ چڑھائے ہوئے ہیں۔

پھر یہ مادی ٹھوس چیزیں جنہیں آپ نے ابھی ذرا دیر پیشتر اپنے اس سوراخ کے ذریعہ اپنے اندر ٹھونسا، یہ بعض کو بہت کم اور بعض کو بہت زیادہ ملتی ہیں، اور بدنصیبی یہ نظر آئی کہ جنہیں کم ملتی ہیں انہیں خراب بھی ملتی ہیں۔ اور جنہیں زیادہ ملتی ہیں انہیں اچھی قسم کی بھی۔ تو آپ کی جمہوریت میں چند زبردست آدمی اچھی حالت میں رہتے ہیں اور بہت سے کمزور بری حالت میں ہیں۔ پھر مساوات کیسی؟" میں کچھ قائل سا ہو گیا جیسے اس نے ہماری دنیا کی سیاست کا دو لفظوں میں بھانڈا پھوڑ دیا۔ ذرا دیر سکوت رہا۔ اور اس نے کہا۔

"خیر آپ کی دنیا کے بیشتر حصہ پر جمہوریت کی شکلوں کے نظام ہیں اور کہیں کہیں اور کون سے نظام ہیں"

"جمہوریت کی زیادہ اچھی شکل اشتراکیت ہے اور گری ہوئی صورت آج کل کے دور کی بادشاہت۔"

"بادشاہت کیا؟"

"یعنی جو اختیارات جمہوریت میں بہت سے لوگوں کی منتخب کردہ ایک جماعت کو ہوتے ہیں تقریباً وہی بادشاہت میں ایک فرد کو ہوتے ہیں اور اس فرد کا انتخاب نہیں ہوتا بلکہ اس کا باپ بادشاہ ہوتا ہے اور حکومت اسے وراثت میں پہنچی ہے۔"

"خیر ایسی صورت میں عملی مساوات نہ ہو جیسا کہ آپ بتاتے ہیں کہ جمہوریت میں بہت سے لوگ خود اپنے اوپر حکومت کرنے کو ایک جماعت کو اختیار دیدیتے ہیں تو پھر آپ کی دنیا میں بہت سے لوگ اس طرح آرام اور شان و شکوہ کے ساتھ کیوں زندگی نہیں گذارتے جس طرح وہ چند انہیں کے منتخب کردہ افراد بسر کرتے ہیں۔"

"انہیں ان پر فوقیت ہوتی ہے۔"

"کیسی فوقیت؟"

"دماغی اور ذہنی فوقیت۔"

"پہلے تو آپ یہ بتائیے کہ جب فطرت آپ کو یکساں پیدا کرتی ہے تو کیسے ایک کو فوقیت کیسے حاصل ہو جاتی ہے ظاہر بات ہے کہ کچھ بے ایمان لوگ یا تو دوسروں کو بڑھنے نہیں دیتے ہیں اور خود بڑھتے جاتے ہیں یا دوسروں کا حصہ غصب کرتے جاتے ہیں، مثلاً آپ بیچارے صرف ایک شہر کے حاکم ہونگے اور جو بہت سے شہروں کا حاکم ہے وہ آپ کا حصہ مار کر آگے بڑھ گیا، اسی طرح آپ بھی پورے ایک شہر بھر کے لاکھوں محکوموں کو دھکا دے کر حاکم بن بیٹھے۔"

"جی یہ بات نہیں صاحب دیکھئے میں پہلے سمجھا چکا ہوں۔ یہ نظام فطرت ہے۔"

"ارے صاحب نظامِ فطرت کو مطعون نہ کیجئے یوں کہئے یہ نظام فطرت سے جنگ ہے اور بالکل خلافِ فطرت!

"اور کیوں صاحب کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ اپنے ہی جیسوں میں سے حکومت کرنے والی جماعت کا انتخاب کریں:"

"نہیں صاحب وہ تو پہلے سے ایسی جماعت کے لوگوں کو کچھ فوقیت ہوتی ہے۔ اور وہی منتخب ہوسکتے ہیں:"

"تو پھر وہی بادشاہت والی بات ہوئی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے ایک خاندان کے متعلق ایک مفروضہ تھا کہ یہ بادشاہ ہیں اور بادشاہت ان کا حق ہے اور اب چند چالاک ہستیاں بہت سی سیدھی سادی بھولی بھالی مخلوق کو یہ باور کراتی ہیں کہ ہم لوگ حکومت کے اہل ہیں اور مزے سے بادشاہت کرتی ہیں:"

میں کیا جواب دیتا۔ بات بدلنے کے لئے میں نے پوچھا "خیر آپ کو ہمارے یہاں کوئی چیز پسند بھی آئی:"

"ہوں، خیر آپ نے اپنی ناقص کمرو استعداد کے مطابق اپنی دنیا کو اچھا خاصا عجیب بنا لیا ہے۔ آپ کے یہاں ایک چیز جاذب نظر پائی اور دوسری چیز پسند آئی، اور ایک حصہ کو دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ اور یہ بھی آپ کے متعلق جو کچھ بھی اچھی رائے تھی وہ ختم ہوگئی:"

آخری جملے پر مجھے ڈر سا معلوم ہوا، نہ معلوم کون سے حصہ کو دیکھ کر دکھ ہوا۔ خیر میں نے بات بدلتے ہوئے کہا "ہاں وہ بتائیے وہ جاذب نظر چیز کون سی تھی؟"

"ہے تو وہ ٹھوس مادی، پھر بھی جاذب نظر ہے، وہ ایک عمارت، جو چلتے وقت بالکل شروع میں آپ نے دکھائی تھی، اس پر چاند کی شعاعیں عجیب منظر پیش کرتی تھیں جیسے یہ انہیں شعاعوں کی تشکیل ہو کر رہ گئی ہے:"

"اوہو! آپ تاج محل کو کہہ رہے ہیں:— جی تاج محل:"

"محل؟ مگر اس کے ساکنان نظر نہ آئے:"

"نہیں وہ تو ایک مقبرہ ہے:"

"مقبرہ کیا ہوتا ہے؟"

"مرنے کے بعد جسم۔ یعنی اس خاکی جسم کو مٹی میں دفن کر دیتے ہیں اس چیز کو جس میں ہمارا مردہ جسم رکھا جاتا ہے مقبرہ یا قبر کہتے ہیں:"

"اچھا تو آپ سب مرنے کے بعد ایسی اچھی عمارت میں رکھے جاتے ہیں:"

"سب کہاں صاحب، سب کے تو قبروں کے نشان تک بھی نہیں رہتے، بڑی بڑی ہستیوں کے

"تعجب کر رہتے ہیں۔"

"اہو! تو مرتے تو سب ایک ہی طرح ہیں، یا موت موت میں بھی فرق ہے شاید لیکن بڑی ہستیاں مرنے کے بعد بھی بڑے مقبروں میں رہتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ بڑی ہستیوں کا جسد خاکی مرنے کے بعد بھی باقی رہ جاتا ہے۔ اور چھوٹی ہستیوں کا جسم مرنے کے بعد معدوم ہو جاتا ہوگا۔"

"جی نہیں سب یکساں مرتے ہیں اور مرنے کے بعد یہ قالب بے روح باقی رہ جاتا ہے جس کا عدم وجود برابر ہے۔ اور تاج محل ایک بادشاہ یا شہنشاہ کی ملکہ کا مقبرہ ہے جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا اور اسی کے اندر اس کا جسم خاکی دفن ہے۔"

"تو شاید آپ کے یہاں جتنا بڑا آدمی ہوتا ہے اتنی ہی اس کی محبت بھی بڑی ہوتی ہے۔"

"نہیں محبت کا جذبہ تو چھوٹے بڑے سب کو قدرت نے یکساں عطا فرمایا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بڑا آدمی اظہار زیادہ نمایاں طریقے سے کر سکتا ہے۔ اور چھوٹا نہیں کر سکتا۔ اور یہ مقبرہ جو آپ کو پسند آیا شہنشاہ نے پندرہ سال کی مسلسل محنت اور زر کثیر صرف کر کے تعمیر کیا ہے۔"

"اوہو! تو پندرہ سال تک وہ شہنشاہ مقبرہ ہی بناتا رہا۔ بڑا محنتی انسان تھا۔"

"شہنشاہ بناتا رہا!" میں نے ہنس کر کہا "ارے صاحب بنواتا رہا اور بہت سے لوگ بناتے رہے وہ خزانہ سے روپیہ دیتا رہا۔"

"بڑی اچھی ملکہ تھی، کیسی ہر دلعزیز رہی ہوگی، بہت سے لوگ بناتے رہے اس کا مقبرہ! شہنشاہ کے علاوہ اس سے بہت سے لوگ محبت کرتے تھے۔"

"نہیں صاحب شہنشاہ روپیہ دیتا رہا اجرت میں اور بہت سے لوگ کام کرتے رہے۔"

"تو پھر شہنشاہ روپیہ بناتا رہتا ہوگا۔"

مجھے پھر ہنسی آ گئی "روپیہ بھی شہنشاہ بہت سے لوگوں سے پاتا رہا۔ اور انہیں دیتا رہا یہ کام کرتے رہے۔"

"تو پھر آپ نے یہ کیوں کہا کہ شہنشاہ نے بنایا، روپیہ بھی بہت سے لوگوں کا اور کام بھی بہت سے لوگوں کا تو یوں کہیے کہ شہنشاہ کی مرضی سے یہ بہت سے لوگوں کا مقبرہ بنا ہے۔"

میں ہنس پڑا۔ خیر آپ یوں ہی سمجھیے، مگر ہے وہ ملکہ ممتاز محل کا مقبرہ، اور اس کے اندر ملکہ اور شہنشاہ دونوں دفن ہیں۔"

"خیر تو یوں کیوں نہ کہیے کہ بہت سے لوگوں نے انہیں اس میں دفن کیا ہے' یا یوں کہیے کہ بہت سے

لوگوں نے اپنی محنت اور روپیہ اس میں دفن کیا ہے۔"
میں نے مسکرا کر کہا "اب آپ جو کچھ بھی سمجھیں اور کہیں، عدم مساوات واہیات ہے۔"
"ہاں وہ تو خیر میں نے سمجھ لیا عدم مساوات والی بات ہے لیکن مرنے کے بعد اس جسد کو زمین میں دفن کرنا کیا ضرور ہے۔"
"پہلی بات تو یہ ہے کہ اسکا دفن نہ کرنا اور نظروں سے نہ چھپانا ہمارے شعور پر بہت گراں معلوم ہوگا اور سخت ناز یبا ہے، ذرا جذبات کو بروئے کار لا کر اندازہ کیجئے وہ ہستی جو ہمارے ساتھ چلتی پھرتی تھی، ذہنی اور جسمانی ہر صورت میں ہمارے دوش بدوش تھی، ہماری بات سمجھتی تھی ہم اس کی بات سمجھتے تھے موت کے ہیبت ناک تغیر کے بعد یوں بے حس و حرکت جامد و ساکن تعلقات زندگی سے محروم پڑا دیکھنے کو ہماری آنکھ اور دل کیسے گوارا کرے، دوسری بات یہ ہے کہ تھوڑا وقت گذرنے پر اس میں عفونت پیدا ہو جانا لازمی ہے جو ہمارے لئے مزید باعث استکراہ او مضر صحت ہے لہذا جلد از جلد اسے تو مٹی میں دفن کر دینا ہی ٹھیک ہے۔"
"چہ چہ چہ! ارزل خاک۔ یا از میں نے تو پہلے ہی اندازہ کیا تھا کہ آپ کی زندگی بھی خاک ہے اور انجام بھی خاک، تو یوں کہئے کہ مرنے کے بعد خاک رہ جاتی ہے۔"
"جی بالکل، اور آپ لوگوں کی موت کے ساتھ آپ کا جسم بھی غائب ہو جاتا ہے؟"
"اجنبی نے جواب دیا" دیکھئے میں مجملاً اس کے متعلق پہلے عرض کر چکا ہوں ہم لوگوں کی مدت حیات ہمارے کرہ کے قیام کے ساتھ ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قضا ایک دن ضرور آئے گی۔ اور ہم سب فانی ہیں، اور وقتی تغیر سے جسے آپ موت کہتے ہیں ہم بھی مبرا نہیں لیکن یہ فنا نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ جیسا کہ شاید میں نے پہلے عرض کیا وہ اس پیکر ظاہری سے جس میں اس وقت میں آپ کے سامنے موجود ہوں بے نیاز ہو جاتے ہیں۔"
"تو یہی تو میں پوچھتا ہوں یہ ظاہری پیکر کہاں کہاں چلا جاتا ہے؟"
"دیکھئے ہمارے اندر یہ تغیر رفتہ رفتہ ظہور پذیر ہوتا ہے، یک لخت انقلاب نہیں آتا اور جب اس تغیر کی تکمیل ہو جاتی ہے تو جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ہماری زندگی کی ارفع ترین منزل آجاتی ہے اور قیود مکان و زمان سے آزاد ہو جاتے ہیں، آپ اپنی فہم میں یوں سمجھ لیجئے کہ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں اور کہیں بھی نہیں۔
"مگر یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں ہوا آپ کا یہ ظاہری پیکر کہاں چلا جاتا ہے؟"
"صاحب ہم ان ضروریات سے مستغنی ہو جاتے ہیں جو ہمارے اس جسم کیلئے ناگزیر ہیں لہذا ظاہری پیکر سے بھی مستغنی ہو جاتے ہیں مگر یہ بھی رفتہ رفتہ ہوتا ہے اشکال ظاہری کا ہمارے یہاں کوئی مقام نہیں ہمارا اصلی وجود ہماری روح ہے ارتقا کی اس منزل پر پہنچکر ہمارے ظاہری پیکر میں اتنی صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ روح کا انجذاب ہم قرار

رکھ سکے اور روح ہی روح باقی رہ جاتی ہے۔ لہٰذا ظاہری پیکر کا کوئی سوال ہی نہیں۔

"تو پھر جب آپ اس منزل پر پہنچتے ہیں تو آپکا کوئی تعلق اپنے ان ہم جنسوں سے جو اس منزل تک نہیں پہنچ پائے جاتے ہیں باقی رہ جاتا ہے" میں نے کہا اور اجنبی نے جواب دیا "یقیناً، باقی رہتا ہے" وہ ہماری خوشیوں میں خوش ہوتے ہیں، اہم معاملات میں ہمارے مشیر ہوتے ہیں، خاص طور پر اس منزل کے لئے جس میں وہ پہنچ چکے ہوتے ہیں ہمارے رہنما ہوتے ہیں" اور نئی روح ہمارے اندر مستقل افادہ اور متواتر استحصال کی شکل میں حلول کئے رہتی ہے۔ آپ کی دنیا میں معاملہ دوسرا ہے آپ چونکہ مادیت میں زیادہ پھنسے ہوئے ہیں اس وجہ سے بہت ہی ادنےٰ فطری عمل تغیر اشکال پر بھی قدرت نہیں رکھتے حتیٰ کہ اس تغیر کے بعد جسے آپ موت کہتے ہیں آپ کا یہ خاکی پنجر تک پڑا رہ جاتا ہے۔"

میں نے متاثر ہو کر کہا "بھائی آپ سے بات کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ ہم ارضیوں کی فطرت کیا ہے۔"

"دیکھیے صناعِ فطرت اور کائنات ہماری دنیا ایک ہے۔ فطرت اس عظیم قوت کا نام ہے جو تمام کائنات پر حاوی ہے۔ فطرت نے اعلےٰ ترین صلاحیتوں سے آپکو سرفراز کیا ہے مگر اس کے دوش بدوش چلنا اس سے ٹکرانا یہ آپ کی اپنی استعداد طبع پر منحصر ہے۔"

"مگر میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اعلےٰ اکتسابات اور مابعد... آپنے اپنی مضمر صلاحیتوں سے حاصل کئے ہیں"

"جی بیشک مگر یہ قوتیں فطرت نے ہماری سرشت میں اور بلکہ آپکی بھی سرشت میں ودیعت کی ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ ابتدائے آفرینش سے آپنے اپنے اندر انہیں مسخ کیا ہے اور ہم نے انہیں بنایا سنوارا ہے اور شاید یہ تو آپ بھی مانتے ہونگے کہ کوئی چیز بلا مانگے نہیں ملتی، اور صاحب فطرت بڑی فیاض ہے دوسرے لفظوں ہم فطرت سے لے کر اپنا خزانہ بھرتے ہیں اور آپ کو جو کچھ ملا تھا اسے بھی کھوتے رہے۔"

"کیا داد دی ہے آپ نے ہمارے تمدن و ترقی کے دریں کوششوں کی۔"

"اور کیا کہوں معاف کیجئے، آپ کو اس خود ساختہ تمدن پر ناز ہے۔ اور حد ہے کہ آپ اپنے اس ذرا سے کرہ کے اندر ایک سیاسی نظام بھی قائم نہیں کر سکے۔" اس نے حقارت کے ساتھ کہا۔

"میں نے کہا "جناب ہماری دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف قومیں آباد ہیں اور وہ اپنی اپنی خصوصیات ملکی کی بنا پر ایک دوسرے سے مختلف طبیعتوں اور عادتوں کی واقع ہوئی ہیں، اس وجہ سے ہم ایک دوسرے کے ساتھ بالاشتراک زندگی بسر نہیں کر سکتے اور اس لئے یہ ناقابلِ عمل ہے کہ ہم تفریق باہمی کو مٹا کر ایک ہو جائیں۔"

"اچھا تو آپ آدمی آدمی ایک قوم نہیں ہیں؟"

"مخلوق ایک ہیں، ایک ہم جنس مگر ایک قوم نہیں ہو سکتے۔"

"واہ! یہ عجیب بات ہے یعنی ایک ہونے کے لئے آپ کو آدمی آدمی کا عظیم رشتہ کافی نہیں، یہ قومیت کا تخیل تو بڑا گمراہ کن ہے اور قانونِ فطرت کے بالکل منافی ہے۔"

"دیکھئے ہمارے ملکی اغراض قدرتی طور پر جدا گانہ ہیں۔"

"وہ چھوڑیئے میری موٹی سی بات کا جواب دیجئے جب آپ ایک ہی قسم کی مخلوق ہیں، ہم جنس پیدا ہوئے ہیں، اور آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ آپ کا کرہ چھوٹے چھوٹے نظاموں کے حصوں میں بٹا ہوا ہے اور ان چھوٹے چھوٹے نظاموں میں آپ شامل ہیں تو پھر اس میں کیا قباحت ہے کہ آپ ایک وسیع ارضی برادری میں شامل ہو کر ایک نظام میں منسلک ہو جائیں۔"

"یہ ملکی اور قومی اغراض کے علاوہ سب سے بڑا اثر جو اس خصوص میں کام کرتا ہے آپ اپنی فہم میں یوں سمجھ لیجئے وہ مالی معاملہ ہے، ہر ملک کے نسلی اور قومی اختلاف کے علاوہ معاشیات جدا جدا ہیں۔"

"مالی معاملہ کیا؟"

"آپ یوں سمجھ لیجئے کہ نقد کا، جس پر ہماری دنیا کی معاشیات کا دار و مدار ہے۔"

"نقد کیا؟" اجنبی نے ذرا تحیر کے ساتھ دریافت کیا۔

کس چوپٹ سے پالا پڑا تھا! اور محلا میں نے دنیا کے اقتصادی نظام کے متعلق سمجھایا، اور یہاں تک جیب سے ایک روپیہ کچھ اٹھنیاں، چونیاں نکال کر دکھائیں اور بتایا کہ یہ دھات کے ٹکڑے اس صورت میں ڈھال کر اور اسکے نظام کو حکومت کے سپرد کر کے ہم انہیں ذریعہ تبادلہ بناتے ہیں تاکہ ضروریات زندگی کی چیزیں ان کے بدلے حاصل کر سکیں، یہ تو چاندی کے ہیں، ان سے زیادہ قیمتی سونے کے ہوتے ہیں۔ ان سے گھٹیا تانبے کے، جو دھاتیں ہماری دنیا میں کم میسر آتی ہیں انہیں کے تبادلہ میں ضروریات زندگی کی چیزیں مل جاتی ہیں۔"

"دھاتوں کے خواص سے تو ہم بھی بڑے محرم ہیں مگر آج دھات کا یہ بڑا انوکھا استعمال معلوم ہوا۔ یہ شاید دہی دکان والی بات کہہ رہے ہیں آپ۔ مگر آپ کی دنیا نہ معلوم کیسی ہے اور ضروریات کس قسم کی، یعنی آپ نے اپنی صلاحیتیں یہاں تک برباد کر دی ہیں کہ آپ کے یہاں ہر فرد بلا امداد دیگرے خود اپنی بھی ضروریات زندگی مہیا کرنے پر بھی قادر نہیں۔

"ہمارا ہمارا معاشرہ بہت سے شعبوں میں بٹا ہوا ہے، اور اس کے قیام، تسلسل اور ترقی کے سلسلے میں

لاتعداد نفوس بلکہ یوں کہیے کہ ہمارے اس کرہ کی تمام آبادی ہمہ وقت سرگرم عمل ہے اور اپنی اپنی مسکرہ استعداد کے مطابق اس میں ہر فرد لگا ہوا ہے لہٰذا ہر فرد کے لئے یہ ضروری نہیں اور نہ شاید اتنا وقت ہی ہے کہ اپنی ذات کے متعلق جملہ ضروریات خود پوری کرے، لہٰذا ایک معاشی نظام مرتب ہے اور انفرادی ضروریات کے تحت دھات کے ان ٹکڑوں کے ذریعہ تبادلہ کا طریقہ رائج ہے۔"

"اچھا تو یہ سکے ہر فرد کے قبضہ میں یکساں تعداد میں ہوں گے۔"

"نہیں جو فرد اپنی صلاحیت یا دیگر حالات کے تحت ان پر زیادہ سے زیادہ قبضہ کر سکے اسے ہماری سوسائٹی میں تفوق ہوتا ہے۔"

"اچھا تو یہ بھی آدمیوں آدمیوں کے پاس کم و بیش ہوتے ہیں، اور تفوق کا معیار ہیں۔"

"جی۔"

"بس یہی معیار تفوق ہے آپ کی سوسائٹی کا۔"

"ہاں بڑی حد تک ۔۔۔۔ لیکن معیار افضلیت اور بھی ہے، کسی کو علمی ترجیح ہے، کوئی مذہبی اعتبار سے اور کوئی سیاسی اعتبار سے فوقیت رکھتا ہے، حالانکہ یہ بھی دونوں علمی زمرہ میں آتی ہیں۔"

"مگر سب آدمیوں کی ضروریات یکساں ہیں اور ان کی بہم رسانی کا بھی ایک واحد ذریعہ ہے تو جو اس کے حصول میں جتنا زیادہ کامیاب ہوتا ہوگا اتنا ہی وہ افضل ہو جاتا ہوگا۔"

"اس پوچھئے تو میزان فوقیت تو یہیں پہ لگتا ہے۔"

"دیکھئے تو اب میں سمجھا، بس اسی وجہ سے تو آپ کی دنیا میں مساوات نہیں ہو سکتی۔"

"جی، مگر میرا تو خیال ہے کہ نظام کائنات ہی عدم مساوات پر ہے۔"

"نظام کائنات تو عین مساوات پر ہے، البتہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی دنیا کا نظام تقاضائے فطرت کے خلاف کر رکھا ہے اور اپنی غیر فطری ضروریات کا دائرہ اتنا بڑھا لیا ہے کہ ہر فرد کے دست قدرت سے باہر ہے، اور ان کی تکمیل کے لئے اپنے دوسرے ہم جنسوں کی امداد کا طالب ہوتا ہے اور اس کے لئے آپ نے نقد و دولت کا چکر چلایا ہے، اس کی ضرورت نہیں، فطرت نے اپنی نعمتیں اور عطیات سب کے لئے یکساں اتارے ہیں، فطرت کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ ایک شخص اپنی ضرورتوں کو اس قدر بڑھائے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل میں دوسروں کی امداد کا طالب ہو، اور اس کے عوض میں یہ خود ساختہ سکوں کی شکل میں قیمت ادا کرے۔"

میں نے کہا "جناب یہ ہمارا معاشی نظام ہے، اور سچ پوچھئے تو کوئی شے ایسی نہیں ہے جو ان سکے

دھات کے ٹکڑوں کے بدلے حاصل نہ کی جاسکے، حتیٰ کہ انسان اپنی محنت و کاوش کے بہترین پھل ان کے بدلے میں دینے کو طیار رہتا ہے، اپنی عقل کے بہترین مظاہرے اس کے حصول کی خاطر کرتا ہے، یہاں تک کہ کبھی کبھی اس میں اپنا ضمیر بھی بیچ کھاتا ہے"

"توبہ! اول تو سیدھی سادی فطری زندگی میں اس کی ترویج، کیسی بدعت! کاش کہ آپ کی دنیا غور کرتی کہ آپکی تخلیق کا یہ مقصد تھا، میں تو سمجھتا ہوں کہ اس غیر فطری احساس نے آپ کے یہاں اندھیر مچا دیا ہوگا، اور شاید قانون فطرت سے لڑنے کا سب سے کارگر اور سنگین ہتھیار یہی ہے"

"لیکن ہر دور میں کم و بیش ہمارے یہاں ایسی ہی ہستیاں موجود رہتی ہیں جو روپیہ کو مٹی کی ٹھیکری کے برابر بھی نہیں سمجھتیں"

"اچھا ایسے لوگ بھی! ـــــ مگر ان کی ذاتی ضروریات کی بہم رسانی کا ذریعہ کیا ہوتا ہے"

"دیکھئے ہم لوگ معجونِ مرکب ہیں اگر ایک طرف بدترین طینیت اور خصلت کا شکار ہیں تو دوسرے پہلو سے ملکوتی صفات و بہی محاسن کا سرچشمہ بھی ہیں، اور ہماری دنیا میں خیر بلا امتیاز شر مفقود ہے، ہماری اسی دنیا میں ایسی برگزیدہ ہستیاں بھی ہیں جو نیکی اور بدی کے توازن کو نہایت خوبصورتی کے ساتھ سنبھالے ہوئے ہیں، کبھی کبھی ایک ہی ہستی متضاد اوصاف کی حامل ہوتی ہے، اور ہماری دنیا میں بہت سی ایسی ہستیاں تھیں اور شاید ہیں بھی جو اپنی ذاتی ضروریات کو کم سے کم دائرہ میں سمیٹ کر زندہ رہتی ہیں اور جو کچھ بھی ضروریات ہوتی ہیں ان کی بھی کوئی اہمیت ان کی نظر میں نہیں ہوتی، ان کی نگاہ میں تخلیق کا اصل راز ہوتا ہے اور یہ خدا کے نیک بندے دوسروں کے لئے مشعل راہ ہوتے ہیں، اور بڑی حد تک ہماری سوسائٹی کے ہر شعبہ میں اچھائی اور برائی کا توازن انہیں کی رہنمائی سے ہے، بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ ہمارے معاشرہ کو یہ منزل انہیں کے ہاتھوں نصیب ہوئی ہے"

"ہوں تو وہ ہستیاں کون ہیں"

"وہ ہم ہی جیسے آدمی، اور حال کا صیغہ میں نے یوں استعمال کیا اگرچہ آج کل بہت کم ہیں لیکن پچھلے دور میں بہت سے گذر چکے ہیں اور ان کا راستہ اور تعلیم ہمارے سامنے ہے اور ہم انہیں زندۂ جاوید تسلیم کرتے ہیں۔ خیر چھوڑیئے اور دوسری چیز آپ کو ہمارے اس خاکی کرہ میں کیا پسند آئی"

"ہاں وہ، وہ۔ بڑی پیاری۔ زندہ جیتی جاگتی مخلوق! ـــــ تصور سے ہی لطف آرہا ہے، کیا ادائیں تھیں، واہ!"

میں نے خیال کیا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کسی تیرِ نظر کا شکار ہو گئے۔ اور مجھے لطف سا آیا میں نے کہا۔

"بتائیے صاحب — کہاں! ؟ — کیا کہیں دل دے بیٹھے"

"ہاں وہ ننھا منا آپ ہی جیسا آدمی، اس کی معصوم ادائیں بہت بھائیں، وہ ہے دراصل صانع فطرت کا صحیح وارث، اور خلیفۃ الارض بننے کا اہل"

"اچھا آپ بچہ کو کہہ رہے ہیں، ہوں میں سمجھ گیا، کہاں دیکھا" میں نے پیار والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"جہاں جب ل گیا یہ میری نگاہ کا مرکز رہا اس کی معصوم اداؤں میں کسی کسی وقت عین مطابق فطرت تیور جھلکتے ہیں، اور ہر خط میں جیسے ایک ہی زنجیر کی سنہری روپہلی کڑیوں میں منسلک ہے اور سچ میں تو یہ کہوں گا کہ آپ کے اس تاریک خاکی کرہ میں اسی چراغ کی روشنی ہے اور اسی کے دم سے آپ کی دنیا عبارت ہے"

"اس میں شک بھی کیا ہے — بظاہر یوں بھی بڑی جاذب نظر ہستی ہے اور پھر اصولی طور پر یہ نسل آدم کے شجر کا اکھوا ہے"

"اکھوا ہے! یعنی ابھی پروان نہیں چڑھا ہے؛ کیا یہ ہمیشہ ایسا ہی نہیں رہے گا؟"

میں کھلکھلا کر ہنس پڑا اور کہا "میرے بھولے بھالے دوست ہم سب بچے پیدا ہوتے ہیں اور پھر جوان اور بوڑھے ہوتے ہیں"

"اچھا تو پھر آپ بھی کبھی ایسا ہی ننھا منا پیارا بچہ تھے" اس نے بھولے پن سے سوال کیا۔

"ہوں! اور بچہ نہ ہوتا تو آج جوان کہاں سے آتا" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس نے سنجیدگی سے کہا "اوہو! تو یوں کہئے کہ فطرت آپ کو بڑا خالص پیدا کرتی ہے، اور جوں جوں بڑھتے ہیں خراب ہوتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ مسخ ہو کر جوان اور بوڑھے ہوتے ہیں"

میں ہنس دیا اور میں نے نیم مذاق میں کہا "اور دوسری چیز ہمارے یہاں آپ کو صنفِ نازک پسند نہیں آئی"

"صنفِ نازک! صنفِ نازک کیا؟"

مجھے پھر ہنسی آگئی۔ یہ بھی مرد ہیں سالے، عورت کو جانتے تک نہیں! — اور میں نے کہا "میاں ساری زلیخا پڑھ گئے اور یہ نہ سمجھے کہ زلیخا عورت تھی کہ مرد تھا۔ میں نے ابھی ذرا دیر پہلے وہ کون سی عورت ہے جو نہ دکھادی ہو، اپنی سانولی سلونی لمبی زلفوں والی بنگالنیں، سیب سے رخساروں اور گلاب کی پنکھڑی سے ہونٹوں والی کشمیر میں سنہری ناگن کی طرح لہراتی بلوچنیں اور مرمریں ستون سی پٹھانیاں — خیر یہاں نہ سمجھے تو کوئی بات نہیں گھر کی مرغی دال برابر، میں نے بیروت کی تفریح گاہوں میں آپ کو کردوں کے غول دکھلائے، سچ مچ کوہ قاف کی پریاں، اور پھر سیزر کی سرزمین پر خالص اطالوی حسن کے نمونے

دکھائے، اور پھر تو پیرس کے پری وشوں کے جھمگٹوں کے بیچوں بیچ اتارا اور اخیر پر لندن کے بال روم اور تماشے گاہوں میں لے گیا۔ اور میاں یہاں دونوں جگہ عورت کو کس کس روپ اور بہروپ میں دیکھا اور پوچھتے ہو صنفِ نازک کیا، واقعی بڑے زاہدِ خشک ہو یار!"

"جی میں سمجھ گیا، عورت اور آپ کے کرہ کی عورت بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے جس وقت وہ بچہ سے ملتفت ہوتی ہے۔ تو واقعی صانعِ فطرت کا ہلکا سا عکس دکھائی پڑتی ہے، لیکن میں تو یہ پوچھتا ہوں کہ آپ عورت کے لئے صنفِ نازک کا لفظ کیوں استعمال کرتے ہیں؟"

مجھے تاؤ سا آ گیا، عجیب سی بنگم مخلوق ہے، بھلا کوئی پوچھے کہ صنفِ نازک نہ کہوں تو کیا بھینس کہوں یا ہتھنی اونٹنی! اور میں نے جواب دیا "یہ امر تو مسلمہ ہے کہ جسمانی اعتبار سے وہ ہماری بہ نسبت فطرتاً نازک پیدا ہوئی ہے ساتھ ہی نازک مزاج بھی ہے لہذا ہم عورت کو صنفِ نازک کہتے ہیں۔"

"صنفِ نازک! یعنی یہ آپ کا سب سے غلط مفروضہ ہے کہ جسمانی اور مزاج کے اعتبار سے عورت فطرتاً نازک پیدا ہوئی ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح آپ نے اپنی اور بہت سی چیزوں کو تمدن اور معاشرہ کا نام دے کر بگاڑا ہے اسی طرح عورت کو بھی خراب کیا ہے۔"

کہاں تک سمجھاؤں اس کندہ ناتراش کو، غیر شاعر مخلوق! عورت کو صنفِ نازک نہیں کہنے دیتا اور میں نے مسکرا کر کہا "میرے پیارے مہمان ہماری دنیا میں ساری رنگینی اور رعنائی عورت ہی کے دم قدم سے ہے، بڑی بڑی طاقتیں عورت کے قدموں پر جھکتی ہیں کل کی بات ہے ہماری دنیا کا سب سے بڑا شہنشاہ ایک معمولی سی عورت کے مقابلہ میں تاج و تخت پر لات مار کر چلدیا، ہماری تاریخ شاہد ہے کہ بڑی بڑی فوج کشیاں اور خونریزیاں ایک عورت کے لئے ہوئیں، اگر عورت کا وجود اس طرح جس طرح ہم اس کے متعلق بقول آپ کے مفروضہ قائم کئے ہوئے ہماری دنیا سے نکال لیا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہماری دنیا کا دم گھٹ جائے، عورت جانِ بہار ہے، عورت جانِ فن ہے، عورت جانِ زندگی ہے جانِ جہان ہے۔"

"نہیں عورت کی اہمیت سے مجھ کو کب انکار ہے سب سے بڑی چیز ہے کہ فطرت عورت کے ذریعہ اپنا بنیادی اور سب سے اہم ترین تقاضا پورا کرتی ہے، اور توالد و تولید و تناسل کا دارو مدار اسی شجر پر ہے۔" اس نے کہا اور میں نے دل میں کہا "کیا بات کہی ہے اس کھرپے نے۔ یعنی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے یہاں عورت بچہ جننے کی مشین ہے؟"

میں نے حقارت کے ساتھ ہنس کر کہا "جی وہ بھی ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا کرہ احساسِ لطیف سے بالکل عاری ہے، جو عورت کو صرف اس نظر سے دیکھتے ہیں؟"

"جی مگر میں سمجھتا ہوں کہ جس چیز کو آپ احساسِ لطیف سے تعبیر کر رہے ہیں۔ اس کے تحت الشعور میں بھی عورت کی وہی تولید و تناسل والی اہمیت ہے، جو اس صورت میں آپ کے محسوسات میں کارفرما ہے۔ ہمارے یہاں عورت ایک ساتھی ہے، جو قانون فطرت کے اہم ترین تقاضے کو ہمارے دوش بدوش پورا کرتی ہے، اور چونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ اس سلسلے میں اس کی ذمہ داری ہم سے کچھ زیادہ ہے لہٰذا اس نقطۂ نظر سے ہم اپنے سے افضل اور زیادہ طاقتور سمجھتے ہیں کہ صنف نازک کہہ کر اس کی توہین کریں۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی "نہیں صاحب توہین نہیں یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ ہم اسے صنف نازک سمجھ کر اس کا بار زیادہ تر اپنے کندھوں پر خیال کرتے ہیں اور اسے اپنے سے افضل تر سمجھتے ہیں۔"

"کیا اوندھا طریقہ ہے، یعنی افضل تر آپ کے یہاں کمزور تر ہے! ارے صاحب وہ تو افضل تر ہے اور اس لحاظ سے غالب تر کہا جائے تو زیادہ صحیح ہے۔"

اجنبی کی بات مجھے جیسے کچھ لگتی سی معلوم ہوئی۔ کچھ جواب بن نہ پڑا، ٹالنے کے لئے میں نے سگریٹ کیس سے ایک سگریٹ نکالا اور سلگا یا ساتھ ہی اجنبی کی جانب بڑھایا "لیجئے شوق کیجئے۔"

"یہ کیا بلا ہے! اور آپ یہ گرمی اپنے اندر کیوں لے رہے ہیں؟"

میں نے جواب دیا "یہ سگریٹ ہے، کل رات سے نیند پوری نہیں ہوئی، طبیعت میں کسل ہے۔ ذرا پی لوں۔"

"اچھا! اسے آپ کسل دور کرنے کے لئے استعمال میں لاتے ہیں۔ اس کی نوعیت کیا ہے؟"

میں نے مختصر لفظوں میں تمباکو کی ماہیت اور اس کے فوائد بیان کئے۔ اجنبی نے سمجھ کر کہا "معلوم ہوتا ہے کہ کچھ نشہ آور معاملہ ہے" اور یہ کہتے ہوئے جیسے میری جانب سے رجعت کا انداز نمایاں ہوا۔

"جی نشہ! خیر نشہ تو نہیں، مگر ہاں کچھ اسی قبیلہ کی چیز ہے۔ یوں سمجھئے ہلکی منشی۔"

"چھ چھ چھ —— بالکل غیر فطری، آپ کے یہاں منشیات کا رواج بھی عام ہے؟" اجنبی کے انداز پر حقارت نمایاں تر ہو گئی۔

میں نے کہا "نہیں یہ تو تمباکو ہے، بہت ہی ہلکا نشہ، اور پھر اس کے کچھ فوائد بھی ہیں اس لئے اس کا استعمال ہمارے یہاں تقریباً عام ہی ہے۔"

"لیکن نشہ اور فوائد دو متضاد چیزیں ہیں یہ، فطرت ایک چیز کے اندر پیدا نہیں کر سکتی۔"

میں نے کچھ خفیف سا ہو کر کہا "نشہ آور چیز آپ کے کرہ میں پیدا نہیں ہوتیں؟"

"جی پیدا کیا چیز نہیں ہوتی، مگر ہماری سرشت میں ان سے رجعت بھی ساتھ ساتھ پیدا ہوتی ہے"

اور ہم انہیں استعمال کر ہی نہیں سکتے۔"

اور مجھے وہ لطیفہ یاد آ گیا کسی واعظ سے کسی افیونی نے جنت کا حال سنتے ہوئے پوچھا "کیوں مولانا، خیر جنت میں افیون کا ہرا بھرا بوٹا تو پیدا ہوتا ہی ہو گا مگر وہاں حقہ بھی ملے گا؟ اس کے لئے آگ کا کیا انتظام ہے؟"

"استغفراللہ! وہاں اس ناپاک چیز کا کیا کام!" مولانا نے فرمایا تو افیونی نے زیر لب منمنا کر کہا "تو ایسی جنت کو ہمارے سات سلام جہاں اجابت ہی نہ ہو سکے۔"

میں نے مسکرا کر کہا "بس حضرت معلوم ہو گئی حقیقت آپ کی فردوس دنیا کی۔ تمباکو نوشی نہیں شراب کی چسکی نہیں، افیون کا انٹا نہیں، چرس چانڈو کا دم نہیں، بھنگ تاڑی کا گھونٹ نہیں پھر حور و قصور نہیں اور شاید جنگ و جدل بھی نہ ہو — پھر زندگی کیسے کاٹتے ہو پیارے ہم سے تو اللہ میاں نے جنت میں بھی ان کا وعدہ کیا ہے۔"

"یہ سب نشہ آور چیزیں ہیں" اس نے میرے نیم مذاق کو سنجیدگی کے ساتھ سنکر کہا۔

میں نے کہا ہاں، جناب آپ یہی سمجھئے کہ یہ سب نشہ آور چیزیں ہیں۔" بات مذاق میں جانا چاہئے تھی مگر اجنبی نے مجھ سے ہر چیز کی تفصیل دریافت کی، اور جب میں بیان کرتے کرتے خاموش ہو گیا تو کہا "اور یہ جنگ و جدل کیا چیز ہے اس کی ماہیت آپ نے بیان نہیں کی۔"

میں نے مسکرا کر کہا "ارے صاحب یہ نہ پوچھئے اس کا نشہ ان سب سے تیز چڑھتا ہے، اور جب چڑھتا ہے تو ہماری دنیا کی رگ رگ پر طاری ہوتا ہے بلکہ یوں کہئے کہ اور سب نشے تو جسم پر چڑھتے ہیں اور یہ روح پر سوار ہوتا ہے۔" اور مجملاً جنگ کا مفہوم سمجھایا۔

"مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہی سب سے زیادہ خلافِ فطرت ہے۔"

"خیر یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ جنگ خلافِ فطرت ہے۔ قانون تنازع للبقا کے مطابق اگر کوئی جذبہ ہے تو یہ ہے" میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

"لیکن قانون تنازع للبقا کا فطری تقاضا جنگ تو نہیں۔ آپ شاید قانون تنازع للبقا کے معنی ہی نہیں سمجھتے۔ یہ وہ قانون فطرت ہے جو تصادم ضروریات فطری کی صورت میں کائنات کے ہر طبقہ میں عمل پذیر ہے۔ اور قانون بقار حیات اسی کا لازمی نتیجہ ہے مگر تصادم ضروریات یا کشمکش اغراض کی بنا پر جنگ و جدل ہونا لازمی نہیں، قانون کو اپنا عمل کرنے دیجئے، ضعیف کا استیصال اور قوی کی بقا فطری طور پر عمل میں آتی رہے گی۔ لیکن فطرت نے یہ تو نہیں بتایا ہے کہ آپ اپنے ہاتھ خون میں رنگ کر اپنا منہ

کالا کریں۔ کیا آپ کی فطرت آپ کو یہ بتاتی ہے کہ آپ اپنے ہم جنسوں کو جو آپ ہی جیسی جان رکھتے ہیں اپنے ہاتھوں فنا کر دیں۔ یاد رکھئے کہ فطرت آپ کو بالا رادہ جنگ و جدال اور خونریزی سے روکتی ہے"۔

"لیکن جناب میں اس کو ماننے کے لئے طیار نہیں۔ نہ صرف ہماری دنیا بلکہ کل کائنات میں ہمہ وقت ایک تصادم ایک کشاکش جاری ہے اور اسی کے تحت فنا و بقا، کا عمل ظہور پذیر ہے۔ ماننا پڑتا ہے کہ جنگ عین منشائے فطرت ہے۔ اور روح انسانی کا پورا کمال جنگ و جدال کے ہی وقت ہوتا ہے اور اکثر اوقات انسانی کردار کی بلند ترین تعمیر اسی وقت پر ہوتی ہے۔ اگرچہ کہتے ہیں کہ صلح و امن کے ساتھ فلاح و بہبودی آتی ہے، لیکن تاریخی تجربات اس کے منافی ہیں، ہماری دنیا اعلےٰ ترین فنونِ لطیفہ اور نادر ترین ایجادات جنگ ہی کے طفیل بڑے کارلائی اور ذہنی قوائے ذہنی اور جسمانی جنگ ہی کے ہاتھوں معراجِ کمال کو پہنچتے رہتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جنگ نے ہم کو تعلیم و تربیت دی اور صلح نے جمود اور دھوکا دیا"۔

"نہیں ممکن ہے کہ آپ کے تجربات یہ ہوں، لیکن جنگ کے فوری اثرات اس قدر مہیب ہوتے ہیں کہ جس مخلوق کا رجحان صحیح راستہ پر ہوگا وہ جنگ سے گریز کرے گی۔ ذوقِ حفظِ زندگی ہر جاندار کی فطرت کا اہم ترین خاصہ ہے اور یہی جذبہ خود ہم کو خطرہ ہلاکت میں پڑنے اور دوسرے کو خطرہ ہلاکت میں ڈالنے سے گریز کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ آپ کے یہاں جنگ انفرادی طور پر عمل میں آتی ہے یا اجتماعی؟"

میں نے جواب دیا" دونوں طریقوں سے۔ ذاتی اور صفاتی وجوہات کی بنا پر۔ انفرادی حیثیت سے ہم اپنی ذاتی اغراض کی بنا پر ٹکرا جاتے ہیں، اور جب وسیع امور یعنی سیاسی اور معاشی تصادم اغراض کی صورت رونما ہوتی ہے تو ایک قوم کے کل افراد دوسرے قوم کے تمام افراد سے برسرِ پیکار ہوتے ہیں۔ اور پھر آپ جانیں جنگ تو آگ کی طرح پھیلتی ہے۔ رفتہ رفتہ اور دوسرے ممالک اور قومیں اپنے اغراض کے پیش نظر فریقین میں سے کسی ایک کے شریک ہو جاتے ہیں، اور یہ سلسلہ چلتا اور بڑھتا رہتا ہے، اور جنگ کا دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے۔ اور ابھی کل کی بات ہے دس بارہ سال پیشتر ہماری پوری دنیا جنگ کے شعلوں میں لپٹ کر رہ گئی تھی اور زمین کا کوئی چپہ ایسا نہ تھا جہاں خونریزی نہ ہو رہی ہو"۔

"اچھا آپ جنگ میں کن آلات سے کام لیتے ہیں؟" اجنبی نے پوچھا

"یہ رائفل آپ کے سامنے ہی رکھے ہوئے ہیں، ان کا استعمال تو آپ دیکھ ہی چکے" میں نے کہا اور پھر اپنا طمنچہ نکال کر دکھایا" یہ چھوٹا نمونہ انہیں کا ہے ذرا ہلکا اور کم مہلک" اور پھر شکاری چاقو کھول کر پیش کیا۔ "اور یہ دھاردار ٹھنڈا آلہ اور اس قسم کی اور بڑی چیزیں تلوار سنگین اور کیا کیا سبھی استعمال ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سب بہت ہی ہلکی اور کم مہلک ہیں" اور رائفلوں کے پیر کی جانب اشارہ کرکے کہا" اسی قسم کے اس

سے ہزاروں بلکہ لاکھوں گنا تیز اور موثر ہتھیار انہیں اصولوں پر بنا کر استعمال کرتے ہیں، اور اب تو یہ چیزیں بھی بہت پیچھے رہ گئی ہیں ہم نے اس جنگ میں تو مہلک ترین ہتھیار ایٹم بم ایجاد کر کے استعمال کیا جس کی ہلاکت کی شدت سے کرہ ارض کانپ اٹھا اور اب اس سے بھی آگے بڑھ رہے ہیں اور ہائیڈروجن بم کے تجربات کامیاب ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے جنگی جہاز اور ہوائی جہاز بھی اسی مقصد کے لئے کام میں لائے جاتے ہیں:

"الامان! الحفیظ!" ـــــ اجنبی کے منہ سے بے ساختہ نکلا، اور رائفل کی جانب اشارہ کر کے کہا "یہ ہتھیار! اور اس سے بھی زیادہ مہلک! تو پھر عالم گیر جنگ میں کیا حالت ہو جاتی ہو گی آپ کی دنیا کی!؟!! ـــــ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک آپ کی عقل کی بہترین اخذ و ایجاد ہلاکت کی جانب رہی ہے ـــــ اور یہ پانی پر تیرنے والے بڑے بڑے مساکن اور ہوا پر اڑنے والے تیز رو مکان جن کی ایجاد پر آپ کو ناز ہے اپنی نسل کو ورطہ ہلاکت میں ڈالنے کے لئے ایجاد کئے ہیں۔ کیا وہ مہلک ترین ایجاد جس کو آپ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کہتے ہیں آپ نے انسانوں کو مارنے کے لئے بنائے ہیں ـــــ توبہ! فطرت کے گراں بہا عطیے آپ نے فطرت کے خلاف استعمال کئے۔ اور شاید پھر انہیں کی بنا پر خلیفۃ اللہ کا خود ساختہ لقب اختیار کیا، کیا ڈھٹائی ہے بھائی!!"

"مگر صاحب میں پہلے عرض کر چکا کہ تنازع للبقا اور تصادم اغراض ـــــ.." میں نے کہا اور اس نے میری بات کاٹ دی "جی معلوم ہو گیا آپ کا تنازع للبقا اور تصادم اغراض کا اندھا فلسفہ اور گونگی منطق ہے ـــــ جس قسم کی جنگ آپ کی دنیا میں ہوتی ہے وہ غیر فطری ہے، ممکن ہے کہ ضمنی طور پر کچھ اچھے نتائج ردعمل میں پیدا ہو جاتے ہوں مگر جنگ کے اجراء کے دوران میں جو شدید تباہ کاریاں ہو جاتی ہیں میں سمجھتا ہوں کہ ان کی تلافی آپ کی قوت سے باہر ہے، آپ موجوداتِ عالم میں جس کی تعمیر و تخلیق میں فطرت ہمہ تن مصروف ہے تخریب و استیصال کرتے ہیں:"

"جناب آپ جس چیز کو تخریب و استیصال کہتے ہیں اسی میں تو موجوداتِ عالم کی تعمیر تحفظ اور بقا کا راز مضمر ہے، ہم آپس میں اس وقت جنگ کرتے ہیں جب حقیقی امن و امان کے حصول و قیام میں رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں:"

"تو آج تک آپ کی دنیا میں جتنی لڑائیاں لڑی گئیں سب اسی ضرورت کے تحت لڑی گئیں؟"

"جی یہ تو نہیں کہہ سکتا۔ مگر ہماری دنیا میں جنگ کا اصول یہی رہا ہے اور ہونا چاہئے۔ اگرچہ تاریخ کا تجزیہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے یہاں بہت سی جنگیں تفریحاً اور قوت آزمائی کے لئے بھی لڑی گئیں، اکثر لڑائیاں جو الارض کی دیوانگی میں توسیع سلطنت کے لئے ہوئیں اور ابھی ان تیس سال کے اندر دو عظیم لڑائیاں تجارتی

اور صنعتی فروغ کے لالچ میں ہوئیں۔ اور تحفظ کے سلسلے میں بھی کچھ جنگوں کا تاریخ پتہ دیتی ہے۔"

"خیر یہ تو سنا، لیکن یہ بتلائیے کہ آپ کے یہاں جنگ میں لڑنے والا ہر سپاہی اصل غایت کو سمجھتا ہوگا۔"

"جی بالکل نہیں۔ اصل غایت حکمراں جماعت یا فرد کے علم میں ہوتی ہے اور اسی کی مرضی کے مطابق جنگ کی جاتی ہے، لڑنے والوں کو بجز اس کے کہ لڑو اور کوئی خاص علم نہیں ہوتا۔"

"مگر وہ حکمراں جماعت یا فرد خود بھی میدان جنگ میں ساتھ جاتا ہوگا تو پھر لڑنے والے سپاہی اس سے اصلی غایت جنگ کیوں دریافت نہیں کرتے؟"

"مطلق نہیں، وہ کوسوں دور بیٹھا میٹھا خبریں سنتا اور احکام صادر کرتا رہتا ہے۔ وہ پہلے جنگ کا اعلان کرتا ہے اور اعلان سے پیشتر بھی ضروری نہیں کہ وہ حکمراں جماعت یا فرد لڑنے والوں سے دریافت کرنے اور اعلان کرنے کے بعد جمہور کی بڑی تعداد کو جن کی مرضی یا رائے کو جنگ جاری کرنے یا نہ کرنے میں کوئی دخل نہیں ہوتا تھوڑی سی لڑنے کی تربیت دے کر میدان جنگ میں بھیج دیتا ہے، اور وہ کسی باطل جذبے کے زیر اثر یا لالچ کے تحت یا میدانِ جنگ کے ماحول سے متاثر ہو کر اپنی جانیں دے دیتے ہیں اور دوسروں کی جانیں لے لیتے ہیں جو ان کے مدِمقابل ہوتے ہیں اور ایسی ہی صورت میں میدان جنگ میں بھیجے جاتے ہیں۔"

"کس قدر شرمناک! ——— افسوس دشمن تو دشمن آدمی دوست سے دھوکا مکاری کرنے میں نہیں چوکتے۔ غور تو کیجئے قربان ہونے والے بے چاروں کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ ان کی قربانی کی غایت اصلی اور مقصد کیا تھا، اور جو طبقہ جنگ کے آغاز اور اجراء کا حکم دیتا ہے وہ جنگ کے خطرات سے بالکل محفوظ رہتا ہے کیا اندھیر ہے! معصوم اور ناسمجھ ہستیوں کے ذریعہ اپنے مقاصد اور اغراض پوری کرتے ہیں تو یوں کہیے کہ یہ جنگ ان چند قابو یافتہ ہستیوں کیلئے ذریعہ ترقی ہو تو ہو مگر جمہور کیلئے تو اندھی موت ہے، یہاں تک کہ مرنے اور مارنے والوں کو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ کیوں مرے اور کس لئے مارا۔"

"جی بالکل ——— ہمارے یہاں اچھی فوج کی تربیت یہی سمجھی جاتی ہے کہ وہ جنگ کی اصل غایت سے نابلد ہو، مگر ذاتی طور پر مجھ کو اپنے ہم جنسوں کی اس پالیسی سے اختلاف ہے، لیکن آپ ایسی جنگ کے متعلق کیا کہیں گے جو اس صورت میں لڑی جائے جب۔ ایک قوم یا کسی ملک کے چند افراد قوانینِ فطرت کی اس حد تک خلاف ورزی کریں کہ اپنے ہم جنسوں کا پیدائشی حق یعنی آزادی سلب کر لینا چاہیں بدی اور گناہ کو کوئی ملک یا قوم اپنی سرشت میں داخل کرنے اور اپنے ذاتی تمتع کی خاطر دوسروں کا حق غصب کرے، ابلیسی قوتوں کو اپنا ذریعۂ ترقی بنائے، بدی نفسانیت خود غرضی کو اصول زندگی قرار دے دے۔"

"بہر حال میں ان حکمراں جماعتوں یا افراد کو بھی جو ان کی بنا پر اپنے ملک و قوم کو جنگ میں جھونکتے ہیں۔ اور اپنا الو سیدھا کرتے ہیں اسی زمرہ میں شمار کرتا ہوں جو آپ تفصیل کہہ رہے ہیں اور ان کے خلاف جنگ کرنا عین منشائے فطرت سمجھتا ہوں، کیا آپ کے یہاں ایسی جنگیں بھی ہوتی ہیں۔"

"میں نے عرض کیا نہیں یہ دو جنگیں جو میرے سامنے لڑی گئیں یہ تو خالص صنعتی اور تجارتی اغراض کی بنا پر تھیں اور دونوں فریقین میں سے کسی ایک کی بھی نیت بخیر نہیں تھی البتہ تاریخ ایسی بہت سی جنگوں کا پتہ دیتی ہے جو حق نے باطل کے خلاف اس وقت جب ان کا ظلم و استبداد حد سے گذر گیا تو معرکہ آرائی کی۔"

"خیر اس قسم کی جنگ میں حصہ لینا اور ان غیر فطری باطل قوتوں کو مغلوب کرنا عین تقاضائے فطرت ہے۔" اجنبی نے کہا۔

"جی اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس قسم کی جنگوں میں جو افراد شریک ہوتے ہیں وہ سب کے سب اس کی اہمیت اور مغز کو خوب سمجھتے ہیں، اور خوب سوچ سمجھ کر میدان میں اترتے ہیں اور سچے فاتح کا لقب پاتے ہیں۔ حقیقتاً امن و امان کی زندگی میں مسلسل سکون اور تعیش میں وقت گذار کر جو شیطانی خصائل کسی قوم کے عوام و خواص کا جزو بن جاتے ہیں ان کا علاج جنگ کے سوا کچھ نہیں اور ایسے محاربہ میں حصہ لینا عین زندگی ہے۔"

اجنبی نے جیسے کچھ خوش ہو کر کہا "آپ نے کبھی ایسی جنگ میں حصہ لیا ؟"

میں نے ٹھنڈی سانس بھر کر جواب دیا "جی میں نے جنگ میں تو حصہ لیا لیکن ایسی پاک لڑائی میں حصہ لینے کی سعادت میرے نصیب میں نہیں آئی۔"

"تو پھر وہ کس قسم کی جنگ تھی۔"

میں نے اس دوسری جنگِ عظیم کا تذکرہ کیا اور بتایا کہ تھی تو یہ مدافعانہ ہی، مگر فریقین میں دونوں میں سے کسی کی نیت پاک نہ تھی۔ لہٰذا مدافعانہ اور جارحانہ دونوں صورتیں برابر تھیں۔"

"ہوں، تو آپ انہیں رائفلوں سے مسلح ہو کر اپنے ہم جنسوں کا شکار کرنے گئے تھے۔"

"خونریزی کی براہِ راست خدمت میرے ذمہ نہیں تھی بلکہ جو لوگ میدانِ جنگ میں عملی طور پر حصہ لے رہے تھے ان کے لئے رسد رسانی اور دوسرے سامان کی فراہمی کا کام مجھ سے متعلق تھا بلکہ یوں کہئے کہ اس کا ایک وسیع پیمانہ پر انتظام میرے ذمہ تھا۔ اور ہاں ہتھیاروں کے ایک خاص شعبہ کی فراہمی بھی میرے ذمہ تھی۔"

"ایسے ہی ہتھیار۔" اس نے میرے رائفلوں کی جوڑی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہیں نے عرض کیا نہیں، ہاں ایسے ہی ہتھیار، اور ان سے ہزار گنا لاکھ گنا زیادہ مہلک اور تیز رفتاری کے ساتھ چلنے والے":

"ہاں تو میں یہی تو پوچھنے والا تھا کہ آپ کے ہم جنس بڑے مضبوط ہیں، اس شیر سے بھی زیادہ سخت جان! جو ان کے لئے آپ کو بہت زیادہ کارگر ہتھیار استعمال کرنا پڑتے ہیں":

میں ہنس دیا" اب میں آپ کو کیا بتاؤں خیر کبھی بہت ہی ذرا سے صدمہ سے ہمارا ہم جنس ہلاک ہو جاتا ہے، اور جسمانی اعتبار سے شیر تو شیر بیل اور گھوڑے سے بھی کہیں زیادہ کمزور ہے۔ مگر ہاں اور اس شیر کے مقابلہ پر تو صرف جسمانی طاقت اور پھرتی سے مقابلہ ہوتا ہے اور انسان کے مقابلہ پر انسانی فہم و عقل سے مقابلہ ہوتا ہے لہٰذا زیادہ اچھی قوت سے کام لینا پڑتا ہے":

"ہوں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ کے یہاں عقل انسانی کا مقابلہ طاقت سے ہو سکتا ہے کیونکہ جو قوت آپ جنگلی جانوروں کے مقابلہ پر استعمال کرتے ہیں وہی آدمیوں کے":

"اس وقت جب ہمارے مدمقابل انسان ہوتے ہیں تو اس قوت کو صرف کرنے میں ہم کو بہت زیادہ چالاکی کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ فریق مخالف کے پاس بچاؤ کے سامان بھی عقل کی مدد سے ہوتے ہیں لہٰذا ہمیں ہلاکت کے سامان میں بھی زیادہ سے زیادہ عقل سے کام لینا پڑ جاتا ہے":

"بندہ نواز میں سمجھ گیا تھا، ابھی جو چند چیزیں آپ نے دکھلائے ان میں دو مقامات پر پہنچ کر مجھ کو انسانی تباہ کاری کا اندازہ ہوا، اور میں نے سمجھ لیا کہ حضرتِ انسان نے یہاں اپنی قبر آپ کھود دی ہے۔ اور بس یہیں پہونچکر جو رہی سہی آپ کے متعلق اچھی رائے تھی اس قبر میں آپ کے ساتھ دفن کر دی":

"اوہو! میں سمجھ گیا، آپ جاپان کے متعلق کہہ رہے ہیں اس کے دو شہر ہیروشیما اور ناگاسا ہمارے مہلک ترین ہتھیار ایٹم بم کا شکار ہوئے ہیں":

"اور آپ کہتے ہیں کہ انسان نے اس سے بھی زیادہ قوی اور مہلک ہتھیار ایجاد کر لئے ہیں":

"جی ہاں تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ ہائیڈروجن بم اس سے کہیں زیادہ قوی ہے مگر وہ ابھی جنگ میں استعمال نہیں ہوا ہے، اس پچھلی جنگ میں جس کا میں نے تذکرہ کیا ایٹم بم ہی استعمال ہوا تھا":

"تو شاید اب کی مرتبہ جنگ میں آپ اپنے پورے کرہ کو ہی خلا و بسیط سے زائل کر دینگے":

میں جھینپ کر مسکرایا اور اس نے مجھے کچھ قائل سا پا کر کہا "تو اب تو جنگ نہیں ہو رہی ہے اب آپ کے ذمہ کیا کام ہے۔ آپ نے کہا نہیں کہ شہر کے حاکم کی اس حیثیت سے کیا فرائض ہیں":

میں نے بحیثیت حاکم ضلع اپنے فرائض منصبی کی مختصر مگر جامع روئداد پیش کی اور جب یہ بتایا کہ میں انسداد جرائم کی غرض سے مجرموں کو ایک معیاد معین تک قید خانہ میں بند کر دیتا ہوں تو وہ بہت چونکا اور کہا "اوہو! آپ کے یہاں جرائم اس حد تک بڑھے ہوئے ہیں کہ آپ کو انسداد کے لئے خارجی تدابیر اختیار کرنی پڑتی ہیں۔"

میں نے خیال کیا کہ یہ تو کسی داؤ پر پچھڑتا ہی نہیں، اور مجھے اپنی قانون دانی کا زعم تھا، میں نے ایک تجربہ کار وکیل کی طرح بحث سی کرنی شروع کی "دیکھئے جناب بدی بھی سرشت انسانی کا ایک خاصہ ہے اور جب سے آدمی نے اس دنیا میں قدم رکھا یہ مصیبت اس کے ساتھ آئی اور یہاں تک سرایت کر گئی کہ طینت انسانی میں داخل ہو کر رہ گئی اور ابتدائے آفرینش سے اب تک ہماری سوسائٹی کے مصلحین کی تمامتر کوششیں اس کے استیصال کی جانب مبذول رہیں مذہب و حکومت کے سب ادارے اس کی بیخ کنی کرتے رہے۔"

"مگر یہ کیوں؟ ـــــ آخر آپ کے یہاں جرائم کا اتنا ارتکاب کیوں ہے کہ آپ اس جہل مرکب میں گرفتار ہیں کہ بدی سرشتِ انسانی کا ایک خاصہ ہے اور پھر بدی کے انسداد کے لئے مذہب اور حکومت کو ایک ادارہ قائم کرنا پڑا۔"

"مجھے کچھ جواب نہ بن پڑا "دیکھئے اس پر ذرا دیر پہلے بات ہو چکی ہے سوا اس کے کیا کہوں کہ" انسان کی خلقی بدی۔"

"میں اسے نہیں مانتا اگرچہ میں نے بہت کچھ آپ کے متعلق آپ ہی سے دریافت کیا ہے مگر کچھ خود بھی سمجھا ہے اور شاید بہت کچھ کائنات کی تخلیق اور خالق کے منشا کے متعلق پہلے سے بھی جانتا ہوں کسی مخلوق کی خلقت بد نہیں ہو سکتی۔ خالق ہر ایک کو نیک اور اچھا پیدا کرتا ہے، معاف کیجئے یہ آپ کی خود ساختہ سوسائٹی اور اس کے معاشرہ کی تربیت کی خامی ہے کہ آپ کی فطرت میں نقص واقع کر دیتی ہے اور آپ بد ہو جاتے ہیں۔"

میں کچھ قائل سا ہو گیا اور بات بدل کر کہا "کیا آپ کی سوسائٹی ہر قسم کی برائیوں سے پاک ہے؟"

"خیر میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ہم برائیوں سے پاک ہیں لیکن ہم جرم کا ارتکاب عمداً نہیں کرتے۔"

"خیر عمداً نہ سہی سہواً سہی۔ آپ لوگوں سے جرم کا ارتکاب عمل میں آتا ہے، اس کے تدارک کی کیا صورت ہے۔"

"دیکھئے میں اس پر پہلے روشنی ڈال چکا ہوں، اس کے تدارک کے لئے ہمیں کسی خارجی تدبیر کی ضرورت نہیں، فطرت خود بڑی منتظم اور شاید عظیم مصلح ہے، جو سزا قانونِ فطرت کے مطابق ملتی ہے وہ بہت زیادہ

موثر اور اصلاح کرنے والی ہوتی ہے آپ کے یہاں کس قسم کے جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے اور ان کا انسداد کیسے ہوتا ہے؟

میں نے تعزیرات پاکستان کے مندرجہ اہم دفعات سنائیں اور مجملاً ان کی غرض و غایت سمجھائی اور پھر فلسفہ قانون و نفسیات جرائم و سزا پر ایک مختصر سی تقریر کی اور بتایا کہ طینت بشری میں خباثت عجیب پیچیدگی کے ساتھ ودیعت ہے، اور بڑے سے بڑے جرم کے تدارک کی ترکیب اگر محال نہیں تو سخت دشوار ضرور ہے، لیکن اس سلسلہ میں جو قانون ہمارے یہاں نافذ ہے وہ بڑے عقل مندوں نے جو نفسیات انسانی کے ہر پہلو کے محرم تھے۔ بہت غور و خوض کے بعد بنایا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ کم و بیش تمام جرائم کا انسداد جتنا امکان میں ہے ہو سکتا ہے۔

اور اس نے تو تعزیرات پاکستان لفظ بہ لفظ ابھی مجھ سے سن کر یاد کر لی تھی "معاذ اللہ! عجیب عجیب جرائم کا ارتکاب آپ کے یہاں ہوتا ہے! ہوں! آپ کی دنیا بڑی بری مخلوق سے بھری ہوئی ہے لیکن یہ تو بتلائیے کہ ان سب جرائم کے تدارک کے لئے آپ کے یہاں سزائیں بھی مختلف ہیں، دوسری بات یہ بتائیے کہ پھر انسداد کلی کیوں نہیں ہوتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سزائیں پورے طور پر موثر نہیں ہوتیں"۔

"بجز دو مخصوص جرائم کے ہمارے یہاں بقیہ تمام جرائم میں سزا ایک ہی قسم کی ہے، قاتل اور باغی کی سزا تو یہ ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ باقی دوسرے جرائم میں مقید رکھتے ہیں اور مالی تاوان بھی عاید کرتے ہیں اور کبھی کبھی دونوں ساتھ ساتھ بھی کرتے ہیں اور بعض جرائم ایسے بھی ہیں جن میں جسمانی سزا دی جاتی ہے یعنی درے لگاتے ہیں"۔

خیر وہ مالی تاوان والی بھی سمجھ آگئی اور درے والی بھی، اور خیر مان لیا سزائے موت بھی ٹھیک ہی ہے حالانکہ یہ قطعاً غیر قرین فطرت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس مقید رکھنے والی سزا میں آپ کے پاس کیا منطق ہے؟"

"دیکھئے ہماری جتنی سزائیں ہیں وہ کسی نہ کسی اصول کے تحت ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ مالی تاوان اور درے والی سزا اور شاید سزائے موت یہ سب انتقامی ہیں، ان سے مجرم کو تکلیف دے کر یا اس کی زندگی کو ختم کر کے انسداد کرنا اور دوسروں کو عبرت دلانا مقصود ہے مخصوص مدت تک مقید رکھ کر اپنی زیر نگرانی رکھنے میں ہمارا مقصد صرف اصلاح ہوتا ہے"۔

"تو شاید جو مجرم ایک مرتبہ آپ کی قید میں رہ لیتا ہوگا وہ تو فرشتہ ہو جاتا ہوگا"۔

مجھے کچھ جواب بن نہ پڑا۔ میں نے تو پندرہ سالہ تجربہ میں تو بار بار وہی مجرم جو پچھلے سزا یافتہ تھے جیل بھیجے تھے، اور میرا تو اندازہ یہ تھا کہ جو مجرم ایک دفعہ کے بعد دوبارہ جیل نہیں گیا وہ دراصل پولیس

نے بے گناہ پھانس دیا تھا، اور کیا کہوں میرے تجربات میں تو ایسے کیس بھی تھے جو پولیس بے گناہ پھانس دیے اور کافی ثبوت ہونے کے سبب انہیں جیل ہو گئی اور قید کاٹنے کے بعد مستقل طور پر جرائم پیشہ بن گئے۔

"نہیں یہ تو نہیں ہے۔" میں نے بھینسی آواز میں کہا جو مشکل میرے ہی کانوں تک منمنا کر رہ گئی۔

"اور جو سزائیں جسمانی تکلیف مالی تاوان اور عبرت دلانے والی ہیں ان کو دیکھ کر دوسرے آدمی جرائم سے اجتناب کیوں نہیں کرتے؟" اجنبی نے دوسرا سوال کر دیا۔

"کیا بتاؤں" میں نے کہا اور کچھ کہتے بن نہ پڑا۔ اور حلق صاف کرکے آہستہ سے کہا۔ "سوا اس کے کہ اسے ہم آدمی کی روز افزوں خباثت اور بدطینتی پر محمول کریں کیا کہہ سکتے ہیں۔"

"خیر وہ چھوڑیے بیکار بات، ہاں میں تو یہ پوچھتا تھا کہ شاید آپ کے یہاں کسی مجرم کو ایک مدت قید میں رکھنے کے بعد دوبارہ سزا دینے کی تو نوبت آئی نہ ہو گی۔" اجنبی نے کہا اور اب مجھے کہنا پڑا "نہیں برابر آتے ہیں۔"

"تو پھر کیا خاک اصلاح کرتے ہیں آپ؟"

میں کچھ اس گواہ کی طرح ہکلا کر رہ گیا جس کو کبھی کبھی بیان دینے کے بعد شاطر وکیل جرح پر رکھ لیتا ہے کچھ کہے بن نہ پڑا اور جواب دیا "ایسی صورت میں ہماری سزا کا پنجہ شدید تر ہو جاتا ہے یعنی ایک دفعہ کی سزائے قید سے مجرم کی اصلاح نہ ہو اور دوبارہ سزا دینے کی نوبت آئے تو سزا کی مدت بڑھا دیتے ہیں۔"

"خیر میں آپ کا تمام طریقۂ تعزیر سمجھ گیا، لیکن اب یہ بتلائیے کہ اس سے جرائم کا انسداد کلی کیوں نہیں ہوتا؟"

"اور اس کا جواب میرے پاس، شاید سولنِ اعظم کے پاس بھی نہ تھا۔ اجنبی نے کہا۔ "کہہ دیجئے کہ سزا کا غیر موثر اور ناقص ہونا۔"

"خیر پھر آپ ہی کچھ بتائیے کہ دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے جو موثر اور مکمل ہو۔"

"جی، نہ تو میں مقنن ہوں اور نہ آپ کی طرح قانون پیشہ محتسب، لیکن یہ سمجھ گیا کہ آپ کا طریقۂ سزا بھی ناقص ہے اور شاید اسی کے اندر جرائم کے تسلسل اور تواتر کا راز بھی مضمر ہو، ہاں یہ بتلائیے کہ آپ قید میں مجرم کی ضروریاتِ زندگی کے بھی کفیل ہوتے ہیں؟"

"جی بالکل، نہایت قاعدہ کے ساتھ، اور اس سے وہاں جو کچھ کام لیتے ہیں اس میں بھی کوشش کرتے ہیں کہ اسے کسی مفید ہنر پر ڈال دیں اور اس کی تربیت اس طرح کر دیں کہ قید سے آزاد ہو کر یہ اپنی روزی اپنے ہنر کے ذریعہ کما سکے اور جرائم کی جانب توجہ نہ دے۔"

" اور اس کے ان متعلقین کے بھی کفیل ہوتے ہیں جن کی روزی کا بار قید میں جانے سے پیشتر اس کے ذمہ رہتا ہے " اجنبی نے یک دم جیسے گھونسہ سا سوال رسید کیا۔

" میں نے چونک کر کہا " کیوں ان سے کیا مطلب ہم کو !"

" آپ کو نہیں تو کسے مطلب ہو ایں ! جب اُسے ان سے مطلب تھا جس کو آپ نے قید کر دیا اور وہ خواہ چوری سے یا محنت سے جیسے بھی ہو سکتا تھا ان کی روزی کا کفیل تھا تو آپ یوں سمجھئے کہ اس کو قید میں بند کرنے کے ساتھ آپ نے ان کا ذریعہ روزی بھی بند کر دیا ' تو پھر روزی کی ذمہ داری کس پر رہی ؟"

میں پھر کچھ عاجز سا ہو گیا اور کچھ کہتے بن نہ پڑا " جی اب یہ ہم کیا جانیں ؟"

" دیکھئے یہ آپ اسے قید کرنے سے پہلے جانیں ' آپ مصلح ہیں ' اور آپ کی دنیا میں پیٹ بھرنے کے جائز اور ناجائز دونوں ذرائع موجود ہیں ' آپ ایک آدمی کو بقول اپنے اصلاح کے لئے قید کرتے ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے ذمہ جو چار آدمی لگے ہوئے ہیں جائز ہی ذرائع سے اپنا پیٹ بھریں گے ' ساتھ ہی یہ بھی کہتے جاتے ہیں کہ انسان کی سرشت میں بدی کی جانب رجحان ودیعت ہوا ہے تو گمان غالب یہی ہے کہ وہ بھی پیٹ بھرنے کے لئے جرائم کی جانب رجوع ہوں گے اور آپ نے مان لیا کہ ایک مجرم کی اصلاح قید میں رکھ کر کر بھی لی تو اس کی جگہ چار مجرم اور پیدا کر لئے۔ اس سودے میں جناب کو کتنا گھاٹا رہا کچھ اندازہ کیا ؟"

میں نے ہار سی مان کر کہا " اب جو کچھ بھی ہو ' بہر حال یہ ہمارے نظام کی قدرت سے باہر ہے ابھی تک تو بہر حال اس سے بہتر صورت ہمارے امکان میں نہیں "

" بہرصورت یوں کہئے کہ اس سے بدتر صورت کوئی نہیں قبلۂ عالم "

" تو پھر آپ ہی کوئی صورت بتائیے "

" دیکھئے قانونِ فطرت کے نزدیک اصلاح کے ضمن میں خارجی تدابیر بالکل بے کار اور غیر موثر ہیں تعلیم و تربیت اور عمل و مثال سے مجرم کا رجحان جرم بدلنا چاہئے اس طرح جرائم رفتہ رفتہ معدوم ہو جائیں گے۔ آپ کے اصلاحی طریقے ہر پہلو سے ناقص ہیں ' بظاہر امتناعی تدابیر اور عبرتناک سزائیں ایک وقتِ خاص تک موثر ہوتی ہیں لیکن ردِ عمل میں ان کے اثرات بھی الٹے ہوتے ہیں "

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا " میرے پیارے بھائی آپ کو ہماری دنیوی سوسائٹی کا تجربہ نہیں ' ابتدائے آفرینش سے ہمارے مذہبی نظام کی اخلاقی تعلیم ' وقت وقت پر ہمارے معاشرہ اور تہذیب کے تقاضے بھی دہرائے رہے ہیں لیکن بدی کا طوفان رو کے نہیں رکتا ' آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں

کہ اتنی سختی پر یہ عالم ہے ۔"

"کیسی کم وزن باتیں کرنے لگے آپ۔ میں ثابت کر چکا کہ آپ مجرم کی تربیت اور رجحان جرم پر توجہ نہیں دیتے اور جس چیز کو آپ اصلاح کا نام دیتے ہیں وہ اصلاح نہیں عین غیر اصلاح ہے جیسا کہ آپ کا تجربہ خود بتاتا ہے کہ ایک مجرم قید سے آزاد ہو کر پھر ارتکاب جرم کرتا ہے اور جتنے دنوں قید میں رہتا ہے اکثر اوقات اس کے متعلقین اس دوران میں مجرم بن کر اصلاح کے لئے طیار ہو جاتے ہیں، بس یہ طریقہ سزا ہی جرم کے تسلسل و تواتر کا بانی ہے۔ اپنی نوع کو ابتدائے قانون فطرت کے مطابق صحیح شاہراہ پر ڈالئے اور آپ دیکھیں گے کہ گناہ سے رجعت آپ کے خمیر میں ودیعت ہے یا نہیں اور پھر مسکرا کر کہا "اور آپ کی دنیا سے جرم و گناہ ختم ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ شاید آپ کو اپنے کار منصبی سے بھی سبک دوشی ہو جائے گی ۔"

میں نے مسکرا کر جواب دیا "جی نہیں، مجھے سبک دوشی نہیں ہو سکتی۔ میں مال کا کام بھی کرتا ہوں ۔"

"مال کا کام! —— یہ کیا ؟" اس نے کہا۔

"ہوں آپ شاید یہ نہیں سمجھے کہ ہماری کل زمین چھوٹے بڑے حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصہ کسی نہ کسی گورنمنٹ کا ہے، اور جو لوگ گورنمنٹ سے زمین حاصل کر کے اس پر پھل ترکاری، اپنے مویشیوں کا چارہ وغیرہ پیدا کرتے ہیں۔ ان سے مالگذاری وصول کی جاتی ہے۔ میں نے آپ کو ابھی اس مختصر سی سیاحت میں اپنے تمام کرہ پر کاشتکاری کا انتظام دکھایا یا نہیں تو بس آپ سمجھ لیجئے کہ جو آدمی کاشتکاری کرتے ہیں وہ گورنمنٹ کو روپیہ ادا کرتے ہیں جسے مالگذاری آراضی کہا جاتا ہے ۔"

"مگر گورنمنٹ کاشتکاری میں کیا کرنے جاتی ہے جو روپیہ لیتی ہے ؟"

"ارے صاحب غرض کیا نہیں، زمین گورنمنٹ کی ہے اور جو کوئی اس پر کاشت کے ذریعہ فائدہ حاصل کرتا ہے وہ گورنمنٹ کو مالگذاری آراضی دیتا ہے یوں کہئے کہ زمین کا محصول ادا کرتا ہے ۔"

"زمین تو کیا آپ کا کرہ آپ کی گورنمنٹ نے بنایا ہے ؟ !" اس نے طنزیہ کہا۔

میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "نہیں بھائی، زمین اللہ کی ہے اور اللہ نے ہی بنائی ہے مگر ہمیں اپنے نظم و نسق کی سہولتوں اور گورنمنٹ کے بہت سے امور چلانے کے لئے مالگذاری لینی پڑتی ہے جو لوگ اس سے ذاتی نفع حاصل کرتے ہیں وہ اس نفع کا ایک جز گورنمنٹ کو دیتے ہیں تب گورنمنٹ کا کام چلتا ہے ۔"

"لیکن یہ تو سراسر انصاف کے خلاف ہے آپ زمین کو خدا کا بھی بتاتے جائیں اور مخلوق خدا پر

جس کے لئے خدا نے اپنی زمین مفت اور عام بنائی ہے محصول بھی عائد کرتے جائیں۔"

"ارے صاحب وہ اس پر کاشت کاری کرتے ہیں اور اس سے بہت زیادہ نفع حاصل کرتے ہیں۔" میں نے ذرا جھنجلا کے ساتھ کہا۔

"اچھا تو بغیر کاشت کاری کئے ہوئے زمین آپ اپنی قدرتی پیداوار نہیں دیتی ہر کرہ میں پیدا کرنے کی صلاحیت تو فطرت نے بدرجہ اتم پیدا کی ہے۔"

"ارے صاحب ہمارے تو بابا آدم کو اللہ میاں نے ہل بیل دے کر زمین پر اتارا تھا اور کاشت کاری کرنے کا اصول بتا دیا تھا، جتنا اچھا جوتو بوؤگے زمین کو بناؤ سنوارو گے اتنی ہی زیادہ پیداوار زمین دے گی۔"

"تو یوں کہئے کہ آپ پوتڑوں کے بگڑے ہوئے ہیں، حضرتِ آدم نے زمین پر اترتے ہی زمین کو کریدنا شروع کر دیا تھا، اور ہوس میں یک لخت بہت سا فائدہ حاصل کرنے کے لئے اس کی قدرتی طاقت سے زیادہ نکال کر اپنی جھولی بھرنا شروع کی۔ تو پھر مالگذاری، محصول، تاوان جو کچھ کہئے بھگتو گے بچہ۔"

"بھیا! اتنا دکھایا اتنا بتایا سمجھایا پھر بھی خاک نہ سمجھے۔ ہماری دنیا بڑے وسیع نظام میں پھیلی ہوئی ہے بلکہ جکڑی ہوئی ہے یوں کہئے اور ایک گورنمنٹ کے ذمہ ہزاروں شعبہ اور سینکڑوں انتظام ہوتے ہیں اور میں آپ کو اپنا معاشی نظام بتا چکا تو اس تمام کاروبار کو چلانے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہے اور حصولِ روپیہ کا ذریعہ ہمارے ملک میں بلکہ ہمارے کرہ کے بیشتر حصہ پر مالگذاری آراضی ہے، اور کاشت کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ پیداوار زمین سے حاصل کرنا ہی ہماری فلاح و بہبودی کا راز ہے۔"

"اچھا تو یہ تو آپ نے اپنے ملک اور کرہ میں جگہ جگہ شاداب میدان اور ہرے بھرے باغات دکھلائے یہ سب کاشت کے ذریعہ آدمی نے خود اپنے ہاتھ کی محنت شامل کر کے پروان چڑھائے ہیں؟"

"جی اور نہیں تو کیا یہ جنگل ہیں!"

"تو یہ! مجھے تو یہ اندازہ تھا کہ زمین انہیں بہت بخل سے دیتی ہے۔ لیجئے اک نہ شد دو شد! اس میں آپ کے کاشتکار کی محنت کو بڑا دخل ہے، تب کہیں جا کر یہ مٹھی بھر دانے آپ کو مل پاتے ہیں۔"

میں نے کہا "جی ہمارا کاشتکار پورے سال چمٹا رہتا ہے اور سمجھ لیجئے کہ خود مٹی میں مل کر یہ پیداوار حاصل کرتا ہے۔"

"افسوس! آپ نے اپنی زمین کو بھی فطری صلاحیتوں سے ہٹا کر خراب کر لیا ہے، اور پھر زمین بھی آپ کی جھولی میں بھیک سی ڈال دیتی ہے۔"

"تو حضرت کیا آپ کے یہاں کھیتی باڑی کا طریقہ نہیں ہے ؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہم ہوس میں فطرت سے دھینگا مشتی نہیں کرتے۔ اور فطرت ہم کو ہماری جائز ضروریات کے مطابق دے دیتی ہے، ہمیں فطرت کے عطیوں سے نہ آلات ہلاکت بنانے کی ضرورت پیش آتی ہے نہ سامان تعیش مہیا کرنے کی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جب آپ کی گورنمنٹ زمین پر خود کاشت نہیں کرتی تو پھر یہ مالیانہ یا کوئی بھی بدل لینے کا بھلا کیا حق رکھتی ہے ؟"

"عام تحفظ اور سرپرستی کرتی ہے ہماری گورنمنٹ، اور کاشت کاری میں عملی امداد گورنمنٹ کا کام نہیں۔ ملکی نظم و نسق برقرار رکھنا گورنمنٹ کا کام ہے جو بغیر اس مالیانہ کے نہیں چل سکتا۔ اور میں آپ کو اس سے پیشتر بتا چکا کہ ہماری دنیا کے جملہ امور روپیہ کے ذریعہ انجام پاتے ہیں ۔"

"اور آپ کے پاس روپیہ حاصل کرنے کا واحد ذریعہ مالگذاری ہے" اس نے پوچھا۔

"جی واحد ذریعہ تو نہیں، اور بہت سے ذرائع ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہماری دنیا میں بیشتر ممالک کی حکومتوں کا بڑا ذریعہ آمدنی یہی ہے ۔"

"اور دنیا بھر میں کہیں کی گورنمنٹ کاشتکاری میں کاشتکاروں کا ہاتھ نہیں بٹاتی۔ کیا ایک حکومت کے فرائض منصبی میں یہ چیز نہیں ہے کہ وہ کھانے کی اشیاء مہیا کرنے میں ہاتھ پاؤں چلائے ۔"

"میں نے کہا نہیں حکومت کا کام کھیتی کرنا نہیں ہے، تحفظ اور امن عامہ تاکہ ملک میں ہر کام آسانی کے ساتھ انجام پا سکے ۔ میں نے کچھ اس طرح کہا جیسے اپنے کسی نادان دہقان سے کہہ رہا ہوں۔

"اچھا تو پھر کتنا مالیانہ لیتی ہے آپ کی گورنمنٹ ۔"

اور میں نے اجنبی کو اپنے ملک میں مختلف مالگذاری کی شرح اور طریقے بتائے اور بتایا کہ مختلف علاقوں کی آراضیات پر کم و بیش مالیانہ ہوتا ہے، مختلف اجناس کی پیداوار پر شرح کم اور زیادہ ہوتی ہے ۔

"اچھا زمین پر محصول کی یہ شرح ہے، اور ہوا اور سورج کی روشنی کا کیا نرخ ہے ؟" اجنبی نے مضحکہ خیز سا سوال کیا۔

میں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور اجنبی کی جانب غور سے دیکھا کہ شاید مذاق کر رہا ہے مگر اس نے سنجیدگی سے کہا "نہیں ہوا پر ضرور ہونا چاہئے، یہ تو آپ کے لئے زمین سے بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ آپ کو اس کی ہر وقت ضرورت ہے اور آپ کا وجود بہت کچھ اسی پر ہے اور روشنی پر بھی کیونکہ یہ آپ کے کرہ کے قیام کی بانی ہے ۔"

میں نے کہا "نہیں جناب ہوا اور روشنی پر کیا محصول ہوتا۔ البتہ مصنوعی ہوا اور مصنوعی روشنی پر ہمیں

ٹیکس بھی دینا پڑتا ہے "

"یہ کیسی ہوتی ہیں؟"

میں نے دل میں کہا کیا بتاؤں اس بھولی بھالی مخلوق کو" اور کہا" دیکھئے، سیاحت میں میں نے آپ کو بجلی کے پنکھے اور برقی روشنی بھی دکھائی تھی اور آپ اتنی جلدی بھول گئے "

"اوہو! آپ کا مطلب ان جھپاتے قمقموں سے ہے اور شاید ان پنکھوں سے جو آپ کے اردگرد کی ہوا کو متحرک کر دیتے ہیں، اس کو چمکانے اور حرکت میں لانے کے لئے آپ کو خارجی ذرائع استعمال کرنا پڑتے ہیں"

"عجیب چوپٹ مخلوق ہو یار، اور میں نے یہ بڑے بڑے بجلی پیدا کرنے والے پلانٹ دکھلائے تھے یا نہیں، اور ہماری دنیا میں برقی قوت کا ہی تو سارا کرشمہ ہے "

"اوہو! میں سمجھا، مگر شاید آپ واقف ہوں یا نہ ہوں کہ برقی قوت کا سب سے بڑا خزانہ آپ کا جسم ہے اور آپ اس سے کام نہیں لیتے، یہ قوت آپ کے جسم میں بہت مری مری رہتی ہے ہم نے اپنے جسموں کی کہربائی قوت کو اتنا برقرار رکھا ہے کہ ہم میں کا ہر ایک آپ کے بڑے سے بڑے بجلی پیدا کرنے والے پلانٹ سے زیادہ قوی ہے"

مجھے اس کی طاقتوں کا علم تھا، خاموش ہو گیا اور اس نے میری ٹارچ کی جانب غور سے دیکھا، غیر کے شکار میں وہ اس کا استعمال دیکھ چکا تھا۔ اس نے کہا" اور یہ بھی کوئی اسی قبیلہ کی چیز معلوم ہوتی ہے "

"جی ہاں، جی ہاں ـــــ یوں ہی سمجھ لیجئے، اسی اصول پر بنی ہوئی مگر اس سے بہت ہی چھوٹے پیمانہ پر، طاقتوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں "

"تو یہ بھی منجانب حکومت آپ کو دی جاتی ہے اور اس پر محصول لیا جاتا ہے؟"

"نہیں یہ تو میری اپنی خریدی ہوئی ہے اور میرے ذاتی استعمال کی چیز ہے، لیکن جب حکومت اس قسم کے برقی آلات سے روشنی، ہوا، اور مختلف قسم کی حرکت دینے والی طاقتیں منظم کر کے بہم پہنچاتی ہے تو اس کا محصول لیتی ہے۔ اس کا ایک علیحدہ شعبہ ہے، اور صرف یہی نہیں بلکہ شہروں اور مکانوں کی اندرونی اور بیرونی صفائی، حفظانِ صحت اور بیماریوں کی روک تھام اور شفاخانوں کے قیام غلاظت اور گندگی کا دفیعہ وغیرہ بہت سے کام گورنمنٹ کے ایک مخصوص شعبہ سے متعلق ہیں ؛ اور ان سب شعبوں کے قیام کے لئے ہمیں محصول ادا کرنا پڑتا ہے "

"ہاں تو کیا آپ کی دنیا میں قدرتی ذرائع صفائی قیام صحت اور آب و ہوا کو صاف کرنے کے لئے

ناکافی ہیں؟" اجنبی نے تعجب سے پوچھا۔

میں نے جواب دیا "گنجان آبادی میں کافی نہیں اور ان کے لئے آلات اور خاص طور پر صفائی کے لئے آدمیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔"

"آدمیوں کی ضرورت پڑتی ہے! اور آدمی کی غلاظت صاف کرنے والے آدمی ہی ہوتے ہیں، آپ ہی جیسے، آپ کے مساوی انسان۔"

"بھئی انسان سب ہی ہیں، مگر کام کام بٹے ہوئے ہیں، اور آدمی ہونے کے لحاظ سے سب برابر کے ہم جنس مگر کام کے لحاظ سے جدا جدا حیثیت ہے۔"

"یعنی کام کے لحاظ سے جدا جدا حیثیت کیا معنیٰ؟"

میں نے دوحرفی جواب دیا "جیسا جس کا کام ویسی ہی اس کی حیثیت۔"

"تشریح کیجئے۔" اجنبی نے مستفسرانہ انداز نمایاں کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کو وضاحت کے ساتھ اپنا طبقاتی نظام سمجھایا اور بتایا کہ ہمارے بعض پیشے ممتاز اور معزز خیال کئے جاتے ہیں اور کچھ سوسائٹی کی نگاہ میں اتنے ممتاز نہیں ہوتے، بلکہ ذرا حقیر سمجھے جاتے ہیں۔"

"پیشوں کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہونے کا آپ کے یہاں کیا معیار ہے؟" اجنبی نے پوچھا۔

"معیار پوچھتے ہیں تو یہ ہے کہ جن کاموں میں دماغی اور ذہنی قوتیں کام میں لانی ناگزیر ہیں وہ کام اعلیٰ پیشوں میں شمار ہیں اور جن میں جسمانی محنت و مشقت ہوتی ہے وہ ادنیٰ سمجھے جاتے ہیں۔"

اور اجنبی نے ذرا سنبھل کر کہا "مگر یہ معیار تو عجیب سا ہے اور شاید غلط سا کہ دماغی کام کرنے والوں کو جسمانی کام کرنے والوں پر فضیلت دی جائے۔ آخر عزیبوں کا قصور؟"

"اچھا خیر آپ یوں سمجھ لیجئے کہ دماغ جسم کا بادشاہ ہے اور جسم دماغ کے تابع، اس لئے فضیلت ہے۔"

"مگر جناب جتنا جسم دماغ کے تابع ہے اتنا ہی دماغ جسم کا محتاج ہے۔ اور ایک کل تندرست ہستی کے لئے دونوں یکساں طور پر قوی ہونا لازمی ہیں، جسم انسانی میں جتنے اعضا ہیں ان سب کے افعال فطرت نے علیٰحدہ علیٰحدہ معین کئے ہیں۔ اور آپ کی زندگی کے قیام کے لئے ہر عضو کی تکمیل اور تندرستی ضروری ہے پھر یہ امتیاز کیا معنیٰ۔"

"خیر پھر آپ کی رائے میں کیا معیار ہونا چاہئے؟"

"میری رائے میں پہلے تو امتیاز کرنا ہی غلطی ہے۔ خدمات کے لحاظ سے ہر ایک اپنی جگہ پر اہم ہے البتہ سوسائٹی کا جو طبقہ وہ خدمت انجام دے جو نوع بشر کے لئے سب سے زیادہ اہم ہے اس کو پیشہ کے لحاظ سے

فضیلت دی جا سکتی ہے۔ خواہ جسمانی ہو یا دماغی "

"آپ کا معیار تسلیم کر لیا جائے تو ہمارے یہاں صفائی کی خدمت انجام دینے والے، زراعت پیشہ اور دوسری شدید جسمانی محنت کرنے والے ادنےٰ اور رذیل لوگ اعلےٰ طبقہ کے علوم نظری اور فنونِ لطیفہ کے ماہرین سے افضل سمجھے جائیں گے "

"مگر افسوس کہ ان کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے بھی آپ انہیں ادنےٰ اور رذیل کے کریہہ الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ دل ہیں، انصاف کیجئے کہ جو خالص ضروریات کی تکمیل کرے وہ افضل ہے یا جو زواید و فروعات میں وقت صرف کرے وہ افضل ہے "

اس میں شک نہیں، جو طبقہ براہِ راست خالص ضروریاتِ انسانی کی تکمیل کرتا ہے اور جسمانی محنت و مشقت کرتا ہے وہ فطری ضروریات انسانی بہم پہنچاتا ہے، لیکن اس کے کام میں اگرچہ مشقت کرنا پڑتی ہے۔ مگر وہ اس قدر سادہ ہے کہ بہت آسانی کے ساتھ ہر شخص اسے انجام دے سکتا ہے برخلاف اس کے دماغی کام کرنے والے دنیا میں بہت کم ہیں اور اس کی تربیت کے لئے عمر کا ایک حصہ دینا پڑتا ہے۔

"وہ سب کچھ ہے۔ مگر ضروریات خواہ جسمانی ہوں یا دماغی مگر وجود انسانی میں دونوں کی حیثیت نئی ہے، کیا ایک بھوکا سائنسداں کوئی تجربہ کر سکتا ہے، لہٰذا اس کے لئے جو طبقہ روزی فراہم کرے اس کی اہمیت آپ کے معاشرہ میں اس سے کم کس حساب سے ہو گئی "

میں نے جواب دیا "ہمارے گروہ کے ایک بڑے حصہ میں یہ بیداری پیدا ہو چکی ہے اور ایک حد تک ایک مخصوص زاویہ سے آپ کی بات صحیح ہے اور اب سے بہت پہلے بعض اہم مذاہب نے مساواتِ انسانی کی تعلیم دی تھی، لیکن یہ کوئی آسان امر نہیں ہے خواہ ہمارے ملک میں اس قسم کے امتیازات ہزارہا سال سے چلے آرہے ہیں اور اب ہمارا جدید معاشرہ رفتہ رفتہ انہیں ختم کر رہا ہے مگر میرے بھائی یہ ایک دن کی بات نہیں ہے اس کے لئے کئی نسلیں درکار ہیں۔ جب کہیں جا کر کچھ اثرات معمولی زندگی میں رونما ہو سکتے ہیں۔ ورنہ ابھی تک اس برعظیم کی آبادی کے بڑے حصہ میں اسی تفریق کی بنا پر آدمی آدمی سے اس حد تک اجتناب کرتا ہے کہ ایک طبقہ کے ہاتھ کی چھوئی ہوئی چیز ناپاک خیال کرتا ہے "

"توبہ! تو آپ شاید میرا چھوا ہوا ناپاک سمجھیں، اور آپ کا یہ کھٹولا میرے یہاں آ بیٹھنے سے ناپاک ہو گیا ہو "

"نہیں خدا کا شکر ہے کہ میں ان میں سے نہیں ہوں، لیکن برادر مجھ ہی جیسے کروڑوں آدمی واقعی ایسے ہیں جو آپ کے آ بیٹھنے سے اس مچان کو ناپاک خیال کرنے لگتے "

مجھے خمار میں کچھ اعضا شکنی اور دوران سر سا محسوس ہوا، سار یڈان کی ایک ٹکیہ تھیلے سے نکال کر کھائی اور ایک گھونٹ پانی پیا۔ اجنبی نے بڑے غور سے دیکھا اور دریافت کیا " یہ کیا کھایا آپ نے، یہ بھی کوئی تغذیہ ہے۔"

" جی نہیں تغذیہ نہیں، دو تین راتیں جاگتے گذر گئیں، طبیعت میں ماندگی ہے، اس سے رفع ہو جائے گی۔"

" مگر آپ جب سونے کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں تو اس کے کھانے سے وہ ضرورت کیونکر رفع ہو سکتی ہے۔"

" دیکھئے یہ دوا ہے، اور سونے کی ضرورت کو رفع کرنے کا موقع نہیں ہے لہٰذا اس دوا کے ذریعہ وقتی طور پر سکون ہو جاتا ہے۔"

" یہی تو میں پوچھتا ہوں آرام کرنے کے علاوہ اس میں کیا چیز ہے جو سکون مہیا کر دیتی ہے۔"

" دیکھئے مسلسل حرکت اور محنت کے بعد آرام نہ کرنے سے ہمارے جسم میں ایک کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسے ہم تکان، بے چینی کہتے ہیں اور ایسی کیفیت میں ہمارے قویٰ آرام چاہتے ہیں جس کے بعد ہم تازہ دم ہو کر مزید محنت کے لئے طیار ہو جاتے ہیں اب اگر آرام کا وقت نہیں ہے تو آپ یوں سمجھئے کہ ہمارے جسم میں قوت کا ایک محفوظ ذخیرہ چھپا ہوا موجود رہتا ہے لہٰذا اس قسم کی دوائیں ہماری اس محفوظ قوت کو بروئے کار لا کر وہ تکان دور کر دیتی ہیں۔ اور ہم بغیر ہی آرام کئے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔"

" لیکن یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اپنے محفوظ ذخیرہ کو خرچ کرو جب یہی چیز بغیر اس کے آپ کو حاصل ہو سکتی ہے، صرف آرام کے لئے تھوڑا وقت نکالنے سے اور جب سب ذخیرہ ختم ہو جائیں گے تو کیا کریں گے آپ؟"

" آپ ٹھیک کہتے ہیں ـــــــ لیکن یہ ہمارا روزمرہ کا تکان دور کرنے کا ذریعہ تھوڑی ہے، وقتی ضرورت کے لئے ہے جب آرام کرنے کو وقت نہ مل سکے، اور ہمارے اطباء بھی ایسی چیزوں کے استعمال کے مخالف ہیں۔"

" اطباء کون؟"

میں نے مختصر الفاظ میں اطباء کے متعلق بتایا، اور دریافت کیا کہ آپ کے یہاں اور علوم کے ماہرین تو ہیں نہیں کیا اچھے اطباء بھی نہیں ہیں؟

" ہمارے یہاں ہر فرد اپنی جگہ پر طبیب حاذق ہے۔ آپ یوں سمجھئے۔"

" یہ تو عجیب بات ہوئی ابھی آپ کے یہاں حکیم و ڈاکٹر ہی بستے ہیں۔"

"میں نے عرض کیا نہیں ہم لوگ قانونِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں اور ایسی مخلوق کو طبیب کی ضرورت ہی نہیں ہو سکتی یا دوسرے لفظوں میں قانونِ فطرت پر چلنا ہی سب سے بڑا طبیب ہوتا ہے۔ اچھا خیر تو آپ کے یہاں طبیب کا ایک علیحدہ فرقہ بن گیا ہے۔ یقیناً آپ کی دنیا میں ان کی شدید ضرورت ہوگی۔"

"ضرورت! ارے صاحب یہ فرقہ ہمارے معاشرہ میں سب سے اہم رکن خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے بھی مختلف شعبے ہیں ایک شعبہ مزاجِ انسانی اور بیماریوں کے اثرات کے مطابق مختلف ذرائع سے جدید انکشافات کرتا ہے اور بیماریوں کے دفعیہ کے لئے دوائیں اور دوسرے ذرائع دریافت کرتا ہے اور دوسرا شعبہ براہ راست ہر مریض پر اس کی حالت کو دیکھ کر ان چیزوں کو استعمال کرتا ہے اس طرح بیماریوں کی روک تھام اور دفعیہ ہوتا ہے۔"

"اچھا خیر! مان لیا — تو پھر یہ کام آپ کے یہاں کب سے ہو رہا ہے؟"

"کب سے؟! جناب جب سے ہماری دنیا وجود میں آئی تبھی سے، اور زمانہ کے ساتھ ساتھ جہاں ہمارے معاشرے کے اور تمام شعبوں میں ترقی ہوئی ہم نے اس میں بھی ترقی کی بلکہ آج فخر کے ساتھ ہم سر بلند ہو کر کہہ سکتے ہیں کہ اس شعبہ میں اکثر دوسرے شعبوں سے زیادہ ترقی کی۔"

"لیکن اس میں تو ایک مخصوص حد تک ترقی کی گنجائش ہے اور پھر اس شعبہ کو آپ کے یہاں عضو معطل اور بیکار ہو کر ختم ہو جانا چاہئے۔"

"کیوں جناب" میں نے ذرا ترچھی گردن کرکے کہا۔

"یوں جناب کہ دفعیہ اور روک تھام کے لئے جب آپ کے معاشرہ کا ایک بڑا عضو کام کر رہا ہے۔ اور آپ کہتے ہیں کہ آپ نے اس شعبہ میں اکثر دوسرے شعبوں سے زیادہ ترقی کی ہے تو پھر آپ کی دنیا سے تمام بیماریوں کا استیصال ہو جانا چاہئے۔"

"جی تھیوری تو یہی ہے، اور صاحب ہم نے بعض وبائی پھیلنے والی بیماریوں کو اپنے یہاں سے تقریباً جڑ سے کھود دیا ہے۔"

"تھیوری تو آپ کی بڑی امید افزا اور روشن نتائج نکالتی ہے لیکن پریکٹس کیا ہے؟ آپ کے یہاں موت کی بڑی وجہ بیماری ہے اور ابھی آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کی دنیا میں آدمی چالیس سال سے زیادہ زندہ نہیں رہتا۔ بندہ نواز ہمارے یہاں حشراتِ الارض کی عمریں بھی اس سے کہیں زیادہ ہیں خیر چھوڑیئے آپ کے یہاں عمر کا اوسط چالیس سال ہے اب یہ بتایئے کہ آپ کے یہاں تندرست اشخاص

کا اوسط کیا فیصدی ہے؟

میں نے اسے اپنی دنیا کا یہ اوسط بھی بتا دیا۔

اور اس نے تحقیر کے ساتھ کہا "اے فطرت کے باغیو! ــــ اور اس پر اپنی طبی ترقی کی ڈینگیں مارتے ہو۔ اور اپنے حفظانِ صحت کے اصولوں پر فخر کرتے ہو، معلوم ہوگئی آپ کی طبی قابلیت کی رسائی ــــ آپ کی طب آخر کن اصولوں پر چل رہی ہے؟"

میں نے اسے بتایا کہ ہمارے یہاں تو اس سلسلہ میں مختلف مکتبِ فکر کے طبیب ہیں اور سب کے اصول علیحدہ علیحدہ ہیں کسی ایک میں ایک نظریہ قائم کر کے تحفظِ صحت اور دفعیۂ امراض کی صورتیں بنائی گئی ہیں اور دوسرے میں بالکل اس کے متضاد اصولوں سے انہیں نتائج پر پہنچے ہیں۔

"لیکن جب غائت ایک ہے تو اصول متضاد کیسے ہو سکتے ہیں؟"

"ہاں بظاہر یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے لیکن تجربات یہ بتاتے ہیں کہ تمام اصول صحیح ہیں کیونکہ ان میں سے جو بھی طریقۂ علاج اختیار کیا جائے کامیاب ہوتا ہے۔"

"مگر تجربات سے یہ کب ثابت ہوتا ہے اگر اصول صحیح ہوتے تو امراض کی کثرت صحت کی کمی اور مدتِ حیات کی قلت کیوں ہوتی۔"

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب طبی اصولوں کی خلاف ورزی ہے، ورنہ ہماری طب کا تحقیقاتی سرمایہ جو نوعِ انسان کے اعلٰے ترین دماغوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے اور مسلسل تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ غلط اصولوں پر مبنی ہے؟"

"دیکھئے جناب کسی اصول کی صحت یا غلطی کا معیار نتیجہ ہے۔" اس نے نہایت ترش تیوروں سے کہا۔

"تو پھر یوں تو علوم نظری نے ہر چیز کے متعلق جو نتائج قائم کئے ہیں وہ کبھی کبھی غلط ثابت ہو جاتے ہیں تو پھر اس طرح تو آپ ہمارے تمام علوم کے دفتر دھو کر پھینک دیں گے؟"

"یہ تو میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ نتائج کی ناکامیابی ہمیشہ اصول کی ہی غلطی نہیں ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ اصول صحیح ہو لیکن سہواً اس کے اطلاق میں رد و بدل ہو گیا ہو۔ لیکن آپ کے علمِ طب کے نتائج اتنے مایوس کن ہیں کہ اس کو دیکھتے ہوئے اصول کی غلطی کی جانب رائے جھکتی ہے، بجائے اس کے کہ اس کو عمل کرنے والوں کی غلطی یا نافہمی کہا جائے۔"

"خیر تو کیا آپ کی دنیا میں کوئی مریض نہیں ہوتا؟" میں نے باقاعدہ سوال کر ہی دیا۔

"کبھی کبھی بیمار ہوتے ہیں ہم بھی! ــــ لیکن اس کے وجوہات اصولِ فطرت کی خلاف ورزی

ہوتے ہیں اگرچہ اصول فطرت کو توڑنا خود ہماری خلقت کے منافی ہے پھر بھی کبھی کبھی یہ بھی واقع ہو جاتا ہے:

"تو پھر آپ کس قسم کا علاج کرتے ہیں؟" میں نے سوچا لاؤ لگے ہاتھوں ان سے ایک آدھ مجرب نسخہ ہی اینٹھ لوں۔

"علاج! علاج وہی ——— یعنی جو اصول توڑا تھا اس کو فوراً اختیار کر لیتے ہیں:"

"اور اگر زیادہ بیمار ہو گئے اور مستقل مضرت پہنچ گئی تب؟"

"اگرچہ بات اتنی بہت کم بڑھ پاتی ہے، کیونکہ ایسی صورت میں ہم کو دو سیدھے راستوں میں ناہمواری پیدا کرنا ہوتی ہے ایک اصولِ فطرت کی خلاف ورزی اور دوسرے اپنی خلقت اور جبلت سے بغاوت، لیکن اگر یہ نوبت آجاتی ہے تو ہمارے یہاں ایسی مثالیں موجود ہیں کہ اس کا علاج پورے طور پر فطرت کے توی ہاتھ کی دسترس سے بھی باہر ہو جاتا ہے اور پھر پاداش بھگتنی پڑتی ہے:"

میں نے کہا "خیر دوا علاج کے معاملہ میں آپ بہت سستے چھوٹ جاتے ہیں" اور دل میں خیال کیا کہ ہمارے یہاں کے ڈاکٹر علاج شروع کرنے سے پہلے تشخیص مرض ہی میں کفن تک کے پیسے جیب سے سونت لیتے ہیں ——— اور کہا "خیر لیکن آپ ایک بڑی چیز سے محروم ہیں، ہم کو ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک طب کے ذریعہ علم خواص الاشیاء ملتا رہا۔

"علم خواص الاشیاء ———! ——— "میں اچھی طرح سمجھا نہیں ذرا اس کی تشریح کیجئے:"

"لکھو کھا قسم کی چیزیں ——— جو ازالۂ مرض اور تدارک کے سلسلہ میں ہمارے استعمال میں آتی ہیں ان کی ماہیت اور مزاج اور خواص کا علم، یعنی فطرت کے وسیع خزانہ میں بہت سی چیزوں کے متعلق معلومات ہم کو طب کے ذریعہ ہوتی ہے:"

"دیکھئے ——— یوں تو ہم فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں، لہٰذا فطرت کا ہر راز ہم پر روشن ہے بلکہ وہ ہمارا اپنا راز ہے، اور ضرورت کے وقت ہم کو از خود معلوم رہتا ہے:"

میں نے دل میں کہا "عجیب آدمی ہے، باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چودہ طبق روشن ہیں:" کیوں صاحب اس میں شک نہیں کہ آپ کو بہت سے بلکہ شاید تمام ذہنی اور جسمانی عوارض سے نجات ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پھر زندگی بے کیف، یک رخی اور پھیکی پھیکی گزرتی ہوگی۔ نہ کوئی کاروبار، نہ مشغولیت، نہ ناکامی اور ناکامی کے بعد کامیابی، تلخی کے بعد شیرینی کی لذت ——— اور شیرینی کے بعد تلخی کا مزہ:"

"نہیں خیر یہ تو آپ کے خود ساختہ مفروضے ہیں ——— اور جہاں تک ہماری زندگی کے متعلق آپ نے سمجھا ہے وہ بھی ٹھیک نہیں ہے، ہمارا ہر لمحہ مصروفیت میں گزرتا ہے اور ہماری مصروفیتیں ہمیں مشغلے خالق ہیں،

نہ کہ آپ جیسی موضوع ــــ"

"ہاں تو میں یہی تو معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی وہ مصروفیتیں کیا ہیں؟ ــــ لباس سے بے نیاز، مساکن کی ضرورت نہیں، حتےٰ کہ خوردنی اشیاء سے بھی مستغنی ــــ نہ کوئی نظام مملکت اور امور سیاست، جرائم سے پاک، جسمانی امراض سے محفوظ، تعلیم و تربیت کی ضروریات سے بالاتر، مذہبی پابندیوں سے آزاد، جنگ و جدل سے کوسوں دور، بار بار میرے اندر سے یہی سوال اٹھتا ہے کہ پھر کوئی تو چیز ہونی چاہئے جس کی تلاش اور خواہش آپ کے وجود و قیام کا بہانہ ہو، اور آپ کی زندگی اور وقت کٹے۔"

"کیا عرض کروں میرے بھولے میزبان، کاش کہ آپ ایک مرتبہ کو میرے مہمان ہوں اور ہماری دلچسپیوں اور مشاغل میں ایسے کھو کر رہ جائیں کہ آپ اپنے اس بگڑے ہوئے بلکہ یوں کہئے کہ بگاڑے ہوئے خاکی کرہ کی ساری دلفریبیاں بھول جائیں۔ اب سوا اس کے میں یہاں اتنی دور بیٹھے بیٹھے آپ کو اور کیا سمجھا سکتا ہوں کہ ہر لور ان تمام ضروریات سے بے نیاز رکھنے کے لئے ہم ہمہ وقت ایک مسلسل کوشش میں ہیں، اور یقین مانیئے بڑا دلچسپ اور پیارا مشغلہ ہے۔ اور یہ جو آپ بار بار وقت کٹنے والی بات پوچھتے ہیں، اس سے بہتر وقت اور کیا گذر سکتا ہے۔"

"دیکھئے آپ کے یہاں جانے کو بھلا کس کا جی نہ چاہے گا۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ آپ کے یہاں جانا جیتی زندگی جنت کی سیر کرنا ہے، مگر آپ کا مہمان ہونے میں میرے پیش نظر چند ناگزیر مجبوریاں ہیں، آپ ایسا کیجئے کہ اپنی زندگی کا ایک عکس نقشہ ہی پیش کرکے مجھے کچھ تفصیل بتا دیجئے۔"

"یہ کیا؟" اس نے سوال کیا۔

میں نے بتایا کہ ہر مادی چیز جو دیکھنے میں آسکتی ہے اس کی بجنسہٖ نقل یا بعض آلات کے ذریعہ اس کا جوں کا توں نقش یا تصویر اور کیفیات کی تفصیل جو زباں سے بیان نہ ہوسکتی ہوں کاغذ پر جیسی کی تیسی پیش کرنے کو نقشہ یا عکس یا تصویر کہتے ہیں۔ اس صورت میں اس چیز یا اس کیفیت کا ایک حد تک ہمارے سامنے ذہنی یا عینی منظر آسکے۔

"دیکھئے یہ میرے نزدیک بہت ہی معمولی چیز ہے، لیکن جب آپ نے ایک چیز دیکھی ہی نہیں یا ایک مخصوص شعور آپ کے اندر موجود ہی نہیں تو پھر اس کا نقشہ یا تصویر آپ کیا خاک سمجھیں گے۔ حالانکہ آپ کو بھی فطرت نے یہ تمام چیزیں ہم سے کم عطا نہیں کی تھیں لیکن تم نے اپنے اندر ان کی حفاظت کی اور آپ نے ازالہ کر دیا۔ البتہ آپ کو اپنے یہاں سے جاکر چشم دید سیر کرا سکتا ہوں، اگرچہ مجھ کو اس میں بہت کام کرنا پڑے گا۔ اور تھوڑی سی تکلیف آپ کو بھی ہوگی۔ سو آپ کبھی ذکر و فکر اور کار منصبی کا حیلہ درمیان میں لائے

ہیں یا شاید ڈرتے ہیں اور نہ معلوم کیا کیا وسوسے دل میں لاتے ہیں :

" دیکھئے تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے۔ یوں بھی جب ہم سفر پر نکلتے ہیں تو تھوڑی بہت تکلیف لازمی ہوتی ہے، اور جس کے یہاں مہمان ہوتے ہیں اس کو بھی ہماری مہمان داری میں تھوڑی سی تکلیف ہوتی ہی ہے "

" تو پھر بسم اللہ، کیا دیر ہے " اور جیسے ایک پُر خلوص میزبان ساتھ لے جانے کے لئے تواضع میں ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہے۔ . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

اور میں تو ایک عجیب سے عالم میں پہنچ گیا، پہلے تو مجھے جیسے اپنا ماحول حتیٰ کہ خود اپنا وجود نامانوس سا معلوم ہوا۔ اور جب ذرا سنبھل کر زیادہ تمیز کیا تو کچھ عجیب بیگانگی اور اجنبیت کا سا احساس رفتہ رفتہ تیز تر ہو رہا تھا۔ اور ذرا سا وقت گذرنے پر جسمانی طور پر بھاری پن محسوس ہونا شروع ہوا . . . . . . . . اور میں بڑھتا رہا۔ ہوا، روشنی اور شاید وقت کی رفتار سے بھی تیز تر جس کا ساتھ دینا میرے شعور اور حس سے باہر سا تھا، جیسے یہ سب کچھ میرے تاثر کی گرفت سے باہر تھا اور صرف محسوسات کے ذریعہ اس کی مبہم اور دھندلی دھندلی سی کیفیت سمجھ میں آ رہی تھی کچھ اس طرح جیسے جو کچھ شعور کی گرفت آجاتی ہے۔ وہ آتے ہی معدوم ہوتی جاتی ہے . . . . . . . . . . . . . . . اور یہاں تک کہ یکدم جیسے میری لاسہ بر روئے کار آگئی۔ اور میں نے صریحاً محسوس کیا کہ میرے قدموں میں بوجھ سا ہے . . . . . . . کہ جیسے میرے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ اور میں نے اندازہ کیا کہ میرے جسم پر شکاری زین کا سوٹ! جیسے بھاری لوہے کا خول منڈھا ہوا ہے . . . . . . . . . . ایک جھرجھری سی لی اور پاؤں پٹخے ۔ گویا میں یہ کرہی نہ سکا اور بار جوں کا توں بلکہ فزوں تر ہوتا رہا؛ اب میں نے اپنے دائیں بائیں گردن موڑی اور نیچے دیکھا۔ کیا پاؤں میں فیل کا مرض ہو گیا ؟ اور ہاتھوں بازوؤں کو فالج مار گیا ! ؟ ——— آخر جیسے بھی ہوا چند قدم چلا، سر پر محسوس ہوا کہ دو من وزن کی گٹھری لدی ہے، اور جب ذرا گردن ہلا کر معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کیا وبال ہے تو شاید اندازہ ہوا کہ شکاری ٹوپی ہے . . . . میں چلتا رہا . . . . . مگر ایسے جیسے کوئی اور چلا رہا ہے، سمجھنے کی تمام قوتوں کو بروئے کار لایا تو بس اتنا سمجھا کہ وزن ہی وزن، ماحول بھاری، فضا وزنی ——— دنیا بوجھل اپنا وجود بار ——— اب اور زیادہ سمجھنے کی کوشش کی تو جیسے اتنا سمجھ میں آیا کہ اتنا بوجھ باندھ کر چلنا دوبھر ہو رہا ہے۔ ذرا سستا لوں ——— اور میں بیٹھ گیا یا بڑھتے بڑھتے بوجھ نے مجھے دبا سا دیا۔ اور پسینہ پونچھنے کے لئے جیب سے رومال نکالا، جیسے لٹھے کا پورا ایک تھان میرے ہاتھ میں آگیا۔ پسینہ پونچھ کر محسوسات نے تاثرات کا روپ بدلا اور معلوم ہوا کہ آگے پیچھے، دائیں بائیں، اوپر نیچے ہر طرف سے شدید

بار سا پڑ رہا ہے۔ اور سانس بندسی ہوتی جارہی ہے جیسے نزاع طاری ہے۔ اور یہ میرے گناہوں کی گٹھری ہے۔ ایسے وقت میں خدا یاد آیا۔ منہ سے کلمہ طیبہ پڑھا مگر وہ تو میں خود بھی نہ سن سکا۔ . . . . . . . . . عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ خیال آیا کہ قیامت کے روز اپنے کان زبان آنکھ ناک سبھی گواہی دینگے —— مگر میری گواہی کے لئے میرے اپنے کان بھی طیار نہ ہو سکے۔ —— اور کان بے چارے کیا گواہی دیں گے . . . . . . جب زبان ہی پیدا نہیں دیتی . . . . . . . . . اور زبان بے چاری کہاں سے ساتھ دے . . . . . . . . . یہاں تو سانس ہی بند ہے . . . . . . . . اور لاکھوں من بوجھ میں رونگٹا رونگٹا گرفتار ہے . . . . . . . . . . اور موت سر پر سوار . . . . . . اور میں نے محسوس کیا کہ خدا کا شکر ہے کہ زبان، کان، آنکھ ناک سب کچھ میرا ساتھ چھوڑ گئے ہیں مگر میرے دماغ میں احساس تو ہے . . . . . . . . . اور اللہ! تو عالم الغیب ہے، مقلب القلوب ہے۔ دل کی آواز سنتا ہے —— اور ناظرِ حقیقی ہے —— تیرا یہ عاصی، مجبور، مقہور بندہ جو دیارِ غیر میں دم توڑ رہا ہے، ایسا بے بس کہ ایڑیاں رگڑنے سے بھی عاجز! تیرے سامنے اپنی سیاہ کاریوں اور گناہوں کی معافی مانگتا ہے، اور تجھ پر اور تیرے حبیب پر ایمان رکھتا ہے، اور تیرا ہی سہارا تلاش کرتا ہے میرے عصیاں کا بار کم کر۔ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ میرے سینے سے نکلا اور میں نے جیسے سہارے کے لئے بڑے دور سے ہاتھ پھیلائے۔ اور میرا ہاتھ تو سہج ہی کسی چیز سے ذرا زور کے ساتھ مس ہوا —— تب یکدم ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا —— اور میرے شکاری تلی نے میرا پنجہ چھوڑ دیا۔ اور ذرا خشمگیں سی آواز میں محاسبہ سا کرتے ہوئے بولا "اے سرکار! ستم کر دیا —— شیر کا موقع! اور جہاں کے تہاں سو کر رہ گئے۔ اور یہیں پڑے رہے تمام رات!! حیرت کے مارے میرے لب بند تھے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا، درخت کی جڑ سے لگی ہوئی نرم نرم گھاس کا دبا ہوا بستر میری پوری لمبائی چوڑائی میں چت پڑ کر ایک نیند سوتے رہنے کا گواہ تھا، میری اسٹک چیئر بائیں جانب ایستادہ تھی اور کتاب THE MARS دائیں جانب جو دو تین روز سے میرے زیرِ مطالعہ تھی کھلی پڑی تھی۔ سامنے بکرا بدستور بندھا منمنا رہا تھا۔ . . .

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

. . . . . . . . . . . . . . . . . . . . . .

# خاص نمبر ۵۷ء

# "نقش"

ادبی اضافوں کے اعلان کے جواب میں جو حوصلہ افزا خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ان کے پیش نظر ادارہ نقش نے فیصلہ کیا ہے کہ اگست ۵۷ء میں نقش کا خاص نمبر شائع کیا جائے جو منتخب افسانوں کے علاوہ مندرجہ ذیل ادبی اضافوں پر مشتمل ہوگا۔

- منتخب افسانوں میں بیس صفحات کا اضافہ
- نظموں اور غزلوں کا انتخاب
- علمی اور ادبی مضامین کا انتخاب
- معیاری رسائل سے اداریوں کا انتخابی خلاصہ
- سخنہائے گفتنی کے عنوان سے ایک افتتاحیہ

یہ خاص نمبر ہمارا ایک تجربہ ہے اور اگر ہماری مزید حوصلہ افزائی کی گئی تو مذکورہ عنوانات کو مستقل کر دیا جائے گا۔ —— خاص نمبر تقریباً سوا سو (۱۲۵) صفحات پر مشتمل ہوگا۔

## قیمت —— ایک روپیہ

## ناظم نشر و اشاعت "نقش" پوسٹ بکس نمبر ۷۴۰۲ کراچی ۳

فون نمبر ۷۰۱۵۶

# اندھی گلیاں

شوکت صدیقی

# ا

گلی کے نکڑ پر میونسپلٹی کی لالٹین جل رہی تھی، جس کی دھندلی روشنی میں محلے کے کچھ لڑکے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا راجہ تھا۔ اس کا حلیہ فلم ایکٹروں سے ملتا جلتا تھا۔ بڑے بڑے الجھے ہوئے بال، جس کی ایک لٹ ہر وقت ماتھے پر پڑی رہتی پھٹی ہوئی قمیص اور بوسیدہ پتلون۔ گلے میں ریشمی رومال بندھا تھا۔ وہ اس وقت بڑے ٹھاٹھ سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ ملی جلی آوازوں کے شور میں وہ بار بار چیخ کر کہتا۔

"کہو استاد کیسا جمیہ کیا۔"

"ابے یہ رہا اکّا، واہ میری جان میں تیرے قربان۔"

"سالے آج تم کو ہرا مار دوں گا۔"

اور یہ واقعہ ہے کہ وہ برابر جیت رہا تھا۔ اس کے مقابلے پر شامی تھا۔ وہ دبلا پتلا لڑکا تھا مگر اس کی آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی۔ مزاج کا بھی تیز تھا۔ ایک بار جب راجہ سب کی نظریں بچا کر پیر کے نیچے سے تاش کا پتّہ نکال رہا تھا تو شامی کی نگاہ وہاں پہونچ گئی۔ وہ فوراً چلایا۔

"دیکھ لیا، دیکھ لیا، سالے یہ بے ایمانیاں کرتے ہو۔"

راجہ کھسیانا ہو کر ہنسنے لگا "ابے کچھ دماغ خراب ہوا ہے۔"

شامی ضد کرنے لگا "تم نے ابھی پیر کے نیچے سے پتّا نکالا ہے۔"

راجہ اپنی بات پر اڑا رہا تو شامی نے تاش فرش پر پھینک دیئے اور رُوٹھ کر بیٹھ گیا۔ راجہ اسکو چھیڑنے لگا۔ بار رہے ہو تو رونے لگے۔"

وہ کہنے لگا "تم بے ایمانی کرتے ہو۔ میں اب نہیں کھیلوں گا۔"

راجہ زبردستی پر اتر آیا "کھیلوگے کیسے نہیں۔ داؤں دے کر جانا پڑے گا۔" یہ کہہ کر اس نے شامی کا

گریبان پکڑ لیا۔ شامی نے جھٹکا دے کر گریبان چھڑانا چاہا تو وہ جڑ سے پھٹ گیا۔ ایک بارگی شامی کو تاؤ آ گیا۔ اس نے منہ بسور کر راجہ کی جانب دیکھا۔ اور زنّاٹے کا ایک ایسا ہاتھ راجہ کے گال پر دیا کہ اس کے کان بج اٹھے اب راجہ بھی جھلا کر اس پر جھپٹا اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔

لڑکے اب دو ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک ٹولی راجہ کی حمایت میں تھی۔ اور دوسری شامی کو للکار للکار کر اس کی ہمت بڑھا رہی تھی۔ شامی تھا تو مریل سا مگر اس کے دبلے پتلے جسم میں بڑا کس بل تھا۔ شروع میں راجہ نے ٹنگڑی لگا کر اس کو پٹخنی دی تھی۔ مگر ایک بار شامی نے کچکچا کر زور لگایا تو راجہ سے سنبھلا نہ گیا اور وہ دھڑام سے نیچے آ گیا۔ شامی جھٹ اس کے سینہ پر چڑھ بیٹھا اور گردن پر گھٹنا رکھ کے دو تین گھسّے جو دیئے تو راجہ چیں بول گیا۔ لگا غیں غیں کرنے۔

اسی وقت گلی میں ایک سایہ نمودار ہوا۔ جب وہ روشنی میں آیا تو لڑکوں نے دیکھا کہ کالے صاحب آ رہا تھا۔ وہ اس وقت بہت تھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ اور چلتے وقت اس کے قدم بوجھل دکھائی پڑتے تھے۔ اس کو دیکھتے ہی لڑکوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ کالے صاحب نے قریب آ کر راجہ اور شامی کو گتھم گتھا دیکھا۔ تو دونوں کو ڈانٹنے لگا۔ بڑی مشکل سے اس نے دونوں کو علیحدہ کیا۔ ان کی قمیصیں جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھیں، چہرے خاک میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اور سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ کالے صاحب ان کو چھڑا کر آگے بڑھا تو سارے لڑکے اس کے پیچھے لگ گئے۔ وہ تالیاں بجا بجا کر چیخ رہے تھے۔

"کالے صاحب، ٹوٹ گئی بوتل اڑ گیا کاگ"

کالے صاحب چلتے چلتے ٹھہر جاتا۔ بار بار لڑکوں کو ڈانٹتا۔ کبھی ان کو دھمکانے کے لئے جھپٹتا۔ لڑکے اسکو پلٹتے دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ پھر اکٹھا ہوتے اور تالیاں بجا بجا کر کالے صاحب کو چھیڑتے۔ وہ گلی کے اندر دور تک شور مچاتے چلے گئے۔ میونسپلٹی کی لالٹین کے پاس اب صرف راجہ، شامی اور نوشارہ گئے تھے۔ راجہ کھسیانا کھسیانہ دکھائی پڑ رہا تھا۔ وہ محلے کے سارے لڑکوں کا سرغنہ تھا اور اس وقت سب کے سامنے اس کی کرکری ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے درست کیا۔ ایک مڑی تڑی سگریٹ نکال کر سلگائی۔ دو تین لمبے لمبے کش لگائے اور پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپیہ نکالا اور نوشا سے بولا۔

"تجھے سینما چلنا ہے؟"

نوشا کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں کہنے لگا "ابے کونسی پکچر دیکھے گا؟"

راجہ جو شامی سے اب انتقام لے رہا تھا، اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "آج تو یار لوگ سنبادکا جہاز دیکھیں گے۔ واللہ تم وہ فسٹ کلاس پکچر ہے کہ لطف آ جائے گا۔"

نوشا نے ڈرتے ڈرتے شامی کی سفارش کی: "اور شامی کو نہیں لے چلوگے ؟"

راجہ بگڑ کر بولا: "چلنا ہے تو ویسی بات کر ورنہ جا اپنی ایسی کی تیسی میں۔"

نوشا خوشامد کرنے لگا "یار تو تو سچے پر ہاتھ ہی دھرنے نہیں دیتا۔ بس ذرا سی بات میں ہتھوں سے اکھڑ جاتا ہے۔"

راجہ ذرا نرم پڑا تھا کہ شامی اس پر غرّایا "دیکھ بے تجھے سینما جانا ہو تو جا، میرا ذکر مت کر میں تو گھر جا کر سوؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ چل دیا۔

نوشا نے اس کو ٹوکا: "ابے سن تو۔"

مگر اس نے ایک نہ سنی اور آگے بڑھتا چلا گیا۔ راجہ کہنے لگا "جانے دے سالے کو۔ دیکھ لینا اب کبھی اس کو ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ ایک نمبر کا نیاں ہے۔ لے کر سالے نے گردن ہی ڈالی۔" وہ ہاتھ سے آہستہ آہستہ گردن کی جلد کو سہلانے لگا۔

اس کے بعد دونوں باتیں کرتے ہوئے سینما ہاؤس کی طرف چل دیئے۔

آدھی رات کے قریب جب دونوں بغداد کا چور دیکھ کر لوٹے تو گلی بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سناٹا تھا۔ میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے ایک خارش زدہ کتا، بری طرح اپنی پیٹھ کھجا رہا تھا۔ جب دونوں اس کے قریب سے گزرے تو راجہ نے کتے کے ایک ایسی زور کی لات ماری کہ وہ ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا ہوا بھاگا۔ اس کی چیخوں سے ساری گلی گونج اٹھی۔ نوشا جو پہلے ہی سے سہما ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس شور سے اور بھی خوفزدہ ہو گیا۔ مگر راجہ بڑے کھلنڈرے موڈ میں تھا۔ پکچر اس کو بہت پسند آئی تھی۔ بار بار کہہ رہا تھا۔

"یار بڑی زوردار پکچر تھی۔ کیا سالا اسٹائل سے مکا مارتا تھا۔" راجہ نے اپنا ہاتھ اٹھا کر ہوا میں لہرایا۔ "ڈھم، وہ گرایا۔ باپ ستم مچا آگیا آج تو۔"

نوشا جل کر بولا: "ابے بچّو مجا آ رہا ہے کہیں اپنا سینما نہ ہو جائے۔"

راجہ اسکو چھیڑنے لگا "جب گھر والوں کا اتنا ہی ڈر ہے تو سالے خاں پھر سینما کیوں جاتے ہو۔"

نوشا کہنے لگا "یار اب نہیں جاؤں گا۔ بہت رات ہو جاتی ہے۔"

"ابے تو روز یونہی کہتا ہے۔ کل پھر چلے گا۔ دیکھ لینا۔"

دونوں باتیں کرتے کرتے گھر کے قریب پہونچ گئے۔ جب گھر ذرا سے فاصلہ پر رہ گیا تو نوشا نے راجہ کو روک دیا۔ اور خود آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے پر پہونچا ہاتھ رکھ کر دیکھا دروازہ اندر سے بند تھا۔

پھر اُس نے کان لگا کر آہٹ لی سب لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔ وہ الٹے قدموں راجہ کے پاس گیا۔

راجہ نے پوچھا "سب ٹھیک ٹھاک ہے؟"

نوشا سہمے ہوئے لہجہ میں بولا "دروازہ تو بند ہے معلوم ہوتا ہے کہ سب سو گئے"

راجہ نے چہک کر کہا "تو پھر انتظار کس بات کا ہے"

دونوں دبے دبے قدموں سے چلتے ہوئے گھر کی چہار دیواری کے نیچے پہونچ گئے۔ نوشا کا گھر محلے عام مکانوں کی طرح کھپریل کی چھتوں والا، کواٹر نما مکان تھا۔ اس کی دیواریں نیچی نیچی تھیں راجہ دیوار سے ٹکا کر گھوڑا بن گیا اور نوشا سے بولا "آجا میرے شیر" نوشا اس کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ اُسنے کھڑے ہو کر گھر کی دیوار کو مضبوطی سے پکڑا اور بندر کی طرح اچک کر دیوار پر پہونچ گیا۔ نیچے سے راجہ نے سرگوشی کے سے لہجہ میں کہا۔

میں تو اب چلا"

نوشا نے دبی زبان سے جواب دیا "اچھا" راجہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ نوشا ذرا دیر تک دیوار پر بیٹھا رہا جب دیر تک کوئی آواز سنائی نہ دی تو وہ دھم سے صحن میں کود گیا۔ اسی وقت کمرے کے اندر نوشا کی ماں کی آواز ابھری۔

"کون؟"

نوشا دیوار سے چپٹ کے بیٹھ گیا اور منہ سے بلی کی طرح آواز نکالی، میاوں، میاؤں۔ ماں نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں بلی کو بھگانے لگی "ہشش، بلی بلی بلی ہشش" نوشا دیوار کے قریب سہما ہوا بیٹھا رہا اس نے سوچا اگر اس وقت اماں نے باہر آکر کہیں اس کو دیکھ لیا تو پھر اُس کی اچھی خاصی مرمت ہو جائے گی۔

غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہوا سائیں سائیں کرتی چل رہی تھی۔ سردی کے مارے نوشا کے دانت کٹکٹا رہے تھے۔ سارا بدن برف کی طرح ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ مگر وہ دبکا ہوا وہیں بیٹھا رہا۔ جب دیر تک کمرے کے اندر کوئی آہٹ نہ ہوئی تو اُسنے احتیاط کے طور پر دو تین بار بلی کی آواز نکالی۔ مگر کوئی نہ بولا۔ لہذا وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا کمرے کے دروازے پر پہونچ گیا۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا۔ کونے میں لالٹین جل رہی تھی۔ اور اس کی دھندلی روشنی میں سامنے فرش پر اُس کا چھوٹا بھائی اُڈو لیٹا تھا اس سے ذرا فاصلہ پر ماں لیٹی تھی اور اُس کے قریب ہی اس کی بڑی بہن سلطانہ لحاف اوڑھے پڑی سو رہی تھی۔

نوشا جھجکا جھجکا کمرے کے اندر گیا اور اَنّو کے برابر لیٹ گیا۔ ڈر کے مارے اُس نے اَنّو کی رضائی کو بھی ہاتھ نہ لگایا جس کو اوڑھ کر دونوں سویا کرتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ نیند میں ذرا بھی اَنّو کے ہاتھ لگا تو وہ گھبرا کے اس طرح بولتا تھا کہ سوتوں کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ سردی سے کانپتا ہوا اسکڑا اسکڑایا لیٹا رہا۔ ذرا دیر بعد سلطانہ کے کھانسنے کی آواز کمرے کی گہری خاموشی میں ابھری۔ پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے گھوُر کر نوشا کو دیکھا جو جھوٹ موٹ آنکھیں بند کئے پڑا تھا۔ سلطانہ آہستہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور رضائی اس کے جسم پر ڈال کر سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔

"اُو موٹے تلے، رضائی تو اوڑھ لے، تجھے تو سردی بھی نہیں لگتی"

نوشا نے آنکھیں کھول دیں اور گھور کر سلطانہ کو دیکھا۔ وہ اسکو چھیڑنے لگی "آنکھیں نکالیں تو ابھی جگاتی ہوں اماں کو" نوشا نے زبان سے تو کچھ نہ کہا البتہ اس کی ران میں زور سے چٹکی بھری۔ وہ بلبلا کر بولی۔

"ہائے اماں مری۔ ایک تو کمبخت کے ساتھ نیکی کرو اوپر سے چٹکیاں بھرتا ہے"

اس دفعہ سلطانہ کی آواز کسی قدر اونچی تھی مگر ماں گہری نیند سو رہی تھی۔ اس نے کروٹ تک نہ بدلی۔ نوشا نے ڈر کے مارے چوں تک نہ کی۔ آنکھیں بند کئے چپ پڑا رہا۔ جب سلطانہ اٹھ کر جانے لگی تو وہ جل کر بڑبڑایا۔

"حرام زادی"

سلطانہ نے اس کی گالی سن لی تھی مگر اب وہ اس سے الجھنا نہ چاہتی تھی۔ خاموشی سے اپنی جگہ پر جا کر لیٹ گئی۔ نوشا ذرا دیر پڑا کروٹیں بدلتا رہا، پھر وہ گہری نیند سو گیا، اور دن چڑھے تک پڑا سوتا رہا۔

اس روز وہ کارخانے پہونچا تو دیر ہو گئی۔ پھاٹک پر گل خان بیٹھا، ناک میں نسوار چڑھا رہا تھا، اس کو دیکھتے ہی بولا "تم اتنی دیر سے آتا ہے سیٹھ بُوت گرم ہو رہا ہے۔ جاؤ جلدی جاؤ نہیں تو۔ . . ."

فوراً ہی اسکو چھینک آ گئی۔ پھر کئی چھینکیں آئیں۔ اُس کی بقیہ بات ان چھینکوں کی نذر ہو گئی اور نوشا لپک کر احاطہ میں داخل ہو گیا۔

اندر پہونچتے ہی اُسنے چاروں طرف چوروں کی طرح چوکنا نظروں سے دیکھا مگر عبداللہ مستری کہیں نظر نہ پڑا۔ وہ موٹروں کی مرمت کرنے والے اس کارخانے کا مالک تھا اور کاریگروں کو سزا دینے کے معاملہ میں دُور دُور تک اس کا شہرہ تھا۔ نوشا چاروں طرف دیکھتا بھالتا شیڈ کے نیچے پہونچ گیا جہاں دوسرے کاریگر گرٹے کے نیچے کام کر رہے تھے اس کے پہونچتے ہی ایک لڑکا زور سے کھنکار کر بولا۔

"دیر سے آنا تھا تو سر سے تو باندھ کر آتے۔"

دوسری طرف سے آواز آئی۔"ارے یار یہ تو بڑا پکا ہے۔ ابے رات کونسی فلم دیکھی تھی۔"

"سالا روز سینما جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شوقین سے ٹکرا گیا۔"

"ارے اس کی کیا پوچھتے ہو اسپر تو جا تو چلتے ہیں، چاقو۔"

نوشا ان کی باتوں پر بگڑ کر بولا" دیکھو جی، مجھے یہ مذاق اچھا نہیں لگتا۔"

ابھی اس کے کچھ اور کچھ کے لگتے۔ اسی وقت عبداللہ مستری کی آواز سنائی دی۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ نوشا نے جلدی سے ایک رنچ اٹھایا اور پاس کھڑی ہوئی ایک موٹر کے نیچے گھس کر خواہ مخواہ کھٹر پٹر کرنے لگا۔ ذرا ہی دیر بعد عبداللہ وہاں آ گیا۔ کاریگر لڑکوں کی روح فنا ہو گئی سب کے ہاتھ جلدی جلدی چلنے لگے۔ نوشا اندر گھسا ہوا کھٹر پٹر کئے جا رہا تھا۔ اس کا آدھا دھڑ باہر نکلا تھا اور برابر جنبش کر رہا تھا۔ وہ تو صاف بچ گیا۔ ساری آئی گئی ایک اور کاریگر کے سر گئی۔ وہ بھی دیر سے پہونچا تھا۔ اس کے پاس کوئی کام نہیں تھا، ہاتھ پر ہاتھ دھرے خالی بیٹھا تھا۔ عبداللہ نے پہلی ہی نظر میں اس کو بھانپ لیا۔ گردن ہلا کر بولا۔

"کیوں بے دیر سے آیا تھا؟"

ڈر کے مارے لڑکے کے منہ سے آواز نہ نکلی۔ اس دفعہ وہ گرج کر بولا" ابے کیا منہ پھوٹ گیا ہے، بولتا کیوں نہیں۔"

وہ گھبرا کر بولا" اماں نے روک لیا تھا۔"

عبداللہ نے کارخنداروں کی زبان میں ایک ٹیڑھی سی گالی دے کر کہا" اماں نے کیا اپنے کسی یار کے پاس بھیجا تھا۔"

اس بات کا وہ بے چارا کیا جواب دیتا۔ صرف عبداللہ کے منہ کو ٹکر ٹکر تکنے لگا۔

عبداللہ غضبناک ہو کر چلا دیا" سالوں کو کام بھی سکھاؤ اور اوپر سے تنخواہ بھی دو۔ اور یہ حرام کے تخم اس کا یہ صلہ دیتے ہیں کہ گھر سے نواب بنکر چلتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک کاریگر کے ہاتھ سے پلاس چھینا اور اس لڑکے کی ناک اس میں رکھ کر زور سے بھینچ دی۔ وہ بلبلا کر چیخنے لگا۔

"ہائے مر گیا، اب کبھی دیر سے نہیں آؤں گا۔"

وہ بار بار چیختا رہا، گڑگڑاتا رہا مگر عبداللہ نے اس کی ناک نہ چھوڑی۔ جب وہ تکلیف سے گھبرا کر ہاتھ پاؤں فرش پر پٹخنے لگا، تب کہیں جا کر عبداللہ نے پلاس کی گرفت سے اس کی ناک کو آزاد کیا۔ جو اب ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گئی تھی۔ لڑکا بار بار ناک کو چھوتا اور زور زور سے سسکیاں بھرنے لگتا۔ عبداللہ

نے اس کی تکلیف پر توجہ دیئے بغیر، اونچی آواز میں پکارنا شروع کر دیا۔
"منشی جی، اے منشی جی، ذرا ادھر تو آنا۔"
فوراً ہی ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر کا آدمی ناک پر عینک کو درست کرتا ہوا وہاں آگیا۔ عبداللہ نے اس لڑکے کی جانب اشارہ کر کے اس آدمی سے کہا: "دیکھو جی، آج اس حرام خور کی تنخواہ نہیں لگے گی۔ سمجھ گئے۔"
منشی نے جھٹ سے جواب دیا: "بہت بہتر سرکار جیسا آپ حکم دیں۔"
لڑکے نے اطمینان کی سانس لی کہ اب تو اس کی جان بچ جائے گی لیکن عبداللہ مستری اتنی آسانی سے کاریگروں کی غلطیاں معاف کر دیا کرتا تو اس کی شہرت کیوں ہوتی۔ اس سے کہنے لگا۔
"اچھا اب تم سب کپڑے اتار دو اور نلکے کے نیچے جا کر بیٹھ جاؤ، فی الحال تمہاری یہی سزا ہے۔"
لڑکا گڑگڑانے لگا مگر عبداللہ نے اس کی ایک نہ سنی۔ ڈانٹ کر بولا "ابے اتارتا ہے کپڑے یا پھر پکڑوں تیری ناک۔" ابھی تک پلاس اس کے ہاتھ میں تھا۔ اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے پلاس اس کی ناک کی طرف بڑھایا۔ لڑکے نے گھبرا کر جلدی، جلدی سارے کپڑے اتار ڈالے اور مادر زاد برہنہ ہو گیا۔

اس روز آسمان پر ابر چھایا تھا۔ ہوا میں اس قدر خنکی تھی کہ جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ خود عبداللہ مستری موٹے اونی کپڑے اور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور کانوں تک مفلر سے سر ڈھکا تھا۔ لڑکے کا برہنہ جسم سردی سے بید مجنوں کی شاخوں کی طرح کپکپانے لگا۔ عبداللہ نے اس کو خاموش کھڑا دیکھ کر کہا۔
"ابے اس طرح چوتیا کھڑے کب تک کھڑا رہے گا۔ اب نلکے کے نیچے جاتا ہے کہ نہیں۔"
نو، دس سال کے نو عمر لڑکے نے بے بسی سے عبداللہ کی جانب دیکھا اور نظریں شرم سے نیچی کئے ہوئے شیڈ سے نکل کر، پانی کے نل کے نیچے جا کر بیٹھ گیا جس کی ٹونٹی کھلی ہوئی تھی اور پانی موٹی سی دھار بن کر گر رہا تھا۔

جب عبداللہ وہاں سے چلا گیا تو نوشا نے چوہے کی طرح موٹر کے نیچے سے گردن نکالی اور باہر آگیا۔ اس کے کپڑے گرد سے اٹے گئے تھے۔ اور چہرے پر سیاہی کے جگہ جگہ دھبے نظر آ رہے تھے۔ پاس بیٹھے ہوئے ایک کاریگر نے جو اس سے عمر میں دو تین سال بڑا ہوگا، کان کے پاس منہ لے جا کر آہستہ سے کہا "بیٹا اب رشوت میں ایک پیالہ دلواؤ۔ نہیں تو ابھی تم کو بھی نلکے کے نیچے بھجواتا ہوں" نوشا، اس کے خیال ہی سے کانپ اٹھا۔ اس نے چپ چاپ چہرہ اس کے قریب کر دیا۔ اس لڑکے نے اس کے

گالوں کا ایک بوسہ لیا اور پھر بڑا سا منہ بنا کر فرش پر تھوک دیا۔

"سالے نے منہ کڑوا کر دیا، ابے یہ منہ پر موبل آئل کہاں سے چپڑ لیا؟"

سب کاریگر اس کی اس حرکت پر کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ نوشا کھسیانہ ہو کر سر کے بال کریدنے لگا۔ کارخانے کی زندگی میں نہ اس کے لئے یہ نیا تجربہ تھا، نہ دوسرے کاریگروں کے لئے۔ آئے دن کسی نہ کسی کاریگر کو عبداللہ مستری ایسی ہی اذیت ناک سزا دیا کرتا تھا اور جس کے احساس کو بقیہ کاریگر لڑکے تھوڑی دیر بعد قہقہوں میں اڑا دیتے تھے۔

## ۲

کمرے کے اندر لالٹین جل رہی تھی جس کی زردی مائل دھندلی روشنی میں سلطانہ چپ چاپ بیٹھی قینچی سے بڑی کے پتے کاٹ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ماں بیٹھی تھی، جو کٹے ہوئے پتوں میں تمباکو بھر کر بیڑیاں بناتی جا رہی تھی۔ ان دونوں سے ذرا ہٹ کر، آنو ایک کاپی پر جھکا ہوا، جلدی، جلدی لکھنے میں منہمک تھا۔ نوشا سب سے الگ تھلگ کونے میں پڑا ہوا کروٹیں بدل رہا تھا۔ کمرے میں بڑی دیر سے گہری خاموشی چھائی تھی۔ آخر ماں نے اس سکوت کو توڑا، وہ آنو کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"دیکھ کل سویرے ہی سویرے اٹھ کر کارخانے چلا جانا۔ اور سیٹھ سے کہنا کہ سارا پچھلا حساب صاف کر دو۔"

آنو نے ماں کی جانب دیکھے بغیر، بے نیازی سے جواب دیا "اچھا، اچھا۔"

ماں نے پھر کہا "دیکھ بھولنا مت۔ پورا حساب لے کر آنا۔ نہیں تو گھر میں فاقہ پڑے گا۔ میرے پاس اب ایک دھیلا بھی نہیں رہا۔ اور ہاں اسے یہ بھی بتا دینا کہ شام تک ہزار بیڑیاں پہنچ جائیں گی۔ سمجھ گیا نا۔"

اس کے ہاتھ برابر تیزی سے چلتے رہے اور وہ رک رک کر اپنی بات کہتی رہی۔ ذرا دیر وہ خاموش رہی۔ پھر نہ جانے کیا سوچ کر بولی۔

"ذرا ادھر تو آ۔ بیڑیوں کے بنڈل بنا بنا کر تاگہ لپیٹتا جا۔"

آنو نے احتجاج کیا "میں اسکول کا کام کر رہا ہوں۔ نہیں تو ماسٹر صاحب بنچ پر کھڑا کر دینگے۔ مگر

ماں نے اس کی ایک نہ سنی۔ ڈانٹ کر بولی۔

"چل، چل باتیں نہ بنا۔ بس ہو چکی پڑھائی۔ پہلے پیٹ کا دھندا کر۔ کھانے کو نہیں ہوگا تو سب سے زیادہ تو ہی فیل مچائے گا۔"

آخر بادلِ نخواستہ اٹھ کر ماں کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور بیڑیوں کے بنڈل تیار کرنے لگا۔ اسی وقت گلی میں گیدڑ کے بولنے کی آواز ابھری۔ نوشا جو ابھی تک تھکا ہوا سا لیٹا تھا۔ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سلطانہ نے اس کی جانب مسکرا کر دیکھا۔ اور ماں سے کہنے لگی۔

"اماں، آج تو سرِ شام ہی گیدڑ بولنے لگے۔"

ماں لاپرواہی سے بولی "توبہ کرو بیٹیا، اس وقت کہاں سے گیدڑ آ گئے۔"

نوشا فوراً بیچ میں بول اٹھا "نہیں اماں آواز تو گیدڑ ہی کی معلوم پڑتی ہے، جا کر بھگا آؤں۔" یہ کہہ کر وہ چلنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ ماں نے ڈانٹ کر کہا۔

"چل بیٹھ، بڑا آیا گیدڑ بھگانے والا۔ یہ کیوں نہیں کہتا کہ وہ تیرا سگا باہر کھڑا بلا رہا ہے۔ دیکھ میں تجھ سے ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ اس حرامی راجہ کی صحبت چھوڑ دے نہیں تو سر پر ہاتھ دھر کر روئے گا۔"

نوشا کھسیانہ ہو کر اپنی جگہ پر جا کر لیٹ گیا اور دیر تک پڑا سلطانہ کو کوستا رہا۔ جو شوخی سے بار بار اس کی جانب دیکھ کر ہنسے جا رہی تھی۔ نوشا کا بس چلتا تو وہ اس کے منہ پر ایسا زناٹے کا تھپڑ رسید کرتا کہ ساری ہنسی نکل جاتی۔

نوشا جھنجھلا، جھنجھلا کر، سلطانہ کو کوستا رہا اور باہر گلی میں راجہ بار بار حلق کے اندر سے گیدڑ کی آواز نکالتا رہا۔ ہر بار وہ دروازے کی جانب دیکھتا مگر اس روز دروازہ نہ کھلنا تھا نہ کھلا۔ وہ دیر تک نوشا کے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر مایوس ہو کر واپس چلا گیا۔

وہاں سے وہ میونسپلٹی کی لالٹین کے پاس آیا۔ یہاں بھی سناٹا پڑا تھا۔ محلے کے کسی لڑکے کا دور، دور تک نشان نہ تھا۔ ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی۔ اور اب ہوا کے جھکڑ چل رہے تھے۔ راجہ کے پاس اس روز پیسے بھی زیادہ نہیں تھے، ورنہ وہ سنیما ہی چلا جاتا۔ سوچا تھا کہ نوشا مل جائے گا تو دونوں بیٹھ کر مسلم ہوٹل میں ایک ایک کڑک چائے پئیں گے اور ریڈیو سے فلموں کے گانے سنیں گے۔

راجہ نے لالٹین کے نیچے کھڑے ہو کر زور، زور سے گیدڑ کی بولی بولی۔ ہکّا ہوا، ہکّا ہوا۔ دیر تک سنسان گلی کے اندر آواز گونجتی رہی مگر کوئی دروازہ نہ کھلا۔ کوئی باہر نہ نکلا۔ راجہ جل کر بڑبڑانے لگا "آج سسالے مر گئے۔" اسی جھنجھلاہٹ کے عالم میں وہ مسلم ہوٹل کی طرف نکل گیا، مگر

سنائی جارہی تھیں۔ وہاں بیٹھنا فضول تھا۔ اس نے سوچا جب تک خبریں چلیں اتنی دیر میں کیوں نہ چمپی کرالی جائے۔ سر میں کچھ درد بھی ہو رہا تھا۔ چمپی کرنے والا لڑکا، ہوٹل کے باہر ہی بیٹھا تھا۔ راجہ نے اس کے قریب جاکر کہا۔

"ابے کچھ ہوتی ہے چمپی ومپی"

وہ جھٹ سے بولا "ابھی لو۔ اور تیل کی شیشیاں سنبھال کر سامنے آ کھڑا ہوا۔ راجہ نے پوچھا "مگر یہ تو بتا کرے گا کیا؟"

وہ کہنے لگا "ابے یار جو جی چاہے دیدینا"

راجہ بولا "میرے پاس تو صرف ایک دُونی ہے۔ بول کیا کہتا ہے؟"

اس نے لمحہ بھر توقف کیا، پھر کہنے لگا "اچھا چل یار تو بھی کیا یاد کرے گا"

راجہ وہیں ہوٹل کی سیڑھیوں کے پاس بیٹھ گیا۔ چمپی والے نے شیشی سے تیل نکال کر راجہ کے سر میں ڈالا اور مالش کرنے لگا۔ اس کی انگلیاں نرم تھیں اور ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہے تھے۔ راجہ چمپی کراتے کراتے، اس سے پوچھ بیٹھا۔

"کیوں بے، روزانہ تجھ کو کیا مل جاتا ہوگا"

وہ بولا "بس یار کچھ پوچھ نہیں کیا مل جاتا ہے"

راجہ اصرار کرنے لگا "پھر بھی!"

"یہی روپیہ، ڈیڑھ روپیہ مل جاتا ہے"

راجہ نے حیرت سے کہا "ابے تو یہ کچھ کم ہے۔ کیا کسی کا گھر لوٹے گا"

وہ کہنے لگا "کم تو نہیں ہے، مگر محنت بڑی ہے"

راجہ بولا "ابے کیا محنت ہے میں سیکھوں تو مجھ کو یہ کام سکھادے گا" واقعی وہ اس کے لئے تیار بھی تھا۔ چمپی کرنے والا لڑکا کہنے لگا۔

"یار کیا کرے گا یہ کام سیکھ کر، سالا بڑا واہیات دھندا ہے"

"واہیات کی اس میں کونسی بات"

وہ کہنے لگا "بس کہہ دیا کہ ہے؟"

راجہ نے ڈانٹ کر کہا "ابے صاف صاف بتا۔ آخر بات کیا ہے؟"

لڑکا مسکرانے لگا "تو پھر اس آدمی سے پوچھ لو، جو جو تیرے پر بیٹھا دان کھا رہا ہے"

"اس سے کیوں پوچھوں تو کیوں نہیں بتاتا؟"

وہ ہنسنے لگا: "وہ بالکل ٹھیک بتا سکتا ہے۔" اس کے بعد وہ اس آدمی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"اماں، کلن خاں، یہ راجہ تم کو پوچھ رہا ہے۔"

کلن خاں نے ران کھجاتے کھجاتے، راجہ کی جانب دیکھا اور ہنس کر بولا "روپیہ ایک عدد کلدار ملے گا، بول چلتا ہے۔" راجہ نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"کہاں؟"

اس نے بدمعاشی سے آنکھ مار کر کہا "اب یہ بھی سمجھانا پڑے گا؟" اور جیسے ایک بارگی راجہ سب کچھ سمجھ گیا۔ اس نے وہیں سے اس کو ایک موٹی سی گالی دی اور لپک کر اس کے قریب پہونچ گیا۔

"سالے حرامی پن کرتا ہے، ابھی ساری بدمعاشی نکال کر رکھ دوں گا۔"

کلن خاں اس کی تیزی سے گھبرا کر بولا "ابے تو میں نے تجھ سے کہا بھی کیا، کیوں خواہ مخواہ سر ہوئے جارہا ہے۔"

راجہ کو بے حد طیش آگیا تھا۔ اس نے کلن خاں کو سینکڑوں گالیاں دے ڈالیں۔ غصہ میں اس نے چپی والے کی تیل کی شیشیاں توڑ ڈالیں۔ اچھا خاصہ ہنگامہ برپا ہو گیا۔ کلن خاں بڑا سٹ پٹایا۔ راجہ کی خوشامد بھی کی اور گالیاں گھاٹے میں کھائیں۔

راجہ نے مارے غصہ کے چائے بھی نہ پی اور اپنی کھولی کی طرف چل دیا۔ کھولی کا دروازہ حسب معمول کھلا تھا۔ اور اندر گھپ اندھیرا تھا۔ یہ کھولی ایک شکستہ عمارت کا ایک حصہ تھی، جو پچھلی برسات میں منہدم ہو گئی تھی۔ راجہ کے قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی بوڑھے کوڑھی نے کھانسنا شروع کر دیا۔ راجہ نے پوچھا۔

"استاد ابھی تک تم جاگ رہے ہو؟"

وہ کھانستے کھانستے بولا "باپ رے باپ، آج تو غضب کی سردی ہو رہی ہے۔ ذرا دروازہ بند کر دے۔ اور دیکھ وہ کونے میں چادر پڑی ہے، وہ مجھے اوڑھا دے۔"

اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ راجہ نے ماچس جلائی تو سامنے چیتھڑوں میں لپٹا ہوا بڈھا کوڑھی، فرش پر گٹھری بنا ہوا نظر آیا۔ روشنی کے ساتھ ہی ایک چمگادڑ کھولی کے اندر اپنے پر پھڑپھڑا کر تیزی کے ساتھ چکر کاٹنے لگی۔ اس نے کونے میں سے چادر اٹھائی اور گداگر کے جسم پر ڈال دی۔ گداگر اپنے زخموں کو کھبڑ کھبڑ کھجاتے ہوئے بولا۔

"آج تو تو جلدی آگیا۔ سردی لگی ہو گی۔ باہر جھکڑ چل رہے ہیں۔"

راجہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کھولی کا دروازہ بند کیا۔ اور اپنی گدڑی کے اندر گھس گیا۔ واقعی اس وقت غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ راجہ کو محسوس ہوا کہ گدڑی برف کی طرح سرد ہے۔ اور اس کا سارا بدن سردی سے کپکپا رہا ہے۔ اس نے کھلنڈرے بچوں کی طرح ہُو ہُو کرکے حلق سے بے ہنگم آوازیں نکالیں اور گھٹنوں کو سکیڑ کر سینے سے لگا لیا۔ اس روز اس کو بڑی دیر میں نیند آئی۔

سویرے ہی سویرے گداگر نے کمر پر زور کی لات مار کر اس کو جگا دیا۔ راجہ کی آنکھ کھل گئی۔ مگر وہ خاموش پڑا رہا۔ دوسری لات اس کے کندھے پر پڑی۔ اب لیٹے رہنا مشکل تھا۔ گداگر بخشنے والا نہیں تھا۔ لاتیں بھی مارتا اور شام کو واپسی پر انجن دینے میں نخرہ الگ کرتا۔ وہ جھٹ سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ گداگر نے کھولا تھا یا رات کو ہوا کے جھکڑوں سے پٹ سرک گیا ہوگا۔ باہر ہر طرف کہرا چھایا تھا۔ اس دھندلی روشنی میں گداگر بھوتوں کی طرح خوفناک نظر آ رہا تھا۔ اس کی گندی داڑھی ٹاٹ کی طرح مٹیالی معلوم ہو رہی تھی۔ اور وہ اس کے سر پر کھڑا اپنے رستے ہوئے زخموں کو تیزی کے ساتھ کھجا رہا تھا۔

راجہ نے کھڑے ہو کر کھولی کے اندر سے لکڑی کی چھوٹی سی گاڑی کو کھینچ کر باہر نکالا۔ گداگر کو اس میں سوار کیا اور گاڑی دھکیل کر کھینچتا ہوا آگے چل دیا۔ کوڑھی تو گدڑی اوڑھ کر مزے سے بیٹھا تھا۔ مگر راجہ جو صرف ایک پھٹی ہوئی قمیض پہنے تھا۔ اس کا جسم صبح کی ٹھنڈی ہوا سے لرز رہا تھا۔ اس کو سردی سے ٹھٹھرتے دیکھ کر وہ کہنے لگا۔

"ابے یہ روز روز جو تو سینما دیکھتا ہے، کیوں پیسہ برباد کرتا ہے۔ ایک پرانا کوٹ کسی کباڑیئے سے کیوں نہیں خرید لیتا۔ دیکھ تو کیسی ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔"

راجہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ چپ چاپ گاڑی کو دھکیلتا رہا اور سردی سے کپکپاتا رہا۔ سارا شہر کہر کے جال میں الجھا ہوا ابھی تک سو رہا تھا۔ ہر طرف دھندلی دھندلی خاموشی تھی اور اس گہرے سکوت میں، آہستہ آہستہ ابھرتی ہوئی انسانی آوازیں مکھیوں کے پروں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ اللہ دیا کے چائے خانہ کے پاس پہنچ کر راجہ نے گاڑی کی رفتار بالکل سست کر دی۔ چائے خانہ کی بھٹی میں انگارے دہک رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی کوند لپکتا تو روشنی دُور تک لہرا جاتی۔ بھٹی کے اوپر بڑا سا ساوار رکھا تھا جس کے اندر سے ہلکی ہلکی بھاپ اٹھ رہی تھی۔ گداگر نے صدا لگائی۔

جاگتا ہے جاگ رے افلاک کے سائے تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سائے تلے

اس کی آواز میں اس بلا کا درد و سوز تھا کہ صبح کی گہری خاموشی میں اس کی صدا کسی اور دنیا سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی کی سرحدیں ختم ہو گئی ہیں اور ہر طرف موت کا سایہ پھیلتا جا رہا ہے۔ آہستہ آہستہ، دھیرے، دھیرے، اب ہر چیز مٹ جائے گی، سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ مگر اللہ دیا پر اس کی دردناک صدا کا ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اس کی نظروں میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھنچنے کی بجائے، گاہکوں کی کالی پیلی شکلیں ابھر رہی تھیں، ڈوب رہی تھیں۔ جن کی خاطر وہ اس جاڑے پالے میں گرم گرم بستر سے نکل کر آیا تھا۔ بوڑھے گداگر کو دیکھ کر اُسنے بے نیازی سے کہا۔

"بابا آگے جاؤ۔"

راجہ نے گاڑی کو ایک جھٹکے سے آگے بڑھایا۔ اندر چائے خانہ میں اللہ دیا بڑبڑا رہا تھا سالے صبح ہی صبح آ گئے۔ "نہیں نہ بیٹا، پہلے ان کو دے دو" گداگر نے اس کی آواز سن لی تھی۔ راجہ سے کہنے لگا۔

"ابے تو بھی کس سالے بنیئے کے پاس پہونچا۔"

راجہ نے بیزاری سے کہا "میں نے سوچا تھا کہ سالا ایک چائے ہی پلا دے گا۔"

گداگر ہنس کر بولا "ابے تو تو نے یہ بات پہلے کہی ہوتی۔ پیسے دیتے تو اسکا باپ چائے پلاتا۔ چل تجھے چائے پلواتا ہوں۔ سردی بھی تو زبردست پڑ رہی ہے۔"

وہاں سے آگے بڑھ کر وہ ایک اور چائے خانہ کے قریب پہونچے۔ دونوں نے ایک ایک پیالی چائے کی چڑھائی اور پھیری پر چل دیئے۔ دونوں تھوڑی ہی دُور گئے کہ ایک راہگیر نے قریب سے گزرتے ہوئے ایک سکہ گداگر کے پیالے میں ڈالا۔ ٹن سے آواز اُبھری بوڑھے گداگر نے اسکو ٹٹول کر دیکھا اور خوش ہو کر کہنے لگا "اکنی جان پڑتی ہے۔" اُسنے آنکھیں کھول دیں اور اکنی کو اٹھا کر دیکھنے لگا۔

"مجھے تو کھوٹی لگتی ہے، ذرا تو دیکھ راجہ۔"

راجہ نے اکنی اس کے ہاتھ سے لے کر غور سے دیکھا اور اس کو واپس دے کر بولا "ایک دم کھوٹم ہے۔"

گداگر جل کر بولا "یارو کیا زمانہ آگیا ہے، اب تو لوگ اللہ میاں کو بھی دھوکا دینے لگے۔ اسکے

بعد وہ دیر تک بڑبڑاتا رہا: "آج کا دن تو بڑا منحوس معلوم ہوتا ہے۔ صبح ہی سے نسیٹ پرنسیٹ ہوتی جا رہی ہے۔ خدا خیر کرے"

مگر وہ دن ان کے لئے منحوس ثابت نہ ہوا۔ کچھ ایسے بھی اللہ کے بندے مل گئے جن کے دل میں خوفِ خدا بھی تھا اور جو اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے تھے۔ دوپہر تک روپے، سوا روپے کی ریزگاری اکٹھی ہوگئی۔ ایک محلہ میں کسی مرنے والے کا چالیسواں تھا، دونوں نے ٹھاٹھ سے خمیری روٹیاں اور سالن کھایا، دیر دھوپ میں بیٹھ کر آرام کیا اور آگے بڑھ گئے۔

دونوں جب شہر کی ایک صاف ستھری سڑک سے گزر رہے تھے تو ایک شخص نے، جو وضع قطع سے ڈاکٹر معلوم ہوتا تھا، راجہ کے برابر لمحہ بھر رُک کر اُس سے کہا: "اے بچے، تم اس بوڑھے کے ساتھ کب سے ہو" اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اُس نے بوڑھے کوڑھی کو دیکھا جو آنکھیں بند کئے ڈھیلا پڑا تھا اور اپنے زخموں کو لُنجی انگلیوں سے کھجا رہا تھا۔ وہ راجہ سے کہنے لگا: "تم اس بوڑھے کا ساتھ چھوڑ دو۔ یہ بڑی خطرناک بیماری ہے" یہ کہکر اس شخص نے نزدیک کھڑی ہوئی کار کا دروازہ کھولا اور اسٹیرنگ پر بیٹھ کر کار اسٹارٹ کر دی۔ جب موٹر آگے بڑھ گئی تو گداگر نے اس شخص کو گندی سی گالی دی۔ اور راجہ سے کہنے لگا۔

سالے نے پیسہ ایک نہیں دیا۔ نصیحت بہت سی کر ڈالی۔ اب اس مرغی کے جنے سے پوچھو کہ نصیحت سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ دہشت تیرے کی"

گداگر نے پھر گالی دی۔ راجہ نے سوچا کہ بوڑھا ٹھیک تو کہتا ہے۔ خالی نصیحت سے پیٹ تو نہیں بھرتا۔ جب اُسے کہیں کام نہ تھا، تب ہی اُس نے گداگر کی نوکری کی تھی۔ اب اس کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانے کو ملتا تھا اور روزانہ رات کو اٹھنی جیب خرچ کو۔ اس کے علاوہ گداگر کی نظر بچا کر جو پیسے وہ بھیک سے اڑا لیتا تھا وہ آمدنی الگ رہی۔ وہ چھ مہینے سے اس کے پاس تھا، بوڑھے کی بیماری خطرناک ہوا کرے، اُسے تو اب تک کچھ ہوا نہیں۔

دن بھر راجہ بوڑھے گداگر کو گاڑی میں بٹھلائے شہر کی گلی کوچوں میں گھومتا رہا اور بوڑھا اپنی دردناک صدا بلند کرتا رہا، جو کائنات کے سینے کو چیرتی ہوئی فضا میں تحلیل ہو جاتی۔ گاڑی کے پہیئے راستوں پر کھڑکھڑاتے رہے، گداگر جب ایک کروٹ پڑے پڑے تھک جاتا، تو دوسرا پہلو بدلتا۔ کوئی سنسان جگہ ملتی تو راجہ دم لینے کو ٹھہر جاتا۔ سگرٹ سلگا کر دو چار کش لگا کر تازہ دم ہو جاتا۔ صبح تڑکے کے نکلے ہوئے دونوں جب تھکے ہارے کھولی میں واپس پہونچے تو ایک

رات گزر چکی تھی۔

## ۳

گداگر کی گاڑی کا ایک پہیہ سڑک کے ایک کھانچے میں گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ لہذا راجہ پھیری پر بھی نہ جاسکا۔ خوب اینڈ اینڈ کر پڑا دن بھر کھولی کے اندر سوتا رہا۔ شام کو وہ باہر نکلا تو اس کی جیبیں پیدائشی اندھے کی آنکھوں کی طرح خالی تھیں۔ اُس نے بازار کا ایک چکر کاٹا اور گلی کے اندر گھس گیا۔

میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے صرف شامی بیٹھا تھا۔ راجہ ایک بار اس کے قریب سے گزرا مگر دونوں میں سے کوئی بھی نہ بولا۔ اُس روز کے جھگڑے کے بعد سے اب تک دونوں میں بات چیت بند تھی۔ راجہ گلی کے دوسرے نکڑ تک ٹہلتا ہوا چلا گیا۔ چلتے چلتے اُس نے سوچا کہ شامی سے صلح کر لینی چاہیے ورنہ وقت کاٹنا مشکل ہو جائے گا۔ واپسی پر جب وہ لالٹین کے پاس آیا تو اُس نے بڑی بے باکی سے کہا۔

"ابے آج نوشا کہاں مر گیا؟"

شامی بھی شاید اسی انتظار میں تھا، اُسنے جھٹ جواب دیا "اس کی ماں نے پکڑ کر بٹھا لیا ہوگا"

راجہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور بڑی بے تکلفی سے بولا "یار اس کی ماں، سالی ایک نمبر بدمعاش عورت ہے۔ باپ رے باپ اس زور سے چلاتی ہے کہ اُس سے ڈر لگنے لگتا ہے"

شامی نے اس کی اس بات کو نظرانداز کر کے کہا "یار تاش ہو تو نکال، ذرا دو چار ہاتھ ہو جائیں"

راجہ نے فوراً پتلون کی جیب سے تاش کی گڈی نکالی اور تاشوں کو پھینٹنے لگا۔ شامی بولا "دیکھو استاد چیٹنگ نہیں ہوں گی۔ نہیں تو میں نہیں کھیلوں گا۔ بیکار میں جھگڑا ٹنٹا ہو جاتا ہے" راجہ اپنے گندے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔

"نہیں بے اس روز تو میں ذرا مجاخ کر رہا تھا"

دونوں اطمینان سے بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔ ایک بار شامی نے جھک کر زور سے پتا مارا اور گردن جاکر کہا "کہو استاد کیسی رہی" اسی وقت اس کے سر پر دھڑ سے ایک جوتا پڑا۔ پلٹ کر دیکھا تو اسکا

باپ سر پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جوتا تھا اور آنکھیں جنگلی کبوتر کی طرح سُرخ ہو رہی تھیں۔

باپ نے جُوتے کا دوسرا ہاتھ گھمایا مگر شامی گردن جھکا کر سر کو صاف بچا گیا۔ اور تاش چھوڑ کر ایک دم بھاگا۔ باپ نے چیخ کر کہا "ٹھہر جا سالے نہیں تو کھال کھینچ ڈالوں گا" مگر شامی اب کہاں ٹھہرنے والا تھا۔ گلی کا چکر کاٹ کر سیدھا گھر پہونچا۔ باپ ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ماں نے اسکو خوفزدہ دیکھا تو سمجھ گئی کہ باپ سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ اُسنے دو چار کوسنے دیئے اور کوٹھری کی جانب دھکا دے کر بولی۔

"اب منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ جا جلدی سے چھپ جا۔ ورنہ وہ تیرا باوا، آج ہڈی پسلی توڑے بغیر نہیں چھوڑے گا۔"

شامی جلدی سے کوٹھری کے اندر داخل ہو گیا۔ اور دروازہ اندر سے بند کر کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد باپ گھر کے اندر آیا اور اِدھر اُدھر شامی کو تلاش کرنے لگا۔ آخر تھک کر وہ اپنے بستر پر آگیا۔ وہ رات گئے تک کھانستا رہا اور شامی کو گالیاں دیتا رہا۔

شامی کا خوف کے مارے بُرا حال تھا۔ وہ سہما ہوا کوٹھری کے اندر بیٹھا رہا۔ دروازے پر ذرا بھی آہٹ ہوتی تو اس کا دل زور سے اچھل پڑتا۔ بہت دیر بعد دروازے کو کسی نے آہستہ سے کھٹکھٹایا۔ اس کی ماں باہر کھڑی آواز دے رہی تھی۔ شامی نے دروازہ کھولا۔ ماں اس کو لئے ہوئے چولھے کے پاس گئی اور کمر میں زور کی چٹکی بھر کر بولی۔

"ارے کچھ ٹھونس لے، صبح کا بھوکا پیاسا پھر رہا ہے۔ کمبختوں نے میری زندگی حرام کر دی۔"

وہ بیٹھی اپنی قسمت کو کوستی رہی اور شامی لمبے لمبے نقمے حلق کے نیچے سے جلدی جلدی اتارتا رہا۔ بار بار اس کی سہمی ہوئی نظریں کمرے کی جانب اٹھ جاتیں۔ وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا بات بھی ایسی ہی تھی۔ مارنے کے معاملے میں اس کا باپ بڑا لاپرواہ تھا، جو چیز ہاتھ میں آجاتی وہی اٹھا کر کھینچ مارتا۔ کئی دفعہ اس مار سے شامی کا سر اور پیشانی لہولہان ہو چکی تھی۔

جب وہ کھانا کھا چکا تو ماں نے لے جا کر اس کو بڑی بہن کے بستر میں دبکا دیا تا کہ رات میں اگر باپ کی آنکھ کھل جائے تو اسکو سامنے دیکھ کر کہیں پھر نہ بھڑک اٹھے۔ شامی دم سادھے پڑا رہا۔

سویرے کسی کے اٹھنے سے پہلے ہی، وہ گھر سے باہر نکل گیا۔ بغلوں میں ہاتھ دبائے سردی سے ٹھٹھرتا وہ نیوز ایجنٹ کے پاس پہونچا، اس نے اخبار لئے اور سڑکوں پر آوازیں لگانے لگا۔

"آگیا، آگیا، آج کا اخبار آگیا!"

سنسنی خیز خبروں کی سرخیاں چیخ چیخ کر سناتا ہوا وہ تیز تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ ابھی اس کو بہت سے ٹھکانوں پر اخبار لگانا تھا۔ ہر ایسے گھر پر وہ اخبار کھڑکی کے راستے یا دروازے کی دریز سے پھینکتا۔ جہاں دروازہ کھلوائے بغیر چارہ کار نہ ہوتا وہاں وہ آواز لگاتا "اخبار والا" اسی طرح اخبار ڈالتا ہوا، جب وہ ایک گھر پر پہونچا تو آواز لگاتے ہی ایک شخص دروازے سے برآمد ہوا اس وقت وہ تولیا سے چہرہ پونچھ رہا تھا۔ اسکو دیکھتے ہی تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"تم اتنی دیر سے اخبار کیوں لاتے ہو"

شامی نے معذرت شروع کر دی "کل سے جلدی لاؤں گا۔ آج ذرا اخبار دیر سے چھپا تھا" وہ صاف جھوٹ بول گیا۔

وہ شخص غالباً اسکو ڈانٹنے کے لئے طے کئے بیٹھا تھا۔ تیز لہجہ میں بولا "بکواس مت کرو۔ تم اخبار لاتے ہی دیر سے ہو" وہ دیر تک اسپر ناراض ہوتا رہا۔ جب ذرا اس کا غصہ کم ہوا تو شامی نے دبی زبان سے کہا۔

"صاب اس مہینہ کا پیمنٹ ابھی تک نہیں ہوا"

وہ کہنے لگا "آئندہ مہینہ ہوگا۔ یہ اخبار دیر سے لانے کی سزا ہے"

اتنا کہہ کر اسنے دروازہ بند کر دیا۔ زیادہ دیر ٹھہرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ ابھی اسکو بہت سے گھروں میں اخبار پہونچانا تھا۔ اس کے لئے سب سے بڑا مرحلہ، اس انگریز کا بنگلہ تھا جس کے گھر پر ایک خطرناک کتا پلا تھا دیکھتے ہی غرا کر بھونکنا شروع کر دیتا تھا۔ اس کی آواز اس طرح نکلتی تھی۔ جیسے کوئی گنبد کے اندر چیخ رہا ہو۔ جہاں وہ پھاٹک کھول کر اندر داخل ہوا اور وہ دراندڑے سے بھونکتا ہوا جھپٹا۔ ایک بار تو وہ اسپر چڑھ دوڑا تھا۔ ڈر کے مارے شامی کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ انگریز پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں انجینیر تھا اور بل ادا کرنے کے معاملے میں بڑا کھرا تھا۔ کبھی اس کے یہاں پیمنٹ میں پہلی سے دوسری نہیں ہوئی۔ اسی لئے وہ کتے کے خوف کے باوجود پابندی سے اب تک اسکو اخبار دے رہا تھا۔

نو بجے کے قریب جب وہ اخبار بیچ کر تھکا ہارا گھر پہونچا تو ماں نے ذرا دیر کر بھی سیدھی نہ کرنے دی۔ کہنے لگی "جا۔ جلدی سے دوکان چلا جا، آج تیرے باپ کی طبیعت خراب ہو رہی ہے" شامی اسی وقت دوکان پہونچا۔ اس کے باپ کی بازار میں چھوٹی سی بساط خانہ کی دوکان تھی۔ اس وقت وہ دوکان پر بیٹھا کھانس رہا تھا اسنے صرف گھور کر شامی کو دیکھا مگر کوئی بات نہ کی۔ وہ چپ چاپ اس کے برابر جا کر بیٹھ گیا۔

اس وقت دوکان پر کوئی گاہک نہیں تھا۔ ذرا دیر بعد ایک آٹھ نو سال کی لڑکی سیپ کے بٹن خریدنے آئی۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ واپس آئی۔ کہنے لگی سیپ کے نہیں پلاسٹک کے بٹن دے دو۔ شامی نے پلاسٹک کے بٹن دے دیئے مگر چند ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ لڑکی پھر دوکان پر موجود تھی۔ اس دفعہ اسکو بڑے بٹن چاہیئے تھے۔ شامی نے بٹن تو بدل کر دے دیئے، مگر جل کر اس کی کمر میں چٹکی بھرلی۔ وہ تلملا کر چیخی تو باپ کو بھی اس کی حرکت کا پتہ چل گیا۔ اس نے فوراً شامی کو کئی گالیاں دے ڈالیں۔

اس کا باپ دمہ کا پرانا مریض تھا۔ دوکان پر بیٹھا کھانسا کرتا یا اس کو گالیاں دیا کرتا۔ زیادہ غصہ آتا تو شامی کے دو چار چانٹے رسید کر دیتا۔

اب بازار کی چہل پہل کم ہو گئی تھی اور دوپہر کا سناٹا پھیلتا جا رہا تھا۔ اتنے میں برابر والے بساطی نے اس کے باپ سے کہا "اماں دلاور خاں لگتی ہے" یہ جوا کھیلنے کی دعوت تھی۔ شامی کے باپ نے فوراً جواب دیا۔

"یہاں کب انکار ہے۔"

وہ بولا "تو پھر نکالو رقم۔"

شامی کے باپ نے ٹین کے ڈبے سے روپیہ نکالا "یہ رہی رقم۔"

ان کا جوا بھی خوب تھا۔ دونوں نے ایک ایک روپیہ نکالا، اسکو صابن سے دھو کر صاف کیا اور دوکان کے پٹرے پر رکھ دیا۔ پھر دونوں پوری تو جہ سے روپیوں کو دیکھنے لگے کہ مکھی کس کے روپے پر بیٹھتی ہے۔ داؤں کی شرط یہ تھی کہ جس کے روپے پر مکھی پہلے بیٹھ جائے وہ دونوں روپے اٹھائے۔

ذرا دیر بعد ایک مکھی اڑتی ہوئی آئی۔ دونوں بچوں کی سی حرکتیں کرنے لگے۔ شامی کا باپ گردن ہلا ہلا کر کہنے لگا "آؤ آؤ والی ادھر آؤ۔"

دوسری طرف وہ شخص بھی لگا کہنے "اُدھر کہاں چلیں، ارے ذرا ادھر، اے، اے۔"

مکھی اس وقت شامی کے باپ کے روپے پر منڈلا رہی تھی وہ لگا چلّانے "وہ آئی۔ وہ آئی۔ شیخ جی آج تو دونوں روپے اپنی جیب میں گئے۔"

شیخ جی نے فوراً کہا "ذرا تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو" مگر اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ مکھی بھی بڑی ستم ظریف تھی۔ کئی بار شامی کے باپ کے روپے پر بھنبنائی، مگر اس پر بیٹھنے کے بجائے قریب ہی

جاکر بیٹھ گئی۔ شامی کے باپ کے دل کی دھڑکن کئی بار تیز ہوئی، کئی بار مسرت سے اس کی آنکھیں چمکیں مگر بات نہ بنی۔

ادھر شیخ جی کی حالت دگرگوں تھی۔ مکھی اسی طرف چکر کاٹ رہی تھی، ایکبار بھی ادھر کا رُخ نہ کیا۔ مگر وہ برابر اپنے دل کو دلاسہ دیتا رہا۔

"بھائی وہ بیٹھے گی تو سوا روپے پر بیٹھے گی۔ بڑی کھری کمائی کا روپیہ ہے۔"

شامی کا باپ بگڑ کر بولا۔ "اور یہاں تو حرام کی رقم آتی ہے۔"

وہ کہنے لگا "اس وقت تو ابھی چل جائے گا۔"

اتنے میں مکھی پھُر سے اڑ گئی۔ شامی کے باپ نے جل کر کہا "دھت تیری، سالی۔" اس نے ایک موٹی سی گالی مکھی کی ماں کو دی۔ لیکن ذرا سی دیر بعد مکھی پھر بھنبھناتی ہوئی آئی۔ وہی تھی یا کوئی دوسری۔ یہ پتہ چلانا مشکل تھا۔ لیکن اس دفعہ جو آئی تو سیدھی شیخ جی کے روپئے کی طرف۔ وہ اس کو اسطرح چمکارنے لگا جیسے واقعی وہ اس کی بات سن رہی تھی۔ وہ اپنی دھن میں کہتا رہا۔

"آ، آ بیٹی۔ تیج، کھٹی خدا قسم ایک بار تو کلیجہ ٹھنڈا کر دے۔"

مکھی واقعی ان کے چمکارنے میں آگئی۔ اسنے ایک بار پر سمیٹے اور عین روپئے کے اوپر آگئی اسی وقت شامی کے باپ کو کھانسی کا دورہ پڑا اور وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔ مکھی فوراً اڑ گئی۔ شیخ جی بگڑ کر چلانے لگے۔

"لگے تم چوتیاپن کرنے۔ اڑا دیا نہ کھانس کر۔"

وہ سمجھانے لگا۔ "اماں کھانسی آگئی تو میں کیا کروں، وہ سالی تھی ہی نہیں بیٹھنے والی۔"

شیخ جی ابھی تک ناراض تھا۔ "عین موقع پر تمہیں کھانسی آتی ہے۔"

دونوں دیر تک الجھتے رہے۔ شامی ان دونوں بڈھوں کی حرکتوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھتا۔ روانہ دوپہر کو یہ جوا ہوتا اور بہت کم ایسا اتفاق ہوتا کہ کوئی جیت جاتا۔ البتہ دونوں میں تکرار ضرور ہو جاتی۔ اکثر گالی گلوچ تک کی نوبت آ جاتی۔ مگر دوسرے دن جہاں دوپہر ہوئی، دونوں کو ہڑک ہوتی، روپئے نکالے جاتے اور صابن سے دھوکر رکھ دیئے جاتے۔

بہت دیر تک دونوں روپئے پر مکھی بٹھانے کی کوشش کرتے رہے۔ دوپہر کا سناٹا اور بڑھ گیا۔ بازار کی رونق مضمحل ہو گئی آخر انہوں نے اپنے اپنے روپئے اٹھائے اور آنکھیں بند کر کے تھکے ہوئے سے لیٹ گئے۔

دھوپ اب سامنے کے رُخ آگئی تھی۔ شامی نے اٹھ کر دوکان کے سامنے پردہ ڈال دیا۔ اس کا باپ آنکھیں بند کئے سو رہا تھا۔ شامی نے بھی سونے کی غرض سے آنکھیں میچ لیں مگر اسکو نیند نہ آئی۔ دوپہر کے سناٹے میں کبھی کبھی کوئی گاڑی پہیے کھڑکھڑاتی ہوئی گذر جاتی۔ بازار میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، صرف ٹرنک بنانے والے کارخانے میں دھڑا دھڑ کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ خالی بیٹھے بیٹھے شامی کا جی گھبرا گیا۔ اُسنے باپ کی جانب دیکھا وہ بے خبر پڑا خراٹے بھر رہا تھا۔

شامی آہستہ سے اپنی جگہ سے اٹھا اور چپکے سے دوکان کے باہر چلا گیا۔ باہر دھوپ بہت تیز تھی۔ موسم کچھ اس طرح کا تھا کہ سائے میں بیٹھنے سے سردی معلوم ہوتی۔ اور دھوپ میں سورج کی سلگتی ہوئی کرنیں جسم میں سوئیوں کی طرح چبھتی تھیں۔ دوکان سے نکل کر وہ ٹین کے کارخانے کی طرف گیا۔ وہاں اسکے کئی دوست کاریگر تھے۔ سوچا تھا کہ ذرا دیر انکے ساتھ خوب گپ شپ ہوگی۔ مگر اس وقت سیٹھ کارخانے میں موجود تھا۔ کسی کاریگر نے رنگ کا ڈبہ گرا دیا تھا، اسکو چیخ چیخ کر گالیاں دے رہا تھا۔ ویسے وہ دل کا بُرا نہ تھا۔ جب باہر کے بیوپاری کیلئے اسکو ارجنٹ مال تیار کرانا پڑتا، اور کارخانے میں رات رات بھر گیس بتی جلا کر کام ہوتا تو کاریگروں کے ٹھاٹھ ہو جاتے۔ ہر گھنٹہ آدھ گھنٹے کے بعد چائے آتی، سب مل کر چائے پیتے اور کالیتین سے گانا سنتے۔ کالیتین کا رنگ تو توے کی طرح سیاہ تھی مگر آواز میں بڑا رس تھا۔ وہ جھنّو بیا قوال کی چوکی میں ہمنوا تھا اور ہر فلمی گانے کی دھن بڑی آسانی سے اتار لیتا تھا۔

اس وقت کارخانے کی فضا کچھ بگڑی ہوئی تھی۔ سارے کاریگر اپنے اپنے کاموں میں جُٹے ہوئے تھے۔ کسی نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ شامی وہاں سے نکل کر بازار کے نکڑ کی طرف چلا گیا۔ وہاں نیم کا گھنا پیڑ تھا۔ جس کے نیچے کبھی کبھی دوپہر کو راجہ، گھاگر کی گاڑی لا کر ٹھہراتا تھا اور دونوں دھوپ میں بیٹھ کر کپڑوں میں سے جوئیں نکالتے تھے۔ شامی نے سوچا اگر اس وقت راجہ مل جائے تو سگریٹ کے دو چار کش ہی لگانے میں آجائیں گے۔

ابھی وہ کچھ ہی دُور گیا ہوگا کہ اچانک بازار کے بیچ سے مڑنے والی گلی کے اندر ملی جلی آوازوں کا شور ابھرا۔ راجہ لپک کر گلی میں گھس گیا۔ اس نے دیکھا کہ مسجد کے دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا اور سب لوگ اکٹھا بول رہے تھے۔ اُسنے ایک شخص سے معلوم کرنے کی کوشش کی یہ شور کیوں ہو رہا ہے۔ مگر وہ صرف اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ "چور پکڑا گیا ہے۔" چور کا نام سنتے ہی شامی خوفزدہ ہو گیا۔ وہ ہجوم کیطرف نہ گیا۔ ایک بند دوکان کے چبوترے پر چڑھ کر اس طرف دیکھنے لگا۔

شامی نے اب تک چور کو نہیں دیکھا تھا، اس وقت وہ چور کو دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر سامنے ہجوم میں کہیں چور نظر نہیں آرہا تھا۔ سب آدمی ہی آدمی کھڑے تھے۔ دیکھنے میں سب ایک ہی جیسے لگتے تھے۔ کوئی بھی چور نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اسی اثناء میں ایک شخص اس کے برابر آکر چبوترے پر کھڑا ہو گیا۔ شامی نے اُس سے پوچھا۔

"چور کہاں ہے جی؟"

وہ بولا "وہ جو مجمع کے بیچ میں کھڑا ہے۔ وہی چور ہے" اس نے ایک آدمی کی طرف انگلی اٹھا کر اشارہ کیا۔ شامی نے دیکھا لوگ اس آدمی کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ اس کا سر ننگا تھا۔ اور وہ ایک گندی سی واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ ہجوم میں ہر شخص کچھ نہ کچھ بول رہا تھا۔ صرف وہی گردن جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ شامی کو وہ کہیں سے بھی چور نہ معلوم ہوا۔ نہ اس کا چہرہ بے حد ڈراونا تھا۔ نہ اس کی سرخ انگارہ سی آنکھیں تھیں اور نہ بڑی بڑی خوفناک مونچھیں تھیں۔ اس کے ذہن میں چور کا کچھ ایسا ہی تصوّر تھا۔

اس نے پاس کھڑے ہوئے آدمی سے پوچھا "کیا چرایا تھا؟"

وہ ہنس کر بولا "مسجد سے جوتے چرا کر بھاگا تھا۔ نمازی بے چارے تو ظہر کی نماز پڑھ رہے تھے اور یہ سالے خاں ان کے جوتوں کی تاک میں تھے۔"

شامی نے اس آدمی کو ایک بار پھر غور سے دیکھا۔ اس لئے کہ وہ صرف چور نہیں تھا بلکہ اللہ میاں کے گھر میں اس نے چوری کی تھی۔ ابھی وہ چور کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اتنے میں مجمع میں سے ایک ٹھگنا سا آدمی اپنی تہمد سنبھالتا ہوا نکلا اور اسنے چور کے منہ پر کس کے تھپڑ رسید کیا۔ یہ گویا ابتدا تھی۔ پھر تو ہر طرف سے چور پر مار پڑنے لگی۔ طمانچے، مکّے، لاتیں۔ ہر شخص اچک اچک کر اس کو مار رہا تھا اور گندی گندی گالیاں بک رہا تھا۔

اتنے میں ایک بوڑھا سا آدمی وہاں آگیا۔ اس کی لمبی سفید داڑھی تھی۔ اسنے چور کو مار کھانے سے بچا لیا اور سب سے کہنے لگا "اسکو ایسی سزا ملنا چاہئے کہ سب کو عبرت حاصل ہو۔" اس نے سزا کے لئے جو اسکیم بتائی وہ شور میں شامی سُن نہ سکا۔ البتہ اس نے یہ ضرور دیکھا کہ ایک آدمی ہاتھوں میں کالک بھرے ہوئے آیا اور اُسنے چور کا سارا چہرہ کالا کر دیا۔ اب واقعی وہ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ سیاہی کے اندر سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور کچھ کچھ ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد کہیں سے ایک گدھا بھی آگیا۔ چور کو گدھے پر بٹھایا گیا۔ اس کے گلے میں پرانے

جوتوں کا ہار ڈالا گیا گدھے کو ہانک کر آگے بڑھایا گیا۔ پیچھے پیچھے لوگوں کا غول تھا۔ کچھ لڑکے ٹین کا ایک پیپا اٹھالائے تھے۔ اور اس کو زور زور سے بجا رہے تھے۔ جب یہ جلوس اسکے برابر سے گزرا تو وہ بھی اس میں شامل ہوگیا۔ اُسنے کئی بار لڑکوں سے ٹین کا پیپا چھین کر بجایا اور سب کے ساتھ مل کر نعرے لگائے۔ نعرے لگانے والے دو گروہ میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ گلا پھاڑ کر چلاتا۔

"جوتے چور کا"

دوسرا گروہ جواب دیتا "منہ کالا"

جلوس گلی سے نکل کر بازار میں آگیا۔ دوکاندار دوکانوں پر سے اٹھ اٹھ کر چور کو دیکھ رہے تھے۔ جو ذرا زندہ دل تھے وہ دوکانوں سے اتر کر جلوس میں شامل ہو جاتے۔ ہر شخص ہنس رہا تھا جوتا چور گردن جھکائے گدھے پر سوار بیٹھا تھا۔ شامی کو بھی مزہ آرہا تھا۔ ایک دفعہ اُسنے زور سے قہقہہ لگایا قہقہہ کے ساتھ ہی اس کی گدی پر ایک زناٹے کا ہاتھ پڑا۔ شامی چکرا کر گرتے گرتے بچا۔ پلٹ کر دیکھا تو باپ بھوت کی طرح سر پر سوار تھا۔

جوتے چور کا جلوس تو پیپے بجاتا، شور مچاتا آگے بڑھ گیا۔ مگر شامی کے بیچ بازار میں دھڑا دھڑ جوتے پڑنے لگے۔ نہ جانے اسکے باپ کے مریل سے جسم میں کہاں سے قوت آگئی تھی ایسے گن گن کے جوتے مارے کہ شامی بلبلا کر زور زور سے چیخنے لگا۔ دو ایک دوکاندار، دوکانوں سے نکل کر وہاں آگئے۔ بڑی مشکل سے اس کی جان بچی۔

دوکاندار کہہ رہے تھے "ہو گا جانے دو، بچہ ہے اب ایسی حرکت نہیں کرے گا"

اس کا باپ بار بار لوگوں کو ہاتھ سے ہٹا کر اسپر جھپٹتا "میں اس حرامی کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔ اماں ذرا میری آنکھ لگی اور یہ سالا دوکان چھوڑ کر رفوچکر ہو گیا۔ خدا کے گھر کو تو لوگ چھوڑتے نہیں۔ دوکان تو پھر دوکان ٹھہری۔ میاں سویا مرا برابر ہوتا ہے۔ کوئی کچھ اٹھا کر لے جائے تو اس سالے کی گرہ سے کیا جائے گا" وہ چیخ چیخ کر بول رہا تھا اور تیزی کے ساتھ گالیاں دیتا جا رہا تھا۔

آخر لوگوں نے اپنی حفاظت میں لے کر شامی کو دوکان کے اندر پہونچایا۔ اس کے باپ کو قسمیں دیں کہ اب نہ مارنا۔ باپ نے اس کے بعد اسکو مارا تو نہیں۔ البتہ کئی بار مارنے کے لئے اٹھا ضرور اور جب بھی شامی سسکی بھرتا تو وہ ایک زناٹے کی گالی دے ڈالتا۔

وہ دیر تک بیٹھا سسکیاں بھرتا رہا اور باپ کی گالیاں کھاتا رہا۔ سہ پہر ہو گئی۔ بازار کی گہما گہمی بڑھ گئی۔ گاہک بازار میں منڈلانے لگے۔ لوگوں کی ملی جلی آوازیں، اور گاڑیوں کا شور بڑھ گیا۔ اس ہنگامے

میں وہ سب کچھ بھول گیا۔ اور دوکان داری میں ایسا الجھا کہ شام کو اس وقت ہوش آیا جب اسکے باپ نے دوکان بند کی اور اس سے کہنے لگا "میں ایک جگہ کام سے جا رہا ہوں۔ تو سیدھا گھر جانا" اُس نے باپ کی نصیحت پر عمل کیا اور سیدھا گھر کی طرف چل دیا۔

راستہ میں نوشا مل گیا۔ اس وقت وہ بڑا اکڑا اکڑ کر چل رہا تھا۔ شامی کو دیکھتے ہی اُس نے قمیص کی جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور اترا کر بولا "آج تو اپنے ٹھاٹھ ہیں" شامی نے گھر جانے کا ارادہ بدل دیا اور اس کے ساتھ ہو لیا۔

"ابے کہاں سے مار لایا"

نوشا کہنے لگا "مار کہاں سے لاتا، ملے ہیں مجھ کو"

شامی نے پوچھا "کہاں سے مل گئے۔ ابے اکٹھا بیس روپے"

نوشا پھر اترایا "بس مل گئے"

شامی نے مسلم ہوٹل کی جانب اشارہ کر کے کہا "تو پھر ہو جائے کچھ چائے پانی"

"نہیں یار آج نہیں پھر کسی دن"

شامی جل کر بولا "لگے سے سیانپن کرنے۔ ابے تو تو ایک نمبر کنجوس ہے۔ پورے بیس روپے ہیں۔ آٹھ دس آنے بھی خرچ نہیں کر سکتا"

وہ زور سے قہقہہ لگا کر بولا "جابے تو بھی یوں ہی رہا۔ یہ میرے روپے کب ہیں مکان کے کرائے کے روپے ہیں۔ نیاز کو دینے جا رہا ہوں"

شامی کہنے لگا "بھی تو میں بھی سوچ رہا تھا، ایک نہ دو، اکٹھا بیس روپے کہاں سے مار لایا"

نوشا نے اس سے کہا "ابے چلتا ہے ذرا نیاز کی دوکان تک، ذرا دیر کی تو بات ہی ہے"

"چائے پلاؤ تو چلتا ہوں"

مگر نوشا کے پاس چائے پلانے کے پیسے نہیں تھے۔ اس لئے شامی اس کے ساتھ جانے کو آمادہ نہیں ہوا اور سیدھا گھر کی جانب چل دیا۔

۴

نیاز کی دوکان چوراہے سے ذرا ہٹ کر اندر کی طرف تھی۔ پہلے وہ فرنیچر کے ایک کارخانے میں

ملازم تھا، مگر اب کباڑ خانہ کی دوکان کھول لی تھی۔ دوکان کے پچھلے حصہ میں ایک کمرہ تھا جس میں اس کی رہائش تھی۔ بیوی اس کی عرصہ ہوا فوت ہو چکی تھی۔ اولاد بھی اُسنے کوئی نہ چھوڑی۔ شادی کے کوئی دو سال بعد اس کے یہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی تھی، جو نمونیہ میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ وہ شادی کے آٹھ سال تک زندہ رہی اور اولاد کی حسرت لئے ہوئے اللہ میاں کو پیاری ہو گئی۔

نیاز نے دوسری شادی نہ کی وہ کنواروں کی سی زندگی گزار رہا تھا۔ یوں ابھی تک وہ جوان تھا۔ اس کی عمر ۳۵ سے کچھ اوپر ہوگی۔ البتہ جسم میں چربی بڑھ جانے کے باعث وہ اب کسی حد تک بھدا لگتا تھا کام بھی اس کا کچھ ایسا تھا کہ تمام دن گدی پر بیٹھا رہتا۔ صرف اتوار کے روز نیلام میں مال کا سودا کرنے جاتا تھا۔ یا اتفاقیہ کوئی سودا آگیا۔ مگر ایسا کبھی کبھار ہوتا تھا۔ کہنے کو تو وہ کباڑیا تھا، مگر وہ اصل میں کام کرتا تھا، چوری کا مال فروخت کرنے کا۔

اس وقت نیاز کی دوکان میں لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اپنی گدی پر بیٹھا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اتنے میں دوکان کے اندر نوشا داخل ہوا۔ نیاز نے اسکو دیکھ کر پوچھا۔

"کیسے آنا ہوا؟"

نوشا نے چپ چاپ قمیص کی جیب سے دس دس کے دو نوٹ نکالے اور نیاز کو دیتے ہوئے کہنے لگا: "اماں نے دو مہینہ کا کرایہ بھیجا ہے۔"

نیاز نے تیوری پر بل ڈال کر کہا "دو مہینہ کا کیوں۔ سارا حساب انہوں نے کیوں نہیں ادا کیا؟"

نوشا نے ماں کی ہدایت کے مطابق عذر پیش کرتے ہوئے جواب دیا "اماں نے کہا ہے کہ جلدی بقیہ دونوں مہینوں کا کرایہ بھی آپ کو پہونچ دیا جائے گا۔"

نیاز کہنے لگا: "ان سے کہنا کہ جلدی پہونچا دیں" اسکے لہجے سے یہ بات صاف واضح ہو رہی تھی کہ دو ماہ کا کرایہ مل جانے سے وہ کسی حد تک مطمئن ہو گیا ہے۔ یوں نیاز اپنے مکانوں کا کرایہ وصول کرنے کے معاملہ میں بڑا سخت تھا۔ محلہ میں اسکے دو مکان تھے جو اس نے ایک ہندو بنئے سے بڑے سستے داموں میں خرید لئے تھے اس لئے کہ فسادات کی خبروں سے وہ بڑا سہما ہوا تھا اور کسی نہ کسی طرح ساری جائیداد فروخت کر کے بمبئی جانا چاہتا تھا، جہاں اسکے بال بچے پہلے ہی پہونچ چکے تھے۔

کرائے کے روپئے لے کر نیاز یونہی پوچھ بیٹھا: "آج کل کیا رہا ہے تو؟"

نوشا نے جواب دیا "عبداللہ مستری کے کارخانے میں کام سیکھ رہا ہوں۔"

نیاز نے حیرت سے کہا" اچھا، کب سے ؟"

" چھ، سات مہینے ہو گئے اب تو بیس روپے تنخواہ بھی لگ گئی ہے "

نیاز کہنے لگا " یہ بہت اچھا ہوا، مگر وہ عبداللہ سالا تو بڑا بدمعاش آدمی ہے سنا ہے کاریگروں کو بہت مارتا پیٹتا ہے۔ مگر کام اسنے اچھا جانا ۔ جب یہاں آیا تھا تو ڈپٹی صاحب کے یہاں کلینر تھا۔

نوشا خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔ ذرا دیر بعد جب وہ اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا تو نیاز نے اسکو نظر بھر کر دیکھا اور آہستہ سے بولا" ہتے چڑھ جائے تو کبھی کبھار موٹر کا کوئی پرزہ اٹھا لایا کر۔ اس سالے کا مال کھانا تو ثواب ہے۔ گھر لے جانے کی ضرورت نہیں۔ بس سیدھا میرے پاس آجایا کر ۔ تیرا چائے پانی کا خرچہ نکل آئے گا۔ اور میں نے سنا ہے کہ تو تو سنیما دیکھنے کا بہت شوقین ہے۔ بول کیا کہتا ہے "

نوشا کو فوراً عبداللہ مستری کا خونخوار چہرہ یاد آگیا۔ کہنے لگا " مستری جی کو کہیں پتہ چل گیا تو میری کھال ادھیڑ ڈالیں گے "

نیاز اس کو بہلانے لگا " ابے جب اسکو پتہ لگے تب۔ بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے دوپہر کا کھانا تو کارخانے ہی جاتا ہوگا ۔ واپسی میں کھانے کے خالی ڈبے میں کوئی پرزہ یا اوزار اٹھا کر رکھ لیا۔ اور چپ چاپ نکل آئے ۔ کسی سالے کے باپ کو پتہ نہیں لگے گا۔

مگر نوشا آمادہ نہ ہوا۔ برابر عبداللہ مستری کی مار کا ڈر بتا کر انکار کرتا رہا۔ نیاز نے جل کر اسکو ایک سڑی ہوئی گالی بھی دی جسکو خاموشی سے سنکر وہ دوکان سے باہر آگیا۔

بازار سے گزر کر جب وہ گلی میں داخل ہوا تو اسنے دیکھا میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے محلہ کے لڑکے جمع تھے۔ ممدو جو ہوٹل میں کام کرتا تھا، مزے سے بیٹھا ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔ اسکے چاروں طرف لڑکے بیٹھے باجا سن رہے تھے، ان میں راجہ بھی تھا۔ نوشا پر ممدو کا بڑا رعب پڑا۔ وہ بھی چپ چاپ جا کر بیٹھ گیا ممدو ایک فلمی دھن بجا رہا تھا۔ باجے میں بالکل صاف بول نکل رہے تھے۔

ذرا دیر بعد اسنے ماؤتھ آرگن بجانا بند کر دیا۔ اور منہ صاف کرکے کہنے لگا" بس بھئی کھیل ختم پیسہ ہضم" سب لڑکے اصرار کرنے لگے اور ممدو کو ان کے اصرار میں مزا آرہا تھا۔ نوشا نے اس سے پوچھا۔

" اماں کتنے کا خریدا تم نے یہ باجا ؟"

وہ بڑے فخریہ لہجہ میں بولا" نقد چھ روپے خرچ کئے تھے ۔ کیا سمجھے" چھ روپے کا نام سنکر نوشا تو خاموش ہو گیا۔ اتنے روپے وہ کہاں سے لاتا۔

تب لڑکوں نے بہت اصرار کیا تو اسنے ایک نئی دھن بجائی۔ سب مزے میں آکر گردن ہلانے لگے۔ ممدبا جا بجاتے بجاتے ایک دم اٹھ کر بھاگ گیا سب اسکو دیکھتے ہی رہ گئے۔ راجہ نے جل کر اسکو کئی گالیاں دیں اور نوشا سے کہنے لگا۔

"ابے تھیٹر چلتا ہے"

نوشا فوراً تیار ہو گیا۔ کہنے لگا "چلو"

راجہ ہنس پڑا "ابے اپنی تو گاڑی ابھی ٹوٹی پڑی ہے۔ کل بڑھئی نے دینے کا وعدہ کیا ہے پہلے ایک روپیہ لے آ پھر بات ہو گی۔ ابھی شامی ملا تھا۔ اس سے بھی میں نے کہہ دیا ہے۔ کل رات چلنے کا پروگرام ہے"

نوشا خوش ہو کر سوچنے لگا کہ ایک روپئے کا کہاں سے بندوبست کرے۔ راجہ تھیٹر کی تعریف کرنے لگا "کل تو شیریں فرہاد کا کھیل ہے۔ دیکھے گا تو آنکھیں کھل جائیں گی۔ جب فرہاد، شیریں میری پیاری شیریں کہہ کر بیلچہ سر پر مار کر مرجاتا ہے تو رونا آجاتا ہے" راجہ نے پوری اداکاری کے ساتھ یہ جملے کہے۔

نوشا نے حیرت سے کہا "تو کیا وہ سچ مچ مرجاتا ہے؟"

راجہ ہنس کر بولا "تو بھی بس یونہی رہا۔ کہیں وہ سچ مچ مر سکتا ہے۔ یہ تو ایکٹنگ ہے ایکٹنگ"

نوشا ابھی تک حیرت زدہ تھا "کمال ہے بھئی"

راجہ کہنے لگا "یہی نہیں، بتلی جان کا ڈانس دیکھے تو مزا آجائے گا۔ سالی بالکل ننگی ناچتی ہے"

نوشا چونک کر بولا "ننگی ناچتی ہے؟"

"بس ذرا سی جانگیہ پہنے رہتی ہے۔ سالی کی گوری گوری رانیں روشنی میں ایسی چمکتی ہیں کہ یار طبیعت خراب ہو جاتی ہے"

نوشا نے شرما کر اس کو ڈانٹا "سالے تو بہت بدمعاش ہو گیا ہے" مگر بتلی جان کی گوری گوری رانیں دیکھنے کے لئے اس کا بھی دل تڑپ رہا تھا۔

راجہ بڑی دیر تک تھیٹر کی ایک ایک تفصیل بتاتا رہا۔

اس وقت تو نوشا خاموش چلا گیا۔ مگر دوسرے دن وہ کارخانے سے نکلا تو سید ہا نیاز کی دوکان پر پہونچا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر موٹر کا ایک پرزہ نیاز کے سامنے ڈال دیا۔ نیاز نے اسکو الٹ پلٹ کے دیکھا اور کہنے لگا۔

"ابے تو بھی کیا کاٹ کباڑ اٹھا لایا۔ کسی بڑھیا چیز پر ہاتھ مارا ہوتا"

نوشا نا امید سا ہو گیا۔ مگر جب نیاز نے اسکو ڈیڑھ روپیہ گن کر دیا تو خوشی کے مارے اس کا چہرہ سُرخ پڑ گیا۔ نیاز نے اسکو شاباشی بھی دی اور اس بات پر مادہ کیا کہ آئندہ وہ قیمتی پرزہ چرا کر لائے۔

نوشا وہاں سے سیدھا گلی میں پہونچا۔ راجہ پہلے ہی موجود تھا۔ اُسنے جاتے ہی اسکو ڈیڑھ روپیہ دکھایا۔ دونوں نے اسی وقت تھیٹر جانے کا پروگرام بنایا۔ راجہ بھی اس روز ایک روپیہ لایا تھا اب شامی کا انتظار تھا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ دونوں اسکے گھر کی طرف چل دیئے۔ قریب پہونچے تو گھر کے اندر اودھم مچا تھا۔ شامی چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اور اس کا باپ گالیاں دے رہا تھا۔ راجہ نے سرگوشی کے انداز میں نوشا سے کہا۔

"معلوم ہوتا ہے شامی سالا پکڑا گیا۔ اس کی ٹھکائی ہو رہی ہے۔"

نوشا نے کہا "رونے کی تو آواز آ رہی ہے، چلو یار، اس کے آباتے کہیں دیکھ لیا تو ہم دونوں کو بھی گالیاں دینگے۔"

دونوں چپ چاپ واپس لوٹ آئے اور پتلی جان کی ننگی ننگی رانیں دیکھنے تھیٹر کی جانب چل دیئے۔

تھیٹر سے واپسی پر صبح ہو گئی جیسے ہی دونوں گلی کے اندر داخل ہوئے، کہیں نزدیک ہی مرغ نے بانگ دی۔ نوشا سہم کے رہ گیا۔ راجہ تو اسکو دیوار پر چڑھا کر اپنی کھولی میں چلا گیا۔ مگر نوشا دیوار پر سے کود کر جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا، ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اُسنے نوشا کی پیٹھ پر ایک ایسا دو ہتڑ مارا کہ وہ فرش پر گر پڑا۔ پھر تو اسنے چیخ چیخ کر کوسنے دینا شروع کئے تو سب کی آنکھ کھل گئی۔

چند ہی روز بعد نوشا نے کارخانے سے ایک اور پرزہ اڑایا اور سیدھا نیاز کے پاس پہونچا۔ روپیہ دھیلی، جو کچھ اُسنے دیا، جیب میں ڈالا اور راجہ کو ساتھ لیکر مسلم ہوٹل میں بیٹھ کر ریڈیو سے فلمی گانے سنے اور چائے اور بسکٹ اڑائے۔

اس کے بعد تو اس کا یہ معمول ہو گیا کہ کارخانے کی چھٹی سے پہلے، وہ سب کی نظریں بچا کر، کوئی پرزہ یا اوزار، ناشتہ دان کے خالی ڈبے میں ڈال کر پھاٹک سے باہر نکل آیا اور گھر جانے کے بجائے پہلے نیاز کی دوکان پر جاتا۔

انہی دنوں ایک روز رات کے وقت، جب سلطانہ اور اس کی ماں کمرہ کے اندر بیٹھی جلدی جلدی بیڑیاں تیار کر رہی تھیں۔ اچانک دروازہ پر کسی نے دستک دی۔ اُنہوں نے باہر جا کر دیکھا، دروازہ

پر نیاز کھڑا تھا۔ اُسنے نیاز کی آمد کی اطلاع ماں کو دی، تو اسنے بیڑی بنانے کا سامان فوراً وہاں سے ہٹا دیا۔ اس لئے کہ نیاز کی بیوی سلطانہ کی سگی ماموں زاد بہن تھی۔ اس رشتہ سے وہ نوشا کی ماں کا بھتیج داماد لگتا تھا۔

نیاز نے کمرے میں آکر نوشا کی ماں کو سلام کیا اور اسکے قریب ہی دری پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت کمرے میں سلطانہ داخل ہوئی اسنے دوپٹہ کو سر سے ڈھک کر، شرماتے ہوئے کہا "دولھا بھائی سلام" نیاز نے اسکو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ بہت عرصہ بعد اس گھر میں آیا تھا۔ دبی سوکھی مریل سی لڑکی، جو بال بکھرے گھر بھر میں دھیڑ دھیڑ کد کڑیاں بھرتی پھرتی تھی، اب چھوٹ چھٹا کر، پتھر کے مجسم کی طرح سڈول ہو گئی تھی، اس کی آنکھوں میں ستاروں کی جھلملاہٹ اور چہرے پر چاندنی کی چھوٹ پڑ رہی تھی۔

نیاز نے دل ہی دل میں سوچا، یا اللہ، یہ لڑکی تو اب قیامت بن گئی ہے اس روز وہ اپنا سکنڈ ہینڈ امریکن کوٹ پہنے تھا جس کی شکنیں چغلی کھا رہی تھیں کہ اسکو دو ہی ایک دن پہلے خریدا گیا تھا۔ سر پر سیاہ اون کی جناح کیپ تھی اور گلے میں گلوبند لپٹا ہوا تھا۔ کباڑیوں کی اصطلاح میں وہ اس وقت بالکل ٹنا ٹن نظر آ رہا تھا۔

نیاز آیا تھا تو کرایہ کا تقاضہ کرنے، مگر سلطانہ اس کی نظروں میں کچھ ایسی کھب گئی کہ وہ کرائے کا سوال تک زبان پر نہ لایا۔ بلکہ جب نوشا کی ماں نے دو ماہ کا کرایہ بروقت نہ پہونچنے پر شرمندگی کا اظہار کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

"جب جی چاہے بھیج دیجئے گا۔ مجھے معلوم ہے کہ آجکل آپ کا ہاتھ تنگ ہے۔"

وہ کہنے لگی "میں رانڈ بیوہ کسی نہ کسی طرح ان بچوں کا پیٹ پال رہی ہوں۔ نوشا تو روزگار سے لگ ہی گیا، اب یہ شامی بھی پڑھ لکھ کر کہیں نوکری کرے، تو میں سمجھوں گی اس گھر کے دلدر دور ہو گئے۔"

نیاز نے فوراً اسکی ڈھارس بندھائی "آپ پریشان نہ ہوں جس بات کی تکلیف ہو آپ مجھ سے کہلوا دیا کریں۔ بشرطیکہ آپ مجھ کو اپنا سمجھیں۔ ورنہ مرنے والی کے ساتھ سب ہی نے مجھ سے آنکھیں پھیر لیں۔ حالانکہ میں تو آج بھی آپ لوگوں کو ویسا ہی مانتا ہوں۔"

نوشا کی ماں نے اس کی سعادت مندی پر بڑی بوڑھیوں کی طرح دعائیں دیں۔ پاندان سے پان بنا کر، اس کو کھلایا اور دیر تک اپنی مصیبتوں کا دکھڑا سناتی رہی۔ نیاز خاموش بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا تھا کے سامنے ہی سلطانہ، ماں کے برابر بیٹھی تھی۔ وہ بار بار اس کی جانب دیکھتا رہا۔ ایک دفعہ جب سلطانہ نے بھی شرمائی ہوئی نظریں اس کی جانب اٹھائیں تو نیاز کا سارا بدن سن سے ہو گیا، اُسنے کوٹ کے بٹن کھول دیئے

اور سینہ تان کر نوجوان پٹھوں کی طرح ذرا ترچھا ہو کر، اکڑ کے بیٹھ گیا۔ کسی شوقین مزاج سے اُسنے سُن رکھا تھا کہ عورت پیسے کوڑی پر اتنا نہیں ریجھتی، جتنا مرد کے جسم پر مرتی ہے۔

دوکان سے وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ کھڑے کھڑے بات کر کے چلا آؤں گا۔ مگر اس کا وہاں ایسا دل لگا کہ اٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ سامنے سلطانہ بیٹھی تھی اور اس کی گدرائی ہوئی جوانی نے ایسا لاسا لگایا تھا کہ نیاز، شکرے کی طرح پھنسا ہوا پر پھڑپھڑا رہا تھا۔

اس روز وہ نوشا کے گھر سے باتیں کر کے نکلا تو رات خاصی بھیگ چکی تھی۔ ہر طرف سناٹے کا راج تھا اور سنسان گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے۔ اپنا کمرہ اس کو خالی، خالی اور ویران معلوم ہو رہا تھا۔

ایک روز ناغہ کر کے تیسرے دن وہ پھر نوشا کے گھر پہونچا۔ اس روز وہ اپنے ہمراہ جھوٹے موتیوں کا ایک ہار بھی لیتا گیا۔ ہار بڑی نفاست سے تیار کیا گیا تھا جس کو نیاز نے انگلستان واپس ہونے والے کسی انگریز خاندان کے سامان سے نیلام میں خریدا تھا۔ اور عرصے اس کے کباڑ خانے کی الماری میں پڑا تھا۔

نیاز نے ڈبہ کھول کر نوشا کی ماں کے سامنے رکھ دیا اور جھجکتے ہوئے بولا "آج ایک شخص زبردستی یہ ہار میرے سر چپکا گیا۔ دیکھئے کیسا ہے؟"

ماں نے ہاتھ میں اٹھا کر اسکو دیکھا اور تعریف کرنے لگی "بڑا خوبصورت بنا ہے" سلطانہ ذرا دیر تک تو اسکو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی مگر الھڑ لڑکی سے ضبط نہ ہو سکا۔ اُسنے ماں کے ہاتھ سے ہار لیا۔ لمحہ بھر کے لئے اسکو دیکھا اور گلے میں پہن کر ماں سے بولی۔

"کیسا لگ رہا ہے اماں؟"

ماں نے اسکو فوراً ڈانٹا "تجھ کو کسی کے آگے کی بھی غیرت نہیں، کیسے جلدی مٹکا کر بیٹھ گئی۔ اتار کمبخت، آنکھیں نکالے کیا دیکھ رہی ہے۔"

نیاز کو موقعہ مل گیا کہنے لگا "پہنے رہنے دیجئے۔"

مگر سلطانہ نے بجھے ہوئے دل سے ہار اتار کر ڈبے میں رکھ دیا۔ نوشا کی ماں نیاز سے کہنے لگی "تمہاری بات دوسری ہے۔ تم گھر کے آدمی ٹھہرے۔ مگر لڑکیوں میں یہ عادت نہیں ہونا چاہئے۔ کسی اور کے سامنے یہ ایسی حرکت کر بیٹھتی تو وہ کیا کہے گا۔ میں لڑکیوں کو سر پر چڑھانے کی قائل نہیں ہوں۔ اولاد کو نوالہ کھلائے سونے کا مگر دیکھے ہمیشہ قہر کی نظر۔ تب ہی وہ دبے دبائے رہتے ہیں۔ ورنہ یہ آج کل کی اولادیں تو

آفت کی پر کار ہیں" نوشا کی ماں نے اولاد کی تربیت پر اپنا لکچر ختم کیا تو نیاز بولا۔

"اب اِسنے پہن لیا ہے تو اسی کو دیدیجئے"۔

وہ پوچھنے لگی" کتنے کا لیا تم نے ؟"

نیاز ہنس کر کہنے لگا" کیا کیجئے گا پوچھ کر۔ میں اب اس کی قیمت تو آپ سے لینے سے رہا"

وہ دیر تک اصرار کرکے خاموش ہوگئی۔

اس کے بعد دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس روز بھی وہ رات گئے واپس گیا اب اس کا یہ معمول ہوگیا کہ رات کا کھانا ہوٹل سے کھاکر، ہر دوسرے تیسرے دن نوشا کے گھر چلا جاتا اور گھنٹوں اس کی ماں سے باتیں کیا کرتا۔

ایک روز جو وہ آیا تو نوشا کی ماں پڑوس میں کسی کے یہاں گئی ہوئی تھی۔ نوشا حسب معمول گھر سے غائب تھا۔ گھر میں صرف سلطانہ تھی اور انو، جو لالٹین کے پاس پڑھتے پڑھتے وہیں لڑھک کر سوگیا تھا۔ سلطانہ نے اس سے اِدھر اُدھر کی دو ایک باتیں کیں اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ نیاز نے پوچھا۔

"بیٹھو کہاں چلیں"

وہ بولی" اماں کو بلانے جارہی ہوں، سامنے والے گھر میں تو گئی ہیں"

وہ باہر جانے کے لئے مڑی تو نیاز نے ہاتھ بڑھاکر اس کی کلائی پکڑلی۔ ہاتھ کچھ ایسا بے ڈھب پڑا کہ کلائی کی تمام چوڑیاں چھن چھنا کے ٹوٹ گئیں۔ وہ منہ بگاڑ کر بولی" لیجئے آپنے ساری چوڑیاں توڑ ڈالیں، کل ہی تو پہنی تھیں" نیاز ہنس کر بولا۔

"اور پہن لینا"

وہ آہستہ سے بولی" بڑی مشکل سے تو اماں نے اب کی چوڑیاں پہنائی تھیں۔ آپ نے میرا ہاتھ ننگا کردیا۔ اماں دیکھیں گی تو میرا فضیحتہ کرکے رکھ دیں گی" اس کا چہرہ ایکبارگی افسردہ ہوگیا۔

نیاز کی جیب میں اس وقت کئی سو کے نوٹ موجود تھے۔ اسنے نوٹوں کی گڈی نکال کر اس کے سامنے کردی "تم اتنا پریشان کیوں ہورہی ہو، تو کتنے کی چوڑیاں پہنو گی" سلطانہ نے کبھی اتنے نوٹ نہیں دیکھے تھے۔ اس کی آنکھوں سے حیرت جھلکنے لگی۔ لمحہ بھر بعد جب وہ استعجاب سے چونکی تو بڑی بے نیازی سے کہنے لگی۔

"جی نہیں مجھے آپکے روپے نہیں چاہئے"

نیاز نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا" مگر تم بیٹھو تو۔ میں تمہیں کاٹ تو نہیں کھاؤں گا"

وہ شرمائی ہوئی سی، اس سے ذرا ہٹ کر وہیں دری پر بیٹھ گئی۔ لالٹین کی زردی مائل دھندلی، دھندلی روشنی میں وہ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ آنکھوں پر جھکی ہوئی لانبی لانبی پلکیں، رخساروں پر کندن کی سی چمک، سمٹتا اور پھیلتا ہوا سڈول جسم، نیاز نے اسکو اس عالم میں دیکھا تو بے قابو ہوگیا۔ کہنے لگا۔

"ایک بات کہوں؟"

وہ آہستہ سے بولی "کہئے"

نیاز جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اس سے کہا نہ گیا۔ الجھی ہوئی سانس بھر کر بولا "تمہاری اماں سے بات کروں گا"

سلطانہ بات کی تہہ تک نہ پہونچ سکی۔ کہنے لگی "مجھ سے کہنے میں کچھ حرج ہے۔"

نیاز نے نظر بھر کر اسکو دیکھا "سلطانہ تم مجھ کو بڑی اچھی لگنے لگی ہو" وہ بڑی سادگی کے ساتھ اپنی بات کہہ گیا۔ سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی انگلی سے پیروں کے ناخن توڑتی رہی۔ نیاز کہنے لگا۔

"تم نے میری بات کا برا تو نہیں مانا"

"اس میں برا ماننے کی کونسی بات"

لڑکی بڑی تیز تھی۔ اس بات کو نیاز نے بھی محسوس کیا۔ لمحہ بھر رک کر بولا "تمہیں معلوم ہے میں یہاں روز روز کیوں آتا ہوں" وہ اس وقت اس سے سب کچھ کہدینا چاہتا تھا۔

وہ بے نیازی سے بولی "مجھے کیا معلوم"

"اور جو میں یہ کہوں کہ میں صرف تمہاری خاطر یہاں آتا ہوں تو"

اسنے تڑاخ سے جواب دیا "بالکل جھوٹ"

نیاز ہنس پڑا "اب تم کو کیسے یقین دلاؤں"

"واہ، بیٹھے اماں سے باتیں کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے لئے آتے ہیں"

نیاز برابر ہنستا رہا "لیکن میری آنکھیں تو برابر تم کو ڈھونڈتی رہتی ہیں" نیاز اسوقت بڑے شاعرانہ موڈ میں تھا۔ سلطانہ نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"میرے قریب آکر بیٹھو تو بتاؤں"

اسنے انکار میں گردن ہلادی "میں یہیں ٹھیک ہوں"

سلطانہ کی ایک ایک ادا اس کو ڈسے جا رہی تھی۔ خوشامد کرنے کے انداز میں بولا "تو پھر میں تمہارے پاس آجاؤں"

وہ اسی تیزی کے ساتھ بولی "آپ وہاں بیٹھے کیا بُرے لگ رہے ہیں"

نیاز نے اسکو پھر چھیڑا "اچھا ذرا میری طرف تو دیکھو"

وہ آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگی "لیجئے"

نیاز اس کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بڑی بے صبری سے بولا "ہائے" دل کی بات ٹھنڈی سانس کے ساتھ بہہ گئی۔ اسی وقت دروازہ کھول کر سلطانہ کی ماں گھر کے اندر داخل ہوئی۔ نیاز سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ماں نے اس کو دیکھا تو کہنے لگی۔

"ارے تم کب آئے، میں تو برابر والے مکان میں تھی۔ بلوا لیا ہوتا"

وہ صاف جھوٹ بول گئی "آئے ہوئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی"

ماں کہنے لگی "اے سلطانہ تو نے اپنے دولھا بھائی کو پان بھی کھلایا" اس نے پاندان کھولا اور پان لگانے لگی۔

پان کھا کر دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ سلطانہ ذرا دیر تک تو وہاں بیٹھی رہی۔ پھر اٹھ کر اپنے بستر میں جا کر دبک گئی۔ نیاز اس روز بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ بات بات پر ہنس پڑتا تھا۔ آخر تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔

## ۵

نیاز کی دوکان میں لیمپ جل رہا تھا۔ وہ اس وقت ایک آدمی سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ کسی مال کا سودا ہو رہا تھا، جو کسی طرح طے نہ ہوتا تھا۔ نیاز سو روپے سے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ اور وہ شخص بضد تھا کہ ایک سو دس سے کم نہیں لوں گا۔ نیاز نے آخری قیمت لگا دی۔

"پانچ اور بڑھا لو۔ پسند آئے تو دے دو نہیں تو دوسری جگہ دکھا دو۔ مگر ایک یاد رکھنا، اگر دوسری جگہ بھی یہی دام لگیں تو یہیں دے جانا"

وہ آدمی بولا "بیچوں گا تو تمہارے ہی ہاتھ اور پورے ایک سو کس لوں گا۔"
نیاز نے صاف انکار کر دیا "نہیں بھئی اتنی گنجائش نہیں۔"
اس شخص نے جیب سے دو گھڑیاں نکالیں اور اس کے سامنے ڈال دیں" خدا قسم بازار میں صرف ایک کی قیمت دو سو سے زائد ہے۔ روز ہم تمہاری بات مان لیتے ہیں۔ آج ہماری بات ہی سہی۔
نیاز نے گھڑیاں اٹھا کر ایک بار پھیر الٹ پلٹ کر دیکھیں اور اس سے کہنے لگا" دیکھنے میں تو قیمتی لگتی ہیں۔ مگر ان کا نکالنا مشکل ہے۔ سالا ہر وقت پولیس کا خطرہ۔ چوری کا مال سمجھتا تم کوئی آسان کام سمجھتے ہو۔"
وہ بولا" یار نیاز تم اپنے ساتھ ٹرکیں نہ کیا کرو۔ تمہارے ساتھ آنے میں کوئی نقصان تھوڑی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے ان ہاتھوں سے تم کو ہزاروں کا مال دے چکا ہوں۔ ہر وقت بحث نہیں ہوتی۔ لاؤ نکالو سیدھے ہاتھ سے روپئے۔"
وہ اپنی بات پر اڑا رہا" ہوں گے وہی ایک سو پانچ۔"
"لا یار نکال، جو تیرا جی چاہے۔"
نیاز نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی۔ اور ایک سو پانچ روپئے گن کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ آدمی بولا" اماں چائے پانی کو تو کچھ دلا دو" نیاز نے اٹھنی اور دے دی۔ وہ جل کر بولا۔
"لو یہ بھی لو۔ تمہارے اسی بیچڑ پن سے مجھے چڑ ہوتی ہے۔"
وہ شخص بے حیائی سے ہنسنے لگا۔ اُسنے نوٹ گن کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھے اور دوکان سے باہر چلا گیا۔ نیاز نے گھڑیوں کو لالٹین کے قریب لے جا کر غور سے دیکھا۔ بالکل نئی تھیں پھر اُس نے دونوں گھڑیوں کو کمرے کے اندر جا کر الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔
کمرے سے باہر آ کر اُس نے دیکھا تو نوشا وہاں بیٹھا تھا۔ اس روز وہ موٹر سائیکل کے انجن کا پرزہ لایا تھا۔ نیاز نے پرزہ کو صرف ایک نظر دیکھا اور جیب سے دس روپئے کا ایک نوٹ نکال کر نوشا کو دیا۔
"جاؤ عیش کرو۔"
نوشا نے پورے دس روپئے کا نوٹ دیکھا تو وہ گھبرا سا گیا۔ جب اُس نے نوٹ سنبھالا تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ نیاز نے اس کی گھبراہٹ کو بھانپ لیا تھا۔ اسنے فوراً ہوٹل سے چائے منگوا کر اس کو پلائی اور کچھ دیر تک عبداللہ مستری کے متعلق اس سے باتیں کرتا رہا۔

نوشا دکان سے نکل کر فوراً میونسپلٹی کی لالٹین کے پاس پہونچا۔ جہاں روزانہ راجہ سے اسکی ملاقات ہوتی تھی۔ اس وقت راجہ تو وہاں نہیں تھا۔ البتہ شامی موجود تھا۔ شامی نے اسکو دیکھتے ہی کہا کہ راجہ کالے صاحب کے گھر تمبولا کھیلنے گیا ہے۔ اور یہ کہہ گیا ہے کہ نوشا کو وہیں لیتے آنا۔ نوشا کے پاس اس وقت دس روپے تھے۔ اُسنے سوچا آج تو ٹھاٹھ سے تمبولا کھیلوں گا۔ وہ گھر بھی نہیں گیا۔ شامی کے ہمراہ سیدھا کالے صاحب کے گھر کی طرف چلدیا۔

کالے صاحب کا گھر کوئی فرلانگ سوا فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ بیچ میں دو گلیاں پڑتی تھیں اس کے بعد عیسائیوں کا محلہ شروع ہوتا تھا۔ وہیں کالے صاحب کا گھر تھا۔ دونوں جب وہاں پہونچے تو سرنگ کی طرح لمبے کمرے میں، بوسیدہ بنچوں پر بہت سے آدمی بیٹھے تھے۔ ایک بڑا سا گیس کا ہنڈا جل رہا تھا۔ کمرے کے اندر تمباکو کا دھواں ہر طرف منڈلا رہا تھا۔ سامنے چبوترے پر کالے صاحب، اونچی باڑہ کی ہیٹ لگائے ہاتھ میں جادوگروں کی طرح ایک سیاہ چھڑی لئے کھڑا تھا۔ اس کے سامنے میز رکھی تھی۔ جس پر ایک تھیلا پڑا تھا، چار پانچ سال کا ایک گول مٹول سا بچہ تھیلے کے اندر سے پرچیاں نکال کر دیتا جا رہا تھا جن پر لکھے ہوئے نمبروں کو کالے صاحب، سرکس کے مسخروں کی طرح گردن مٹکا مٹکا کر، اونچی آواز سے بول رہا تھا۔

کمرے میں ایک طرف بنچ پر راجہ بھی بیٹھا تھا۔ کالے صاحب نمبر بولتا، کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگ ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذ پر پنسل سے جلدی جلدی نمبر کاٹتے۔ کسی کو تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ ہر شخص کے کان کالے صاحب کی آواز پر لگے تھے، جو دھڑا دھڑ نمبر بولتا جارہا تھا۔ اتنے میں ایک موٹے تگڑے سیاہ فام آدمی نے ہاتھ اٹھادیا۔ کسی دل جلے نے چیخ کر کہا " دہت تیری کی " کمرے کے اندر اسکی آواز دیر تک گونجتی رہی۔

شامی نے راجہ کو آواز دی۔ اسنے پلٹ کر دونوں کی جانب دیکھا اور اٹھ کر ان کے پاس آگیا۔ نوشا نے تمبولا کھیلنے کا ارادہ ظاہر کیا تو راجہ نے اسکو ڈانٹ دیا " یار یہ کالے صاحب ایک نمبر کا بے ایمان ہے۔ سالا ضرور گڑبڑ کرتا ہے۔ اس روز وہ شام سے بیٹھا تمبولا کھیل رہا تھا۔ اور برابر ہار رہا تھا۔

کالے صاحب کے مکان پر ہر سنیچر کی شام کو تمبولا ہوتا تھا۔ راجہ کئی ہفتوں سے وہاں جارہا تھا اور ہر بار ہار کر آتا تھا۔ تمبولا کھیلنے کے لئے وہ ہفتہ بھر تک پیسہ جمع کرتا تھا۔ اور سب وہاں جاکر ہار آتا تھا۔ اور اسکے بعد کالے صاحب کو گالیاں دیتا تھا۔

نوشا کا دل تمبولا کھیلنے کو پھڑک رہا تھا۔ اُسنے دبی زبان سے کئی بار اصرار بھی کیا۔ مگر راجہ کے سامنے اُس کی ایک نہ چلی۔ وہاں سے نکل کر جب تینوں باہر آئے تو نوشا نے راجہ کو دس روپے کا نوٹ

دکھا یا۔ راجہ پر بڑا رعب پڑا۔ ذرا دیر کے لئے تو وہ چکرا گیا۔ پھر حیرت زدہ ہو کر بولا۔

"ابے آج تو تو بڑی لمبی رقم لے آیا۔"

نوشا نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی "اسی لئے تو تمبولا کھیلنے کو کہہ رہا ہوں۔"

راجہ نے اس دفعہ بھی اس کی خواہش کا گلا دبا دیا "ابے تمبولا میں کیا رکھا ہے۔ میں تو ہنگی کو دیکھنے چلا آیا تھا، پر سالی آج وہ آئی نہیں۔"

نوشا نے جھینپتے ہوئے کہا "یار تو اس کی تعریف تو بہت کرتا ہے، کسی دن اسکو دکھا تو دے۔"

شامی بیچ میں بول اٹھا "ابے کیا کرے گا دیکھ کر، میری دوکان پر سالی روز سودا خریدنے آتی ہے۔ ایک دم واہیات ہے، بالکل کالی کلوٹی ہے۔" راجہ کو اس کی بات سخت ناگوار گزری۔ اسنے گھور کر شامی کو دیکھا۔ اور جل کر کہنے لگا۔

"سالے تمہاری وہ عشو تو جیسے اپنے وقت کی مدھو بالا ہے۔ سالی بھینگی کہیں کی۔"

نوشا کو ان کی باتیں سنکر شدید احساس ہوا۔ بڑی بے بسی سے بولا "یار تم دونوں نے تو ایک ایک معشوق چھانٹ لیا، یہاں تو سالی کوئی کالی کلوٹی بھی نہیں ملتی۔" دونوں اس کی سادگی پر بیساختہ ہنس دیئے۔ شامی کہنے لگا۔

"استاد اس کے لئے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے، تب جا کر کہیں لونڈیا پھنستی ہے۔"

راجہ کہنے لگا "سالا یہ دوکان پر بیٹھا دن بھر یہی کام تو کیا کرتا ہے۔"

شامی نے جھٹکے دے کر اپنے بڑے بڑے بال ایکٹروں کی طرح پیچھے کئے اور آہستہ آہستہ مسکرانے لگا۔ راجہ کہنے لگا "ابے نوشا میں تجھ کو ایک تدبیر بتاؤں۔ وہ جو اوورسیئر ہے نا، وہی جس کا چوراہے پر پکا مکان ہے، تو اس کی لونڈیا کو گانٹھ لے۔ روز اسکول پڑھنے جاتی ہے۔ باپ قسم بڑی زوردار لونڈیا ہے۔ میں نے تو اس کے بھائی سے دوستانہ کر لیا ہے۔ روز سالے کو ہوٹل میں چائے پلاتا ہوں۔ چاہے تو تو بھی ساجھا کر لے پٹ گئی تو مزے آ جائیں گے۔ لاملا پلاؤ کا ہاتھ۔" راجہ اور نوشا نے بڑی گرمجوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

تینوں دیر تک محلّہ کی لڑکیوں کی باتیں کرتے رہے۔ راجہ اور شامی جو لگ بھگ نوشا ہی کے ہم عمر تھے اور کسی کا بھی سن ۱۵ سال سے زائد نہ ہوگا، اس انداز سے ایک ایک بات بیان کر رہے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔

تمبولا کھیلنے کا پروگرام منسوخ ہوا تو راجہ نے ایک نیا پروگرام بنایا مگر اس کی تفصیل نہ بتائی۔ شلی

نے منڈی تو اسے ڈانٹ دیا" بس کہہ دیا کہ ایک جگہ چلیں گے۔ تجھ کو چلنا ہے تو چل"
شامی نے پوچھا "کب تک واپس لوٹو گے"
راجہ نے کہا" کوئی ٹھیک نہیں، گیارہ تو بج ہی جائے گا"
شامی نے کانوں پر ہاتھ رکھ لئے" نا بابا، میں اتنی دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ ابا مولوی فرقان اللہ کا وعظ سننے گئے ہیں۔ دس بجے سے پہلے ہی لوٹ آئیں گے۔ میں تو یہ چلا" اور وہ وہاں سے گھر کی طرف چل دیا۔
راجہ اور نوشا باتیں کرتے ہوئے بازار کی جانب مڑ گئے۔
بازار کی چہل پہل اجڑ چکی تھی۔ کہیں کہیں اکا دکا دکانیں کھلی تھیں۔ چوکیداروں نے گشت لگانا شروع کر دیا تھا۔ اور دکانوں کے تالے ہلا ہلا کر دیکھ رہے تھے کہ کہیں کوئی تالا کھلا تو نہیں رہ گیا۔ راجہ اور نوشا نے بازار کو عبور کیا۔ اور ایک پتلی سی گلی میں داخل ہو گئے۔
گلی کے اندر گھپ اندھیرا تھا۔ آگے آگے راجہ تھا اور اس کے پیچھے نوشا آ رہا تھا۔ جو گلی کے اندھیرے سے خوفزدہ ہو رہا تھا۔ مشکل سے دس قدم دونوں گئے ہوں گے کہ ایک موڑ پر روشنی دکھائی دی۔ قریب ہی ملی جلی آوازوں کا شور آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ دونوں اسی طرف مڑ گئے جسقدر وہ آگے بڑھتے گئے، شور نزدیک آتا گیا۔ آخر راجہ اونچی دیواروں والی ایک قدیم وضع کی عمارت کے پاس جا کر رک گیا۔
بڑا پھاٹک بند تھا اور اندر خوب شور ہو رہا تھا۔ راجہ نے کھڑکی نما دروازے کو کھولا اور اندر چلا گیا اسکے ساتھ ہی نوشا بھی داخل ہو گیا۔ دروازے کے سامنے بڑا سا احاطہ تھا۔ اس کے بعد اونچی اونچی محرابوں والا طویل دالان تھا جس میں گیس بتیاں جل رہی تھیں۔ جگہ جگہ ٹین کی کرسیاں اور لکڑی کی بھدی میزیں پڑی تھیں۔ میزوں پر شراب کی بوتلیں اور شیشے کے گلاس رکھے تھے۔
اس شراب خانہ میں دیسی شراب ملتی تھی۔ دالان میں شرابیوں کی اچھی خاصی بھیڑ تھی۔ وہ شراب پی رہے تھے، چیخ چیخ کر باتیں کر رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ راجہ اور نوشا کرسیاں کھینچ کر میز کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر راجہ نے نوشا سے دس روپے کا نوٹ لیا اور کاؤنٹر پر سے جا کر ٹھرے کی ایک بوتل لے آیا۔ اس نے بوتل کھول کر میز پر رکھی۔ اپنے گلاس میں شراب انڈیلی تو نوشا نے گھبرا کر کہا۔
"یار یہ کس کے لئے انڈیل رہا ہے"
وہ ہنس کر بولا" ابے تیرے لئے اور کس کے لئے"
نوشا سہمی ہوئی آواز سے کہنے لگا" نہیں یار مجھ کو نہ پلا"

راجہ اصرار کرنے لگا۔ مگر نوشا برابر انکار کرتا رہا۔ اسی وقت دالان کے اندر ڈھولک ٹھنکنے لگی اور ایک ہیجڑا لہک لہک کر گانے لگا۔

بریلی کے باجار میں جھمکا گرا رے

ادجھمکا گرا رے

گانے کے ساتھ ساتھ وہ کمر ہلا ہلا کر ناچنے بھی لگا۔ ایک شرابی جھومتا ہوا اٹھا اور ہیجڑے کے ساتھ ساتھ ناچنے لگا۔ وہ آدمی بھاری بھرکم جسم کا تھا۔ دھم دھم کرکے ناچتا تو چھت تک ہل جاتی۔ دالان میں بیٹھے ہوئے لوگ اسکو ناچتے دیکھ کر زور زور سے قہقہے لگانے لگے۔ شراب خانے میں ان دونوں کے ناچ سے ایک نئی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ نوشا بھی ان کے ناچ سے ایک نئی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ نوشا بھی ان کے ناچ میں دلچسپی لینے لگا۔ وہ بار بار کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے آکر ان دونوں سے پوچھا۔

"کھانے کے لئے کچھ لاؤں؟"

راجہ نے اس سے کہا: "کباب ہوں گے؟"

وہ بولا "کباب تو ابھی ابھی ختم ہو گئے"

راجہ کہنے لگا "اچھا تو آلو دے جاؤ۔ مگر خوب چٹ پٹے ہوں"

"ابھی لایا"

یہ کہہ کر وہ آدمی چلا گیا۔ اور ذرا دیر بعد المونیم کی ایک گندی سی پلیٹ میں آلو دے آیا۔ جن پر ہری مرچیں پڑی تھیں۔

بھاری بھرکم جسم والا شرابی ابھی تک ہیجڑے کے ساتھ، اپنے چوڑے چوڑے کولھے مٹکا کر ناچ رہا تھا۔ نوشا کو بڑا لطف آرہا تھا۔ راجہ نے کہا "ابے ذرا سی لگائے بغیر کیا لطف آئیگا۔" یہ کہکر اُسنے گلاس نوشا کے منہ سے لگا دیا۔ نوشا نے ایک گھونٹ پی کر بُرا سا منہ بنایا۔

"یار یہ تو بہت کڑوی ہے۔"

راجہ نے آلو کی پلیٹ سامنے کردی۔ "ایک آدھ قتلہ آلو کا کھا لے"

نوشا نے پلیٹ سے آلو کے کئی قتلے اٹھا کر کھا لئے۔ راجہ نے گلاس اٹھا کر عین آنکھوں کے سامنے کیا۔ گہری گلابی شراب کو شرابیوں کی طرح روشنی میں دیکھا، اسکو بوسہ دیا اور غٹا غٹ کئی گھونٹ چڑھا گیا۔ نوشا نے بھی گلاس اٹھا کر تھوڑی سی پی لی۔

جب دونوں کے گلاس ختم ہو گئے اور راجہ پھر انڈیلنے لگا تو نوشا بولا "یار راجہ مجھ کو تو کچھ عجیب سا لگ رہا ہے" راجہ ہنس کر بولا۔

"ابے ابھی سے چڑھنے لگی، اناڑی ہے نا۔ چل تھوڑی سی اور لگا"

نوشا اس کی بات پر ہنسنے لگا۔ مگر یہ ہنسی بڑی بے ڈھنگی تھی۔ اس نے گلاس اٹھایا اور غٹاغٹ کئی گھونٹ پی گیا۔ بھاری بھرکم جسم والا شرابی ناچتے ناچتے لڑکھڑا کر گر پڑا اور اب چاروں خانے چت فرش پر لیٹا تھا۔ دالان کے اندر بیٹھے ہوئے شرابی ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔

ہیجڑے نے گانا بند کر دیا تھا۔ وہ ہر میز پر جاتا، ایک آدھ گندا سا مذاق کرتا۔ دو چار بازاری فقرے سنتا اور دونی، چونی وصول کر کے دوسری میز پر چلا جاتا۔ وہ باری باری ہر میز پر جا رہا تھا۔ جب وہ راجہ کے پاس آیا [illegible] کر اسنے ہاتھ مٹکا مٹکا کر تالیاں بجائیں اور زور زور سے گانے لگا۔

چھوٹے سے بلما مورے آنگنا میں گلی کھیلیں

نوشا تو اس کی حرکتوں پر شرما گیا۔ مگر راجہ نے بڑی بے باکی کے ساتھ اٹھ کر اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور چٹاخ سے اس کے گال کو چوم لیا۔ ہیجڑا ہاتھ پھیلا کر بولا "اسی بات پر ایک چونی دلاؤ۔" راجہ نے فوراً جیب سے چونی نکال کر دے دی۔ وہ کولہے مٹکاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

دونوں دیر تک بیٹھے ٹھرا پیتے رہے اور ٹھرے کی خاصیت ہے کہ اس کا نشہ طوفان کی طرح چڑھتا ہے۔ راجہ نے غضب یہ کیا کہ بوتل ختم ہونے کے بعد ایک اَدھا اور منگوا لیا۔ آدھا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ راجہ بہکنے لگا۔ اب وہ برابر ہنسے جا رہا تھا۔ الٹی سیدھی باتیں کر رہا تھا کبھی وہ نوشا کے گلے میں باہیں ڈال دیتا۔ کبھی اس طرح چہرہ بگاڑتا، جیسے رو پڑے گا۔

ایکا ایکی نوشا کرسی پر سے لڑکھڑا کر فرش پر گر پڑا۔ اٹھ کر اسنے میز کا سہارا لیا تو میز الٹ گئی۔ گلاس اور شراب کی بوتل چکنا چور ہو گئی۔ راجہ نے اسکو ایک موٹی سی گالی دی اور اس کے ساتھ ہی ایک زناٹے کا ہاتھ نوشا کے گال پر پڑا۔ نوشا نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو راجہ خونخوار نظروں سے اسکو گھور رہا تھا۔ پھر ایکا ایکی اسکو نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ دالان سے نکل کر احاطے میں آ گیا۔ پیچھے سے راجہ کی آواز سنائی دی۔ نوشا کو ایسا معلوم ہوا، جیسے راجہ کنوئیں کے اندر بول رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور پھاٹک کی کھڑکی سے نکل کر باہر گلی میں آ گیا۔ اسی عالم میں وہ ڈگمگاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ اسکو مطلق علم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔

کوئی آدھ گھنٹہ تک اندھیری گلیوں میں ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ ایک کشادہ سڑک پر آگیا۔ لیکن وہ اس سڑک پر کچھ ہی دُور گیا ہو گا کہ ایکبارگی اس کا جی متلانے لگا۔ اس نے وہیں سڑک پہ قے کر دی۔ الٹا کر لڑکھڑاتا ہوا چند قدم گیا۔ ہر چیز اس کے سامنے گردش کرنے لگی اور وہ چکرا کر وہیں گر پڑا۔ سڑک ٹھنڈی تھی اور خنک ہوا چل رہی تھی۔ نوشا کو بڑا سکون ملا۔ اُسنے آنکھیں بند کر لیں اور سو گیا۔

سڑک کے بیچوں بیچ، نوشا ہاتھ پاؤں پھیلائے لاش کی طرح بے سدھ پڑا تھا۔ ایک موڑ سے ایک کار بڑی تیز رفتاری کے ساتھ نکلی اور آناً فاناً نوشا کے سر پر پہونچ گئی۔ مگر ڈرائیور نے بڑی ہوشیاری سے گاڑی کاٹ کر اسکے قریب سے نکال لی۔ مگر ڈرائیور کی چابکدستی کے باوجود وہ کار کی جھپٹ میں آگیا۔ چوٹ تو زیادہ نہیں البتہ جسم کے داہنے حصہ پر کئی جگہ پر خراشیں آگئی تھیں۔ اس کا چہرہ اور بال گرد آلود ہو گئے تھے اور وہ مردے کی طرح بے خبر پڑا رہا۔

بہت دیر کے بعد ایک راہ گیر ادھر سے گزرا۔ اُسنے نوشا کو دیکھا تو ٹھٹک کر رک گیا۔ پہلے تو وہ اسکو مردہ سمجھا مگر جب ہمت کر کے قریب گیا۔ تو اس کے زندہ ہونے کا یقین ہوا۔ بڑی مشکل سے وہ بے چارہ اسکو گھسیٹ کر بیچ سڑک سے کنارے کی طرف لایا۔

یہ راہگیر سلمان تھا۔ وہ ایک مقامی کالج کا طالب علم تھا اور سینما دیکھ کر واپس لوٹ رہا تھا۔ اُسنے نوشا کو ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی مگر ہر بار وہ مٹی کے ڈھیر کی طرح لڑھک جاتا۔ سلمان نے بڑی مشکل سے نوشا کا نام اور گھر کا پتہ معلوم کیا۔ پھر اُسنے نوشا کو وہیں چھوڑا اور اڈے سے جا کر ایک تانگہ لایا۔ تانگے والے کی مدد سے نوشا کو اس میں ڈالا اور اسکے گھر کی جانب چل دیا۔

سڑک کا راستہ تو تانگے سے اطمینان کے ساتھ کٹ گیا مگر جب سلمان اس کو گلی میں لے کر داخل ہوا تو راستہ چلنا دوبھر ہو گیا۔ نوشا کے ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں تھے۔ کھڑا ہونا اس کے لئے دشوار تھا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ کوئی راہ گیر بھی ادھر سے نہیں گزرا کہ اسی کا سہارا لے لیتا۔ آخر اُسنے نوشا کو اپنی پیٹھ پر لادا اور کپڑوں کی طرح جھکا جھکا، نوشا کے گھر تک پہونچ گیا۔ پھر اُسنے نوشا کو پشت پر سے اتار کر دروازے پر دستک دی۔ کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی سنوائی نہ ہوئی۔

گھر کے اندر سب لوگ بے خبر پڑے سو رہے تھے۔ بہت دیر بعد آہٹ سے ماں کی آنکھ کھل گئی۔ اُسنے آواز دے کر سلطانہ کو جگایا تو وہ ڈر کر پوچھنے لگی "اے اماں یہ اتنی رات گئے کون دروازہ پیٹ رہا ہے" ماں غصہ سے بولی۔

"ہوگا کون، وہی حرامزادہ نوشا ہو گا۔ ساری رات واہی تباہی گھومنے کے بعد اب لاٹ صاحب کو

گھر کی سوجھی۔ جا بیٹیا دروازہ کھول دے، ورنہ وہ کمبخت سونے بھی نہ دے گا۔"
سلطانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ سردی سے ٹھٹھرتی ہوئی کمرے سے باہر نکلی اور آنگن کو عبور کرکے دروازہ کے پاس پہونچ گئی۔ دروازہ کھولنے سے پیشتر اسنے احتیاطاً پوچھا "کون ہے" باہر سے سلمان کی آواز ابھری
"کوئی مرد ہو تو اسکو باہر بھیج دیجئے کہ ان کو سنبھال کرلے جائے۔"
سلطانہ نیند کی غنودگی میں تھی۔ اجنبی آواز سنی تو چونک کر بولی "کس کو سنبھال کر لانا ہے" ؟ سلمان نوشا کا نام بھول گیا تھا۔ اُس نے سلطانہ کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا۔ نوشا کو جھنجھوڑ کر اس سے نام پوچھنے لگا۔
سلطانہ نے جو باہر کھسر پھسر کی آواز سنی تو ڈر کر سیدھی کمرے کے اندر پہونچی۔ اُس نے جاکر سب کچھ ماں سے بتا دیا۔ ماں بھی خوف زدہ ہو گئی۔ ذرا دیر بعد دروازے پر پھر آہٹ ہونے لگی۔ آخر ماں نے ہمت سے کام لیا اور دروازے پر پہونچ گئی۔ سلطانہ بھی اسکے ہمراہ تھی۔ ماں نے اونچی آواز سے پوچھا۔
"آپ کس کو پوچھ رہے ہیں، کیا کام ہے؟"
سلمان نے جواب دیا "نوشا اسی گھر میں رہتا ہے؟"
ماں جلدی سے بولی "ہاں، ہاں وہ یہیں رہتا ہے"
وہ بولا "دیکھئے یہاں وہ دروازے پر پڑا ہے۔ موٹر کی جھپٹ میں آگیا تھا"
ماں بدحواس ہو کر بولی "یا اللہ خیر کیا ہوا اسکو؟" اُس نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ اندھیرے میں اس کو کچھ نظر نہ آیا۔ دونوں ماں بیٹیاں گھبرا کر چیخنے لگیں۔ سلمان نے دونوں کو تسلی دی "آپ پریشان نہ ہوں، گھبرانے کی کوئی بات نہیں" پھر اسنے نوشا کو ہمت کرکے دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور گھر کے اندر داخل ہو گیا۔ ماں اور بیٹی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، دونوں رو رہی تھیں اور جلدی جلدی دعائیں مانگ رہی تھیں۔
سلمان نے نوشا کو لے جاکر دری پر لٹا دیا اس کی آنکھیں تیز تھیں اور لالٹین کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ لاش کی طرح خاکستری نظر آرہا تھا۔ ماں نے جو اس کی یہ حالت دیکھی تو سر پیٹ لیا۔ اور لگی زور زور سے دھاڑنے۔
"یا اللہ میرے بچے کو کیا ہو گیا۔"
سلطانہ بھی چیخ چیخ کر رونے لگی۔ سلمان ان کے رونے سے گھبرا گیا۔ اسنے خود کو سنبھالا اور جھجکتے ہوئے بولا "آپ پریشان نہ ہوں۔ چوٹ زیادہ نہیں آئی ہے" اس کی باتوں سے دونوں کی ذرا ڈھارس بندھی

ورنہ وہ سخت پریشان ہو گئی تھیں۔

سلمان خاموش کھڑا رہا۔ اس نے سرسری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک ایک چیز گھر کی تنگدستی اور دکھ کی داستان سنا رہی تھی۔ ٹوٹا پھوٹا لکڑی کا کاٹ کباڑ، میلے میلے بوسیدہ بستر اور کالی کالی دیواریں۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور دونوں سے بولا۔

"اچھا تو اب میں چلوں گا۔"

ماں اور بیٹی جو اب تک اس کی موجودگی کو گھبراہٹ اور پریشانی میں بھول چکی تھیں۔ ایک دم سے چونک پڑیں۔ سلطانہ تو شرما کے پیٹھ موڑ کے بیٹھ گئی البتہ ماں نے پوچھا "یہ آپ کو ملا کہاں؟" سلمان نے اس کو ساری تفصیل بتائی۔ ماں نے اس خدا ترسی پر اسکو ہزاروں دعائیں دے ڈالیں۔

سلمان دعاؤں سے لدا پھندا اپنے کمرے میں واپس پہونچا۔ بستر پر لیٹ کر اس نے سوچا کہ اسے اس طرح واپس نہیں آنا چاہئے تھا۔ ممکن ہے چوٹ جسم کے اندرونی حصوں میں آئی ہو اور رات کو اس کی حالت زیادہ خراب ہو جائے۔ اسنے سوچا گھر جانے کے بجائے وہ اسکو اسپتال کیوں نہ لے گیا۔ نہ جانے بے چارے کی اب کیا حالت ہو۔ گھر میں کوئی مرد بھی نہ تھا کہ حالت بگڑنے پر اس کو اسپتال لے جائے۔ وہ رات اُسنے بڑی بے چینی میں کاٹی۔

صبح اٹھتے کے ساتھ ہی وہ سیدھا نوشا کے گھر پہونچا۔ نوشا کی ماں نے اس کو اندر بلالیا۔ کمرے میں جاکر اسنے دیکھا نوشا ابھی تک بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ ماں نے بتایا کہ سویرے، بہت تڑکے وہ اٹھا تھا بات چیت بھی کی تھی۔ اب طبیعت ٹھیک ہے۔

سلمان وہیں دری پر بیٹھ کر ماں سے باتیں کرنے لگا۔ سلطانہ کمرے کے باہر تھی۔ اسنے کئی بار دروازہ کی آڑ سے جھانک کر سلمان کو دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ بول رہا تھا اور سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ سلطانہ نے نو کو اشارے سے قریب بلایا اور اس سے کہا کہ پڑوس سے کرسی مانگ لائے۔ اس لئے کہ سلمان سوٹ پہنے دری پر بیٹھا بڑا بے تکا لگ رہا تھا۔

ذرا دیر بعد نو کرسی اٹھائے ہوئے گھر کے اندر داخل ہوا۔ کرسی بوسیدہ تھی اور اس کا ایک پایہ ٹوٹا ہوا تھا۔ سلطانہ نے کرسی کمرے کے اندر بھجوا دی۔

نوشا کی ماں نے اصرار کرکے سلمان کو کرسی پر بٹھا دیا۔ لمحہ بھر بعد اُسنے کرسی پر پہلو بدلا تو کرسی الٹ گئی اور اس کے ساتھ ہی سلمان دھڑام سے فرش پر آگیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ کمرے کے باہر سلطانہ کی ہنسی کی آواز ابھر رہی تھی۔ سلمان جھینپ مٹانے کے لئے خود

بھی ہنسنے لگا۔ ماں بچوں کو کوسنے لگی۔

"ایسے بیہودہ بچے ہیں کہ اچھی بھلی کرسی توڑ ڈالی۔"

اس کے بعد اسنے اٹھ کر کرسی کو اٹھایا اور دیوار سے ٹکا کر سلمان سے اصرار کرنے لگی کہ وہ اسپر بیٹھ جائے۔ مجبوراً اس کو پھر کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ اب وہ عین دروازے کے مقابل بیٹھا تھا۔ کئی بار اس نے سلطانہ کو دروازے سے جھانکتے ہوئے دیکھا اور کئی بار اس کی نگاہیں سلطانہ کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔

نوشا کی ماں نے باتوں باتوں میں ایک ایک بات کرید کر اس کے متعلق معلوم کر لی۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ کے بعد وہ اٹھ کر جانے لگا تو نوشا کی ماں نے بڑے اصرار سے کہا کہ وہ آئندہ بھی آتا رہے۔ سلمان اس کو بڑا نیک اور سعادت مند لڑکا معلوم ہوا۔ اسنے نوشا کی جان بچائی تھی، ورنہ وہ رات بھر سردی میں پڑے پڑے اکڑ کر رہ جاتا۔

۶

سردیاں جا رہی تھیں اور گرمی کی آمد آمد تھی۔ درختوں میں پت جھڑ لگ چکا تھا۔ دن بھر تیز ہوائیں چلتیں اور دھوپ کی تپش بڑھ جاتی۔ مگر راتیں بڑی سہانی ہوتیں۔ پھاگن کا مہینہ تھا۔ چاند نکلتا تو در و بام آئینہ خانہ بن جاتے۔ شفاف چاندنی سے دل میں کسک اٹھتی اور کتنی ہی موہوم خواہشیں انگڑائیاں لے کر بیدار ہو جاتیں۔

ایک ایسی ہی رات کا ذکر ہے۔ سردی کم تھی نوشا کی ماں باہر دالان میں بیٹھی تھی۔ اس روز اس نے غسل کیا تھا اور دھلے ہوئے اجلے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ سلطانہ کو بیٹھے بٹھائے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے ماں کا سفید دوپٹہ اتار کر اپنا بسنتی دوپٹہ اوڑھا دیا۔ ماں نے احتجاج کیا۔

"اری لڑکی کچھ دیوانی ہو گئی ہے، لا میرا دوپٹہ دیدے۔"

وہ ہنس کر بولی "اللہ قسم اماں، یہ بسنتی دوپٹہ تو تم پر کھل گیا۔"

بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اس کی ڈھلی چھپی جوانی بسنتی دوپٹے میں، ایکبارگی جاگ اٹھی تھی۔ باہر صحن میں چاندنی بکھری ہوئی تھی اور اس کے عکس سے نوشا کی ماں کا چہرہ دمک رہا تھا۔ یوں اس کی عمر بھی زیادہ نہ تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں اس کی شادی ہوگئی۔ سال بھر بعد سلطانہ پیدا ہوئی۔ اس حساب سے اب وہ ۳۴ سال کے لگ بھگ تھی۔ لیکن شوہر کے انتقال کے بعد، کچھ تو مصیبتوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اور کچھ اسنے اپنی وضع قطع بھی بڑی بوڑھیوں کی سی بنا رکھی تھی۔ ورنہ ایک زمانہ تھا کہ وہ بڑی طرحدار عورت تھی۔ شوہر چاہنے والا ملا تھا۔ وہ تھا تو ضلع کچہری میں محرر مگر اس نے بیوی کا کبھی دل میلا نہیں ہونے دیا۔ اگر آدھی رات کو بھی اسنے کسی چیز کی فرمائش کی تو وہ اسی وقت جا کر وہ چیز لے کے آتا۔ مگر اب اس کو مرے ہوئے پانچ سال ہوگئے تھے اور ان پانچ سالوں میں اس کے سارے قبین ہوگئے۔ کون سا دکھ تھا جو اس نے نہیں جھیلا۔ کون سی پریشانی تھی جس سے اس کا سابقہ نہیں پڑا۔

اوڑھنے کو تو اس نے بسنتی دوپٹہ اوڑھ لیا مگر ڈر رہی تھی کہ کسی محلے ٹولے والے نے دیکھ لیا تو وہ نکو بن جائے گی۔ سب یہی کہیں گے کہ اے ابھی مرنے والے کا کفن بھی میلا نہ ہوا کہ اس نے رنڈاپا چھوڑ چھاڑ، بننا سنورنا شروع کر دیا۔ مارتے کا ہاتھ سب پکڑ لیتے ہیں، کہتے کی زبان کوئی نہیں پکڑتا۔ وہ بیٹھی یہی سوچ رہی تھی کہ اتنے میں نیاز آگیا۔ اس روز تو وہ بالکل چھیلا بنکر آیا تھا سفید ململ کا کرتہ اور اس کے نیچے شربتی بنیائن، کھڑکھڑاتی ہوئی لٹھے کی شلوار۔ ٹوپی بھی اسنے اتار دی تھی۔ آڑی مانگ نکال کر بڑی محنت سے لمبے بالوں کو جمایا تھا جن پر چپڑا ہوا خوشبودار تیل چمک رہا تھا ایک ہاتھ کی کلائی میں چنبیلی کے پھولوں کا گجرا لپٹا تھا اور کان میں عطر کا پھویا تھا۔

نیاز آکر بیٹھا تو سارا دالان مہک اٹھا۔ اس وقت وہ تھا بھی بڑا خوش خوش، نوشا کی ماں کو بسنتی دوپٹہ پہنے دیکھا تو مسکرا کر بولا "ارے آج تو آپ کو پہچاننا مشکل ہوگیا" سلطانہ جو قریب کھڑی تھی۔ کہنے لگی۔

"دولھا بھائی میں بھی ان سے ابھی یہی کہہ رہی تھی۔ اچھا خاصہ اپنا حلیہ بگاڑ رکھا ہے۔ جب دیکھو یہ نگوڑا سفید موٹا دوپٹہ سر پر منڈھے بیٹھی ہیں۔"

نیاز نے مڑ کر سلطانہ کو دیکھا جس کا حسن سفید لباس کی سادگی میں کچھ اور نکھر گیا تھا۔ اس کے گلابی ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھوں میں تازہ کھلے ہوئے پھولوں کی سی شگفتگی تھی۔ وہ اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

"ٹھیک تو کہہ رہی ہے سلطانہ۔ خدا قسم یہ دوپٹہ آپ پر بڑا اچھا لگ رہا ہے۔"

نوشا کی ماں شرما کر کہنے لگی۔ "کیوں تم دونوں مل کر مجھ کو بنا رہے ہو۔"
سلطانہ کھل کر ہنسنے لگی۔ نیاز کو اس کی یہ ہنسی بہت اچھی لگی۔ وہ اسکو خوش کرنے کے کہنے لگا "سلطانہ تم ان کو روز رنگین دوپٹے چن چن کر پہنایا کرو۔ ذرا دیکھو تو کیسی سج رہی ہیں۔ بھئی اسی بات پر سب کا منہ میٹھا ہو جائے۔" وہ اس وقت بڑے شاہانہ موڈ میں تھا۔ اس نے اسی وقت آنو کو بلایا اور جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر بولا۔

"ذرا لپک کر سیر بھر گرم گرم امرتیاں توے کر آؤ۔"

سلطانہ کی ماں نے اس کو بہت منع کیا مگر باز نہ آیا۔ اسنے زبردستی کرکے آنو کو امرتیاں لانے کے لئے بھیج ہی دیا۔

ذرا دیر بعد آنو امرتیاں لے کر آگیا۔ نیاز نے اصرار کرکے سلطانہ کی ماں کو خود اپنے ہاتھ سے ایک امرتی کھلائی۔ پھر امرتیاں سب میں تقسیم ہوئیں۔ سب خوش تھے۔ ہنس رہے تھے۔ باتیں کر رہے تھے۔ گھر بھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ نوشا بھی اسی وقت آیا تھا۔ وہ سب سے زیادہ شور مچا رہا تھا۔

رات گئے تک یہ ہنگامہ ہوتا رہا۔ آخر نوشا اور آنو اپنے اپنے بستروں میں جا کر سو گئے۔ تھوڑی دیر بعد سلطانہ بھی جمائیاں لینے لگی۔ جب وہ بستر پر جانے کے لئے اٹھی تو نیاز نے اس کو نظر بھر کر اس طرح دیکھا جیسا کہہ رہا ہو کر کچھ دیر تو اور بیٹھو۔ مگر وہ وہاں سے اٹھ کر کمرے کے اندر جا کر بستر پر لیٹ گئی۔ نیاز بار بار مڑ کر کمرے کی جانب دیکھتا رہا کہ شاید سلطانہ واپس آجائے مگر وہ بے خبر پڑی سو رہی تھی۔

نیاز ذرا دیر تک تو بجھا بجھا سا رہا پھر اسنے سوچا چلو آج لگے ہاتھوں سلطانہ کے ساتھ رشتے کی بات چھیڑ دی جائے۔ کچھ یہی سوچ کر وہ سلطانہ کی ماں سے اپنی گھریلو پریشانیوں کا رونا رونے لگا۔ ان میں ہوٹل کے خراب کھانے سے لے کر، گھر کے اکیلے پن تک کی بات شامل تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی اس کی باتیں سنتی رہی۔ جب وہ سب کچھ کہہ چکا تو اسنے اظہار ہمدردی کے طور پر اس سے کہا۔

"میرا کہا مانو تو تم اب اپنا گھر بساو، اس طرح کب تک کام چلے گا۔"

نیاز یہی بات اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ اسنے فوراً کہا "سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں۔ مگر میرا یہاں بیٹھا کون ہے۔ جو کہیں سلسلہ چھیڑے۔ رے دیکھے آپ کا گھر ہے، جہاں چلا آتا ہوں۔"

سلطانہ کی ماں نے کہا "کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں؟"

نیاز کے ذہن میں ایک بار یہ خیال آیا کہ وہ صاف بات کہہ دے مگر ہچکچاہٹ میں اپنی بات کہہ نہ سکا۔ اس نے صرف اس قدر کہا "میں کیا بتاؤں۔ یہ تو آپ ہی کو سوچنا پڑے گا۔" وہ اس کی بات کا مطلب کچھ کچھ

بھانپ گئی۔ کہنے لگی۔

"سچی میں کیا بتاؤں۔ اگر سلطانہ کچھ بڑی ہوتی تو میں خدا قسم اس کو تمہارے ساتھ بیاہ دیتی:"

نیاز کے سینہ پر ایک گھونسا سا لگا۔ بوکھلا کر کہنے لگا "میری عمر آپ کتنی سمجھتی ہیں؟"

وہ کہنے لگی "یہ تو میں جانتی نہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ سلطانہ کی اور تمہاری عمر میں آدھوں آدھ کا فرق ہو گا۔"

نیاز یہ ماننے کو کسی طرح تیار نہیں تھا۔ کھسیانی سی ہنسی ہنس کر بولا "آپ بھی کمال کر رہی ہیں اتنا فرق کیسے ہو سکتا ہے:"

سلطانہ کی ماں کہنے لگی: "برا نہ مانو تو ایک بات کہوں:"

"ضرور کہئے" وہ اس روز سب کچھ سننے پر آمادہ تھا۔ سلطانہ کی ماں نے دبی زبان سے کہا "دو چار سال تو میں تم سے چھوٹی ہوں گی:"

وہ حیرت زدہ ہو کر چیخ پڑا۔ "واقعی:"

وہ بتانے لگی "تم میری عمر کیا سمجھتے ہو۔ یہی ۳۰، ۳۱ سال ہو گی:" دو، تین سال اس نے اپنی طرف سے کم کر دیئے۔

نیاز نے اس دفعہ اس کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ وہ واقعی ابھی تک خاصی جوان تھی، سر کے سارے بال سیاہ تھے اور بڑے سلیقے سے گندھے ہوئے تھے۔ چہرے کے نقوش کا تیکھا پن گو کہ ماند پڑ گیا تھا، پھر بھی ان میں کسی قدر تازگی تھی۔ البتہ جسم ذرا بھدا ہو گیا تھا۔ خاص طور پر کولہے جو پھیل گئے تھے۔ پھر بھی اس میں ایک سج دھج اور دلآویزی نظر آ رہی تھی۔ نیاز نے اب تک اسکو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اس کو صرف سلطانہ کی ماں کی حیثیت سے دیکھتا رہا تھا اور اس وقت وہ اس کو صرف ایک عورت کی حیثیت سے دیکھ رہا تھا اور وہ بھی ایک مرد کی نظر سے۔

سلطانہ کی ماں نے جو اسکو اس طرح گہری نظروں سے گھورتے دیکھا تو شرما کر دوپٹہ سر پر سرکا لیا۔ نیاز کو اس کی یہ ادا بھا گئی۔ سلطانہ کی ماں نے پاندان کھول کر پان لگایا اور اس سے کہنے لگی "تم کس سوچ میں پڑ گئے۔ لو یہ پان کھاؤ:" نیاز نے پان لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اسنے بڑے پیار سے کہا "یوں نہیں میں اپنے ہاتھ سے پان کھلاؤں گی:" نیاز نے بڑی معصومیت کے ساتھ منہ کھول دیا اور اسنے منہ کے اندر پان رکھ دیا۔ دونوں کے چہرے بہت قریب آ گئے تھے۔ آپس میں نظریں ملیں تو نیاز کے جسم میں بجلی سی کوند اٹھی۔

گھبرا کر اسنے سوچا کہ اب چلنا چاہئے۔ اسنے انگڑائی بھر کر کہا "اچھا اب چلوں گا۔ نیند معلوم

ہو رہی ہے۔"

وہ آہستہ سے بولی "بیٹھ چلے جانا۔"

اس کے بعد پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ چاندنی اور نکھر گئی تھی۔ ہوا سکی ہوئی تھی اور نیاز کی کلائی میں پڑے ہوئے گجرے کے پھول مہک رہے تھے۔ ایکا ایکی کمرے کے اندر لالٹین زور سے بھڑکی اور بجھ گئی۔ سلطانہ کی ماں نے مڑ کر کمرے کے اندر دیکھا۔ جہاں گھپ اندھیرا تھا۔ پھر جیسے اسنے خود سے کہا "یہ سب آج سرِ شام ہی پڑ کر سو گئے۔"

نیاز بولا "اب تو گیارہ کے قریب وقت ہو گا۔"

اسنے نیاز کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور دالان سے اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی۔ جتنی دیر وہ کمرے کے اندر رہی، یہ تمام وقت نیاز نے بڑی بے چینی میں گذارا۔ اجلی اجلی چاندنی ہر طرف بکھری تھی۔ ہوا سرسراتی ہوئی چل رہی تھی۔ اور چنبیلی کے پھول مہک رہے تھے۔ جب وہ کمرے سے باہر نکلی تو نیاز نے گردن موڑ کر اس کی جانب دیکھا اور اس وقت تک برابر اسکو تکتا رہا کہ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی مگر جب وہ اس سے ہٹ کر دور بیٹھنے لگی تو نیاز کی زبان سے بے اختیار نکل گیا

"یہاں میرے قریب بیٹھ جائیے۔"

وہ کھسک کر اس کے قریب آ گئی۔ دونوں نے نہ نظریں اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا، نہ کوئی بات کی۔ اجلی چاندنی کے ہلکے ہلکے عکس میں، وہ دالان کے اندر اندھیرے میں بالکل چپ چاپ بیٹھے تھے۔ نیاز نے پھولوں کا گجرا ہاتھ سے نکال کر سامنے رکھ دیا اور لحظہ بھر تک اس کے ساتھ انگلیوں سے کھیلتا رہا۔ پھر اسنے آہستہ سے کہا "ذرا اور ادھر کھسک آؤ" وہ کسمسا کر اپنی جگہ پر رہ گئی۔

نیاز نے اس کی چوڑی چکلی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا "یوں نہیں یوں" اور اس کو اپنی جانب گھسیٹ لیا۔ اندر کمرے میں سلطانہ اور اس کے دونوں بھائی گھپ اندھیرے میں گہری نیند سو رہے تھے۔

نیاز بہت تڑکے اٹھ کر گھر سے چلا گیا۔ رات کے حادثہ کی یادگار گجرے کے مسلے ہوئے پھول رہ گئے تھے جو دالان میں بکھرے پڑے تھے۔

اس کے بعد بارہا ایسا ہوا کہ نیاز سرِ شام نوشا کے گھر آ جاتا۔ رات گئے تک بیٹھا باتیں کیا کرتا اور علی الصبح چپکے سے اٹھ کر باہر چلا جاتا۔ لیکن سلطانہ ابھی تک اس کی نظروں پر چڑھی ہوئی تھی۔ بلکہ ماں اور بیٹی جب کبھی ساتھ بیٹھی ہوتیں تو ماں اس کو بھدی اور بدوضع معلوم ہوتی۔ موقع مل جاتا تو وہ اس سے ہنس کر بات چیت بھی کر لیتا۔ مگر ماں اب اس کی کڑی نگرانی کرنے لگی تھی۔ کسی وقت بھی اس کو

اکیلا چھوڑ کر نہ جاتی۔ ذرا ذرا سی بات پر اسکو سختی سے ڈانٹ دیتی۔ نیاز کی موجودگی میں تو وہ سلطانہ کا بیٹھنا دوبھر کر دیتی۔

ایک روز ایسا ہوا کہ نیاز سلطانہ کی ماں سے بیٹھا باتیں کر رہا تھا کسی رشتہ دار کے گھر کا ذکر ہو رہا تھا۔ ماں بیٹی کہیں مہمان داری میں گئی تھیں۔ اور تھوڑی ہی دیر قبل واپس آئی تھیں۔ سلطانہ ابھی تک اپنا ریشمی جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ اس لباس میں اس کی خوبصورتی اور نکھر گئی تھی۔ چہرے پر معصومیت کے ساتھ ساتھ وقار جھلک رہا تھا۔ نیاز کے لئے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ بار بار اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ سلطانہ کو بھی اس وقت اپنی رعنائی کا احساس تھا۔ ماں کے بار بار کہنے کے باوجود اس نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا اور وہیں ماں کے کولھے سے لگی بیٹھی رہی۔

نیاز نے جو ایک بار نظر اٹھائی تو اس نے دیکھا۔ سلطانہ کی نگاہیں اسی کی جانب اٹھی تھیں۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔ وہ بھی مسکرانے لگا۔ ماں سر جھکائے پان لگا رہی تھی۔ اچانک اس کی نظر سلطانہ پر پڑ گئی۔ اس نے سلطانہ کو مسکراتے دیکھ لیا۔ ایکبارگی اس کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ اسنے قہر آلود نگاہوں سے اس کو گھورا اور ڈانٹ کر بولی۔

"جا اندر جا کر بیٹھ۔ جب دیکھو سر پر سوار ہے۔"

سلطانہ ٹھنکنے لگی "ابھی نیند نہیں آ رہی ہے۔"

ماں نے غصہ سے اس کو دھکا دے کر کہا "جاتی ہے کہ نہیں۔" پھر وہ اسکو گھسیٹتی ہوئی کمرے کے اندر لے گئی۔ وہاں اس نے سلطانہ کے رخسار میں زور سے چٹکی بھر کر دبی زبان سے کہا "حرامزادی میں تیرے سب کرتوت جانتی ہوں۔" سلطانہ منہ بسور کر رہ گئی۔

ماں کے انداز میں رقابت کا جذبہ صاف جھلک رہا تھا۔ یہ بات سلطانہ نے تو محسوس نہیں کی البتہ نیاز کو اس کا شدت سے احساس تھا۔

دوسرے ہی دن سے نیاز یہ بات غور کرنے لگا کہ سلطانہ اب اس کے سامنے آتے ہوئے کتراتی تھی۔ جتنی دیر وہ وہاں رہتا، سلطانہ کمرے کے اندر بیٹھی رہتی۔ ایکبار بھی وہاں نہ آتی۔ کمرے کے اندر سے کبھی کبھی صرف اس کے بولنے کی آواز آ جاتی۔ اسنے ایک آدھ بار ماں سے باتوں باتوں میں سلطانہ کا ذکر بھی کیا تو وہ بات کو صاف ٹال گئی۔ نیاز کے ذہن میں اچھی خاصی الجھن پیدا ہو گئی۔ کئی روز اسی الجھن میں گزر گئے۔

انہی دنوں کا ذکر ہے، ایک روز وہ خلاف توقع، دن کے وقت نوشابہ کے گھر چلا گیا۔ وہ سی،

ساڑھے دس کا عمل تھا۔ سلطانہ کی ماں کی طبیعت خراب تھی، وہ انکے ساتھ اسپتال گئی ہوئی تھی گھر میں صرف سلطانہ تھی اور کمرے کے اندر بیٹھی بیڑی کے پتے کاٹ رہی تھی۔ نیاز نے جو ماں کو غیر حاضر دیکھا تو سیدھا سلطانہ کے پاس پہونچ گیا۔ وہ اسکو اپنے سامنے دیکھ کر گھبرا سی گئی۔

نیاز نے سب سے پہلی بات جو پوچھی وہ یہ تھی۔ "اب تم دکھائی کیوں نہیں دیتیں۔ ہر وقت کمرے کے اندر کیوں بیٹھی رہتی ہو؟"

اس نے صاف بات کہدی "اماں نے آپ کے سامنے آنے سے منع کر دیا ہے"

نیاز کے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ گھبرا کر بولا "کیوں؟"

سلطانہ نے جواب دیا" انہوں نے کہاہے کہ تم دولھا بھائی سے پردہ کیا کرو"

نیاز نے دل ہی دل میں کہا ' اچھا تو یہ بات تھی تب ہی سلطانہ نے اس کے سامنے آنا جانا بند کر دیا۔ ایکبارگی اس نے سلطانہ کی ماں کے خلاف خود میں شدید نفرت محسوس کی۔ ذرا دیر تک وہ خاموش کھڑا پیچ و تاب کھاتا رہا۔ پھر اسنے محبت بھری نظروں سے سلطانہ کو دیکھا اور بڑے پیار سے بولا۔

"سلطانہ"

وہ آہستہ سے بولی "جی" لیکن دوسرے ہی لمحہ اسنے گھبرائی ہوئی آواز سے کہا" اب آپ جائیے۔ اماں آتی ہی ہوں گی۔ آپ کو یہاں دیکھ لیا تو میرے لئے مصیبت آجائے گی"

نیاز نے بھی سوچا کہ اس کا وہاں زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں، لہذا وہ فوراً گھر سے باہر آگیا۔ اس کو رہ رہ کر سلطانہ کی ماں پر تاؤ آرہا تھا۔ اور اسکے ساتھ ہی سلطانہ کو پا لینے کی تمنا شدید ہوتی جا رہی تھی وہ اسی ادھیڑبن میں دوکان کی جانب جارہا تھا کہ گلی میں کالے صاحب سے اس کی مڈبھیڑ ہوگئی۔

کالے صاحب نے ملتے ہی کہا "مسٹر نیاز بہت پریشان دکھائی دے رہے ہو، کیا بات ہے۔ میں کہتا ہوں اپنی لائف انشور کرالو، کوئی پریشانی نہیں رہے گی" وہ کسی وقت بھی اس خیال سے غافل نہیں رہتا تھا کہ وہ بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہے۔ اس کی ہر بات انشورنس سے شروع ہوتی تھی اور اسی پر ختم بھی ہوتی تھی۔

نیاز اس وقت جھنجلایا ہوا تھا، جل کر بولا۔ کالے صاحب تم کو ہر وقت بیمہ ہی کرانے کی پڑی رہتی ہے، نہ وقت دیکھتے ہو، نہ بے وقت، ہر وقت سالا بیمہ تمہارے ساتھ لگا رہتا ہے"

کالے صاحب کھسیانہ ہو کر ہنسنے لگا۔ اس لئے کہ ناراض ہونا تو اسنے سیکھا ہی نہیں تھا۔ ورنہ وہ اس قدر کامیاب انشورنس ایجنٹ نہ ہوتا۔ بڑی نرمی سے بولا" ارے تم تو ناراض ہوگئے۔ آؤ میں تم کو

چائے پلواؤں" مگر نیاز اس کے ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوا۔ کالے صاحب اصرار کرنے لگا۔

"بیمہ نہ کراؤ مگر میری چائے تو پی لو۔ آؤ چلو"

وہ اسکو گھیر گھار کر، قریب کے ایک چائے خانے میں لے گیا۔ چائے کا آرڈر دیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ مگر بیمہ کا ذکر کئے بغیر کالے صاحب زیادہ دیر تک باتیں نہ کر سکتا تھا۔ گھوم پھر کر وہ اسی موضوع پر آگیا۔ کہنے لگا" زندگی میں گارنٹی بہت بڑی چیز ہے اور وہ صرف دو ہزار کی پالیسی لے کر دیکھو۔ پھر تم خود ہی اس کے فائدے جان لوگے"

نیاز نے سنجیدگی سے بیمہ کرانے کے لئے نہ کبھی سوچا تھا اور نہ اب اس کا ارادہ تھا۔ اس نے صرف کالے صاحب کو چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

" دیکھو کالے صاحب بیمہ ویمہ تو میں کراؤں گا نہیں، البتہ کوئی ایسی تدبیر تم کو معلوم ہو جس سے سال سوا سال میں بیس پچیس ہزار روپیہ مل جائے"

کالے صاحب بھلا کہاں میدان چھوڑنے والا تھا، بڑی سنجیدگی سے بولا" اس کا بھی ایک ہی طریقہ ہے۔ انشورنس اور صرف انشورنس۔ اپنے کسی بچے یا وائف کو انشور کرادو، اگر وہ سال بھر کے اندر فوت ہو جائے۔ تو ۲۰ ہزار کیا اگر تم ۵۰ ہزار کی پالیسی لوگے۔ تو تم کو کمپنی اتنا ہی روپیہ دے گی"

نیاز سوچ میں پڑگیا۔ کالے صاحب سمجھا کہ وہ اس کی باتوں پر ناراض ہو گیا۔ لہٰذا وہ معذرت کرنے کے سے انداز میں بولا" دیکھو بھئی برا ماننے کی بات نہیں، انشورنس ایجنٹ موت اور زندگی کی بات ہمیشہ ڈاکٹر کی طرح صاف صاف کرتا ہے"

نیاز کہنے لگا" یہ بات نہیں۔ دراصل میں اس وقت ایک پریشانی میں ہوں" ابھی وہ آگے کچھ اور کہتا مگر کالے صاحب نے اسکو بات پوری نہ کرنے دی اور لگا اپنی ہانکنے۔

" میں تمہاری پریشانی کو خوب سمجھتا ہوں" اس بات پر نیاز نے اسکو گھور کر دیکھا اور چائے کا ایک گھونٹ پی کر سوچنے لگا۔ یہ کالے صاحب بھی عجیب آدمی ہے، میری پریشانی کو یہ کیا جانے مگر کالے صاحب قطعی کاروباری موڈ میں تھا، اسنے دیکھا کہ شکار پھنس رہا ہے۔ اب نکلنے نہ دو، یہیں گردن دبوچ لو کہ پھر پھڑ پھڑا بھی نہ سکے۔ وہ بڑے جوش میں باتیں کرنے لگا" دیکھو مسٹر نیاز آگے کا حال کوئی نہیں جانتا۔ زندگی کیا ہے؟" اسنے میز پر رکھی ہوئی چینی کی پلیٹ کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ اور اس کو نیاز کے سامنے کر کے کہنے لگا" زندگی کی مثال اس پلیٹ کی طرح ہے۔ اس پلیٹ کو اٹھاتے ہوئے تم ڈروگے کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے لیکن اس کا بیمہ ہو چکا ہے۔ تو کوئی ڈر کی بات نہیں اس کی قیمت تو تمہاری جیب میں ہے

اس کو یوں اٹھا کر پھینک سکتے ہو" اور کالے صاحب نے واقعی پلیٹ اٹھا کر اچھال دی۔ وہ فرش پر گر کر ناکے کے ساتھ چکنا چور ہو گئی۔

پلیٹ کے ٹوٹنے کا شور ہوا تو کالے صاحب بھی چونکا کر یہ اس نے کیا کر دیا۔ چائے خانہ میں سنسنی پھیل گئی۔ ایک بیرا لپک کر اس کے پاس آیا اور پوچھنے لگا "ساب آپ نے پلیٹ کیوں توڑ ڈالی" کالے صاحب بڑا چکرایا، کھسیانہ ہو کر ہنسنے لگا۔ نیاز کو بھی ہنسی آ گئی۔ بیرا کہنے لگا۔

"ساب اس میں ہنسی کی بات نہیں دو روپیہ ڈانڈ بھرنا پڑے گا"

ہوا بھی یہی چائے کے بل کے ساتھ کالے صاحب کو پلیٹ کے دو روپیہ بھی دینا پڑے۔ اس روپے کی چپت سے کالے صاحب کی ساری تیزی رفو چکر ہو گئی۔ بھیگی بلی کی طرح مری ہوئی آواز میں کہنے لگا: "مسٹر نیاز میں کسی دن تمہاری دوکان پر آؤں گا۔ پھر اطمینان سے بات ہو گی" پہلے اگر وہ یہ بات کہتا تو نیاز صاف انکار کر دیتا مگر اب وہ واقعی کالے صاحب سے بیمہ کرانے کے متعلق بات کرنا چاہتا تھا۔ لہٰذا وہ فوراً رضامند ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"پرسوں دوپہر کو آ جاؤ۔ اس وقت کام بھی نہیں ہوتا، اطمینان سے بات ہو گی"

ملنے کا پروگرام طے کر کے دونوں نے اپنا اپنا راستہ لیا۔

دوکان پر پہونچ کر نیاز کالے صاحب کی باتوں پر دیر تک غور کرتا رہا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو صرف روپیہ پیدا کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے بوجھ سے دبے ہوئے ایک روز چپ چاپ دنیا کو تج کر جاتے ہیں۔

نیاز نے سوچا اگر بیمہ کے ذریعہ سال، دو سال میں بیس، پچیس ہزار کی رقم ہاتھ لگ جائے تو مزا آ جائے۔ بات کچھ سمجھ میں بھی آتی تھی۔ لیکن اس کے لئے پہلے ایک بیوی کی ضرورت تھی سوچتے سوچتے اس نے ایک اسکیم تیار کی اور اس روز سر شام ہی نوشا کے گھر پہونچ گیا۔

حسب معمول سلطانہ کمرے کے اندر بیٹھی رہی۔ کبھی کبھی اس کی آواز ابھرتی تو نیاز کے سینہ پر سانپ لوٹ جاتا اور نوشا کی ماں کی ہر بات اس کو زہر میں بجھی ہوئی معلوم ہوتی جو اس کے سامنے بیٹھی ہنس ہنس کر پڑوس کی ایک عورت کا قصہ سنا رہی تھی جس کی شلوار میں ایک چوہیا گھس گئی تھی۔

جب ایک پہر رات گزر گئی اور گھر پر گہرا سناٹا چھا گیا تو نیاز نے خلوت میں نوشا کی ماں سے کہا "اس طرح کب تک یہ سلسلہ چوری چھپے چلتا رہے گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ کیوں نہ ایک روز قاضی کو بلا کر قبول پڑھوا لئے جائیں۔ اللہ رسول بھی خوش اور دنیا بھی خوش" سلطانہ کی ماں کی بھی یہی خواہش تھی۔

مگر اس کے اپنے پروگرام کے مطابق ابھی اس نیک کام کا وقت نہیں آیا تھا۔ دراصل اسکو نیاز کی نیت پر شبہ تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ پہلے سلطانہ کا کسی کے ساتھ بیاہ کردے۔ لہذا اس نے نیاز کی بات کو اس وقت بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ٹال دیا۔

## ۷

سہ پہر کا وقت تھا۔ سلمان کہیں سے تھکا ہارا آرہا تھا۔ راستے میں اس کی اتو سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ گھر نزدیک تھا، وہ اصرار کرکے سلمان کو گھرلے آیا۔ ماں نے اندر بلالیا۔

سلمان ان دنوں پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہوچکی تھیں۔ مگر اس دفعہ وہ گھر نہیں گیا تھا۔ اس کا باپ کسی بات پر ناراض ہوگیا تھا۔ ہر ماہ اخراجات کے لئے جو خرچہ بھیجا کرتا تھا وہ بھی بند کردیا تھا۔ اب اس کو اکثر فاقے ہی کرنا پڑتے۔ صحت خراب ہوگئی تھی۔ چہرہ بیماروں کی طرح نظر آرہا تھا۔

نوشا کی ماں نے اس کی یہ حالت دیکھی تو تعجب سے پوچھا "کیا تم کچھ بیمار پڑگئے تھے؟"

وہ صاف جھوٹ بول گیا۔ "جی ہاں ٹائیفائڈ ہوگیا تھا۔"

وہ بولی "جبھی تو میں کہوں کہ تم اس روز کے بعد کیوں نہیں آئے۔"

سلمان کہنے لگا "کچھ تو امتحان کی مصروفیت رہی، اس سے فرصت ہوئی تو اچانک بیمار پڑگیا۔"

سلمان کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے جانے لگا تو نوشا کی ماں نے اس کو روک لیا کہ کھانا کھاکر جاتا۔ وہ تھی بھی کچھ باتونی عورت اور اس روز تو اسپر باتیں کرنے کا دورہ پڑا تھا، نہ جانے کہاں کہاں کے قصے اسکو سنائی رہی۔ سلمان خاموشی سے بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہا۔

اس عرصہ میں کئی بار دروازے پر سلطانہ کی جھلک نظر آئی۔ سلمان جو ماں کی بے سروپا باتوں سے اکتا گیا۔ سلطانہ میں دلچسپی لینے لگا۔ اب وہ ماں کی نظریں بچاکر اس کی جانب دیکھ لیتا۔ سلمان نے سوچا

کر لڑکی خوبصورت ہے، طرحدار ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی تھی۔ یہ احساس خود اپنی جگہ کم کشش انگیز نہ تھا۔ اور ان دنوں تو وہ پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کو پناہ کی ضرورت تھی۔ ذہنی فرار کی ضرورت تھی۔ کچھ یہی وجہ تھی کہ وہ کمرے کے اندر گرمی کا حبس ہونے کے باوجود دیر تک نوشا کی ماں سے باتیں کرتا رہا۔

اب دن ڈھلنے لگا تھا۔ شام کی آمد آمد تھی۔ نوشا کی ماں کسی ضرورت سے کمرے کے باہر چلی گئی تھی۔ کمرے میں وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اور اس تنہا کمرے میں سلطانہ کے جوان جسم کی مہک رچی ہوئی تھی۔ اس مہک میں ایک لذت اور دلفریبی تھی جس کو وہ چپ چاپ بیٹھا محسوس کرتا رہا۔

شام کا دھندلکا فوق کی سیڑھیوں سے اترتا ہوا، در و دیوار پر پھیل گیا۔ گلی کی چہل پہل بڑھ گئی اور گھروں کے اندر ملی جلی آوازوں کا شور ابھرنے لگا۔ موسم گرما کی یہ ایک ایسی شام تھی، جس کی لذت کو وہ صرف آوازوں سے محسوس کر رہا تھا۔ ان آوازوں میں سلطانہ کی بھی آواز تھی، جو خواہ مخواہ اٹھلا اٹھلا کر بول رہی تھی، جیسے اسکو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ کوئی اس کی آواز سن رہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا۔ کھانے میں خاصہ تکلف کیا گیا تھا۔ وہ صبح کا بھوکا تھا۔ کھانا اس کو پسند آیا اور اس نے اس کی تعریف بھی کی۔ نوشا کی ماں اصرار کر کر کے اس کو ایک ایک چیز کھلاتی رہی۔

اس کی یہ شام بڑی مزے دار گزری۔

ایک روز ناغہ کر کے تیسرے دن شام کو وہ پھر وہاں پہونچا۔ نوشا کی ماں اس روز بھی اس سے بڑی محبت سے پیش آئی۔ باتوں باتوں میں نوشا کے باپ کا ذکر چھڑ گیا۔ وہ ایک لمبی چوڑی داستان سنانے لگی۔ نہ جانے کب تک وہ اس قصہ کو جاری رکھتی، اسی اثنا میں کسی نے آ کر اطلاع دی کہ پڑوس میں جو منشی جی رہتے تھے ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے گھر سے نوشا کی ماں کے دیرینہ مراسم تھے۔

نوشا کی ماں جذباتی قسم کی عورت تھی۔ اس خبر کے سنتے ہی بدحواس ہو گئی۔ اسنے سلمان سے بات بھی نہیں کی اور فوراً منشی جی مرحوم کے گھر کی طرف چلدی۔ کمرے میں اب سلمان کے پاس نوشا رہ گیا تھا اور کمرے کے باہر سلطانہ تھی جو کھانا پکانے میں مشغول تھی۔ سلمان نوشا سے باتیں کرنے لگا۔ زیادہ دیر وہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لئے سلمان نے واپس جانے کا ارادہ کیا تو سلطانہ نے دروازے پر آ کر خود اس سے کہا۔

"کھانا کھا کر جایئے گا۔ اماں تھوڑی دیر میں آ جائے گی۔"

وہ دروازے کی آڑ میں اس طرح کھڑی تھی کہ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں، والی بات تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نظر بھر کر دیکھا۔ سلطانہ کی نگاہیں جھک گئیں اور سلمان نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نیاز آیا تھا۔ مگر سلطانہ نے اس کو گھر کے اندر نہ بلایا۔ نیاز جھنجھلایا ہوا چلا گیا۔ نوشا جو دیر سے باہر نکلنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا، وہ بھی وہاں سے کھسک گیا۔ گھر کے اندر سلمان تنہا رہ گیا تھا۔ اس تنہائی نے اس کو شدید بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ اس لئے کہ اب گھر کے اندر وہ دونوں تنہا رہ گئے تھے۔ ان کے درمیان صرف ایک دیوار حائل تھی اور اس دیوار میں ایک دروازہ تھا جس کا ایک پٹ کھلا تھا۔ شام کی مدہم ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے کمرے کے اندر آ رہے تھے۔ لیمپ کی لَو بار بار بھڑک اٹھتی۔ کچھ یہی کیفیت سلمان کی تھی۔

ایک بار سلطانہ دروازہ کے سامنے سے گزری۔ دوبارہ پھر گزری۔ دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ کمرے کے اندر بھڑکتی ہوئی لیمپ کی لَو جیسے بار بار کہہ رہی تھی۔

"کچھ ہونے والا ہے"

"کچھ ہونے والا ہے۔"

اچانک شیشے کے ٹوٹنے کی آواز ابھری۔ سلمان چونک پڑا۔ کمرے کے باہر شیشے کا کوئی برتن فرش پر گر کر ٹوٹ گیا تھا۔ اس کا چھناکا سلمان کے دماغ میں دور سے گونجا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا ہو گیا؟"

باہر سے سلطانہ کی آواز ابھری: "کچھ نہیں چوہوں نے طاق پر سے گلاس گرا دیا تھا۔"

اس نے پوچھا "چوٹ تو نہیں آئی؟"

سلطانہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ سلمان کو اپنے بے تکے سوال کا بعد میں احساس ہوا۔

کچھ اور وقت خاموشی میں گزر گیا۔

سلمان نے اس عجیب سی خاموشی سے اکتا کر اونچی آواز میں پوچھا "یہ نوشا کہاں چلا گیا؟"

سلطانہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سلمان کو بڑی کوفت ہوئی۔ ذرا دیر بعد باہر قدموں کی آہٹ ابھری۔ سلطانہ نے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا تھا؟"

وہ بولا "جی ہاں۔ دیواروں سے تو میں کچھ بات کرنے سے رہا۔"

"ارے ؟" وہ بے پرواہی سے ہنس دی۔
سلمان کہنے لگا "اچھا تو میں اب چلوں گا" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔
وہ شوخی سے بولی "اکیلے کمرے میں آپ کو ڈر تو نہیں لگ رہا؟"
کالج کا کھلنڈرا نوجوان شرارت پر اتر آیا "بات تو کچھ ایسی ہے۔"
سلطانہ سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔
سلمان کہنے لگا "اچھا تو ایسا کیجئے کہ آپ یہاں کمرے میں آکر بیٹھ جائیے اور میں کھانا تیار کروں گا۔"
وہ بولی "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"
"ایسا فرسٹ کلاس کھانا تیار کروں گا کہ آپ بھی کیا یاد کریں گی۔"
"کہاں سیکھا آپ نے؟"
وہ بولا "باقاعدہ امتحان پاس کیا ہے۔"
وہ حیرت زدہ ہو کر بولی "اچھا تو کھانا پکانے کا بھی امتحان دینا پڑتا ہے۔"
سلمان کہنے لگا "بڑا سخت امتحان ہوتا ہے۔"
دونوں باتیں کرتے کرتے بالکل آمنے سامنے آگئے تھے۔ یکبارگی سلطانہ کو جو اس کا خیال آیا تو وہ جھینپ گئی۔ سلمان نے فوراً کہا "اب کیا کیجئے گا پردہ کر کے۔"
وہ بولی "اونہہ ہنہ" پھر اس نے بڑی معصومیت کے ساتھ کہا "اماں ناراض ہوں گی۔"
سلمان مسکرانے لگا "انکے سامنے پردہ کر لیا کیجئے ٹھیک ہے نا" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل اسکے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلطانہ نے جو اسکو اپنے قریب دیکھا تو گھبرا کر بولی "ہائے اللہ" اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ سلمان کو اس کا یہ انداز بڑا اچھا لگا۔ اسنے سلطانہ کے سر پر اس طرح اپنا ہاتھ ڈرتے ڈرتے رکھ دیا کہ جیسے وہ کوئی دہکتی ہوئی انگیٹھی تھی جس سے اس کا ہاتھ جھلس کر رہ جائے گا۔
سلطانہ کا تمام جسم لرز کر رہ گیا۔ سلمان نے جلدی سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔
ذرا دیر تک دونوں خاموش کھڑے رہے۔
سلمان یکبارگی گھبرا گیا۔ کہنے لگا "مجھے اب چلنا چاہیے" اور پھر سلطانہ کے جواب کا انتظار کئے بغیر گھر سے باہر چلا گیا۔ سلطانہ اسکو دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

سلمان، نوشا کے گھر سے نکلا تو بھوک نے ستانا شروع کر دیا۔ آج بھی وہ صبح سے بھوکا تھا۔ نہ جیب میں کوئی پیسہ تھا اور نہ کہیں سے رقم ملنے کی امید تھی۔ لے دے کے اس کے پاس ایک گھڑی رہ گئی تھی۔ جس کو وہ کئی روز سے فروخت کرنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ راستے میں نیاز کی دوکان پڑتی تھی۔ جب وہ اس کے سامنے سے گزرا تو جھجکتا ہوا دوکان کے اندر داخل ہو گیا۔

دوکان کے اندر لالٹین جل رہی تھی۔ اور اس کی پیلی پیلی روشنی میں نیاز خاموش بیٹھا تھا۔ اسکو دیکھ کر بولا: کہئے " سلمان گھبرایا ہوا تھا۔ جلدی سے بولا۔

" میں یہ گھڑی فروخت کرنا چاہتا ہوں "

اسنے گھڑی کلائی سے اتار کر اسکو دے دی۔ نیاز نے گھڑی کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ کان کے پاس لے جا کر اس بات کا اندازہ لگایا کہ آیا گھڑی چل رہی ہے یا بند ہے۔ جب وہ اچھی طرح اس کو دیکھ بھال چکا تو کہنے لگا۔

" آپ ہی کی ہے ؟"

سلمان کو اس کے اس بے تکے سوال پر سخت غصہ آیا۔ اس کا جی تو چاہا کہ اس سے کہہ دے " تو کیا چوری کی ہے " مگر اس وقت وہ جھگڑے کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ گھڑی فروخت کرنے آیا تھا اس نے صرف اس قدر کہا۔

" جی ہاں میری ہی ہے "

نیاز مکاری سے مسکرا کر بولا " معاف کیجئے گا، یہاں ایسے لوگ بھی آتے ہیں جو اپنی چیزیں بیچنے نہیں آتے۔ اگر گھڑی آپ کی بھی نہ ہو تو کوئی بات نہیں " وہ اور کھل کر مسکرا دیا۔

سلمان اس دفعہ بھی تلملا کر رہ گیا۔ کہنے لگا " تو آپ اُسے خریدنا چاہتے ہیں "

نیاز بولا " خرید لوں گا۔ عام طور پر ایسی چیزیں میں خریدتا نہیں اس لئے کہ یہ مشینری کا معاملہ ہے اور اسمیں بڑی بڑی چار سو بیسیں ہوتی ہے "

سلمان سوچنے لگا کہ عجیب نامعقول آدمی سے سابقہ پڑا ہے۔ ایک کے بعد دوسرا الزام عاید کرتا جا رہا ہے۔ مگر کچھ کہنے کی گنجائش نہ تھی۔ اس لئے نرمی سے بولا " آپ مجھ پر اعتبار کر سکتے ہیں "

وہ بولا " چلئے آپ پر اعتبار کر لیا۔ اب یہ بتایئے کہ آپ اس کا لیں گے کیا "

سلمان نے کہا " یہ اُمیگا واچ ہے۔ میں نے اس کو تین سو پچیس روپے میں خریدا تھا "

" تین سو پچیس روپے میں تو آپ نے اسکو خریدا تھا۔ اور ۴، ۵ سال سے استعمال بھی کر رہے ہیں۔

اس سے کم تو پرانی نہیں لگتی "۔

سلمان نے لمحہ بھر سوچ کر کہا" جی ہاں کوئی چار سال تو اس کو خریدے ہوئے ہو گئے "۔

نیاز نے ہنس کر کہا" سمجھئے اس کی قیمت تو آپ نے وصول ہی کر لی "۔

سلمان نے جلدی سے کہا" نہیں صاحب "۔

نیاز نے بات کو زیادہ طول نہ دیا۔ صاف بات کہدی" میں تو اس کے ۵۰ روپے سے زیادہ نہ دوں گا۔ جی چاہے تو اسکو رکھ جایئے اور روپے لے جایئے "۔

سلمان پچاس روپے پر گھڑی فروخت کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔

بڑی مشکل سے نیاز نے ۱۵ روپے اور بڑھائے۔ سلمان کو گھڑی بیچتے ہوئے دکھ تو بہت ہوا مگر مجبوری ایسی آپڑی تھی کہ کوئی اور چارۂ کار نہ تھا۔ اسنے نیاز سے ۶۵ روپے لئے اور دوکان سے باہر آ گیا۔

رات سہانی تھی۔ سلمان کی عرصے سے دبی ہوئی خواہشیں اکیبارگی جاگ اٹھیں۔ وہ ایک بار میں گھس گیا۔ وہاں اسنے بیر کی دو بوتلیں پیئں۔ ایک اچھے سے ہوٹل میں ڈٹ کر کھانا کھایا اور اپنے ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ وہاں حسب معمول رمی ہو رہی تھی۔ سلمان بھی جا کر ان میں شامل ہو گیا۔ سنیچر کی رات تھی۔ دوسرے دن اتوار کی چھٹی تھی۔ تمام رات کھیل ہوتا رہا اور سلمان تمام رات رمی کھیلتا رہا۔

اس روز اس کا ستارہ عروج پر تھا۔ جیسے کارڈ اسنے چاہے وہی ملے۔ دو آنے پوائنٹ سے کھیل ہو رہا تھا۔ سلمان نے بیٹھتے کے ساتھ ہی وارے نیارے کر دیئے۔ جب سلمان وہاں سے نکلا تو مسجدوں میں اذانیں ہو رہی تھیں۔ اس کی جیب میں اس وقت کچھ اوپر تین سو روپے تھے اور آنکھیں شب بیداری سے سرخ ہو رہی تھیں۔

تمام دن وہ اپنے کمرے میں پڑا سوتا رہا جس کی ہر چیز بھی اس کی زندگی کی طرح بے ترتیبی تھی۔ دن ڈھلے وہ نوشا کے گھر کی طرف جانے کے ارادہ سے نکلا مگر راستے میں اکبر مل گیا، وہ اس کا بے تکلف دوست تھا۔ دونوں نے بار میں جا کر بیئر پی اور وہیں یہ پروگرام بنا کہ کسی اچھی سی طوائف کا گانا سنا جائے۔

دونوں نے کئی بالاخانوں کے چکر کاٹے، آخر ایک گانے والی ان کو پسند آئی۔ گانا تو وہ کچھ واجبی ہی سا جانتی تھی مگر آواز ایسی تھی جیسے کوئل کوک رہی ہو۔ حسن بھی زیادہ نہ تھا۔ ایک ایک بول کے ساتھ یوں بھاؤ بتاتی تھی کہ تصویر کھنچ جاتی تھی۔

سلمان کو وہ سانولی سلونی طوائف کچھ کچھ اس قدر بھا گئی کہ وہ کئی گھنٹے تک بیٹھا اس کا گانا

سنتا رہا۔ شروع میں کچھ دوسرے تماشبین بھی وہاں موجود تھے۔ مگر رفتہ رفتہ سب کھسک گئے۔ اس وقت رات آدھی گزر چکی تھی۔ محفل اپنے شباب پر تھی۔ طوائف اس کی فرمائش پر ٹھمری گا رہی تھی۔ اب اسنے پیروں میں گھونگھرو باندھ لئے تھے اور ناچ بھی شروع کر دیا تھا۔ طبلچی جھوم جھوم کر ٹھیکا دے رہا تھا۔ اور طوائف کا جسم یوں لچک رہا تھا کہ سلمان کو ۱۰۰ آ گیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لہراتی ہوئی اس کے قریب آتی تو وہ بے تاب ہو جاتا۔ اور سرگوشی کے سے انداز میں اکبر سے کہتا۔

"یار ہم تو قتل ہو گئے۔"

"استاد بڑی زوردار بونڈیا ہے۔"

عین اس وقت جب ناچ اور ٹھمری کے بولوں نے دونوں کو وارفتہ کر دیا تھا اور وہ بے قابو ہو کر چیخ چیخ کر آوازیں لگا رہے تھے۔ اچانک دروازہ کھول کر ایک شخص داخل ہوا۔ اس کی گھنی مونچھیں تھیں۔ آنکھیں الو کی طرح گول گول تھیں۔ لباس ڈھیلا ڈھالا تھا۔ اندر آتے ہی اسنے ان دونوں کو دیکھا اور گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ سلمان سمجھا کہ بھڑوا ہو گا۔ اس سے کہنے لگا۔

"کچھ شراب دراب کا بھی بندوبست کراؤ گے۔"

اسنے سلمان کی جانب گھور کر دیکھا اور طوائف سے بولا "بند کر دو جی یہ ناچ واچ۔ بس ہو چکا مجرا۔"

طوائف فوراً ہی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئی۔ سازندے خاموش ہو گئے۔ سارنگیا سرنگی پر غلاف چڑھانے لگا اور طبلچی ہتھوڑی سے طبلوں کو ٹھوکنے لگا۔ سلمان کو سخت طیش آیا۔ وہ پچاس روپے سے زائد خرچ کر چکا تھا اور اب جب کہ محفل رنگ پر آئی تھی تو اس نامعقول آدمی نے جو ہر طرف سے بھڑوا نظر آ رہا تھا۔ رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ سلمان اس سے کہنے لگا۔

"آپ یہاں کے چودھری ہیں؟"

اس آدمی نے سگریٹ کا لمبا سا کش لگا کر کہا "جی نہیں ہزار روپیہ مہینہ دیتا ہوں۔"

سلمان موڈ میں تھا۔ ہنس کر بولا "بہت سستا سودا کیا۔ یہاں تو صرف رات بھر کے لئے ہزار روپیہ دینے کا ارادہ تھا۔"

وہ کہنے لگا "آپ لوگوں کا افیون کا ٹھیکہ تو نہیں ہے؟"

اس شخص نے تو سنجیدگی سے یہ بات کہی تھی۔ مگر سلمان سمجھا کہ چوٹ کر رہا ہے۔ فوراً بولا "کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آج کل کوئلہ کا کیا بھاؤ ہے؟"

اس شخص کا رنگ کالا تھا۔ تلملا کر بولا "دیکھئے صاحب میں یہاں یہ بدتمیزی برداشت نہیں کر سکتا"

سلمان نے کہا "سنا ہے لکھنو کے نوابین اپنے صاحبزادوں کو تمیز سیکھنے کے لئے رنڈیوں کے پاس بھیجا کرتے تھے لیکن میں تو روہیل کھنڈ کا رہنے والا ہوں"

وہ جل کر بولا "آپ روہیل کھنڈ کے رہنے والے ہوں یا بندیل کھنڈ کے بس آپ لوگ شرافت کے ساتھ یہاں سے تشریف لے جائیں"

اکبر جو اب تک خاموش بیٹھا تھا، بیچ میں بول پڑا "ورنہ ؟"

اس آدمی نے اس کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا۔ اونچی آواز سے بولا "ابے جھبرو، کہاں مر گیا، ذرا یہاں تو آ"

ذرا دیر بعد ایک لحیم شحیم آدمی کمرے کے اندر آ گیا۔ اس نے آتے ہی کہا "ذرا سلفے پہ دم لگا رہا تھا" نشے سے اس کی آنکھیں لال لال نظر آ رہی تھیں۔ وہ کالا کلوٹا آدمی اس سے کہنے لگا۔

"کمرہ خالی کرا کے دروازہ بند کر دو۔ یہ دونوں آدمی رنگ بازی کر رہے ہیں"

جھبرو نے ان دونوں کو غور سے دیکھا "چلئے جی اٹھیئے۔ اب گانا وانا نہیں ہوگا"

سلمان نے غصہ سے اس کو گھور کر دیکھا۔ وہ کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ جھبرو نے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے کے ساتھ اس کو کھڑا کر دیا۔ سلمان نے گھبرا کر طوائف کی جانب دیکھا وہ نظریں جھکائے مسکرا رہی تھی۔

جھبرو اس کو ڈھکیلتا ہوا دروازے کی جانب لے چلا۔ سلمان نے اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے بہت ہاتھ پاؤں مارے مگر جھبرو نے اسکو نہ چھوڑا اور دروازے پر سے اس زور سے اس کو دھکا دیا کہ وہ لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔

سلمان سڑک پر پڑا ہوا یہ سوچ ہی رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا کہ اتنے میں اکبر آ کر اس کے اوپر گرا۔ دونوں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے۔ سلمان کہنے لگا۔

"سالے کے ہاتھ لوہے کے بنے ہوئے تھے"

اکبر کھسیانہ ہو کر بولا "یار بڑی بے عزتی ہو گئی"

سلمان نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ہاتھ کی کہنی کو رگڑنے لگا، جس پر چوٹ آ گئی تھی۔

ذرا دیر تک دونوں وہاں کھڑے رہے اور پھر چپ چاپ آگے بڑھ گئے۔

سلمان ان طالب علموں میں سے تھا۔ جو زمانۂ طالب علمی میں ہی زندگی کے بہت سے تجربات حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ واقعہ اسکے تجربات کے ذخیرے میں نیا اضافہ ہو کر رہ گیا۔

## ۸

ایک ہفتہ بعد۔

سلمان اپنے کمرے میں پڑا گہری نیند سو رہا تھا۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی آہستہ آہستہ دروازے کو کھٹکھٹا رہا تھا۔ اسنے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دن ڈھل چکا تھا۔ دھوپ مکانوں کی اونچی منڈیروں کو چوم رہی تھی۔ سائے جھک گئے تھے۔ اور ان جھکے ہوئے سایوں میں چائے خانہ کا مالک روشن خاں کھڑا تھا۔ سلمان اسکو دیکھتے ہی گھبرا گیا۔

روشن خاں نے بلا کسی تمہید کے اس سے کہا۔ "آپ کی طرف پچھلے مہینے کے بیس کے ۲۲ روپے نکلتے ہیں۔ آج اس کا حساب بے باق کر دیجئے۔"

اس کے تیور دیکھ کر سلمان کو اندازہ ہو گیا کہ آج وہ یہ طے کرکے آیا ہے کہ روپے لئے بغیر واپس نہیں جائے گا۔ اور اس کی حالت یہ تھی کہ پاس کھوٹا پیسہ تک نہ تھا۔ رات وہ جوئے میں سب کچھ ہار گیا تھا اور صبح سے بھوکا پیاسا پڑا تھا۔ سلمان نے فوراً اس کے مکھن لگایا۔ کہنے لگا۔

"خاں صاحب کیا کسی سے لڑ کر آرہے ہو؟"

وہ بولا "نہیں صاحب۔ ہم دوکاندار آدمی کس سے جھگڑا کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر کچھ طبیعت خراب ہوگی دیکھ کر تو یہی پتہ لگتا ہے۔"

وہ کہنے لگا "گرمی کے دن ہیں جی، طبیعت کچھ گڑبڑ ہی رہتی ہے۔"

اس کے تیور کچھ مدھم پڑ گئے تھے اور وہ ایک جھنجھلائے ہوئے قرض خواہ کے بجائے وہ عام آدمی نظر آنے لگا تھا۔ سلمان اسکو اسی عالم میں دیکھنا چاہتا تھا۔ لاپرواہی سے بولا "خان صاحب گھر سے

میرا ابھی خرچ نہیں آیا ہے۔ کل پرسوں تک منی آرڈر آجائے گا۔ تو فوراً حساب صاف ہو جائے گا"۔ یہی بات وہ دو ہفتے پہلے بھی اس سے کہہ چکا تھا اور پرسوں رات کو چائے پیتے ہوئے بھی وہ یہی بات کہہ آیا تھا۔

روشن ایک دم بپھر گیا "نہیں صاب اس طرح کام نہیں چلے گا۔ میں منی آرڈر وٹی آرڈر کا چکر نہیں جانتا۔ آج تو آپ حساب صاف ہی کر دیجئے۔

سلمان نے بڑی مشکل سے اسکو راضی کیا اور دو روز کی مہلت لی۔

جب وہ بلا (روشن خان) کسی طرح اس کے سر سے ٹلی تو وہ تھکا ہوا سا آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ خالی معدے میں چوہے فری اسٹائل کشتی لڑ رہے تھے۔ نقاہت بڑھ گئی تھی۔ اسنے فرش پر پڑی ہوئی ایک ادھ جلی سگریٹ اٹھا کر سلگائی۔ کش لگاتے ہی کلیجہ سلگنے لگا اسنے سگریٹ کو اٹھا کر پھینک دیا اور غصہ سے اس کو فرش پر مسل ڈالا۔

کچھ دیر وہ چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا کہ اب کیا کیا جائے۔ روشن خاں کے چائے خانہ میں جاکر وہ چائے کے ساتھ کچھ کھا پی بھی سکتا تھا مگر وہ اس قدر بدتمیز آدمی تھا کہ سب کے سامنے تقاضا کر دیتا تھا یہ بے غیرتی بھی وہ گوارہ کر لیتا مگر کب تک۔ سوچتے سوچتے اس کی نظر میز پر رکھے ہوئے تھرماس پر پہونچ گئی۔ پچھلے سال وہ اس کو گھر سے لایا تھا۔ ماں نے یہ سوچ کر کہ سفر میں اسکو تکلیف نہ ہو، برف بھر کے یہ تھرماس اس کے ساتھ کر دیا تھا۔ وہ خوابناک نظروں سے بیٹھا اسکو تکتا رہا۔ پھر اس نے اٹھ کر کپڑے تبدیل کئے اور تھرماس کو اخبار میں لپیٹ کر نیاز کی دوکان کی طرف چلدیا۔

نیاز دوکان پر موجود تھا۔ تھرماس بالکل نیا تھا لیکن بڑی مشکل سے اسنے ۲۰ روپے دیئے۔ سلمان نے روپے جیب میں ڈالے اور دوکان سے باہر آگیا۔

جب سلمان دوکان سے باہر نکل رہا تھا۔ اسی وقت نوشا بھی وہاں پہونچ گیا۔ اسنے سلمان کو دیکھا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ سلمان کی اس پر نظر نہ پڑی۔ نوشا چاہتا بھی یہی تھا۔ جیسے ہی وہ آگے بڑھا نوشا جھٹ سے اندر داخل ہو گیا۔

اس روز نوشا خالی ہاتھ آیا تھا اور اس ارادے سے آیا تھا کہ نیاز سے ایک روپیہ ادھار مل جائے تو اچھا ہے۔ اسنے راجہ اور شامی کے ساتھ سنیما دیکھنے کا پروگرام بنایا تھا۔ مگر نیاز نے صاف انکار کر دیا۔ کہنے لگا۔

"جب کچھ لے کر آؤ گے۔ تب ہی پیسے ملیں گے"۔

نوشا نے خوشامد کرنے کے انداز میں کہا۔ "کل میں ضرور کچھ نہ کچھ پیسے کر آؤں گا۔ بس آج ایک روپیہ دیدو۔"

وہ بگڑ کر بولا۔ "بس ایک بار کہہ دیا۔ خواہ مخواہ جان نہ کھاؤ۔"

نوشا ذرا دیر خاموش بیٹھا رہا اور پھر چپ چاپ اٹھ کر چل دیا۔ لیکن وہ دروازے ہی تک گیا تھا کہ پیچھے سے نیاز کی آواز ابھری۔ "ابے اب چلا ہی جائے گا" نوشا نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا نیاز اس کی طرف دیکھ کر بے تکلفی سے مسکرا رہا تھا۔ اسنے ہاتھ کے اشارے سے اس کو قریب بلایا تو نوشا پالتو کتے کی طرح آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس چلا گیا۔ نیاز چہرے پر مصنوعی ناراضگی پیدا کر کے کہنے لگا۔

"سینما کے لئے روپیہ چاہئے ہے نا؟"

نوشا انکار نہ کر سکا اسنے گردن ہلا دی "ہاں۔"

نیاز نے جیب سے ایک روپیہ نکال کے اس کے سامنے پھینک دیا "سالے یہ سینما کی چاٹ تجھکو تباہ کر دے گی۔"

نوشا نے چپ چاپ روپیہ اٹھا لیا۔ نیاز کہنے لگا "دیکھ کل کچھ نہ کچھ پیسے ضرور آنا۔ ورنہ آئندہ ایک پیسہ نہ دوں گا۔"

نوشا دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے باہر چلا گیا۔ شام ہو گئی تھی۔ ہر طرف چراغوں کی روشنی جھلملا رہی تھی۔ نوشا وہاں سے سیدھا گلی کے اندر پہونچا۔ میونسپلٹی کی لالٹین جل چکی تھی۔ مگر وہاں راجہ موجود نہیں تھا۔ قریب ہی ایک مکان کے چبوترے پر شامی اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کی قمیص کا گریبان پھٹا ہوا تھا۔ ہونٹ سے خون نکل رہا تھا جس کو وہ بار بار آستین سے پونچھ رہا تھا۔ آستین پر جگہ جگہ خون کے سرخ سرخ دھبے لگ گئے تھے۔ نوشا کو آتے دیکھ کر اسنے ڈبڈبائی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا اور خاموشی کے ساتھ آستین سے ہونٹ سے رستا ہوا خون پونچھنے لگا۔ نوشا نے اس کے قریب جا کر فوراً پوچھا۔

"ابے کیا ہو گیا۔ ابا نے مارا ہے؟"

اسنے انکار میں گردن ہلا دی "نہیں۔"

نوشا نے جلدی سے کہا۔ "پھر کیا بات ہوئی؟"

شامی نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے

لگا۔ نوشا گھبرا گیا۔ ڈانٹ کر بولا " اب کچھ بتا تو کہ ہوا کیا ؟" شامی بھرائی ہوئی آواز سے بولا " اس سالے ڈاکٹر موٹو کے لڑکے اور نوکر نے مارا ہے " اتنا کہہ کر وہ اور بھی زیادہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا نوشا نے کہا۔

" اچھا تو یہ بات ہے۔ راجہ کہاں ہے ؟"

شامی بولا " وہ ابھی تک نہیں آیا "

نوشا نے کہا " چل اسکو ساتھ لیتے ہیں۔ اور پھر ان سالوں سے پوچھتے ہیں۔ ان کی تو ایسی کی تیسی۔ سالوں نے سمجھا کیا ہے جی " نوشا بہت جوش میں تھا۔ شامی کا سارا دکھ اڑن چھو ہو گیا۔ اس نے آنسو پونچھے اور اکڑ کر بولا۔

" وہ سالے دو تھے، میں اکیلا پڑ گیا۔ پھر ان کے پاس اسٹکیں بھی تھیں "

" اچھا " نوشا نے گردن ہلا کر کہا۔ " مگر بات کیا ہوئی "

وہ بولا " اماں کوئی بات نہیں تھی۔ سالا میرے ساتھ گلی ڈنڈا کھیل رہا تھا۔ بہت دیر تک پدا تا رہا۔ جب میری باری آئی تو کہنے لگا کہ داؤں نہیں دوں گا۔ میں نے کہا کہ میں تو ابھی داؤں لوں گا سالے نے جھپٹتے ہی میرے منہ پر مکہ مارا۔ پھر تو مجھے بھی تاؤ آگیا۔ اٹھا کر دے مارا۔ سالا اس وقت تو روتا ہوا چلا گیا۔ اب شام کو نوکر کو ٹ کر آیا تھا " وہ ابھی جھگڑے کی کچھ اور تفصیل بتاتا۔ لیکن اتنی ہی بات سنتے ہی نوشا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ کہنے لگا۔

" چھوڑ یار باتوں کو، آ راجہ پاس چلیں "

شامی جھٹ سے چبوترے پر سے اتر آیا۔ دونوں راجہ کی کھولی کی جانب چل دیئے۔

راجہ خلاف معمول دروازے پر منہ لٹکائے گم سم بیٹھا تھا۔ کھولی کے اندر اندھیرا تھا۔ اور اس اندھیرے میں راجہ سائے کی طرح دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ دونوں نے اسے اس عالم میں دیکھا تو کسی قدر تعجب ہوا۔ نوشا سمجھا کہ راجہ بھی کہیں سے لڑ جھگڑ کر آیا ہے۔ اس نے قریب جا کر پوچھا۔

" ابے یہ رونی صورت بنائے کیوں بیٹھا ہے ؟"

راجہ نے کوئی جواب نہ دیا، اسی طرح منہ لٹکائے بیٹھا رہا۔ نوشا نے جیب سے روپیہ نکال کر ٹن سے بجایا اور ہنس کر بولا " بول کیا کہتا ہے ؟"

اس دفعہ راجہ بے زاری سے بولا " یار پریشان نہ کر۔ اپنا یوں ہی ڈبا گل ہو گیا "

شامی جواب تک چپ تھا، جھٹ سے بولا " استاد سے جھگڑا ہو گیا ؟"

"نہیں یار استاد بے چارے کو تو پولیس والے پکڑ لے گئے"

راجہ کی یہ بات سنکر دونوں پریشان ہوگئے۔ اصرار کرکے پوچھا تو معلوم ہوا کہ بوڑھے گداگر کو انسداد گداگری کے قانون کے تحت گرفتار کرکے جیل بھیج دیا گیا۔ راجہ نے یہ بات بڑے دکھ کے ساتھ بتائی اس لئے کہ اس کی آمدنی کا ذریعہ اچانک بند ہوگیا تھا۔ دروازے کے قریب ہی لکڑی کی وہ بھدی سی گاڑی رکھی تھی، جس میں راجہ بوڑھے گداگر کو ڈال کر روزانہ پھیری پر جاتا تھا۔

دونوں جس ارادے سے آئے تھے، راجہ کی پریشانی دیکھ کر اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔ وہ اس وقت واقعی بہت افسردہ ہو رہا تھا۔ نوشا نے سینما جانے کا پروگرام بھی منسوخ کر دیا۔ تینوں نے جاکر ہوٹل میں چائے پی۔ اور دیر تک اس مسئلے پر غور کرتے رہے کہ اب راجہ کو کیا کام کرنا چاہیے۔

رات گئے جب ان کی محفل برخواست ہوئی تو نوشا نے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کرے گا کہ جس کارخانے میں وہ کام کرتا ہے وہیں راجہ بھی لگ جائے۔ مگر نوشا کی کوئی کوشش کام نہ آئی اور راجہ کئی کئی وقت کے فاقے کرنے لگا۔ اسنے گداگری شروع کی تو ایک روز پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہوں نے دوسرے گداگروں کے ساتھ اس کو بھی مویشیوں کی طرح ہانک کر پولیس کی لاری میں بند کر دیا۔ یہاں راجہ کی شرارتیں کام آگئیں۔ جب سب گداگروں کو تھانے کے احاطہ میں لاری سے اتارا گیا، تو راجہ لاری کے نیچے دبک گیا۔ اور موقعہ لگتے ہی احاطہ کی دیوار پھاند کر ایسا رفوچکر ہوا کہ پولیس والے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔

کئی روز تک وہ اپنی تنگ و تاریک کھولی میں پولیس کے ڈر سے چھپا رہا۔ نوشا اور شامی آجاتے تو پیٹ بھرنے کا سہارا ہو جاتا۔ شامی ان دنوں دیر میں آتا تھا وہ آتے کیساتھ ہی پاجامہ میں دبی ہوئی روٹیاں نکالتا اور راجہ کے سامنے رکھ دیتا۔ یہ روٹیاں وہ گھر سے چرا کر لاتا تھا۔ نوشا کو نیاز سے کچھ رقم مل جاتی تو وہ ہوٹل سے سالن منگوا دیتا ورنہ راجہ کو روکھی روٹی پر گزارا کرنا پڑتا۔ پولیس سے وہ کچھ اسقدر خوف زدہ ہو گیا تھا کہ اگر کبھی کبھار ہمت کرکے گلی میں آ جاتا اور کہیں پولیس والے کی جھلک بھی نظر آجاتی تو سر پہ پیر رکھ کر بھاگتا تھا۔

ان دنوں نوشا روزانہ کارخانے سے کوئی پرزہ یا اوزار اڑا لیتا اور سیدھا نیاز کے پاس پہونچتا۔ مگر روز روز چوری سے کارخانے میں کھلبلی پڑ گئی۔ عبداللہ مستری چیخ چیخ کر گالیاں دیتا۔ پھاٹک پر ہر کاریگر کی تلاشی لی جانے لگی۔ مگر نوشا اپنے کام میں ایسا منجھ گیا تھا کہ وہ چوکیدار کی آنکھ میں دھول جھونک کر صاف نکل جاتا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ اس کے ہتھے کوئی پرزہ یا اوزار نہ چڑھا۔ اسنے پیتل کا کچھ تار اٹھا کر ایک پرانی موٹر کی سیٹ کے نیچے چھپا دیا۔ کارخانے میں چھٹی ہونے سے کچھ دیر پہلے اسنے کاریگروں کی نظریں بچا کر تار کو قمیص کے اندر چھپا لیا اور پیشاب خانہ میں گھس گیا۔ دروازہ بند کیا اور پاجامہ اتار کر تار کو ران پر باندھ کر باہر آگیا۔ سیر سوا سیر کا وزن تھا۔ چلنے میں قدم ٹھیک نہ پڑتے تھے۔ وہ لنگڑاتا ہوا پھاٹک سے گزرا تو پٹھان چوکیدار نے اس کو مشتبہ نظروں سے دیکھ کر ٹوکا۔

"تمہارا ٹانگ میں کیا ہو گیا۔ خو تم کیسا چلتا ہے"

نوشا نے چہرے پر زبردستی تکلیف کی کیفیت پیدا کر کے فوراً کہا "سالا ایک راڈ آ کر ٹانگ پر گر گیا۔ بڑا درد ہو رہا ہے" یہ کہتا ہوا وہ پھاٹک سے باہر چلا گیا۔

گھبراہٹ میں اسنے جلدی چلنے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر پھاٹک کے سامنے گر پڑا۔ پیتل کے تار کا لچھا ایک دم سے پاجامہ کے اندر سے نکل کر باہر آگیا۔ چوکیدار کی نظر پڑ گئی۔ وہ لپک کر اس کے پاس پہنچ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا۔

"چوری کرتا ہے تم۔ کہتا ہے ٹانگ میں درد ہے"

اسنے فوراً ہاتھ بڑھا کر نوشا کی گردن اپنے چوڑے چکلے ہاتھ میں دبا لی اور چیخ کر بولا "چلو سیٹھ کے پاس" نوشا گڑگڑانے لگا۔ مگر سوات کے رہنے والے اس چونٹے پٹھان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

نوشا کو عبداللہ مستری کے سامنے پیش کیا گیا۔ چوکیدار نے تار کا لچھا میز پر رکھ دیا۔ مستری نے اسکو اٹھا کر دیکھا، پھر نوشا کو دیکھا اور اس کی آنکھیں ابل کر سرخ پڑ گئیں۔ چیخ کر بولا۔

"کیوں بے حرامی"

مارے غصے کے عبداللہ نے ہاتھ میں دبے ہوئے رجسٹر کو نوشا کے منہ پر دے مارا۔ اس کے بعد اس نے خود اپنے ہاتھ سے دیوار میں ایک مضبوط سی لوہے کی کیل گاڑی اور نوشا کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا کر اسکو کیل پر لٹکا دیا۔ پھر اسنے دو کیلیں اور منگوائیں اور عین نوشا کے تلووں تلے زمین میں اس طرح گاڑیں کہ ان کے نوکیلے سرے اوپر نکلے ہوئے تھے۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہو گیا تو اس نے ڈانٹ کر کہا۔

"دیکھ بے ہاتھ چھوڑے تو سمجھ لینا سالے دونوں کیلیں اندر اتر جائیں گی"

نوشا کی تکلیف سے انگلیاں ٹوٹے جا رہی تھیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک انگلی کی ہڈی دوسری انگلی کی ہڈی کو توڑ کر اندر پیوست ہو جائے گی۔ وہ درد سے بلبلا کر رونے لگا۔

"مستری جی اب کبھی چوری نہ کروں گا، اللہ کے لئے چھوڑ دو۔"

"مستری جی، مستری جی! نوشا تکلیف سے بلکتا رہا، چیختا رہا، خدا اور رسول کی دہائی دیتا رہا۔

مگر مستری اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ جب نوشا زیادہ شور کرتا تو وہ گرج کر کہتا۔

"ابھی سے رونا دھونا شروع کر دیا۔ سارے رات بھر اسی طرح لٹکاؤں گا۔ تو نے مجھے سمجھا کیا ہے۔"

نوشا اور زور سے چیخا، مستری اسی قدر اطمینان سے سگریٹ پر کش لگاتا، مسکرا کر اس کو دیکھتا اور کہتا "چوری کرو، بیٹا اور چوری کرو" نوشا اس کے لہجے میں نرمی دیکھ کر منت کرنے لگتا۔ فوراً ہی مستری غصہ سے اس کو ڈانٹتا۔ کئی منٹ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔

ایکا ایکی نوشا بڑے زور سے چیخا "مستری جی اللہ کے لئے چھوڑ دو۔ میرے ہاتھ چھوٹنے جا رہے ہیں۔"

اس کی ٹانگیں لوہے کے اسپرنگ کی طرح زور زور سے کانپ رہی تھیں۔ عبداللہ نے مڑ کر اس طرف دیکھا۔ اوپر سے خون کا ایک قطرہ فرش پر گرا۔ پھر دوسرا تیسرا، ٹپ ٹپ خون کے قطرے نیچے گر رہے تھے۔ انگلیوں کی کھال پھٹ کر ہتھیلیاں لہولہان ہو گئی تھیں۔ نوشا کب کا ہاتھ چھوڑ چکا ہوتا۔ مگر عبداللہ نے انگلیاں اس طرح پھنسا کر اس کو لٹکایا تھا کہ انگلیاں کھل نہ سکتی تھیں۔ خون دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے عبداللہ کا چہرہ فکرمند نظر آیا۔ اس کے بعد پھر اس کی تیوری پر بل پڑ گیا۔ ذرا دیر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ نوشا ذبح ہونے والے بکرے کی طرح چیختا رہا۔

آخر عبداللہ نے اٹھ کر اسے نیچے اتارا۔ نوشا کی انگلیاں ابھی تک آپس میں جکڑی ہوئی تھیں۔ ان سے خون بہہ رہا تھا۔ اور سارا جسم کانپ رہا تھا۔ وہیں کھڑے کھڑے اسنے پاجامہ میں پیشاب کر دیا عبداللہ نے اسکے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے۔ نوشا تکلیف سے چیخا۔ انگلیاں ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئیں۔ خون تیزی سے بہنے لگا۔ عبداللہ نے منشی جی کو بلایا۔ وہ آیا تو اس کا چہرہ بھی سہما ہوا تھا۔ عبداللہ نے اس سے کہا کہ وہ نوشا کے ہاتھ دھلا دے۔

منشی نوشا کو اپنے ہمراہ لے گیا۔ ذرا دیر بعد وہ اسکو لے کر عبداللہ کے سامنے آیا۔ اسنے گھور کر اس کو دیکھا، ۲۰ روپے جیب سے نکال کر نوشا کے سامنے پھینکے "لو سالے یہ اپنے کفن کے لئے بھی لیتے جاؤ۔ مگر اب کبھی یہاں شکل نہ دکھانا، جا دفعان ہو میرے سامنے سے۔" اس نے ایک سانس میں کئی گالیاں دے ڈالیں۔ نوشا نے کانپتے ہاتھوں سے اٹھائے۔ اور سسکیاں بھرتا ہوا کارخانے سے باہر چلا گیا۔

جب وہ گھر پہونچا، تو اس کی انگلیاں سوج گئی تھیں۔ اور ہاتھوں پر ورم آ گیا تھا۔ ماں سے

اس نے بہانہ کر دیا کہ ایک پرزہ اس سے ٹوٹ گیا تھا جس پر عبداللہ مستری نے اسکو مار کر کارخانے سے باہر نکال دیا میں روپے نوشا نے ماں کو دیدیے۔ ماں بے چاری عبداللہ مستری کو کوسنے دے کر رہ گئی۔ کارخانے ہی سے اس کو بخار ہو گیا تھا اور اب تو اس کا بدن پھنک رہا تھا۔ ماں نے جرّاح کی دوکان سے مرہم منگوا کر اس کی انگلیوں پر لگایا اور ان پر پٹیاں لپیٹ دیں۔ نوشا خاموش لیٹا تکلیف سے کراہتا رہا۔ رات کو نیاز آیا تو ماں نے اسکو پورا واقعہ سنایا مگر نیاز نے عبداللہ مستری کو بُرا بھلا کہنے کے بجائے نوشاہی کے سر پورا الزام رکھا۔ کہنے لگا۔

"یہ آوارہ لڑکوں کی صحبت میں رہ کر حرام خور ہو گیا ہے۔ کام میں اس کا دل ہی کب لگتا ہے کوئی قیمتی پرزہ توڑ ڈالا ہو گا۔ جب ہی عبداللہ کو اس قدر غصہ آگیا۔ ویسے وہ اتنا بُرا آدمی نہیں ہے"

نوشا خاموش پڑا اس کی باتیں سنتا رہا۔ اور دل ہی دل میں کڑھتا رہا۔ کئی روز تک وہ اس تکلیف میں مبتلا رہا۔ نیاز ہر روز اس کے خلاف کچھ نہ کچھ ضرور کہتا۔

کئی روز بعد اس کے ہاتھ کی پٹیاں کھلیں۔ اسی روز وہ گھر سے باہر بھی گیا۔ سید صلاح کے پاس پہونچا۔ وہ روز روز کے فاقوں سے قصائی کے کھونٹے پر بندھی ہوئی گائے کی طرح مریل نظر آ رہا تھا۔ نوشا کے متعلق ساری باتیں وہ آنے سے پہلے ہی سن چکا تھا۔ ذرا دیر تک وہ کھولی کے اندر بیٹھے باتیں کرتے رہے، اس کے بعد وہ باہر نکل آئے۔ شامی کے باپ کی دوکان پر گئے تو وہ وہاں موجود نہ تھا۔ دونوں کی جیبیں خالی تھیں۔ لہٰذا انہوں نے یہ پروگرام بنایا کہ پیل گھاٹ چلیں۔ ان کا خیال تھا کہ ندی کے اس پار سے کشتیوں میں مال آتا ہے، اس کو چل کر اتاریں گے تو تھوڑے بہت پیسے مل جائیں گے۔ مگر جب وہ پانچ میل پیدل چل کر وہاں پہونچے تو معلوم ہوا کہ گھاٹ کی مرمت ہو رہی ہے۔ کشتیاں ان دنوں کسی اور گھاٹ پر سامان اتار رہی تھیں۔ دونوں تھک کر چور ہو چکے تھے۔ وہیں گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

گھاٹ سے تھوڑی دور پر سرکنڈوں کے جھنڈ تھے۔ جن پر آبی پرندوں کے غول منڈلا رہے تھے۔ شکاریوں کی ایک ٹولی وہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ دونوں ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ دھائیں دھائیں کر کے بندوقیں چلتیں، کوئی پرندہ زخمی ہو کر گرتا۔ اور وہ دونوں کیچڑ اور پانی میں گھس کر اس کو نکال لاتے۔ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا۔ شکاریوں نے ان کو کھانے کے لئے بھنا ہوا گوشت اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے دیئے۔ سہ پہر کو چائے پلائی۔ سگریٹ بھی پینے کو ملی۔ شام تک دونوں شکاریوں کے ساتھ ہاؤ ہو کرتے رہے۔

نوشا جب گھر پہونچا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ماں ان دنوں یوں بھی اس سے بے زار بے لاگ سی تھی۔ وہ دن بھر جو غائب رہا تو وہ اور بھی جلی بھنی بیٹھی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی اسنے کہا۔

"اب اس وقت بھی کیوں واپس آیا۔ جا جہاں دن بھر رہا وہیں جا۔"

نوشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ ماں دیر تک اس کو کوسنے دیتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کھانا آیا تو ماں نے اسکو کھانا دینے سے انکار کر دیا۔ سلطانہ نے سفارش کی تو وہ اسپر بھی برسنے لگی۔ تینوں نے اس کے سامنے بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ماں چمکار چمکار کر آذو کو کھانا کھلا رہی تھی۔ مگر ایک بار بھی اس نے نوشا سے نہ پوچھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھا یہی انتظار کرتا رہا کہ ماں ضرور اس کو کھانے پر بلائے گی۔ مگر جب سب لوگ کھانا کھا چکے اور برتن اٹھا دیئے گئے تو وہ تلملا کے رہ گیا۔ اس وقت اس کو سخت بھوک لگ رہی تھی غصا اور دکھ سے اسکا دل بھر آیا وہ کمرے کے اندر جا کر اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ اور دیر تک چپکے چپکے روتا رہا۔ آخر وہ جھنجھلا کر کمرے سے نکلا اور باہر جانے کی غرض سے دروازے کی جانب چلدیا۔ ماں نے ٹوک کر کہا۔

"پھر چلا باہر"

نوشا نے اس دفعہ بھی جواب نہ دیا تو وہ چیخ کر بولی: "ایک باپ کا جنا ہو تو اب واپس نہ آنا۔"

وہ بولا "ہاں نہیں آؤں گا" یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ تیزی سے باہر آ گیا۔ گلی میں آ کر اسنے آنسو پونچھے اور راجہ کے پاس چلا گیا۔ وہ بھی بھوک سے نڈھال پڑا تھا۔ نوشا نے ساری باتیں اس کو بتا دیں۔ راجہ نے خاموشی سے سب کچھ سنا۔ ذرا دیر خاموش رہا۔ پھر بڑی مدھم آواز میں بولا۔

"یار میرا تو دل چاہتا ہے کہ اس شہر کو چھوڑ دیں۔"

"مگر جائیں گے کہاں؟"

راجہ نے کہا "میرا تو ارادہ کراچی جانے کا ہے۔ وہاں تو فوراً کام مل جاتا ہے۔"

نوشا بھی رضامند ہو گیا۔ "میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔"

"تو پھر ملا پلاؤ کا ہاتھ۔"

دونوں نے گرمجوشی سے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ اسی اثنا میں شامی بھی وہاں آ گیا۔ دونوں نے اسکو اپنا پروگرام بتایا تو وہ بھی کسی حد تک آمادہ ہو گیا۔ بات یہ تھی کہ ذرا دیر پہلے اس کے باپ

نے ڈاکٹر صاحب کی شکایت پر ان کے لڑکے کے سامنے اس کو بری طرح پیٹا تھا۔ وہ گھر پر اسکو مار لیتا تو شامی کو اتنا دکھ نہ ہوتا۔ مگر ڈاکٹر کے لڑکے سے چونکہ اس کا جھگڑا چل رہا تھا۔ اس لئے اس کی بڑی سبکی ہوئی تھی۔

اب سوال یہ تھا کہ ریل کے سفر کے لئے رقم کہاں سے آئے۔ یہ مسئلہ شامی نے حل کر دیا۔ اس کے پاس اخباروں کے روپے رکھے تھے۔ وہ گھر سے جا کر سارے روپے چپکے سے نکال لایا۔ رات کے ساڑھے دس بجے ایک گاڑی کراچی کے لئے جاتی تھی۔ انہوں نے اسکے ٹکٹ خریدے اور ٹرین میں سوار ہو کر اسی روز کراچی روانہ ہو گئے۔

لیکن انہوں نے ریل کا سفر شروع ہی کیا تھا کہ شامی نے رونا شروع کر دیا، اسکو گھر یاد آ رہا تھا۔ راجہ نے اس کو سمجھانے کی کوشش کی تو وہ اور بھی زیادہ سسکیاں بھرنے لگا۔ ٹرین کے دوسرے مسافر ان کو دیکھنے لگے۔ راجہ نے گھبرا کر نوشا سے کہا۔

"یار یہ سالا تو دونوں کو پکڑا دے گا"

نوشا بولا "ہاں یار سب لوگ ہماری طرف دیکھ رہے ہیں"

آخر دونوں نے یہ طے کیا کہ اگلے اسٹیشن پر اتر پڑیں۔ اور شامی کو سمجھائیں کہ وہ رونا پیٹنا بند کر دے۔ چنانچہ انہوں نے یہی کیا۔ ٹرین ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکی۔ وہاں تینوں اتر گئے۔ گرمی کے دن تھے۔ پلیٹ فارم ہی پر تینوں ایک جگہ جا کر ٹھہر گئے۔ شامی ابھی تک منہ بسور رہا تھا۔ راجہ جلا ہوا تو تھا ہی۔ اسنے جھنجھلا کر اس کو کئی گالیاں دے ڈالیں۔ البتہ نوشا خاموش رہا اس لئے کہ شامی کو روتا دیکھ کر اس کو بھی گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔

راجہ کی ڈانٹ ڈپٹ سے شامی نے رونا بند کر دیا تھا۔ تینوں نے طے کیا کہ صبح تڑکے جو ٹرین آتی ہے اس سے سفر کرینگے۔ اس کے بعد تینوں وہیں فرش پر سو گئے۔ دیر تک جاگتے رہے تھے اس لئے تینوں گہری نیند سو گئے۔

پہلے راجہ کی آنکھ کھلی۔ اسنے دیکھا دھوپ نکل آئی تھی۔ ایک کتا کھڑا اس کا منہ چاٹ رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ کتا تو دم دبا کر بھاگا مگر راجہ کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ نوشا تو اس کے برابر سو رہا تھا۔ مگر شامی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اسنے نوشا کو جگایا۔ دونوں دیر تک اس کا انتظار کرتے رہے کہ شاید کہیں ادھر ادھر چلا گیا ہو تو آ جائے۔ مگر وہ رات کے پچھلے پہر آنے والی ٹرین سے واپس چلا گیا۔ دونوں کو بتایا بھی نہیں۔ گاڑی کے آتے ہی وہ چپکے سے اٹھ کر

اس میں سوار ہو گیا۔ان دونوں کی صبح والی ٹرین بھی چھوٹ گئی۔

دن بھر وہ پلیٹ فارم پر گھومتے رہے۔دوپہر کو ٹرین آئی تو اس میں بیٹھ کر کراچی روانہ ہو گئے جب وہ وہاں پہونچے تو ایک پہر رات گزر چکی تھی۔ دونوں کے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ساری رقم شامی کے پاس تھی۔جس کو وہ اپنے ہمراہ لے گیا تھا سفر کے تھکے مارے اور دن بھر کی بھوک سے نڈھال وہ مسافر خانے میں جا کر ایک کونے میں پڑ گئے۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی گئی۔سناٹا بڑھتا گیا مسافر خانہ میں جو اکا دکا مسافر رہ گئے تھے۔ وہ ٹانگیں پسار کر سو گئے تھے یا پڑے اونگھ رہے تھے۔مگر راجہ اور نوشا کو بھوک کے مارے نیند نہیں آرہی تھی رات گئے مسافر خانے کے اندر ایک شخص آیا۔وہ دبلا پتلا مریل سا آدمی تھا۔آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ جن سے وہ چاروں طرف ایک تجسس انگیز انداز میں دیکھ رہا تھا۔اسنے مسافر خانہ کا ایک چکر لگایا۔ اچانک اس کی نظر ان دونوں پر پڑ گئی۔ وہ ان کے قریب آکر بیٹھ گیا اور بیٹھتے کے ساتھ ہی بولا۔

"گھر سے بھاگ کر آئے ہو"

نوشا تو ڈر کر سہم گیا البتہ راجہ نے کسی قدر نڈر ہو کر کہا" نہیں جی ہم تو اپنے ماموں سے ملنے آئے ہیں"

وہ شخص ایک آنکھ دبا کر بدمعاشی سے مسکرایا "جھوٹ بولوگے تو سیدھے حوالات میں ہو گے۔صاف صاف بات بتادو" یہ کہہ کر اسنے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔ اور ان سے کہنے لگا" لو پیو سگریٹ پیو" راجہ نے جھجکتے ہوئے ایک سگریٹ لے ہی لی۔اس لئے کہ اسنے صبح سے سگریٹ نہیں پی تھی۔

اس شخص نے راجہ کی سگریٹ سلگائی اور بے تکلفی سے بولا" مجھ سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ تم کو کچھ فائدہ ہی پہونچ جائے گا۔ ویسے یہ کراچی سالا بہت خراب شہر ہے۔ایک سے ایک نمبری یہاں پڑا ہے" دونوں چپ چاپ اس کی باتیں سنتے رہے۔ وہ کہنے لگا۔

"کسی ایسے ویسے کے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ تو سمجھ لینا بس گئے کام سے۔آؤ میرے ساتھ میں تمہارے لئے ملازمت کا بندوبست کرائے دیتا ہوں"

دونوں نے اسے رحمت کا فرشتہ سمجھا جس کو اللہ میاں نے ان کی حالت پر رحم کھا کر بھیجا تھا اور اس کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئے۔ کرتے بھی کیا۔ پاس پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔اجنبی جگہ، کوئی جان پہچان کا بھی نہ تھا۔

وہ دونوں کو اپنے ہمراہ لے کر مختلف سڑکوں اور جگہوں کے چکر کاٹتا ہوا ایک مکان پر پہونچا

یہ علاقہ شہر سے کسی قدر الگ تھلگ تھا۔ مختصر سی آبادی تھی اور چند نیم پختہ مکانوں کے درمیان، وہ ایک منزلہ پختہ مکان تھا۔ اس شخص نے دروازہ پر دستک دی۔ دروازہ تو نہیں کھلا، البتہ کسی نے برابر والی کھڑکی کھول کر پوچھا۔

"کون ہے؟"

وہ شخص بولا "میں ہوں رحمان۔"

"اچھا اچھا" اندھیرے میں بولنے والے کی آواز سنائی دی۔ اس کا چہرہ نظر نہ آیا۔ ذرا دیر بعد دروازہ کھل گیا۔ رحمان ان دونوں کے ہمراہ اندر داخل ہو گیا۔ ایک خالی کمرے سے گزر کر وہ ایک کمرے میں پہنچے، جہاں ایک گٹھے ہوئے جسم کا آدمی آنکھیں بند کئے سر کی مالش کروا رہا تھا۔ رحمان نے کھنکھار کر کہا "میں نے کہا خلیفہ جی، بڑے زوروں کی چمپی ہو رہی ہے۔"

خلیفہ جی نے آنکھیں کھول کر دیکھا "ابے تو آ گیا" پھر اس کی نظر نوشا اور راجو پر پڑی۔ اس نے فوراً کہا "یہ کون ہیں جی؟"

رحمان نے آنکھ مار کر کہا "بے چارے گھر سے روٹھ کر چلے آئے مسافر خانے میں پڑے تھے۔ یہاں کوئی جان پہچان کا بھی نہیں۔ میں یہاں لے آیا۔ رکھ لو پڑے رہیں گے۔"

خلیفہ جی نے اس دفعہ ان کو گہری نظروں سے دیکھا "دیکھنے میں تو سیدھے سادے لگتے ہیں چل تو کہتا ہے تو ان کو بھی رکھ لوں گا۔ ویسے میں نے کب تیری بات ٹالی ہے۔" اس کے بعد وہ ان دونوں کو مخاطب کر کے بولا "ابے تم نے کچھ کھایا پیا بھی۔ صورت سے تو فاقہ زدہ لگ رہے ہو۔" پھر اس نے آدمی کو قریب بلایا جو اس کے سر کی مالش کر رہا تھا۔ اور اس سے کہنے لگا۔

"ابے بوٹا، جا ہوٹل سے ان کے لئے کھانا لے کر آ۔"

بوٹا جانے لگا تو اسے ٹوک کر کہا "اور ہاں دیکھو بڑے کمرے میں ان کے سونے کا بندوبست کر دے۔ وہاں سالا کچھ کاٹ کباڑ پڑا ہے، کل سویرے اسکو ہٹا دیجیو۔" اس کے بعد اسنے راجو اور نوشا سے کہا "جاؤ جی تم اس کے ساتھ چلے جاؤ۔ ڈٹ کر کھاؤ اور اینڈ کر سو اب کل بات ہو گی۔"

وہ دونوں بوٹا کے ساتھ کمرے کے باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد خلیفہ جی نے رحمان سے پوچھا "بول بے ان کا کیا لے گا؟"

رحمان سگریٹ کا کش لگا کر بولا "خلیفہ جی آج تو سیدھے ہاتھ سے پانچ سو سو والے دلوا دو، خدا قسم بڑے کام کے لونڈے ہیں۔"

خلیفہ جی نے اس کو ڈانٹ دیا۔ "چل چل زیادہ باتیں نہ بنا۔ دوسو سے ایک پیسہ زیادہ نہ ملے گا۔ کل دن میں آکر اپنا حساب لے جائیو۔"

"اے خلیفہ جی ایسا ظلم تو نہ کرو۔ اتنے میں سودا نہ ہوگا۔ بلواؤ ان کو ابھی تو انہوں نے تمہارا نمک بھی نہیں کھایا۔"

خلیفہ جی نے اسکو گھور کر دیکھا۔ "اے دلالی کرتے کرتے سالے تونے یہ داداگیری کب سے شروع کردی۔ چل بچا بس اور لے جیو، زیادہ فیل مت مچا۔"

رحمان تھوڑی دیر حیل و حجت کرنے کے بعد ڈھائی سو روپے پر رضامند ہو گیا۔

نوشا اور راجہ کو، خلیفہ جی کے اڈے پر کئی دن گزر گئے۔ اس عرصہ میں نہ خلیفہ جی سے ان کی ملاقات ہوئی، نہ ان کو کوئی کام کرنا پڑا۔ ان کے لئے دونوں وقت کا کھانا ہوٹل سے آجاتا۔ رہنے کو کمرہ مل گیا تھا۔ البتہ ان کو گھڑی بھر کے لئے بھی باہر نکلنے کی اجازت نہ دی گئی۔ دروازے پر ۲۴ گھنٹے ایک آدمی کی ڈیوٹی رہتی۔ اگر وہ کبھی بھولے سے بھی اس طرف نکل جاتے تو وہ آنکھیں نکال کر کہتا۔

"کیوں بے کیا ارادہ ہے، جاؤ اپنی کوٹھری میں، خبردار جو ادھر کا رخ کیا۔"

دونوں اس پابندی سے جلدی ہی گھبرا گئے۔ سب سے پہلے راجہ نے محسوس کیا کہ وہ کسی چکر میں پھنس گئے ہیں۔ روزانہ رات کو خلیفہ جی کی بیٹھک میں محفل جمتی۔ رات کے وقت کتنی ہی اجنبی صورتیں مکان کے اندر نظر آتیں۔ اور رات کے سناٹے میں خلیفہ جی کی بیٹھک سے باتیں کرنے کی آوازیں آیا کرتیں۔

آخر ایک روز دوپہر کے وقت خلیفہ جی کے پاس ان کی طلبی ہوئی۔ وہ گاؤ تکیئے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سامنے ایک بڑا سا چاقو کھلا پڑا تھا۔ دونوں سہم کر رہ گئے۔ خلیفہ جی دونوں کو لمحہ بھر تک گہری نظروں سے دیکھا اور پھر تیوری پر بل ڈال کر بولا۔

"دیکھو بے آج میں تمہاری ڈیوٹی مقرر کر رہا ہوں مگر اتنا یاد رکھنا کہ میرے ساتھ کوئی دغا بازی کی تو سمجھ لینا کہ ٹکڑے ٹکڑے کرکے یہیں دفن کر دوں گا۔"

دونوں نے گردنیں ہلا کر اس کو یقین دلایا۔ وہ بولا "گائے کی طرح یوں گردن ہلا دینے سے کام نہیں چلے گا۔ قسمیں کھاؤ۔"

دونوں نے خدا کی قسمیں کھائیں۔ اسکے بعد خلیفہ جی نے کنٹاک کو بلایا۔ وہ ان کا خاص آدمی تھا اس کا قد لمبا تھا اور آواز بیٹھی ہوئی تھی۔

راجہ اور نوشا کو کنٹاک کے ساتھ کر دیا گیا۔ اور یہ ہدایت دی گئی کہ کنٹاک جن جن کوٹھیوں کا پتہ

بتائے گا۔ وہ وہاں جاکر ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ملازم ہو جانے کے بعد وہ روزانہ کنٹاک کو یہ رپورٹ دیا کریں گے کہ کوٹھی کے اندر قیمتی سامان کہاں کہاں رکھا ہے۔ کتنے لوگ ہیں، کس وقت سوتے ہیں۔ مرد سویرے کتنے بجے باہر نکل جاتے ہیں اور کب واپس لوٹتے ہیں۔ گھر والوں کا کسی رات کو سینما دیکھنے یا کسی تقریب میں جانے کا پروگرام ہو تو اس کو دھیان میں رکھیں اور فوراً آکر اطلاع دیں۔

خلیفہ جی نے تمام ہدایات اچھی طرح ان کو سمجھا دیں اور وہ کنٹاک کے ہمراہ مکان سے باہر چلے گئے۔

## ۹

نوشا کے اچانک غائب ہو جانے سے گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ ماں نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ وہ بات بات پر رو پڑتی۔ اسکو روتا دیکھ کر سلطانہ کے بھی بے اختیار آنسو نکل آتے۔

ان دنوں نیاز کسی اپنے کام سے لاہور گیا ہوا تھا۔ البتہ سلمان آتو کو اپنے ہمراہ لے کر کئی روز تک نوشا کو ہر جگہ تلاش کرتا رہا۔ وہ دن بھر میں کئی کئی بار نوشا کے گھر آتا اور جہاں کہیں بھی نوشا کے ملنے کا امکان ہوتا وہاں پہونچتا۔

ماں نوشا کے غم سے سنبھلنے نہیں پائی تھی کہ بیڑی کے کارخانے میں ہڑتال ہو گئی۔ آمدنی کا ذریعہ اچانک منقطع ہو گیا اور گھر کا خرچ قرض ادھار سے چلنے لگا۔ یہ دن بڑی پریشانی اور دکھ کے تھے۔ ہڑتال طول پکڑتی جا رہی تھی اور پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔

نیاز واپس آیا تو نوشا کی ماں نے نوشا کے غائب ہو جانے کی خبر سنائی مگر اس نے کسی تشویش کا اظہار نہ کیا کہنے لگا۔

"وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ آوارہ ہو گیا ہے۔ کچھ دن ٹھوکریں کھانے کے بعد خود ہی آ جائیگا۔

تم کیوں اس کے لئے پریشان ہو رہی ہو"
نوشا کی ماں کو اس کی یہ بات اچھی نہ لگی۔ وہ ہمدردی کے دو بول سننے کی خواہشمند تھی۔ ابھی وہ اسکی باتوں پر غور کر رہی تھی کہ نیاز بول اٹھا۔

"آج میں یہ طے کر کے آیا ہوں کہ تم مجھ کو ہاں نا کا جواب دیدو"

نوشا کی ماں نے دبی زبان سے کہا "کچھ دن اور ٹھہر جاتے تو اچھا تھا"

لیکن نیاز کالے صاحب سے بیمہ کی پالیسی کی بات طے کر چکا تھا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ شادی کے بعد وہ اس کی زندگی کا ۲۰ ہزار روپے میں بیمہ کرا دے گا۔ اور کمپنی سے اس قسم کا معاہدہ کرے گا کہ اس کے مرنے کے بعد یہ رقم اس کو ملے۔ یہ بات وہ کالے صاحب سے پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ایک ڈاکٹر سے ساز باز کر کے یہ سازش تیار کر چکا تھا کہ وہ نوشا کی ماں کو ایسے انجکشن دیتا رہے گا جس سے اس کا دل کمزور ہو جائے۔ اور پھر وہ ایک روز حرکت قلب بند ہو جانے سے فوت ہو جائے۔ ڈاکٹر کو اس کام کے لئے اسنے ۵ ہزار روپے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ غرضکہ اس کی پوری اسکیم تیار تھی۔ اب صرف کام شروع کرنے کی دیر تھی۔ جس کی ابتدا دونوں کے نکاح سے ہوتی تھی۔ لہذا اسنے اسی بات پر زور دینا شروع کر دیا کہنے لگا۔

"بس اب میں زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔ پرسوں جمعہ ہے۔ مبارک دن ہے۔ اسی روز یہ نیک کام ہو جانا چاہیئے"

وہ بولی "ارے ارے اتنی جلدی"

نیاز نے بڑے جذباتی انداز میں اس کا ہاتھ اپنی انگلیوں میں بھینچ لیا۔ اور اس کے سر کو اپنے شانے سے لگا کر بولا "میں تو اب گھڑی بھر کو بھی تم سے الگ رہنا نہیں چاہتا۔ مجھ سے محبت ہے تو تم کو میری یہ خوشی پوری کرنا پڑے گی"

نوشا کی ماں نے کچھ کہنا چاہا تو اسنے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "تم کو میری جان کی قسم جو انکار میں کچھ کہو۔ بس اب یہ بات طے ہو گئی"

نیاز کے شدید اصرار کے سامنے نوشا کی ماں کو مجبور ہونا پڑا۔ نیاز نے اسی وقت اخراجات کے لئے اسکو جیب سے نکال کے سو روپے دیئے اور یہ طے ہو گیا کہ اب وہ جمعہ کے دن ظہر کے وقت قاضی اور اپنے کچھ احباب کو لے کر آئے گا۔ جب ساری باتیں طے ہو گئیں تو وہ کچھ دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اور صبح سویرے اٹھ کر جانے کے بجائے رات ہی کو واپس چلا گیا۔

نوشا کی ماں نے حامی تو بھری مگر بے چینی کے باعث اسکو تمام رات نیند نہ آئی۔ اس کو سب سے زیادہ فکر سلطانہ کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سلطانہ میں نیاز کی دلچسپی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ نکاح ہو جانے کے بعد وہ سلطانہ کا اس سے پردہ بھی نہ کرا سکے گی ہر وقت کا ساتھ رہے گا۔ اس میں سلطانہ کی بھی زندگی تباہ ہونے کا خوف تھا اور اس کی اپنی زندگی کا بھی۔

دوسرے دن بھی وہ اسی ادھیڑ بن میں رہی۔ بہت کچھ سوچنے کے باوجود بھی کوئی صورت نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بار بار سلطانہ کو دیکھتی، اس کی جوانی کو، اسکے حسن کو، اور ہر بار وہ آنے والے خطرے سے کانپ اٹھتی۔ اب صرف ایک دن اور رات بیچ میں رہ گئی تھی۔ اس سلسلے میں وہ کیا کر سکتی تھی عجیب الجھن تھی اور اسی الجھن میں اٹھ کر وہ اپنی رشتے کی ایک خالہ کے گھر چلی گئی اس لئے کہ نکاح کے وقت گھر میں کسی نہ کسی بڑی بوڑھی کا ہونا ضروری تھا۔

انو اسکول جا چکا تھا، گھر میں سلطانہ بالکل تنہا تھی۔ اسی اثنا میں دروازے پر دستک ہوئی سلمان آیا تھا، پہلے تو وہ جھجکی، پھر اسنے ہمت کر کے اس کو گھر کے اندر بلا لیا۔

سلمان حسب معمول کمرے کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر سلطانہ نمودار ہوئی۔ مگر وہ کمرے میں نہیں آئی۔ وہیں دہلیز پر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت وہ بڑی افسردہ نظر آرہی تھی۔ اسنے سلمان کو اداس نظروں سے دیکھ کر سوچا کہ اب وہ اس سے آئندہ نہ مل سکے گی۔ اس لئے کہ کل نیاز اس کا سوتیلا باپ بن جائے گا۔ اور وہ جب اس کا سوتیلا باپ بن جائے گا تو یہ گھر اسکا ہو جائے گا۔ وہ کسی صورت میں بھی سلمان کو اپنے گھر میں آنے کی اجازت نہیں دے گا۔ سلمان اٹھ کر اس کے قریب آ گیا اور بڑی محبت سے بولا "تم اتنی اداس کیوں نظر آرہی ہو؟" سلطانہ نے اس کو ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے سینے سے لگ کر بے اختیار رونے لگی۔ سلمان نے پیار سے اس کی پیٹھ کو تھپتھپا کر کہا۔

"بات کیا ہے، کچھ بتاؤ تو"

مگر وہ کچھ نہ بولی اور سسکیاں بھر کر برابر روتی رہی۔ سلمان اس کی پیٹھ کو پیار سے تھپتھپا کر دلاسا دیتا رہا۔ دونوں اسی طرح کھڑے تھے کہ ماں دروازہ کھول کر گھر کے اندر آگئی۔ اسنے انکو دیکھا تو حیرت زدہ رہ گئی۔ کچھ دیر تک گم سم کھڑی رہی ان دونوں کو اس کی آمد کا مطلق پتہ نہ چلا۔

ماں فوراً ہی باہر چلی گئی۔ اسنے دروازہ بند کیا اور خواہ مخواہ کواڑ کھٹکھٹانے لگی تاکہ ان کو اس کی آمد کا علم ہو جائے۔ پھر وہ بڑبڑاتی ہوئی اندر داخل ہوئی "دروازہ تو کھلا ہے، میں بھی کہ اندر

سے بند ہے۔ نہ جانے میری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔"

سلمان کمرے کے اندر جا چکا تھا۔ سلطانہ آنسو پوچھ کر اس کی طرف بڑھی "کیا ہوا اماں؟"

وہ بولی "کچھ نہیں بیٹا۔ آجکل میرے اوسان ٹھیک نہیں" پھر کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھ کر اسنے سلطانہ سے کہا "کیا سلمان آئے ہیں؟"

سلطانہ نے کہا "ابھی ابھی آئے تھے۔"

وہ کہنے لگی "اے ہے، گرمی میں بُرا حال ہوگا" یہ کہتی ہوئی وہ کمرے کے اندر چلی گئی۔

سلمان نے اسکو سلام کیا تو وہ دعائیں دے کر بولی "کتنی دیر سے بیٹھے ہو؟"

وہ کہنے لگا "ذرا ہی دیر پہلے آیا تھا۔"

وہ برقعہ اتار کر تھکی ہوئی سی بیٹھ گئی۔ "میں تو ایسے چکر میں پھنس گئی ہوں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں۔"

سلمان پوچھنے لگا "خیریت تو ہے؟"

نوشا کی ماں بولی "بس خیریت ہی ہے۔ اب تم سے کیا بتاؤں کہ کس پریشانی میں گرفتار ہوں۔"

سلمان نے اصرار کیا "کوئی خاص بات ہے۔"

وہ کہنے لگی "ہاں خاص ہی بات ہے۔" لمحہ بھر کے لئے اسنے تامل کیا۔ "اب تم سے کیا پردہ بات یہ ہے کہ سلطانہ کی شادی ہو رہی ہے" یہ کہہ کر اسنے تیز نظروں سے سلمان کے فوری ردِ عمل کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

سلمان اس اطلاع کے لئے تیار نہ تھا، اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ گھبرا کر بولا "کب؟"

"کل"! نوشا کی ماں نے بھی جواب میں صرف ایک لفظ کہا۔ وہ برابر سلمان کا جائزہ لے رہی تھی۔ اُسنے دیکھا اس دفعہ گھبراہٹ کے بجائے اظہارِ حیرت زیادہ تھا کہنے لگا "کل، یعنی جمعہ کو۔ آپنے پہلے نہیں بتایا۔"

وہ صفائی پیش کرنے لگی "میں خود بھی نہیں چاہتی تھی مگر خاندان والوں نے مجلس کر کے دن اور تاریخ طے کرا دی۔"

سلمان کا چہرہ اچانک افسردہ پڑ گیا تھا، وہ تھکے ہوئے لہجہ میں بولا "کون لوگ ہیں؟"

وہ بتلانے لگی" خاندانی ہی کا لڑکا ہے۔ برسر روزگار ہے۔ مزاج کا بھی اچھا ہے —"
سلمان زیادہ اسکی تعریف نہ سن سکا۔ بات کاٹ کر بولا" اچھا تو میں اب چلوں گا" وہ بڑا پریشان معلوم ہو رہا تھا۔ نوشا کی ماں نے اصرار کیا" بیٹھو چلے جانا" مگر وہ فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ اماں چاہتی تھی کہ ابھی وہ کچھ دیر اور بات چیت کرے اور یہی گفتگو اس کے کام کی تھی۔
سلمان اس کی بات کا کوئی جواب دیئے بغیر تیزی سے باہر چلا گیا۔ اس وقت وہ کچھ عجیب اُول جُلول معلوم ہو رہا تھا۔ وہاں سے نکل کر وہ راستہ میں صرف سگریٹ کا پیکیٹ خریدنے کے لئے کھڑا ہوا اور سیدھا اپنے کمرے میں جا کر تھکا ہوا سا بستر پر لیٹ گیا۔ نہ جوتا اتارا نہ کپڑے تبدیل کئے۔ بس خاموش لیٹا سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ یہ ایسا احساس تھا۔ ایسا بوجھ تھا جس سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ سلطانہ کی اس نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے کبھی اس قدر اہمیت نہیں محسوس کی تھی۔ وہ اسکو صرف ایک لڑکی سمجھتا رہا۔ جو جوان تھی، الھڑ تھی، خوبصورت تھی۔ اور آج اچانک وہ معمولی لڑکی، غیر معمولی بن گئی تھی۔ بار بار وہ جیسے چونک پڑتا۔ دل سے ہوک اٹھی، کوئی اندر سے بولتا۔

"اب کیا ہو گا؟"

"اب کیا ہو گا؟"

اور اس کا تمام وجود سوالیہ نشان بن جاتا۔

شام تک وہ اسی کرب، اسی دکھ میں مبتلا رہا۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا۔ سگریٹیں پھونکتے پھونکتے اس کا گلا خشک ہو گیا۔ ہونٹ جلنے لگے۔ جب کمرے کے اندر اندھیرا پھیل گیا۔ تو اسنے اٹھ کر کئی گلاس پانی کے پیئے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ بازار میں چہل پہل تھی۔ ملی جلی آوازوں کا شور و غل تھا۔ زندگی مسکرا رہی تھی۔ ہنس رہی تھی۔ گرمیوں کی شام کا حسن نکھر گیا تھا۔
اس نے بازار کا ایک چکر لگایا، کچھ دیر سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ ذرا دیر بعد اس نے دیکھا کہ وہ نوشا کے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے آنو کو آواز دی۔ نوشا کی ماں نے اسکو فوراً بلوا لیا۔ وہ جیسے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر بولی۔

"کچھ پریشان نظر آ رہے ہو، کیسی طبیعت ہے؟"

سلمان خاموش بیٹھا رہا کہ وہ کیا کہے۔ اسکو کچھ کہنا چاہئے یا نہیں۔ نوشا کی ماں نے اسکو چپ دیکھ کر پھر چھیڑا" آخر بات کیا ہے، بیٹے چپ چپ سے نظر آ رہے ہو"

سلمان گھبرا سا گیا، اس نے آہستہ سے کہا "ایک بات کہوں، آپ بُرا تو نہیں مانیں گی" اس کی آواز میں لرزش تھی۔ نوشا کی ماں نے اسکی ہمت بندھائی۔ کہنے لگی۔

"ہاں، ہاں کہو کیا بات ہے"

بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا "آپ سلطانہ کی شادی نہ کریں" کہنے کو تو اسنے یہ بات کہہ دی مگر وہ یہ کہہ کر پریشان ہو گیا۔ نوشا کی ماں کچھ دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ سلمان نے فوراً کہا۔

"آپ نے میری بات کا بُرا تو نہیں مانا"

وہ بولی "یہ بات نہیں۔ سچ پوچھو تو مجھ کو بھی یہ رشتہ پسند نہیں۔ پھر سوچتی ہوں کہ سیانی لڑکی کو کب تک بٹھائے رکھوں گی"

سلمان نے جھجکتے ہوئے کہا "میں اپنے متعلق اگر کچھ کہوں ——" وہ پوری بات نہ کہہ سکا۔

ذرا دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ پھر نوشا کی ماں کی آواز خاموش کمرے کے اندر ابھری "یہ بات تم نے کاش چند روز پہلے کہی ہوتی" لمحہ بھر اسنے توقف کیا "مجھے تمہارے ساتھ سلطانہ کا رشتہ کرتے ہوئے خوشی ہوتی۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے" بات بھی یہی تھی کہ رات بھر میں وہ کر بھی کیا سکتی تھی۔ کل نیاز اس گھر کا مالک بننے والا تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی یہ گوارا نہ کرتا کہ سلطانہ کی کہیں شادی ہو جائے۔ اس نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔ کاش اسنے یہ بات سلمان سے چند روز پہلے کہی ہوتی یا کم از کم اس نے نیاز کی بات اس روز قبول نہ کی ہوتی" وہ خاموشی کے ساتھ بیٹھی سوچتی رہی۔

سلمان نے اس کو خاموش دیکھ کر کہا "نہیں آپ بہت کچھ کر سکتی ہیں" وہ تقریباً گڑگڑا کر بولا "آپ کچھ کیجئے"

نوشا کی ماں نے نظر بھر کر اسکو دیکھا۔ اور پورے اعتماد سے بولی "اب یہی ہو سکتا ہے کہ میں سلطانہ کو تمہارے ساتھ کر دوں۔ دنیا زیادہ سے زیادہ یہی کہے گی کہ سلطانہ بھاگ گئی۔ میں یہ بھی قبول کروں گی۔ تم تیار ہو"

سلمان آمادہ ہو گیا تو وہ کہنے لگی "ابھی سر شام ہے۔ تم ۱۱ بجے رات تک آجاؤ۔ میں سلطانہ کو تیار کئے دیتی ہوں۔ جاؤ اب دیر نہ کرو"

سلمان چپ چاپ اٹھ کر گھر سے باہر چلا گیا۔

اسکے جانے کے بعد اسنے سلطانہ کے ہاتھ پیروں میں مہندی لگائی۔ اٹو کو بازار بھیج کر عطر، پھولوں کے گجرے اور افشاں منگوائی۔ سامان آجانے کے بعد اسنے سلطانہ کو غسل کرایا۔ ہر رنگ ریشمی

جوڑا پہنایا۔ بالوں کو اپنے ہاتھوں سے گوندھ کر افشاں لگائی۔ اس کے لباس پر عطر لگایا پھولوں کے گجرے پہنائے۔ گیارہ بجے سے پہلے پہلے سلطانہ دلہن بن چکی تھی۔ اس کا سارا جسم تیز خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ ماں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"بیٹا میری تو خواہش تھی کہ میرے گھر بارات چڑھتی اور میں تجھ کو دھوم دھڑکے سے رخصت کرتی، مگر قسمت میں یوں ہی لکھا تھا۔ میری بچی مجھے معاف کرنا۔"

یہ کہتے وہ رو پڑی، سلطانہ کے بھی آنسو نکل پڑے۔

گیارہ بج گئے۔ سلطانہ کی ماں کی نظریں دروازے پر لگ گئیں۔ سلطانہ کا دل دھڑک رہا تھا، اور یہ دھڑکن تیز ہوتی گئی۔ بہت دیر ہوگئی۔ مگر دروازہ پر کوئی دستک نہ ہوئی۔ سنسان گلی میں کسی کے قدموں کی آہٹ نہ ابھری۔

بارہ بج گئے، رات آدھی ہوگئی۔ رات گہری ہوتی گئی۔ راستے سنسان پڑ گئے، ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ وہ دونوں جاگتی رہیں، ہر آہٹ پر سلطانہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی۔ پھر مدھم ہوتے ہوتے اس قدر سست ہو جاتی کہ اسکو محسوس ہوتا جیسے اس کا دل دھڑکنا بند ہو گیا ہے۔

رات ڈھلنے لگی۔ ستاروں کی روشنی ماند پڑنے لگی۔ افق سرحدوں سے سفیدی پھوٹنے لگی تھی۔ سلطانہ جاگ رہی تھی۔ ماں کی آنکھیں انتظار کرتے کرتے پتھرا گئی تھیں۔ اچانک گلی میں کتوں کے زور زور سے بھونکنے کی آواز ابھری۔ اسکے ساتھ ہی قدموں کی آہٹ آنے لگی۔ کوئی آہستہ آہستہ اسی طرف آرہا تھا۔ کھٹ، کھٹ، قدموں کی آہٹ قریب ہوتی گئی، اور قریب، جب قدموں کی آہٹ عین دروازے پر ابھری تو سلطانہ کا دل زور زور سے دھڑکتے دھڑکتے ایکبارگی ٹھہر گیا۔ ماں کی نظریں دروازے پر رک گئیں۔

دروازے پر کوئی دستک نہ ہوئی، کوئی آواز نہ آئی۔ چلنے والا آگے چلا گیا۔ قدموں کی آہٹ دور ہوتی گئی۔ اور دور۔ اسی وقت کہیں نزدیک ہی مرغ نے بانگ دی۔ سحر ہو رہی تھی۔ رات کے ختم ہونے کا اعلان ہو رہا تھا۔

ماں نے ایکبار سلطانہ کو اپنے سینے میں بھینچ لیا اور دونوں ماں بیٹی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

●

# مکتبۂ نیا دور کی چار کتابیں

## ترجمے :۔ جمیل جالبی

### کلچر کی اہمیت

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کی مشہور معروف تصنیف

NOTES TOWARDS THE DEFINATION OF CULTURE

کا اُردو ترجمہ ۔ اس کتاب کی اہمیت آج تمام دنیا میں مسلم ہے۔

### ایلیٹ کے مضامین

ٹی ۔ ایس۔ ایلیٹ بیسویں صدی کی وہ شخصیت ہے جس کا اثر تمام دنیا کے ادب پر یکساں پڑا ہے۔ جمیل جالبی نے ایلیٹ کے معرکتہ الارا مضامین کو اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس کے مطالعہ سے اُردو داں طبقہ اس عظیم شخصیت کے افکار و خیال سے پورے طور پر واقف ہو سکتا ہے۔

### اقدار و مسائل

ہم یورپ کی ادبی تحریکات اور ادیبوں کا ذکر اپنی گفتگو اور مضامین میں قدم قدم پر کرتے ہیں لیکن ہم میں سے بہت کم ایسے ہیں جو ان افکار و خیال اور یورپ کے ادبی اقدار و مسائل سے پورے طور پر واقف ہیں۔ جمیل جالبی نے سینکڑوں مضامین میں سے ایسے مضامین کا انتخاب کیا ہے جنکو پڑھ کر یورپ کے ادب اور ادیبوں کو سمجھا جا سکتا ہے اور ان کی ادبی حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ۔ شاید ہی کوئی ادیب ہو جو اس انتخاب میں شامل نہ ہو۔

### آتش سوزاں

جارج آرویل کا مشہور ناول اینیمل فارم، جسکی اشاعت نے انگریزی داں طبقہ میں ایک دھوم مچا دی تھی۔ اب یہ ناول اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ ناول بے حد دلچسپ اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

# صراط المستقیم

ضمیر الدین احمد

—

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میرے ختنے ہوئے تھے۔ میری عمر اس وقت چار برس کی ہو گی۔ میری یادداشت میں یہ سنت والا واقعہ اس عمر کا واحد نمائندہ ہے۔ مجھے اس کی تمام تفصیلیں ابھی تک بخوبی یاد ہیں۔ کیسے مجھے چوکی پر بٹھایا گیا۔ کیسے سونے کی چڑیا اڑائی گئی۔ کیسے چوکی سے اٹھا کر مجھے بستر پر ڈالا گیا اور کیسے مجھے خوش کرنے کے لیے سب نے ——— ابا جان اور امی جان نے اور ان سب تمام عزیزوں نے جو اس تقریب پر جمع ہوئے تھے ——— روپے دیئے۔ کاغذ کے نہیں۔ چاندی کے جنہیں میں نے سنبھال کر تکیے کے نیچے رکھ چھوڑا تھا اور جنہیں میں بار بار تکیے کے نیچے سے نکال کر ہاتھوں میں لے کر اچھالتا تھا۔ اور خوش ہوتا تھا۔

سونے کی چڑیا اڑے دوسرا یا تیسرا دن تھا کہ دو روپے میرے ہاتھ سے اچھل کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ نانی کی ہدایت کے مطابق انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ پڑھ کر ان روپیوں کی تلاش کی گئی۔ اس دالان کا کونہ کونہ چھان مارا گیا جس میں میرا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ تلاش کرنے والوں کی زد سے صحن بھی نہ بچ سکا۔ اور ایک نظر صحن کی نالی پر بھی ڈالی گئی مگر روپیوں کے تو گویا پر لگ گئے تھے۔

ابا جان نے میرا خسارہ پورا کرنے کے بعد لگ بھگ آدھ گھنٹے تک اپنی زندگی کے وہ مختلف واقعات سنائے جن میں روپیہ ایک مرتبہ کھویا تو پھر کبھی نہیں ملا۔ پیسہ۔ ادھنا۔ اکنی۔ دونی۔ چونی۔ اور اٹھنی کھو جائے تو مل جاتی ہے۔ مگر مگر روپیہ ——— چاندی والا روپیہ ——— کھو جائے تو پھر ملنا محال۔ یہ ابا جان کی رائے تھی جس کی بنیاد ان کے ذاتی تجربات پر تھی۔ نانی بھی ان سے متفق تھیں۔ اور ان کا خیال تھا کہ چاندی کے روپیوں میں چوہوں کے لئے کوئی خاص کشش ہوتی ہے۔ جیونہی روپیہ نظر بچا کر بھاگا چوہے نے بل سے نکل کر اسے منہ میں دبایا اور فوراً اپنے واپس اپنے بل میں، ایک دفعہ ایک مکان کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ اس سلسلے میں کھدائی کی گئی تو چوہوں کے ایک بل میں سے پانچ چاندی کے روپے نکلے۔ یہ واقعہ نانی نے بیان کیا۔ اور سب نے اسے بڑے انہماک سے سنا۔ اور سب نے اس سلسلے میں کسی نہ کسی رائے کا اظہار کیا سوائے امی جان کے

تو چپ رہیں۔

وہ بولیں تو دوسرے دن صبح۔ ناشتے کے بعد جب سنت کی تقریب کے سلسلے میں آئے ہوئے مہمان جن میں خالہ جانی بھی شامل تھیں۔ رخصت ہو چکے تھے۔ کہنے لگیں روپے نہ تو کھوئے اور نہ انہیں چوہے لے گئے۔ تو پھر کہاں گئے؟

خالہ جانی کی جیب میں یا ان کے تنگ پاجامے کے نیفے میں۔ اور ان روپیوں سے خالہ جانی اپنی سینڈلیں کے لئے امیزلین اسنو۔ اور پاؤڈر خریدیں گی۔

ابا جان نے امی جان کی بات کو ہنس کر ٹال دیا۔ ان کا خیال تھا کہ امی جان کو خالہ جانی سے بغضِ للّٰہی ہے۔ تبھی وہ ان پر اس قسم کا رکیک شبہ کرتی ہیں۔ مگر امی جان اپنی بات پر اڑی رہیں۔ انہیں شبہ نہیں یقین تھا۔

نانی نے امی جان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے وہ شبہ کی حد سے آگے نہیں بڑھیں حالانکہ بقول ابا جان کے انہیں بھی خالہ جانی سے بغضِ للّٰہی تھا۔

ان تین بڑوں کے درمیان اس روز اور اس کے بعد خالہ جانی کے بارے میں جو وقتاً فوقتاً جو گفتگو ہوئی اس سے مجھے پتہ چلا کہ خالہ جانی امی جان کی سگی بہن نہیں ہیں۔ نہ جانے کیوں میں یہ سمجھتا تھا کہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ دونوں کا رشتہ یہ تھا کہ نانا مرحوم کے رشتے کے ایک بھائی تھے۔ جن کی ایک رشتہ کی بہن تھیں۔ اور خالہ جانی ان کی لڑکی تھیں۔ ان کی پرورش نانا مرحوم نے کی تھی۔ اس لئے امی جان اور خالہ جانی کا بچپن سے ساتھ رہا تھا۔ حالانکہ امی جان ان سے کئی سال چھوٹی تھیں۔ دونوں کی تعلیم عمر کے اس فرق کے باوجود ساتھ ساتھ ہوتی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ امی جان نے تعلیم میں جتنا جی لگایا اتنا خالہ جانی نے چھپ چھپ کر ناول پڑھنے میں اور امی جان جتنی دیر ایک امریکن مشینری عورت سے سی۔ اے۔ ٹی۔ کیٹ اور آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ پڑھتی رہی تھیں۔ خالہ جانی اس گوری چمڑی کی عورت کا مطالعہ کیا کرتی تھیں۔ اور اس کے جانے کے بعد بڑے انہماک سے اس کے بالوں۔ اس کی پوشاک۔ اس کے اندازِ گفتگو اور اس کے طرز رفتار کی چھپ چھپ کر نقل کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں ــــــــ انہیں محلے اور پڑوسیوں کے لڑکوں کے ساتھ لڑکوں کے کھیل کھیلنے کا بھی بہت شوق تھا۔ پتنگ اڑاتی تھیں۔ گولیاں کھیلتی تھیں۔ پیڑوں پر چڑھنے کی کوشش کرتی تھیں۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی تعلیم بند کر دی گئی۔ اور انہیں گھر کے کام پر لگا دیا گیا۔ پہلے سینے پرونے اور کاڑھنے کا کام دیا گیا۔ اور جب انہوں نے اس طرف بھی کوئی خاص توجہ نہیں دی تو انہیں بقول نانی "چولہے میں جھونک دیا گیا" جس کا مطلب یہ ہے کہ انہیں باورچی خانے کے کام پر لگا دیا گیا۔ مگر وہ باورچی خانے میں بیٹھ کر بیاتو

قبولِ عام عشقیہ غزلیں گنگنایا کرتیں یا باورچی کو بلا وجہ ڈانٹا ڈپٹا کرتیں اور اس پر رعب جمایا کرتیں یا کبھی کبھی اس سے ہنسی ٹھٹول کرتیں۔

نانا مرحوم نے جنہیں میں نے دیکھا تو نہیں مگر جن کے بارے میں میں نے سنا ہے لمبی سی داڑھی تھی خالہ جانی کی شادی کے بارے میں اتنی عجلت برتی کہ ابھی وہ بمشکل پندرہ برس کی تھیں کہ ان کا بیاہ اپنے رشتے کے ایک بھائی کے لڑکے سے کر دیا۔ جن کی عمر اس وقت چوبیس پچیس برس کی تھی۔ جو قرآن حفظ کر چکے تھے۔ اور جن کے چہرے پر داڑھی تھی۔

اُن دنوں ان کی داڑھی کالی رہی ہوگی۔ مگر جب میں نے ہوش سنبھالا تو یہ تین چوتھائی سپید ہو چکی تھی۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ اپنی داڑھی کی مکمل سیاہی سے لے کر تین چوتھائی سپیدی تک انہوں نے کیا کچھ کیا اور کہاں کہاں رہے مگر مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان دنوں وہ "ریلوی" کی مسجد میں امام تھے۔ پتہ نہیں یہ "ریلوی" خالہ جانی کی ایجاد ہے یا کسی اور کی۔ مگر میں نے ریلوے کی یہ بگڑی ہوئی حالت انہی کے منہ سے سنی۔ "ریلوی" کی مسجد میں امام مقرر ہونے سے پہلے وہ اسی "ریلوی" میں ملازم تھے۔ ان کا کام کیا تھا۔ یہ مجھے نہیں معلوم۔ مگر اتنا پتہ ہے کہ تنخواہ قلیل تھی جو امام ہونے کے بعد شاید قلیل تر ہو گئی تھی۔

اس قلت کے پیشِ نظر ان کے گھر کا رکھ رکھاؤ حیرت انگیز تھا۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ ایک کمرہ۔ ایک نیچی سی ایک کوٹھری۔ ایک دالان در دالان، اور ایک کمرے نما کوٹھا۔ مگر کیا حسنِ انتظام اور کیا سلیقہ تھا۔ خالہ جانی کا کہ اس پرانی وضع کے بے ڈھنگے سے گھر میں ہر چیز پر ڈھنگ اور سلیقے کی مہریں ثبت تھیں۔ میں نے صرف خالہ جانی کے سلیقے اور حسنِ انتظام کا ذکر اس لئے کیا کہ ان کے شوہر کا، نہیں ہم لوگ نہ معلوم کس رشتے سے ماموں کہتے تھے اس گھر سے بظاہر اجنبیوں کا سا تعلق تھا۔ وہ یا تو بسلسلۂ امامت گھر سے باہر رہتے یا گھر کے کسی کونے میں پڑے رہتے۔ بہت کم گو تھے جس کی وجہ سے ان کی موجودگی کا احساس ویسے بھی ذرا مشکل سے ہوتا تھا۔ مزید یہاں گھر کی آرائش کچھ اس ڈھب کی تھی کہ اس کا تعلق ان سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ مس کجن کی فریم کی ہوئی تصویر۔ طاقوں میں رکھے ہوئے پوڈر کے ڈبے۔ کریم کی شیشیاں، ناخونوں کی پالش۔ آئینہ۔ سُرمہ دانی۔ کنگھیاں اور کنگھے۔ ان چیزوں سے بھلا ماموں کا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ جو حافظِ قرآن تھے۔ جن کی داڑھی تھی اور جو "ریلوی" کی مسجد میں امام تھے۔

اگر کسی غیر جانبدار شخص سے کہا جاتا کہ وہ خالہ جانی کے گھر اور ہمارے گھر کا مقابلہ کرے تو بلاشبہ فیصلہ خالہ جانی کے گھر کے حق میں ہوتا۔ وہاں نہ تو باورچی خانے میں جھوٹے برتنوں کا ڈھیر لگا ہوتا۔ نہ گھڑوں پر کائی جمی

ہوتی۔ نہ چارپائیوں پر کھلے ہوئے بستر دن بھر دھوپ سب سوکھا کرتے نہ پان کی پیک کے نشان فرش۔ اور دیواروں پر گلکاریاں کرتے۔ نہ ٹوٹے صحن میں اوندھے پڑے ہوتے۔ نہ میزوں اور تختوں پر سیاہی کے دھبے کسی کا منہ چڑاتے۔ اور نہ ——— ایک لمبی فہرست ہے۔ کیا کیجئے گا سنکر۔ بس اتنا کہنا اور ضروری ہے کہ یہ فہرست میرے گھر کی ہے جو خالہ جانی کے گھر سے کم از کم پانچ گنا بڑا تھا۔ اور جس کے کمانے والے کی آمدنی ماموں کی آمدنی سے کم از کم پچاس گنا زیادہ تھی۔

بچپن میں ہم لوگ ——— میں اور میرے بھائی ——— جب گلی ڈنڈا۔ کبڈی یا گولیاں کھیلتے کھیلتے خالہ جانی کے گھر میں گھس جاتے تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے دھوپ میں جھلس رہا تھا کہ سایہ مل گیا۔ دالان میں تخت پر گاؤ تکئے کا سہارا لئے خالہ جانی بیٹھی ہیں۔ ایک کٹورا پان سے بھرا ہوا ہے۔ پاس کے پلنگوں پر ان کی تینوں لڑکیاں لیٹی بیٹھی ہیں۔ بڑی کوئی ناول پڑھ رہی ہے منجھلی ناخونوں پر پالش لگا رہی ہے اور چھوٹی کسی کھیل میں لگی ہوئی ہے۔

"بیٹا ننگے پاؤں مت پھرا کر۔"

"بیٹا دھوپ میں مت کھیلا کر۔ سر میں درد ہونے لگے گا۔ رنگ کالا پڑ جائے گا۔"

"ذرا دیر سستا لے۔ کھیل کوئی بھاگا تھوڑی جا رہا ہے۔"

"گھڑے میں سے نہیں۔ صراحی میں سے پی۔ اسکا پانی زیادہ ٹھنڈا ہے۔"

اور اگر شامتِ اعمال کہیں کھیل کو چھوڑ کر اپنے گھر میں گھس جاتے تو ———

"جھاڑو پھرے تمہاری صورتوں پر۔ باہر لو چل رہی ہے۔ اور تم ہو کہ کدکڑے لگاتے پھر رہے ہو۔"

"ٹھہر۔ آنے دے اپنے باپ کو۔ نہ کی ہو آج تیری شکایت تو کہنا۔"

"خبردار جو اب نکالا قدم گھر سے باہر۔ لیٹ جا کر پنکھے کے نیچے۔ اور جو ہلا تو یاد رکھنا ٹانگیں رکھ دوں گی توڑ کے۔"

خالہ جانی کے چار اولادیں تھیں۔ ——— ایک لڑکا اور تین لڑکیاں۔ سب سے بڑا لڑکا تھا۔ اس کی شادی میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے ہو چکی تھی۔ اور وہ کسی دور دراز مقام پر ملازم تھا۔ اور ہر ماہ منی آرڈر سے کچھ روپیہ خالہ جانی کو بھیجا کرتا تھا۔ مگر خالہ جانی کو اس سے کوئی خاص محبت نہ تھی۔ وہ تو اپنی لڑکیوں پر جان چھڑکتی تھیں۔ اور جو کچھ مدد لڑکا کرتا تھا وہ سب کی سب نہیں تو زیادہ تر ان پر خرچ ہوا کرتی تھی۔ ان کے کپڑوں پر۔ ان کی کریم۔ پاؤڈر۔ سرخی۔ نیل پالش۔ سُرمہ۔ چوٹی۔ کنگھی پر۔ سنا ہے کہ لڑکے کی پرورش انہوں نے کچھ یونہی سی کی تھی۔ نہ سلیقے کی تعلیم دلائی۔ اور نہ اچھی تربیت دی۔ اِدھر اُدھر بھٹکنے کے بعد وہ ایک

نوکری تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا جو اسے وطن سے بہت دُور لے گئی۔ اور اس دُور دراز مقام پر اس نے اپنی پسند سے شادی کرلی۔ جب دلہن گھر آئی تو سنا ہے کہ خالہ جانی نے اتنی ناک بھوں چڑھائی کہ لڑکا دو دن بعد ہی اپنی دلہن کو لے کر دُور دراز مقام کے لئے روانہ ہوگیا۔ جہاں وہ ملازم تھا۔ خالہ جانی کی ناک بھوں چڑھنے کا سبب یہ نہیں تھا کہ لڑکے نے بغیر ان کی اجازت کے شادی کیوں کرلی۔ بلکہ یہ کہ اس نے ان کے لئے خوب صورت بہو کیوں تلاش نہیں کی۔ وہ شکل صورت کی معمولی تھی مگر بدصورت کسی طرف سے بھی نہیں تھی۔ طور طریقوں اور عادات واطوار کی بہت اچھی تھی۔ ملنسار، خلیق، سیدھی سادی۔ مگر خالہ جانی کو ان صفات کو لے کر کیا چاٹنا تھا۔ وہ تو چندے آفتاب چندے ماہتاب بہو چاہتی تھیں جو انہیں ملی۔

لیکن انہوں نے اپنی ناپسندیدگی کو حد سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ وہ ہر سال گرمی کے موسم میں دو تین مہینوں کے لئے اپنی تینوں بیٹیوں کو لے کر بیٹے کے ساتھ رہنے جاتیں۔ ماموں کو وطن میں چھوڑ جاتیں۔ اور وہ یہ دو تین مہینے اپنا کھانا آپ پکا کر گذارتے۔ جب خالہ جانی اس دُور دراز مقام سے واپس آتیں تو ان کی بیٹیوں کے پاس بہت سے نئے نئے کپڑے ہوتے۔ آرائش جمال کی نئی نئی چیزیں ہوتیں۔ اور ان کی اپنی زبان پر یا تو اپنی بہو کی برائیاں ہوتیں یا سفر کے بڑے دلچسپ قصے ہوتے۔

ایک قصہ آپ بھی سن لیجئے۔

"ارے نفیسہ (یہ میری والدہ کا نام ہے) تمہیں ایک بڑے مزے کی بات تو بتانا بھول ہی گئی!"

وہ اپنے بیٹے کے پاس سے ابھی ابھی لوٹی تھیں اور حسبِ معمول امی جان ان سے ملنے گئی ہوئی تھیں۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ خالہ جانی تخت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ امی جان ان کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں خالہ جانی کی تینوں بیٹیاں پاس کے پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور میں فرش پر گولیوں کی مشق کر رہا تھا۔

خالہ جانی نے پان کا ایک اور بیڑا منہ میں ٹھونستے ہوئے قصہ جاری رکھا۔

"گاڑی جب کاملی کے اسٹیشن پر رکی تو ایک ٹی۔ ٹی اِن کے ڈبے میں گھس آیا۔ سب کے ٹکٹ چیک کرچکا تو ہماری طرف رجوع ہوا۔ اب تم دیکھو کر رجوع تو ہوا تھا ٹکٹ دیکھنے کے لئے مگر کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔"

اس مقام پر اُن کی بڑی لڑکی آہستہ سے ہنسی اور خالہ جانی نے قصے کی ڈور ایک لمحے کے لئے چھوڑ دی۔ میں نے گولیوں کی مشق چھوڑ کر امی جان کی طرف دیکھا۔ وہ ہمہ تن گوش تھیں۔ خالہ جانی نے آگے جھک کر اگالدان میں پیک تھوکی اور پھر ایک نظر حاضرین پر ڈال کر بولیں۔

"ہم نے پیرس (میرے گھر میں اس وقت تک صرف جوتے استعمال ہوتے تھے۔ اس لئے پیرس کا لفظ

میرے لئے نیا تھا) میں ہاتھ ڈال کر ٹکٹ نکالے اور اس کی طرف بڑھائے تو وہ شرما گیا۔ کہنے لگا۔ رہنے دیجئے۔ تکلیف نہ کیجئے۔ اور پھر مجھ سے اجازت مانگ کر بھنو (یہ ان کی بڑی لڑکی کا نام تھا) کے پاس بیٹھ گیا۔

" اگلے اسٹیشن پر اتر گیا۔ مگر ہر اسٹیشن پر آکر ڈبے کے سامنے کھڑا ہو جاتا اور بھنو کو دیکھتا۔ ایک اسٹیشن پر اپنے کچھ ساتھیوں کو بھی لایا۔ اور وہ سب ڈبے کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ اور بھنو کی طرف دیکھ دیکھ کر بوٹی فل بوٹی فل (یہ انگریزی لفظ بیوٹی فل کا خالہ جانی برانڈ چربہ تھا) کہنے لگے۔ مجھے بڑی ہنسی آئی۔ بھنو بھی بہت ہنسی۔ اس کے بعد تو سارے راستے اس نے ہمارے اتنے کام کئے کہ مت پوچھو۔ کبھی پان لاکر دیتا۔ کبھی برف لادیتا۔ کبھی پھل خرید لاتا اور کبھی . . . . . "

بھنو جنہیں ہم لوگ پیا کہتے تھے واقعی بڑی "بوٹی فل" تھیں۔ صاف رنگت۔ لمبے لمبے بال۔ جھکی ہوئی پلکیں۔ دراز قد۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ کشادہ پیشانی۔ ستواں ناک، اور نازک بدن۔ کسی طرف سے بھی خالہ جانی کی بیٹی نہیں لگتی تھیں۔ کیونکہ خالہ جانی کا جسم بھرا بھرا تھا۔ ان کے ہونٹ موٹے تھے۔ ان کی رنگت سانولی تھی۔ ان کی پیشانی تنگ تھی۔ اور ان کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بات بات پر مٹکا کرتی تھیں اور ان میں سے ایک عادتاً اکثر جھپک بھی جایا کرتی تھی۔

ہم سب کو بھنو آپا بہت پسند تھیں۔ نانی۔ ابا جان۔ امی جان اور ہم سب بھائی بہن ان سے بہت پیار کرتے تھے اور وہ ہم سب کو بہت چاہتی تھیں۔ ان میں ایک قسم کا خلوص تھا جو دلوں کو چھو لیتا تھا۔ پاؤڈر کریم کے استعمال کے باوجود ایک طرح کی سادگی تھی جو چھپتی نہیں تھی۔

قسمت کی بات کہ یہ سادگی پھر اس طرح بروئے کار آئی کہ اپیا کی زندگی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرح ٹیڑھی ہو کر رہ گئی۔

میری عمر اس وقت آٹھ نو برس کی تھی۔ ایک دن خالہ جانی کے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ بڑے کمرے میں ایک مسہری بچھی ہوئی ہے مسہری کے پاس ایک چمڑے کا سوٹ کیس رکھا ہوا ہے۔ اور مسہری پر ایک نوجوان صاحب دراز ہیں۔ آنکھیں بند ہیں۔ شاید آرام کر رہے ہیں۔

میں دبے پاؤں کمرہ پار کر کے اندر چلا گیا۔ خالہ جانی اور ان کی تینوں لڑکیاں باورچی خانے میں مشغول تھیں۔ ناشتہ تیار کیا جا رہا تھا۔ پراٹھے پک رہے تھے۔ کباب تلے جا رہے تھے۔

میں بھی باورچی خانے میں گھس گیا۔ اور اپیا سے پوچھنے لگا کہ باہر کے کمرے میں جو صاحب مسہری پر دراز ہیں وہ کون ہیں۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اپیا نے جواب میں مجھے کھینچ کر اپنے بدن سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔ "تمہیں نہیں معلوم؟"

ظاہر ہے کہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ تبھی تو میں نے دریافت کیا تھا۔ مگر اپیا نے جس انداز سے مجھے اپنے بدن سے لگایا تھا اس میں سو سوالوں کا ایک ایسا جواب تھا جو میں اس کچی عمر میں بھی کچھ کچھ سمجھ ہی گیا۔

مگر پھر بھی میں نے خالہ جانی سے اپنا سوال دہرایا۔ انہوں نے جواب میں "تمہیں نہیں معلوم!" بھی نہیں کہا۔ بس اپنی ایک آنکھ اشارتاً جھپکا دی اور بڑے معنی خیز انداز میں مسکرانے لگیں۔

میں وہاں سے سیدھا اپنے گھر گیا اور جا کر امی جان کو بتایا کہ خالہ جانی کے ہاں ایک مہمان آئے ہیں۔

امی جان نے پوچھا "کون مہمان؟"

میں نے جواب دیا "مجھے نہیں معلوم"

مگر چند دنوں میں مجھے بھی معلوم ہو گیا اور امی جان کو بھی۔ ان کا نام طاہر تھا۔ وہ خالہ جانی کے دور کے رشتے دار تھے۔ اور بقول خالہ جانی چھٹیاں گذارنے آئے تھے۔ کسی سرکاری دفتر میں ڈیڑھ دو سو روپے پر ملازم تھے۔ بڑے آدمی تھے کیونکہ اس زمانے کے ڈیڑھ دو سو روپے آج کل کے آٹھ نو سو روپیوں کے برابر تھے، ہر ٹی میں رہتے تھے۔ سوٹ پہنتے تھے۔ اور ٹائی لگاتے تھے

جب تک وہ خالہ جانی کے ہاں ٹھہرے میرا معمول رہا کہ دن میں کم از کم ایک چکر ضرور ان کے گھر کا لگاتا۔ ہمارے محلے میں ان دنوں سوٹ پہننے اور ٹائی باندھنے والا ایک شخص بھی نہیں تھا۔ ہم سب کے سب شیروانی پوش تھے۔ اس لئے طاہر صاحب میں میرے لئے ایک ایسی کشش تھی۔ جیسے دیکھنا بڑا مشغل تھا۔ میں کبھی کبھی خالہ جانی کے ہاں گھنٹوں بیٹھا رہتا تاکہ طاہر صاحب کو دیکھ سکوں۔ دقت یہ پیش آتی تھی کہ وہ چھت والے کمرے میں رہنے لگے تھے۔ اور وہاں تک میرا گذر ناممکن تھا۔ خاص طور سے جب اپیا بھی ان کے پاس ہوتیں۔ ایسے وقتوں میں خالہ جانی مجھے زینے کے پاس بھی نہ جانے دیتیں۔ یہ سمجھ لیجئے کہ ایک قسم کا پہرہ لگا رہتا —— خالہ جانی اگر کسی کام میں مشغول ہوتیں تو ان کی لڑکیاں پہرے پر مامور ہوتیں۔ اور میں مجبوراً نیچے صحن میں یا تو گولیاں کھیلتا یا ان کی سب سے چھوٹی لڑکی کے ساتھ جو عمر میں مجھ سے ایک آدھ سال چھوٹی تھی۔ گٹے کھیلا کرتا۔

پھر اپیا چھت پر نمودار ہوتیں، چہرہ سرخ، آنکھیں جھکی ہوئی۔ دوپٹہ سر پر۔ آہستہ آہستہ زینہ اترتیں میں ان کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرتیں ایک آدھ بات کرتیں اور پھر جا کر خالہ جانی کے پاس بیٹھ جاتیں۔ اور میں سب کی آنکھ بچا کر سیدھا چھت پر۔ کبھی طاہر صاحب مجھے کمرے میں بلا لیتے اور مجھ سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے۔ اور کبھی میں دور سے ان کے کپڑوں۔ ان کے چمکتے ہوئے جوتوں کو حسرت بھری نظروں سے دیکھ کر واپس آجاتا۔

طاہر صاحب شاید ڈیڑھ دو مہینے خالہ جانی کے ہاں ٹھہرے ۔ اور پھر ایک دم غائب ہو گئے ۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ ان کی چھٹی ختم ہو گئی تھی ۔ اس لئے چلے گئے ۔ ان کے جانے کے بعد بھی خالہ جانی کے گھر پر وہی بہار چھائی رہی ۔ جو ان کے قیام کے دوران میں چھائی ہوئی تھی ۔ خالہ جانی اور ان کی بیٹیاں ان دنوں بڑی خوش نظر آتیں ۔ خاص طور سے اپیا جنہوں نے طاہر صاحب کے جانے کے بعد چھت والے کمرے میں اپنا ڈیرہ جما لیا تھا ۔ ان دنوں ہرکٹم ترکٹم کا خالہ جانی کے گھر میں سکہ چلتا تھا ۔ یہ ایک خاص قسم کی خفیہ بولی تھی ۔ خالہ جانی اور ان کی بیٹیوں کو اس بولی میں مہارت حاصل تھی ۔ اور وہ دوسروں کی موجودگی میں راز کی ساری گفتگو اسی بولی میں کیا کرتی تھیں ۔ اس بولی کا اصول کچھ یوں سا تھا کہ الفاظ کے ہر دو حروف کے درمیان ر ۔ ک اور ٹ کا اضافہ کر دیا جاتا تھا ۔ اور اس طرح "ہم" "ہرکٹم" ۔ "تم" "ترکٹم" اور "سے" "سرکٹے" ہو جاتا تھا ۔ یہ اصول تو مجھے معلوم تھا مگر چونکہ مہارت نہ تھی ۔ اس لئے خالہ جانی جب اپنی بیٹیوں سے اس بولی میں گفتگو کرتیں تو میں کبھی ایک کا منہ دیکھتا اور کبھی دوسرے کا ۔ امی جان کو بھی یہ بولی بخوبی آتی تھی ۔ مگر وہ اس کا استعمال بہت ہی کم اور وہ بھی تفریحاً کرتی تھیں اور جب بھی خالہ جانی کو اس بولی میں گفتگو کرتے سنتیں تو بہت جز بز ہوتیں ۔

طاہر صاحب کے جانے کے بعد بریلی سے ان کے فوٹو آنا شروع ہوئے ۔ ایسے فوٹو میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے ۔ ایک دن خالہ جانی ہمارے ہاں آئیں تو ان کے ساتھ ان فوٹوؤں کا ایک پلندہ تھا ۔ انھوں نے مسکرا مسکرا کر ہنس ہنس کر ۔ خوش ہو ہو کے یہ فوٹو امی جان کو دکھائے ۔ میں بقول امی جان کے ان کے کولہے سے لگا بیٹھا تھا ۔ میں نے بڑی دلچسپی سے ان تصویروں کو دیکھا ۔ ان میں ایک نئی دنیا تھی جس نے فوراً مجھے اپنی طرف کھینچ لیا ۔ ان تصویروں میں جو طاہر صاحب نظر آرہے تھے وہ ان طاہر صاحب سے بالکل مختلف تھے جنہیں میں نے خالہ جانی کے ہاں اتنی مرتبہ دیکھا تھا ۔ کسی فوٹو میں ان کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی ۔ کسی میں ان کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے ۔ کسی میں ان کے بال بکھرے ہوئے تھے ۔ ان تصویروں کو دیکھ کر مجھے نوٹنکی کا وہ تماشہ یاد آگیا جس میں ایک شخص سرخ دھبوں والے پھٹے کپڑوں میں بیڑیاں پہنے نگاڑے کی کڑدھم دھم ۔ کڑدھم دھم پر سینے پر ہاتھ مار مار کے گاتا تھا ۔

لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں ۔
لیلیٰ پیاری بسی موے من میں ۔

اور پھر ایک بار زور سے سینے پر ہاتھ مار کر چلاتا تھا ۔

ہائے لیلیٰ !

جب خالہ جانی چلی گئیں ۔ تو امی جان اور نانی کے درمیان ایک کھسر پھسر کانفرنس ہوئی جس کی زیادہ تر

گفتگو میرے کانوں تک نہ پہنچ سکی مگر جس کے چند ٹکڑوں کو سنکر میں نے یہ اندازہ لگایا کہ ان دونوں نے ان تصویری مجموعیت کو بہ نظر تحسین نہیں دیکھا۔ مگر مجھے یہ فوٹو اس قدر اچھے لگے تھے کہ میں بار بار خالہ جانی کے گھر جاکر اپیا سے مانگ کر یہ تصویریں بڑے غور سے دیکھا کرتا۔ وہ مجھ سے پوچھتیں۔

"تمہیں اچھی لگتی ہیں یہ تصویریں؟"

میں جواب دیتا "ہاں۔ بہت اچھی"

وہ پوچھتیں "اور طاہر صاحب؟"

میں کہتا "وہ بھی"

یہ سنکر ان کا چمکتا ہوا چہرہ اور چمکنے لگتا۔ اور وہ مجھے کھینچکر اپنے بدن سے لگالیتیں۔

تین چار ماہ بعد طاہر صاحب پھر نمودار ہوئے۔ پھر ان کا بستر چھت والے کمرے میں لگا دیا گیا۔ اور پھر اپیا کے ذمے ان کی دیکھ بھال۔ ان کی خاطر مدارات کردی گئی۔ وہ دن میں بیس بار زینہ چڑھتیں اور بیس بار اترتیں۔ کبھی ناشتہ لئے جارہی ہیں۔ کبھی کھانا۔ کبھی شربت۔ کبھی لسی۔ کبھی چائے۔ کبھی یہ۔ کبھی وہ۔ مگر وہ اس دوڑ دھوپ۔ اس اترا چڑھی سے عاجز نہ آتیں۔ بلکہ طاہر صاحب کی جتنی زیادہ خدمت کرتیں اتنی ہی خوش ہوتیں۔ اور خوش ہونے کی بات بھی تھی۔ کیونکہ طاہر صاحب اتنے اچھے جو تھے۔ اور اتنی اچھی اچھی باتیں جو کرتے تھے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے ایک دن سنا کہ وہ اپیا سے ان کے بالوں کی تعریف کر رہے تھے۔ کچھ اس طرح کہ میرا جی چاہنے لگا کہ میرے بھی ایسے ہی بال ہوتے۔ تاکہ طاہر صاحب کے منہ سے ان کی تعریف سنتا۔

دو ڈھائی ماہ بعد وہ اچانک غائب ہوگئے۔ جس دن وہ روانہ ہوئے اس کے دوسرے دن میں خالہ جانی کے گھر گیا اور سیدھا چھت پر چلا گیا۔ مگر وہاں تو کمرے میں تالا پڑا ہوا تھا۔ میں نیچے آکر اپیا کو تلاش کرنے لگا۔ وہ کوٹھری میں چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے طاہر صاحب کے بارے میں پوچھا تو کہنے لگیں کہ وہ تو چلے گئے۔ میں نے دریافت کیا۔ کیوں؟ ——— تو بولیں۔ ان کی چھٹی ختم ہوگئی تھی۔ اپیا اداس نظر آرہی تھیں۔ غیر شعوری طور پر میں طاہر صاحب کی تعریف کرنے لگا مگر اپیا چپ رہیں اور انھوں نے مجھے کھینچکر اپنے بدن سے نہیں لگایا۔ میں نے پوچھا کہ طاہر صاحب اب کب آئیں گے تو انہوں نے صرف اتنا کہا "کسے معلوم!"

دوسرے دن ایک اور واقعہ رونما ہوا۔ یعنی خالہ جانی اور اپیا غائب ہوگئیں۔ خالہ جانی کی منجھلی لڑکی نے جس کا نام کنیزہ تھا مجھے یہ خبر سنائی کہ خالہ جانی اور اپیا اس دور دراز مقام پر چلی گئی ہیں جہاں ان کا لڑکا سلسلۂ ملازمت مقیم تھا۔ لڑکے کی بیماری کا تار آیا تھا۔ اس لئے اچانک جانا پڑا۔ میں نے جاکر یہ خبر امی جان اور نانی کو سنائی۔ ان دونوں میں فوراً میری موجودگی میں تبادلۂ خیال ہوا۔ امی جان نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا

کہ خالہ جانی بغیر ان سے ملے چلی گئیں۔ اور نانی نے اس بات پر کہ اول تو بقول خالہ جانی کے سالانہ سفر کی نہیں تھی۔ اور دوئم یہ کہ حسبِ معمول وہ اس دفعہ باقی دو لڑکیوں کو ہمراہ کیوں نہیں لے گئیں۔ مگر امی جان نے ان کے اعتراضات کو رد کر دیا۔ کیونکہ یہ غیر معمول سفر تھا جس کا سبب لڑکے کی علالت تھی۔ اور صرف اپنے اعتراض کو برقرار رکھا۔

خالہ جانی اور اپیا جس طرح اچانک غائب ہو گئیں تھیں۔ اسی طرح اچانک واپس آگئیں۔ میں جلیبیاں لینے جا رہا تھا۔ خالہ جانی کے گھر کے سامنے سے گذرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک تانگہ آکر دروازے کے سامنے رکا۔ ذرا سی دیر میں تانگے میں سے خالہ جانی اپنے ٹوپی والے برقعے میں نمودار ہوئیں۔ میں جا کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اور پھر اپیا کا ہاتھ پکڑ کر جو ابھی تک پردہ بندھے تانگے میں بیٹھی تھیں۔ انہیں نیچے اتارا۔ میں نے اپیا کو سلام کیا تو انہوں نے جواب دینے کے لئے برقعے کی نقاب اٹھائی۔ اور میں حیران رہ گیا۔ ان کی رنگت زرد تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں۔ بڑی کمزور دکھائی دے رہی تھیں۔ خالہ جانی کا سہارا لے کر وہ گھر میں داخل ہوئیں۔

میں جلیبیاں بھول کر دوڑا دوڑا اپنے گھر پہنچا اور جاتے ہی امی جان کو خالہ جانی اور اپیا کی اور اپیا کی کمزوری کی خبر سنائی۔ امی جان نے پُر معنی نظروں سے نانی کی طرف دیکھا۔ نانی کی نظریں بھی پُر معنی ہو گئیں گویا کہہ رہی ہوں ـــــ میں نہ کہتی تھی۔

یہ تو میں نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا کہتی تھیں اور کیا نہ کہتی تھیں۔ مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ امی جان اور نانی جو گھر سے بڑی مشکل سے نکلا کرتی تھیں اسی دن خالہ جانی کے گئیں۔ شاید اس کا سبب یہ تھا کہ دونوں کو اپیا سے بڑی محبت تھی۔ خالہ جانی کی لڑکیوں میں انہیں صرف اپیا پسند تھیں۔ میں ان کے ساتھ تھا۔ خالہ جانی نے انہیں اپنے لڑکے کی علالت کی ایک طویل داستان سنائی اور یہ بھی بتایا کہ سفر کے دوران میں اپیا کی طبیعت بھی خراب ہو گئی تھی۔ اپیا کوٹھری میں فرد اوڑھے لیٹی تھیں۔ امی جان اور نانی انہیں دیکھنے اندر گئیں۔ اپیا نے انہیں سلام کیا مگر اٹھیں نہیں۔ جب امی جان اور نانی انہیں دعائیں دیتی باہر نکلیں تو پھر ان کی آنکھیں میں نہ کہتی تھی۔ قسم کی گفتگو کر رہی تھیں۔

اپیا کی کمزوری آہستہ آہستہ دور ہو گئی۔ اور پھر چلنے پھرنے لگیں۔ چہرے کی زردی باقی رہ گئی تھی وہ بھی آہستہ آہستہ دُور ہو گئی۔ مگر ان کا پہلا سا رنگ لوٹ کر نہیں آیا۔ اور ان کے چہرے پر پرچھائیاں سی جمی رہنے لگیں۔

کچھ عرصے بعد ان کی شادی کا سلسلہ شروع ہوا۔ امیدوار طاہر صاحب تھے۔ پتہ نہیں انہوں نے درخواست کی تھی۔ یا بات خالہ جانی نے چلائی تھی مگر یہ معلوم ہے کہ وہ میدان میں اکیلے تھے۔ خالہ جانی اپنے سارے

معاملات خود ہی طے کرنے کی عادی تھیں۔ مگر تکلفاً امی جان اور نانی سے صلاح مشورہ کر لیا کرتی تھیں۔ سو اس معاملے میں بھی ان کی رائے لی گئی۔ کئی مرتبہ کانفرنسیں ہوئیں۔ اور ان دونوں نے ہر مرتبہ دبی زبان سے طاہر صاحب کی مخالفت کی۔ بنائے مخالفت کیا تھی یہ انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ مگر یہ صلاح مشورہ محض تکلف تھا۔ خالہ جانی فیصلہ کر چکی تھیں۔ طاہر صاحب میں انہیں سینکڑوں خوبیاں نظر آتی تھیں۔ اور سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خوبرو اور خوش شکل تھے۔

ایک بار نانی نے کہہ دیا "شکل صورت کو لے کر کیا چاٹنا ہے۔ سیرت چاہئے سیرت!"

اس پر خالہ جانی آگ بگولہ ہو گئیں۔ اور انہوں نے طاہر صاحب کی ایسے حمایت کی جیسے وہ ان کے اپنے لڑکے تھے۔ "کیا برائی ہے طاہر میں! کونسا عیب ہے اس میں! خدا نا خواستہ چال چلن خراب ہیں اس کے کیا! اور پھر شکل صورت کا ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک——"

موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے امی جان نے صلح جوئی کی "اماں کا مطلب یہ تھوڑی تھا کہ خدانہ کرے اس میں کوئی عیب ہے۔ وہ تو یہ کہہ رہی تھیں کہ صورت سے زیادہ سیرت کا خیال کرنا چاہئے۔ اور پھر طاہر میں تو بقول آپ کے سیرت بھی ہے اور صورت بھی۔"

خالہ جانی بولیں "اور نہیں تو کیا!"

بات ختم ہو گئی مگر جب خالہ جانی جانے لگیں تو نانی پھر بول پڑیں "لڑکا بھی تیار ہے؟"

خالہ جانی پھر آگ بگولہ ہو گئیں "لڑکا نہیں تیار ہے تو کیا میں اس کی خوشامد کرنے گئی تھی" اور پھر رک کر۔ "مجال ہے اس کی جو تیار نہ ہو!"

خالہ جانی کے جانے کے بعد امی جان اور نانی میں تھوڑی دیر تک چخ چخ ہوئی۔ امی جان نے کہا "تمہیں کیا پڑی تھی ان کے بیچ میں ٹانگ اڑانے کی!"

"میں کیوں اڑانے لگی ٹانگ! میں تو اسکے بھلے کی کہہ رہی تھی۔ لڑکی کی زندگی خراب کرے گی، اور کیا!"

"کرے وہ خراب تم سے کیا مطلب!"

"مطلب و طلب خاک نہیں۔ منہ کی کھائے گی۔ اب وہ ہرگز نہیں کرے گا اس سے شادی۔ تم دیکھ لینا!"

مگر نانی کا فیصلہ غلط نکلا۔ اور خالہ جانی کا "مجال ہے اس کی جو تیار نہ ہو" صحیح۔ شادی ہوئی اور دھوم دھام سے ہوئی۔ میرا مطلب ہے سب رشتے دار جمع ہوئے۔ ڈھول بجے۔ کھانا ہوا۔ رسمیں ہوئیں۔ اور پھر اپیا لال جوڑا پہن کر رخصت ہو گئیں۔

لیکن سال بھر بعد ایک بار جب وہ میکے لوٹ کر آئیں تو ان کو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھیں۔ رنگت سیاہ پڑ گئی تھی۔ بالکل بجھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ خالہ جانی کا بیان تھا کہ کئی ماہ کی مسلسل علالت نے اپیا کا یہ حال کر دیا۔ مگر امی جان اور خاص طور سے نانی کی رائے کچھ اور ہی تھی — "ظاہر اس کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا! کتنی کمبخت کی! بچی کی زندگی خراب کر کے رکھ دی!"

سچ مانئے اس دن مجھے اپنی والدہ اور نانی پر بہت غصہ آیا۔ آخر یہ لوگ ہمیشہ خالہ جانی میں کیڑے کیوں نکالتے رہتے ہیں! اور پھر ان کے لئے ایسے الفاظ کیوں استعمال کرتے ہیں! اور خالہ جانی کے ہاں جو کچھ بھی ہو اس کا ایک نرالا سا مطلب کیوں نکال لیتے ہیں! اپیا بیمار رہیں۔ ان کی صحت خراب ہو گئی۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ آخر یہ لوگ خالہ جانی کے اس بیان کو قبول کیوں نہیں کرتے؟

اپیا کے بعد کنیز کا نمبر آیا۔ کنیز کی شکل صورت معمولی سی تھی۔ کچھ کچھ خالہ جانی سے ملتی ہوئی۔ خاص طور سے موٹے ہونٹ۔ چھوٹی گردن۔ تنگ پیشانی اور ٹھگنا قد۔ مگر انہیں نہ تو بات بات پر اختلاج کا دورہ پڑتا تھا۔ نہ گرمی کی زیادتی سے غشی آتی تھی۔ نہ باورچی خانے کا کام کرنے سے ان کا دل گھبراتا تھا۔ اور نہ جھاڑو لگانے سے دم گھٹتا تھا۔ اسی لئے میں نے انہیں وہ دوائیں کھاتے کبھی نہیں دیکھا جو پہلے اپیا کھایا کرتی تھیں اور پھر خالہ جانی کی سب سے چھوٹی لڑکی نے جس کا نام زمرد تھا کھائیں۔ خمیرہ مروارید۔ آنولے کا مربہ مع چاندی کے ورق کے۔ خمیرہ صندل۔ شربت گاؤزبان۔ حب یہ اور قرص فلاں۔

میں نے اکثر انہیں چولھے کے پاس دیکھا۔ ان کے ذمے گھر کا کام کاج تھا۔ کھانا پکانا جھاڑو دینا، برتن مانجھنا۔ بستر بچھانا۔ یا پھر خالہ جانی کا بدن دبانا۔ خالہ جانی کے بدن میں نہ جانے کیوں اتنا درد ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے بھی مکیاں لگوایا کرتی تھیں۔ انہیں بھی اختلاج کی شکایت تھی۔ لیکن اتنی نہیں جتنی اپیا کو شادی سے پہلے رہی اور پھر زمرد کو ہوئی۔

کنیز کا نمبر بڑی خاموشی سے آیا۔ ایک دن سنا کہ اس کی نسبت ہو گئی ہے۔ پھر سنا کہ شادی ہونے والی ہے۔ معلوم ہوا کہ پاس کے قصبے کے ایک اسکول میں ٹیچر ہیں ان سے کنیز کی شادی ہو رہی ہے۔

شادی ہوئی مگر بغیر کسی دھوم دھڑکے کے۔ دولھا میاں بڑی سی پگڑی باندھ کر آئے۔ پگڑی پر سہرے کی جگہ دو ایک ہار پڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی ریشمیں رومال نہیں تھا۔ اس لئے نکاح کے وقت ان کا منہ صاف نظر آ رہا تھا۔ جب ان سے آمنت باللہ والی دعا پڑھوائی گئی تو میں نے دیکھا کہ ان کے سامنے کے دو دانت غائب ہیں اور ان کی مونچھ میں چند سپید بال موجود ہیں۔

جب کنیز کی شادی ہوئی تو میری عمر بارہ تیرہ برس کی تھی۔ ان کی شادی کے بعد ہم لوگ نانی کے مکان میں منتقل ہو گئے جس کی پچھواڑے کی دیوار خالہ جانی کے گھر سے ملی ہوئی تھی۔ اس دیوار میں ایک کھڑکی تھی جس میں سے ہو کر ہم لوگ خالہ جانی کی چھت پر پہنچ جاتے تھے۔

نانی کے مکان میں منتقل ہونے کا سب سے پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم لوگوں کا خالہ جانی کے ہاں آنا جانا بڑھ گیا اب ہم لوگ ان کی چھت پر پتنگ اڑاتے اور ڈور لوٹتے تھے۔ ان کے گھر میں گولیاں کھیلتے۔ اور کبھی کبھی ان کا کوئی کام کر دیتے۔ خالہ جانی کو کھٹائی اور مرچوں کا بہت شوق تھا میں نے اکثر انہیں اور ان کی لڑکیوں کو امیا یا کچی املی کی چٹنی سے روٹی کھاتے دیکھا جس میں بہت ساری مرچیں پڑی ہوتیں اور جسے وہ چٹخارے لے لے کر کھاتیں اور کہتیں کہ قورمے اور پلاؤ میں وہ مزہ کہاں جو چٹنی اچار میں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہم لوگوں کو یہ تنبیہ بھی کر دیتیں کہ مردوں کو زیادہ کھٹائی اور مرچیں نہیں کھانا چاہیے۔ اور جب میں ان سے پوچھتا کہ کیوں۔ تو وہ پہلے تو کوئی یونہی سا جواب دیتیں۔ مگر جب میں پیچھے پڑ جاتا تو بڑے پُرمعنی انداز میں مسکرا کر کہتیں کہ اس سے مردانگی پر اثر پڑتا ہے اور ان کا جواب سن کر ان کی لڑکیاں ہنسنے لگتیں۔

مجھے خالہ جانی کی یہ بات بہت پسند تھی۔ یہی کہ وہ مجھے ایسی باتیں بتا دیا کرتی تھیں جو میرے اپنے گھر میں مجھے کوئی بھی نہیں بتاتا تھا۔ اس سے ایک قسم کی آسودگی حاصل ہوتی تھی۔ نہ جانے کیوں۔ مثلاً یہی کھٹائی والی بات۔ امی جان اور نانی بھی ہم لوگوں کو زیادہ کھٹائی اور مرچیں کھانے سے منع کیا کرتی تھیں مگر ہماری کیوں کا جواب انہوں نے کبھی نہیں دیا۔ یہ نہیں کہ اس کچی عمر میں خالہ جانی کے جواب کا مطلب میری سمجھ میں آ جاتا تھا مگر نہ جانے کیوں یہ ضرور محسوس ہوتا تھا کہ خالہ جانی نے جیسے مجھے کوئی راز بتا دیا۔ مجھے اپنا ہمراز بنا لیا۔ مجھے اپنا ہمراز بنانے کے قابل سمجھا اور اس احساس سے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ ایک قسم کا بڑا پن محسوس ہوتا تھا۔

تو وہ یا تو ہم لوگوں سے کچے آم اور کچی املیاں منگواتیں جو ہم لوگ قبرستان میں لگے املی کے پیڑ سے یا پورن کی بغیا سے توڑ کر لا دیتے۔ یا پھر وہ ہمیں بدبودار صابن کے ڈبے دے کر کہتیں کہ فلاں دوکان سے جا کر میلن لے آؤ مگر چھپا کر لانا۔ مجھے تعجب ہوتا کہ خالہ جانی یا ان کی لڑکیاں اتنا بدبودار صابن کیوں استعمال کرتی ہیں۔ جو بدبو ان ڈبوں سے آیا کرتی تھیں وہی کبھی کبھی میں نے ان کے غسل خانے کی نالی میں سے آتے بھی سونگھی تھی۔ اس سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا کہ وہ یہ تاکید کرتی ہیں کہ صابن چھپا کر لاؤں۔ کیونکہ میرا خیال یہ تھا کہ یہ بھی اسی قسم کا صابن ہے جو نانی گرمی دانے مارنے کے لئے استعمال کرتی ہیں اور جس سے نیم کی بو آتی ہے۔ حالانکہ نانی نیم کا صابن منگواتے وقت اس قسم کی کوئی بھی تاکید نہیں کرتی تھیں۔

مگر یہ سب باتیں اس زمانے کی ہیں جب ہم نانی کے مکان میں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ اور میری عمر کم

تھی۔ جب میں تیرہ چودہ برس کا تھا تب بھی خالہ جانی کبھی کبھی کچی املیوں اور امیوں کی فرمائش کر دیتی تھیں مگر صابن نہیں منگواتی تھیں۔ ان دنوں اپیا اور کنیز اپنی اپنی سسرالوں میں تھیں اور زمرد جو مجھ سے سال چھ مہینے چھوٹی تھی۔ ایک دم بڑی ہو گئی تھی۔

زمرد جوان کیا ہوئی قیامت آگئی۔ شاعری والی قیامت نہیں بلکہ سچ مچ کی قیامت۔ اس کی جوانی نے خالہ جانی اور امی جان کے تعلقات کو ایسا تاگہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچے۔ اس تناؤ میں شاعری والی قیامت کو بھی کچھ نہ کچھ دخل تو تھا ہی۔ زمرد چھوٹی سی تھی تو اس کی ناک بہا کرتی تھی۔ جب کبھی کبھی وہ زبان کو لپلپا کر چکھ لیا کرتی تھی۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو وہ ہر وقت ایک انگلی نتھنوں میں ڈال کر کینچوے نکالا کرتی تھی۔ اور پھر ان کی چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر انہیں انگلیوں سے مسلا کرتی تھی۔ اس کی شکل صورت معمولی سی تھی، نہ بری نہ اچھی۔ مگر جوان ہوئی تو انقلاب آگیا۔ اس کے چہرے میں ایک عجیب قسم کی کشش اور اس کی جلد میں ایک نرالی چمک آگئی۔ اس کی پلکیں بڑے پیارے انداز سے جھکی جھکی رہنے لگیں۔ دوپٹہ اس کے سر پر ایک خاص زاویے سے ٹکا رہنے لگا۔ اور وہ ہر آنے جانے والے کی خدمت میں اپنے مخصوص انداز میں تسلیمات اور آداب عرض کرنے لگی۔ سر کو ذرا سا جھکا کر۔ گردن میں ذرا سا خم پیدا کر کے۔ ایک ہاتھ کو ایک چھوٹی سی کشتی کی شکل دیکر اسے چہرے کے سامنے لاکر اور دوسرے سے دوپٹے کو سینے پر سنبھال کر۔

میری امی جان بڑی حسن پرست ہیں۔ جس خوب صورت لڑکی کو دیکھتیں تڑپ کر رہ جاتیں کہ اسے اپنی بہو بنالیں۔ ہاتھ ملا کرتی تھیں کہ ان کا کوئی لڑکا اتنا بڑا نہیں تھا جس کی شادی وہ اپیا سے کر دیتیں۔ اب زمرد جو اس زور شور سے جوان ہوئی تو وہ پھسل گئیں۔ میرے بڑے بھائی صاحب اس زمانے میں کالج میں تھے۔ ابھی ان کی شادی کا سوال نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مگر امی جان کو لڑکی بھا گئی تھی۔ انہوں نے یہ سوچ کر کہ کوئی اور بات چیت نہ کر بیٹھے فوراً اپنی بہن خالہ جانی سے کہہ دیا کہ زمرد کی شادی تو میں قیصور یہ میرے بڑے بھائی کے نام قیصر کی بگڑی ہوئی صورت تھی) سے کروں گی۔

امی جان سمجھی ہوں گی کہ خالہ جانی ان کی بات سنکر خوشی کے مارے پھولی نہ سمائیں گی کیونکہ گھر اچھا تھا۔ لڑکا اچھا تھا۔ پڑھا لکھا تھا۔ دیکھا بھالا تھا۔ مگر خالہ جانی کا ردعمل الٹا ہی ہوا۔ انہوں نے اگلدان اٹھا کر اسمیں پیک انڈیل کر دوپٹے کے کونے سے ہونٹوں کے گوشوں کو پونچھ کر ٹھہر ٹھہر کر کہا کہ زمرد کی شادی کے معاملے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتیں کیونکہ بھنو (اپیا) نے اس کے لئے ایک لڑکا تلاش کر رکھا ہے جو ان دنوں لندن میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔

بس پھر کیا تھا۔ قیامت آگئی۔ وہاں تو وہ کیا کہتیں۔ اپنا سا منہ لے کر چلی آئیں مگر اپنے گھر آکر ان کا جی

جو بری ہیں تو تھمنے کا نام نہ لیتی تھیں۔

"لندن میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے! ایسے ہی تو سرخاب کے پر لگے ہیں اس کی لونڈیا میں کہ لندن میں ڈاکٹری پڑھنے والے لونڈے اس سے شادی کرینگے۔ جاہل بیٹی اور لندن کا ڈاکٹر داماد! سمجھتی ہیں کہ ہر ایک کی آنکھ میں دھول جھونک سکتی ہیں۔ پہلے اپنی اوقات تو دیکھیں پھر کریں بڑی بات"

لگے ہاتھوں انھوں نے زمرد کی شان میں بھی ایک لمبا سا قصیدہ پڑھ ڈالا۔ اس کی ایک ایک بات۔ اس کے ایک ایک نقش۔ اس کی چال۔ اس کی گفتگو کے انداز۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے اور اس کے کاڑھنے پرونے میں انہوں نے وہ وہ عیب لگائے ہیں کہ اگر کوئی غیر شخص سنتا تو یہ سمجھتا کہ زمرد جیسی بدصورت۔ اس جیسی جاہل۔ اور اس جیسی بدسلیقہ اور پھوہڑ لڑکی نہ پیدا ہوئی ہے اور نہ پیدا ہوگی۔ اور یہ قصیدہ اسی زمرد کی شان میں پڑھا گیا تھا جسے آدھ گھنٹہ قبل تک وہ اپنی بہو بنانا چاہتی تھیں۔

خالہ جانی کا انکار عجب اک سانحہ سا ہو گیا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے امی جان اور نانی خالہ جانی کا ذکر کرتیں۔ ان کے عیوب گنائے جاتے۔ ان کے بچپن کے قصے دہرائے جاتے۔ ان کی جوانی کے واقعات بیان کئے جاتے۔ ان کی تانک جھانک۔ ان کی دیدہ دلیری، ان کے دیدوں کا پانی مرجانے پر تبصرے ہوتے۔ اور نانی آخری شعر یا مقطع یوں پڑھتیں "اللہ بخشے تمہارے باپ کو۔ اتنی جلدی نہ کرتے اس کی شادی تو نہ معلوم کیا گل کھلاتی" ان کا خطاب امی جان سے ہوتا۔ اپیا کی "قسمت" کا تذکرہ بھی ہوتا۔ خالہ جانی کی بہو کا نام بھی آتا۔ ان کے لڑکے کا بھی ذکر ہوتا۔ اور ناموں کے "حال" پر ترس بھی کھایا جاتا۔

اس ساری غوں غاں کا نتیجہ یہ نکلا کہ امی جان اور نانی نے خالہ جانی کے ہاں جانا بند کر دیا۔ خالہ جانی ایک آدھ مرتبہ آئیں مگر امی جان اور نانی کے تیور پہچان گئیں اور پھر انہوں نے بھی ہمارے گھر کا رُخ نہیں کیا مگر اس کشیدگی کا ہم لوگوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ہم لوگ اسی طرح خالہ جانی کے ہاں آتے جاتے رہے اور جب قیصو بھائی تعلیم ختم کر کے لوٹے تو وہ بھی بدستور خالہ جانی کے گھر جانے لگے۔

قیصو بھائی شام کو ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ اور لوٹتے ہوئے تھوڑی دیر کے لئے خالہ جانی کے ہاں ٹھہر جاتے۔ ان دنوں اپیا بھی آئی ہوئی تھیں۔ گھڑی دو گھڑی ان سے اور خالہ جانی سے ہلکی پھلکی گفتگو کر کے اپنے گھر آجاتے۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ گھڑی دو گھڑی کا پروگرام گھنٹے دو گھنٹے کے پروگرام میں تبدیل ہو گیا۔ پھر ایک دن پتہ چلا کہ انہوں نے زمرد کو انگریزی پڑھانا شروع کر دیا ہے۔ زمرد نے بغدادی قاعدہ۔ قرآنِ پاک اور بہشتی زیور پڑھا تھا۔ قیصو بھائی نے انگریزی پڑھانے کی پیش کش کی تو خالہ جانی اور اپیا نے اسے فوراً قبول کر لیا۔ اور قیصو بھائی روز شام کو زمرد کو سی۔ اے۔ ٹی کیٹ۔ کیٹ معنی بلی۔ اور آر۔ اے۔ ٹی۔ ریٹ۔ ریٹ معنی چوہا پڑھانے

گئے۔ پہلے آدھ گھنٹہ روز۔ پھر پون گھنٹہ۔ پھر ایک گھنٹہ اور ہوتے ہوتے ڈیڑھ دو گھنٹے روز تعلیم دی۔ اور دی جانے لگی۔

امی جان کو جب اس مشغلے کا پتہ چلا تو انہوں نے کہا تو کچھ نہیں کیونکہ ہمارے گھر میں جوان لڑکوں کو بات بات پر ٹوکنا مناسب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ مگر میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ انہیں قیصو بھائی کی یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ سبب اسکا شاید یہ تھا کہ خالہ جانی ان کی توہین کر چکی تھیں۔

نہ معلوم یہ درس و تدریس کا سلسلہ کب تک جاری رہتا۔ اگر ایک دن میرے ہاتھ زمرد کی مشق کی کاپی نہ لگ جاتی۔ بات یہ ہوئی کہ میں نے ان دنوں نئی نئی سگریٹ نوشی شروع کی تھی۔ قیصو بھائی بھی سگریٹ پیتے تھے۔ مگر گھر کے بزرگوں سے چھپ کر۔ مجھے ان کا یہ راز معلوم تھا۔ لیکن انہوں نے خود مجھے یہ تاکید کی تھی کہ میں ہرگز ہرگز گھر میں کسی سے ان کی سگریٹ نوشی کا تذکرہ نہ کروں۔ مگر انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ میں نے بھی ان کی تقلید شروع کر دی ہے۔ قیصو بھائی ان دنوں چھت والے کمرے میں رہتے تھے۔ یہ کمرہ کچھ اس قسم کا تھا جیسا کہ خالہ جانی کا چھت والا کمرہ تھا۔ دونوں چھتوں کے درمیان ایک دیوار حائل تھی جس میں ایک کھڑکی لگی ہوئی تھی۔ جس میں سے گذر کر خالہ جانی کے گھر سے ہمارے گھر اور ہمارے گھر سے خالہ جانی کے گھر آنا جانا ہوا کرتا تھا۔

میں بات سگریٹ کی کر رہا تھا۔ چونکہ میں چوری چھپے یہ فعل کیا کرتا تھا اس لئے اچھی سگریٹیں پینے سے قاصر تھا۔ کیونکہ ہمارے چھوٹے سے قصبے میں صرف دو دکانیں ایسی تھیں جہاں اچھی سگریٹیں ملا کرتی تھیں ان دونوں دکانوں سے ہمارے ہاں سامان آیا کرتا تھا۔ اس لئے خطرہ تھا کہ اگر وہاں سے سگریٹیں خریدوں گا تو گھر والوں کو پتہ چل جائے گا۔ لہذا پان بیڑی کی دکانوں سے پاسنگ شو اور قینچی مارکہ سگریٹیں خریدنا پڑتی تھیں۔ لیکن جب سے قیصو بھائی کالج سے لوٹے تھے۔ یہ سنا کچھ کچھ حل ہو گیا تھا۔ وہ "بلیک اینڈ وائٹ" پیا کرتے تھے۔ اور میں ان کی دراز میں رکھے ہوئے ڈبے میں سے ہر روز دو تین سگریٹیں چرا لیا کرتا تھا۔

ایک دن میں نے دراز کھولی تو ڈبہ غائب تھا۔ شاید ختم ہو گیا تھا۔ یا شاید قیصو بھائی اسے اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مگر میں سمجھا کہیں ادھر ادھر ہو گیا ہوگا۔ اس لئے میں نے ساری دراز کو کھنگال ڈالا۔ ڈبہ تو کیا خاک ملتا۔ ہاں زمرد کی کاپی ہاتھ لگ گئی۔ پہلے ہی صفحے پر قیصو بھائی کے دستخطوں میں لکھا ہوا تھا "آئی لو یو" ( I LOVE YOU ) اور اس کے نیچے زمرد نے کوئی دس مرتبہ اس عبارت کی نقل کی تھی۔

میں یہ کاپی لے کر سیدھا امی جان کے پاس گیا۔ پہلے صفحے پر لکھی ہوئی عبارت پڑھ کر امی جان کا رنگ سرخ ہو گیا۔ لیکن قیصو بھائی کی شان میں کچھ کہنے کے بجائے وہ مجھے ڈانٹنے لگیں۔ ——— "تو کیوں ہر ایک کی چیزیں کنگھولتا پھرتا ہے؟ تو کیوں گھستا ہے اس کے کمرے میں؟ تو نے کیوں لی اس کی دراز کی تلاشی؟"

میں دبے پاؤں قیصو بھائی کے کمرے میں واپس گیا اور زمرد کی کاپی وہیں رکھ دی جہاں سے نکالی تھی۔ مگر میرے منہ کو خون لگ چکا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے روز موقع پاکر قیصو بھائی کی دو تین سگرٹیں پار کر دیتا اور ساتھ ساتھ زمرد کی کاپی پر ایک نظر ڈال لیتا۔

ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ اندر کے ایک صفحے پر زمرد نے لکھ رکھا ہے "کل آپ نے مجھے پیار کیوں کیا کوئی دیکھ لیتا تو ______"

میں پھر بھاگتا ہوا امی جان کے پاس پہنچا اور ڈرتے ڈرتے انہیں بتایا کہ آج میں نے زمرد کی کاپی میں ایک ایسی بات پڑھی کہ . . . . .

"کہ کیا ؟"

"مجھے شرم آتی ہے بتاتے !" حالانکہ شرم درم خاک نہیں آرہی تھی۔

"کہاں ہے کاپی ؟"

"قیصو بھائی کے کمرے میں۔ ان کی دراز میں"

امی جان کچھ کاڑھ رہی تھیں۔ وہ کڑھائی چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور چلیں زینے کی طرف۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تھا۔ کمرے میں پہنچ کر انھوں نے دراز کھولی۔ کاپی نکالی اور مجھ سے پوچھا "کہاں ہے ؟"

میں نے آگے بڑھ کر ورق الٹے اور زمرد کی لکھی ہوئی عبارت ان کی نظروں کے سامنے لاکر رفوچکر ہو گیا۔

پتہ نہیں عبارت پڑھ کر امی جان کا کیا حال ہوا۔ مگر اسی رات بند کمرے میں امی ابان۔ ابا جان۔ نانی اور قیصو بھائی کے درمیان ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ میں صحن میں لیٹا ہوا تھا۔ بڑی دیر تک آوازیں آتی رہیں۔ مگر سمجھ میں خاک نہیں آیا۔

دوسرے دن امی جان چھت والی کھڑکی میں سے گذر کر خالہ جانی کے ہاں گئیں۔ میں اس وقت اسکول میں تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ معاملہ بہت سنگین ہو گیا تھا۔ قیصو بھائی نے رات کی کانفرنس میں کھلم کھلا اظہارِ عشق کر دیا تھا اور امی جان اور نانی کے سمجھانے کے باوجود اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے تھے۔ امی جان کو اپنی عزت پیاری تھی۔ اور قیصو بھائی کو زمرد۔ معاملہ ابا جان نے بیٹے کے حق میں طے کیا اور فیصلہ ہوا کہ جھوٹی عزت کو بالائے طاق رکھ کر امی جان دوسرے دن خالہ جانی کے ہاں جائیں اور دیکھیں کہ خالہ جانی کا لندن میں ڈاکٹری پڑھنے والا داماد ابھی تک سہرا بنا ہوا ہے کہ نہیں۔

ڈاکٹر سہرا تو بنا ہوا تھا مگر امی جان خالہ جانی کی بہن تھیں اور وہ بھی اکلوتی۔ ان پر اور ان کے بیٹے پر

سے سو ڈپٹی کلکٹر اور ہزار کلکٹر قربان۔

توپھر پہلی مرتبہ جب امی جان نے دامن پھیلایا تھا تو خالہ جانی نے انکار کیوں کر دیا تھا؟

امی جان اور نانی کے درمیان گفتگو اس مرحلے پر پہنچ چکی تھی جب میں اسکول سے لوٹا۔ سوال نانی نے کیا تھا۔ وہ پوچھ رہی تھیں: "اس وقت کون سے کیڑے پڑ گئے تھے اپنے قیصو میں؟

امی جان جو نانی کو رپورٹ پیش کر رہی تھیں بولیں ــــــــ "فرمانے لگیں کہ اس طرح بات پکی کر لینا ٹھیک نہیں ہوتا۔ اپنے تین کا زمانہ تھوڑی ہے کہ جہاں باوا اماں نے ہنکال دیا وہیں چلے گئے۔ آج کل تو لڑکے لڑکی مرضی ضروری ہوتی ہے۔ اور خالی مرضی ہی نہیں۔ کورٹ شپ بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ ایک دوسرے کو جانچ لیں، دیکھ بھال لیں"

نانی نے پوچھا: "یہ موئی کورشپ کیا بلا ہوتی ہے؟"

امی جان بولیں: "کورشپ نہیں۔ کورٹ شپ۔ لڑکے لڑکی کا آپس میں ملنا"

"جھاڑو پھرے اس کی صورت پر۔ فرنگیوں کے طور طریقے نبھانے چلی ہے۔ ایک کا کورشپ کر کے دیکھ چکی ہے۔ اب دوسری کی زندگی خراب کرنے پر تلی ہے"

"اور نہیں تو کیا۔ میرے جی میں تو آئی کہ لے جا کر دکھا دوں انہیں ان کی لونڈیا کی کاپی تاکہ پتہ چل جائے کہ کیسی کورٹ شپ کر رہی ہیں ان کی صاحب زادی"

جملہ ختم کرتے ہوئے امی جان نے پاندان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو ان کی نظر مجھ پر پڑی اور گویا انہیں پہلی مرتبہ میری موجودگی کا احساس ہوا: "تو منہ اٹھا کر گھس جایا کر ہر جگہ لڑکیوں کی طرح"

بات پکی ہو چکی تھی مگر تاریخ وغیرہ کا سوال ابھی تک نہیں اٹھایا گیا تھا۔ کیونکہ پہلے قیصو بھائی کو ملازمت تلاش کرنا تھی۔ گھر والے اس کے خلاف تھے کہ قبل اس کے کہ لڑکا اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے اس کی شادی کر دی جائے۔ اس لئے قیصو بھائی نے ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنا شروع کئے۔ اور اس سلسلے میں دو تین ماہ بعد ان کا ناگپور سے بلاوا آ گیا جہاں ہمارے چچا جان ڈپٹی کلکٹری کے ممتاز عہدے پر فائز تھے۔ لڑائی کا زمانہ تھا۔ نوکریوں کی افراط تھی۔ انہوں نے قیصو بھائی کو بذریعہ خط یقین دلایا کہ وہ ناگپور آ جائیں تو ان کے لئے بہت جلد ایک اچھی سی ملازمت کا بندوبست کر دیا جائے گا۔

اس خط کے بعد جو خط چچا جان نے بھیجا اس نے ہمارے گھر میں تہلکہ مچا دیا۔ دونوں خطوط کے درمیان کوئی چھ سات مہینے کا فاصلہ تھا۔ اس عرصے میں قیصو بھائی کو ناگپور میں ملازمت مل چکی تھی۔ اور وہ چچا جان کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ ان کے خطوط آتے رہتے تھے ان میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی تھی۔ خیر خیریت۔ موسم کا حال اور

سب چھوٹوں بڑوں کی طرف سے سب چھوٹوں بڑوں کو سلام اور دعا لکھی ہوتی تھی۔ اچانک ان کے خطابت ہی مختصر ہونے لگے۔ ... ہوتے بالکل غائب ہو گئے۔ کوئی مہینے پھر وہ بالکل خاموش رہے۔ اور جو ناگپور سے خط آیا تو وہ چچا جان کا تھا۔ ... میں انھوں نے اپنے بھائی جان یعنی ہمارے والد صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کی لڑکی نزہت کو اپنی بہو بنا کر ان پر احسان کریں۔ دبے لفظوں میں انہوں نے یہ بھی لکھدیا تھا کہ لڑکے کو لڑکی پسند ہے۔

اس خط کی آمد پر کچھ دیر تو ہمارے گھر پر بڑی حیرت کا عالم طاری رہا۔ لیکن جلد ہی مسرت نے حیرت کی جگہ لے لی۔ امی جان اور نانی بہت مسرور تھیں کہ قیصو نے زمرد کے بارے میں اپنا ارادہ بدل دیا حالانکہ انھوں نے نزہت کو کئی سال سے نہیں دیکھا تھا۔ مگر انہیں یقین تھا کہ نزہت زمرد سے لاکھ درجے بہتر ہوگی۔ دونوں نے اپنی یادداشت پر زور ڈال کر نزہت کے باپ۔ ماں، نانا۔ نانی اور دیگر رشتے داروں کے ناک نقشوں اور رنگ روغن کو یاد کیا۔ اور نتیجہ نکالا کہ جوان ہو کر نزہت ضرور بڑی پیاری سی لڑکی نکلی ہوگی۔ اور اس میں تو کسی کو شبہ ہی نہیں تھا کہ وہ بڑی سگھڑ۔ بڑی سلیقہ شعار ہوگی کیونکہ گھرانا سگھڑ اور سلیقہ شعار تھا۔ ابا جان بھی خوش تھے کہ ان کی بھتیجی ان کی بہو بنے گی۔ مگر انہیں قیصو بھائی کی یہ تلون مزاجی بالکل پسند نہیں تھی کہ آج اس لڑکی کو دیکھا تو اس پر جان چھڑکنے لگے۔ اور کل اُس لڑکی کو دیکھا تو اُس پر فریفتہ ہو گئے۔

"یہ آثار اچھے نہیں۔" انھوں نے امی جان سے کہا۔

گھر بھر میں ایک میں تھا جسے قیصو بھائی کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ میں زمرد کے حق میں تھا۔ شاید سبب اس کا یہ تھا کہ اسے بچپن سے جانتا تھا اور نزہت کو میں نے صرف دو تین بار وہ بھی بہت عرصہ ہوا دیکھا تھا مگر میں نے اپنے غصے کا اظہار نہیں کیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ کوئی بھی اس کا نوٹس نہیں لیگا حالانکہ میں میٹرک پاس کر چکا تھا اور کالج جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

ابا جان نے اس بار ڈھیل دینا مناسب نہیں سمجھا اور فوراً امی جان کو لے کر ناگپور روانہ ہو گئے۔ جہاں منگنی کی رسم ادا کر کے وہ خوش خوش گھر واپس آ گئے۔ امی جان واپس آنے کے بعد کئی دن تک نزہت کے گن گاتی رہیں ——— کالج جاتی ہے۔ بیڈمنٹن کھیلتی ہے۔ گھر کا کام کاج بھی جانتی ہے۔ چندے آفتاب ہے۔ چندے مہتاب ہے۔ حالانکہ ناک ذرا چھوٹی ہے۔ تندرست ہے۔ اسے اختلاج کا دورہ نہیں پڑتا۔ گانا بھی آتا ہے۔ بڑی ہنس مکھ ہے۔ وغیرہم۔

پھر ایک دن وہ خالہ جانی کے ہاں گئیں۔ اور انہیں مطلع کر آئیں کہ "بہن لڑکے نے ارادہ بدل دیا میں کیا کروں۔ یہ آج کل کے لڑکے . . . ."

خالہ جانی نے جواب دیا "میں تو تمہارے کہنے سے راضی ہو گئی تھی ورنہ زمرد کے لئے لڑکوں کی کیا کمی۔ وہ لڑکا جو لندن میں ڈاکٹری پڑھ ....."

اس کے بعد میں کالج چلا گیا اور چھ سال تک وطن سے دور رہا۔ کبھی کبھار جب گھر آتا تو خالہ جانی اور زمرد سے ملاقات ہوتی۔ مگر ایسے مواقع بہت کم میسر آتے۔ کیونکہ چھٹیاں زیادہ تر سیر و تفریح میں گذر جاتیں۔ علاوہ ازیں مجھے کالج میں داخل ہوئے ابھی بمشکل دو سال گذرے تھے کہ ماموں کا انتقال ہو گیا۔ اور خالہ جانی مع زمرد کے اپنے لڑکے کے پاس چلی گئیں۔ ماموں کے انتقال کے بعد میں خالہ جانی سے صرف ایک بار مل سکا۔ بڑے دن کی چھٹیوں میں گھر آیا۔ ماموں کے انتقال کو شاید ڈیڑھ دو مہینے ہوئے تھے۔ خالہ جانی سفر کی تیاریاں کر رہی تھیں میں پرسے کے لئے ان کے گھر گیا۔ بڑے پیار سے پیش آئیں۔ مجھے سینے سے لگایا۔ پھر اچھی طرح سے میرا جائزہ لیا۔ اور میری تعریفیں کرنے لگیں۔ "کیسا خوب صورت جوان نکلا ہے میرا لال تو شیروانی مت پہنا کر۔ تجھ پر سوٹ بڑا بھلا لگتا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ میں بہت دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ اس دور دراز مقام پر جانے کے خیال سے خوش تھیں۔ جہاں ان کا لڑکا مقیم تھا۔ وطن کی آب و ہوا انہیں راس نہیں آتی تھی۔ اختلاج کی شکایت بڑھ گئی تھی۔ ٹانگوں میں مسلسل درد رہنے لگا تھا۔ زمرد کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی تھی۔ میں نے پاس بیٹھی ہوئی زمرد کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ضرور نظر آ رہے تھے مگر ویسے وہ اچھی بھلی لگ رہی تھی۔

خالہ جانی باتیں کرتی رہیں۔ اور میں سوچتا رہا کہ ماموں مرحوم کا ذکر آئے تو میں دو چار جملے افسوس اور غم کے کہوں۔ مگر اس گھنٹے دو گھنٹے کی گفتگو میں ان کا نام ایک بار بھی خالہ جانی کے منہ سے نہیں نکلا اس لئے مجھے وہ دو چار جملے کہے بغیر ان کے ہاں سے واپس آنا پڑا۔ چلتے وقت میں نے ایک نظر مکان پر ڈالی اور مجھے پتہ چل گیا کہ کیوں خالہ جانی نے ماموں کا ذکر نہیں کیا۔ جب وہ حیات تھے تب بھی ان کی موجودگی کا احساس اس گھر میں بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ اور اب جب وہ اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کی غیر موجودگی کا احساس کرنا اور بھی مشکل تھا۔

اس ملاقات کے بعد میں خالہ جانی سے تب ملا جب تعلیم سے فراغت حاصل کر کے بیکار دنوں اور بے کار راتوں کے چکر میں گھرا ہوا تھا۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ میں امتحان کے نتیجے کے انتظار میں دن دن بھر گھر میں پڑا رہتا تھا۔ اب اس چھوٹے سے قصبے میں دل نہیں لگتا تھا۔ پرانی دوستیاں یا تو ختم ہو چکی تھیں یا دم توڑ رہی تھیں۔ نئی دوستیاں۔ کالج کی دوستیاں۔ دور دور بکھری تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وقت کیسے گذارا جائے۔

اس اکتاہٹ کے عالم میں خالہ جانی اور زمرد کا اچانک ورود بڑا خوش آیند تھا۔ انہیں دیکھتے ہی دل کو

ایک طرح کا سہارا مل گیا۔ اور یہ یقین ہو گیا کہ چلو کچھ دن اچھے گذر جائیں گے۔ خالہ جانی میں ہم لوگوں کے لئے بچپن سے ایک قسم کی کشش تھی۔ وہ جس طرح کی باتیں کرتی تھیں اس قسم کی باتیں ہمارے گھر میں نہیں ہوتی تھیں۔ اس لئے اپنا گھر ان کے گھر کے مقابلے میں مجھے ہمیشہ پھیکا پھیکا سا لگا کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان سے گفتگو کرتے وقت ابا جان بھی کچھ کھل سے جایا کرتے تھے۔ ان دونوں میں خوب ہنسی مذاق ہوتا تھا۔ شاید اس لئے کہ رشتہ اس کا تقاضا کرتا تھا۔

ان کے اچانک آنے سے گھر کا ماحول بدل گیا۔ کم از کم میرے لئے۔ ان کی باتیں جنہیں تائی "مجھے دار" کہا کرتی تھیں۔ ان کے قصے۔ ان کے چٹکلے۔ ان کے لطیفے میری دلچسپی کا سامان بن گئے۔ اور وہ اکتاہٹ جو گھر دبوچے رہتی تھی چاروں شانے چت گر پڑی۔

خالہ جانی کی آمد کا مقصد کچھ کچھ کاروباری تھا۔ یعنی وہ اپنے مکان کی دیکھ بھال کرنے اور اسکی مرمت کرانے آئی تھیں۔ یہ امی جان کی رائے تھی مگر خالہ جانی کا کہنا تھا کہ ایسا محسوس ہو گیا تھا انہیں اپنی بہن سے ملے اس لئے چلی آئیں حالانکہ جیسا کہ واقعات نے ثابت کیا دونوں قول غلط تھے۔

چونکہ ان کے مکان میں اب کرایہ دار رہتا تھا اس لئے خالہ جانی اور زمرد نے ہمارے گھر قیام کیا۔ ابھی دو دن مجھے سخت بخار آیا۔ کئی دن بستر پر پڑا رہا۔ کوئی ہفتے بھر پنڈا اپھنکتا رہا۔ گھر کے سب لوگوں نے تیمارداری کی مگر امی جان کے علاوہ اس تیمارداری میں خالہ جانی پیش پیش رہیں۔ کبھی سر دباتیں۔ کبھی جب بخار تیز ہوتا تو تولئے سے ہتھیلیاں اور تلوے سہلاتیں۔ رات کو بارہ بارہ ایک ایک بجے تک میری پٹی سے لگی بیٹھی رہتیں۔

ایک دن شام کو جب بخار ٹوٹ چکا تو میرا پلنگ صحن میں بچھا دیا گیا۔ اس وقت صرف خالہ جانی میرے پاس تھیں۔ وہ میرا سر دبا رہی تھیں۔ اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہی تھیں۔ انکا ایک ہاتھ نہ جانے کیسے میرے ہاتھ میں آگیا اس ہاتھ کی ایک انگلی میں وہ سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھیں میں یونہی بلاوجہ اس انگوٹھی کو کچھ دیر دیکھتا رہا اور پھر اس بچینی کے عالم میں جو شدید بیماری اکثر انسانوں میں پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے خالہ جانی سے کہہ دیا کہ وہ مجھے بھی ایک ایسی ہی انگوٹھی بنوا دیں۔ عجیب بیہودہ سی فرمائش تھی۔ کیونکہ اول تو مجھے انگوٹھی پہننے کا شوق نہیں تھا اور اگر شوق چرایا بھی تھا تو گھر والوں سے کہنا چاہئے تھا نہ کہ خالہ جانی سے جن کے لئے سونے کی انگوٹھی خریدنا ایک بڑے مالی مسئلے سے ہرگز کم نہ تھا۔ مگر انہوں نے خوش ہو کر فوراً مجھے یقین دلایا کہ جیونہی میں بالکل اچھا ہو جاؤں گا وہ ایک عمدہ سونے کی اچھی سی انگوٹھی میری نذر کریں گی۔

بات آئی گئی ہو گئی۔ میرا مطلب ہے جہاں تک میرا تعلق تھا بات آئی گئی ہو گئی۔ دو چار دن بعد میں بالکل اچھا ہو گیا اور چلنے پھرنے لگا۔ اور یہ بالکل بھول گیا کہ میں نے خالہ جانی سے سونے کی انگوٹھی کی فرمائش

کی تھی۔

لیکن وہ نہیں بھولی تھیں۔ ایک رات جب میں ٹہل کر گھر لوٹا تو کہنے لگیں: "بیٹا میرا ایک کام کر دوگے؟"

میں نے کہا: "ضرور۔ فرمائیے؟"

بولیں: "تمہاری اپیا کا خط آیا ہے۔ وہ یہاں آنا چاہتی ہیں۔ تمہارے دولہا بھائی کو چھٹی نہیں مل سکتی۔ تم جاکر انہیں لے آؤ گے؟"

میں نے کہا: "کیوں نہیں؟"

میں دوسرے دن بریلی روانہ ہوگیا اور چوتھے روز مع اپیا کے گھر واپس آگیا۔ گھر آیا تو معلوم ہوا کہ کنیز جو پاس کے قصبے میں رہتی تھیں۔ پہلے ہی سے موجود ہیں۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ خالہ جانی ان سب لوگوں کو کیوں جمع کر رہی ہیں۔ مگر یہ سوچ کر چپ ہوگیا کہ خالہ جانی اتنے سال بعد وطن آئی ہیں اس لئے اپنی بچیوں سے ملے بغیر کیسے واپس جا سکتی ہیں۔

مگر میرا خیال غلط نکلا۔ بہت غلط نکلا۔ اور اس غلطی کا پتہ جب چلا جب ایک رات امی جان نے مجھے الگ بلا کر بے انتہا سنجیدگی سے پوچھا: "میاں بیٹے (وہ مجھے اس عجیب وغریب، مرکب نام سے پکارا کرتی تھیں) کیا تمہارا خیال زمرد سے شادی کرنے کا ہے؟"

انگریزی میں ایک محاورہ ہے جس کے معنی کچھ کچھ یہ ہیں کہ آپ کا سر چھت سے جا ٹکرایا۔ پتہ نہیں اس میں کتنا ابلاغ ہے۔ مگر سچ مانیئے اگر اس کمرے کی چھت نیچی ہوتی جس میں امی جان نے مجھ سے یہ انتہائی سنجیدہ سوال کیا تھا تو میرا سر یقیناً اس سے ٹکرا جاتا۔ جوانی میں انسان کیا کچھ نہیں سوچتا اور کیسے کیسے برے اور گناہ سے خواب نہیں دیکھتا۔ مگر یقین جانئے میرے ان خیالات اور ان خوابوں پر زمرد کی پرچھائیں تک نہیں پڑی تھی۔ اس آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امی جان کے سوال کا مجھ پر کیا اثر ہوا ہوگا۔

مگر میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بناوٹی لاپرواہی سے جواب دیا: "نہیں تو؟"

"مگر تمہاری خالہ جانی تو فرماتی ہیں کہ تم نے خود ان سے کہا ہے؟"

"میں نے؟"

"ہاں۔ تم نے۔ انہوں نے تو مجھے یہی بتایا۔"

"یہ تو سراسر جھوٹ ہے۔ میں نے ان سے کبھی ایسی کوئی بات کی ہی نہیں۔"

"مگر وہ تو کہہ رہی تھیں کہ تم نے ان سے کہا تھا کہ وہ تمہیں ایک سونے کی انگوٹھی بنوا دیں۔"

میں جھنکتے میں آگیا۔

"میں نے کہا تو تھا۔ مگر. . . . . "

"مگر کیا خاک۔ انہوں نے اس کا مطلب یہ نکالا کہ تم زمرد سے بیاہ کرنا چاہتے ہو اور منگنی کی انگوٹھی مانگ رہے ہو۔"

"مگر میں نے تو یونہی کہہ دیا تھا۔"

"یونہی کہہ دیا تھا! ——— تمہیں اگر انگوٹھی پہننے کا ایسا ہی شوق تھا تو مجھ سے کہا ہوتا۔"

"مگر امی جان میں کہہ جو رہا ہوں کہ میں نے یونہی کہہ دیا تھا۔ اور پھر یہ انگوٹھی مانگ کر شادی کی بات کرنا کس ملک کا رواج ہے۔"

"میں کیا جانوں۔ پر تمہاری خالہ جانی فرماتی ہیں کہ انگریزوں میں یہی رواج ہے۔"

میرے جی میں آیا کہ دوڑا ہوا خالہ جانی کے پاس جاؤں اور جاتے ہی ان سے لڑ پڑوں۔ مگر پیر ہلے تک نہیں۔

"جہاں تک مجھے پتہ ہے انگریزوں میں ایسا کوئی رواج نہیں۔"

"نہ ہو گا۔ مگر وہ تو یہی مطلب نکال کر بیٹھ گئی ہیں انہوں نے مجھے کہہ دیا کہ لڑکا تیار ہے۔ اسی واسطے انہوں نے اپنی لڑکیوں کو بھی بلا کر اکٹھا کر لیا ہے۔"

"میں تو بالکل تیار نہیں۔ اور نہ کبھی ہوں گا۔"

امی جان کا چہرہ قدرے کھلا۔

"تو میں جا کر کہہ دوں ان سے۔"

"فوراً۔"

دوسرے دن سارے گھر پر سناٹا سا چھایا رہا۔ تیسرے دن خالہ جانی اور ان کی لڑکیوں کے بستر بندھنے لگے اور چوتھے دن چاروں مسافر اپنی اپنی منزلوں کو روانہ ہو گئے۔ پانچویں دن "خالہ" نے جو تھیں تو ملازمہ مگر جن کا رتبہ گھر والوں جیسا تھا بتایا کہ خالہ جانی روانہ ہونے سے قبل انہیں یہ اطلاع دے گئیں کہ "میاں بیٹے سے زمرد کی شادی اس لئے طے نہ ہو سکی۔ کہ میاں بیٹے کی صحت اچھی نہیں رہتی۔"

اس انگوٹھی والے واقعے کے چند ماہ بعد پاکستان بن گیا۔ نانی مرحوم ہو چکی تھیں۔ پھوپھو جانی ناگپور میں تھے۔ اور ابا جان کو وطن عزیز تھا۔ باقی سب لوگ لاہور چلے گئے۔

ایک دن نسبت روڈ پر چلا جا رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک دوکان میں جس پر بدیسی شرابوں کے بہت سے چھوٹے بڑے سائن بورڈ لگے ہوئے تھے خالہ جانی کے لڑکے جن کا نام سردار تھا بیٹھے ہوئے ہیں۔ مگر غلطے کے مضمون اور ملاقے میں بہت فرق نکلا۔ یہ دوکان کبھی شراب کی رہی ہو گی لیکن جیسے سردار بھائی نے اس پر قبضہ جمایا تھا شراب

کی بوتلوں کی جگہ کریم۔ صابن۔ پاؤڈر۔ تیل۔ سینٹ۔ موزہ۔ بنیان۔ انڈرویر۔ تولیہ۔ تاش وغیرہ سے لے لی تھی۔

سردار بھائی کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ وہ زمانہ ہی کچھ ایسا تھا کہ پردیس میں جو اب اپنا وطن بن گیا تھا کوئی بھی دوست یا عزیز مل جاتا تو بڑی خوشی ہوتی۔ تھوڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھا۔ ان کی ہجرت کی داستان سنی۔ اپنی سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ خالہ جانی مع زمرد کے ملتان میں اپیا کے پاس ہیں —— یعنی اپیا اور طاہر صاحب بھی انتقال کر کے پاکستان تشریف لے آئے! —— انہوں نے بتایا کہ تقسیم سے کچھ روز قبل خالہ جانی اور زمرد اپیا کے پاس بریلی گئی تھیں۔

پاکستان بنا تو سردار بھائی کو نیچے اپنی اہلیہ۔ لڑکا اور لڑکی کے سر پہ پیر رکھ کر بھاگنا پڑا۔ ان کی روانگی کے چند ہفتوں بعد طاہر صاحب اور اپیا کو بھی بھاگنا پڑا۔ اور ان کے ساتھ خالہ جانی اور زمرد بھی وارد پاکستان ہوئیں۔ جس کا جدھر منہ اٹھا نکل گیا۔ سردار بھائی نے لاہور میں ڈیرا جمایا اور اپیا اور طاہر صاحب نے ملتان میں۔

ایک دن سردار بھائی اور ان کی بیوی ہمارے ہاں آئے تو انہوں نے خبر سنائی کہ خالہ جانی اور زمرد ملتان سے لاہور آگئی ہیں۔ اور ان کے ساتھ مقیم ہیں۔ سردار بھائی تو تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے گئے۔ مگر ان کی بیوی جنہیں ہم لوگ بھابی کہتے تھے۔ دن بھر ہمارے ہاں رہیں۔ نئے ملک کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور پرانے قصے دہرائے جاتے رہے۔ یہ ناممکن تھا کہ پرانے قصے دہرائے جائیں اور خالہ جانی کا ذکر نہ آئے خاص طور سے جبکہ دہرانے والیاں امی جان اور بھابی ہوں۔ آخرالامر کرنے بتایا کہ تقسیم سے پہلے خالہ جانی سردار بھائی سے ناراض ہو کر اپیا کے پاس چلی گئی تھیں کیونکہ انہیں شکایت تھی کہ ان کا لڑکا ان کا اور زمرد کا خیال نہیں رکھتا۔ انہیں یہ بھی شکایت تھی کہ ان کی بہو ان کی عزت نہیں کرتی۔ اور یہ بھی کہ وہ زمرد کی ضروریات کی چیزیں مثلاً کریم۔ پاؤڈر منگا کر نہیں دیتی۔

"اب آپ ہی بتائیں امی جان" —— بھابی بھی ہماری والدہ کو امی جان ہی کہتی تھیں "کون مانے گا ان کی بات۔ جس بیٹے نے ساری عمر انہیں خرچ بھیجا اس سے یہ شکایت کہ خیال نہیں رکھتا! —— اور میں نے تو ان سے کبھی بھلا کر بھی بات نہیں کی۔ جتنا میں نے ان کا خیال رکھا اتنا تو ان کے لڑکے نے بھی نہ رکھا ہوگا۔ رہ گئی زمرد کی بات تو آپ ہی بتائیں کہ اتنی روکر ہم کہاں سے لائیں کہ اس کے تیل پھلیل کا خرچ برداشت کریں۔ ہر مہینے ریشمی جوڑا بنوا کر دیں۔ جتنی چادر اتنے پیر پھیلانا چاہیے۔ اور پھر ہمارے سامنے اپنی اولاد بھی تو ہے۔ کتنی دفعہ کہا کہ لڑکی کے فرض سے فارغ ہو جائیے۔ مگر انہیں تو کوئی لڑکا پسند ہی نہیں آتا۔ خوب صورت ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔ اچھی آمدنی ہو۔ لڑکی کی عمر نکلی جا رہی ہے اور ان کی شرطیں ہیں کہ ٹس سے مس

نہیں ہوتیں۔"

امی جان کی طرف سے سوال کیا گیا کہ ملتان سے کیوں آ گئیں۔

جواب دینے سے پہلے بھابی نے ایک نظر چاروں طرف ڈالی اور پھر رازدارانہ انداز میں یوں گویا ہوئیں۔

"جھوٹ سچ تو خدا بہتر جانتا ہے۔ منے کے ابا بھی اس معاملے میں مجھ سے ڈھکی چھپی رکھتے ہیں۔ مگر ایک دن ان بیٹے میں کچھ کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ میرے کان میں بھی کچھ بھنک پڑ گئی۔"

اس مرحلے پر پہنچ کر ان کی آواز بہت مدھم ہو گئی۔ "مجھے تو ایسا معلوم پڑتا ہے کہ طاہر صاحب کی وجہ سے بھاگیں ملتان سے۔ اس آدمی کی عادتیں اچھی نہیں۔ اور جوان سالی کا ساتھ۔ خیریت اسی میں جانی ہو گی کہ بھاگ لیں وہاں سے۔ ویسے جھوٹ سچ خدا بہتر جانتا ہے۔"

جب تک خالہ جانی سردار بھائی کے پاس رہیں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ کبھی ہم لوگ ان کے ہاں جاتے اور کبھی وہ ہمارے گھر آتیں۔ موٹی زیادہ ہو گئی تھیں۔ بینائی کمزور ہو چلی تھی۔ جوڑوں میں درد رہنے لگا تھا۔ بجز اس کے وہی خالہ جانی تھیں کہ جو ہمیشہ رہیں۔ وہی لطیفے بازی۔ وہی ایک آنکھ جھپکانا۔ وہی مزے دار باتیں۔ وہی پان سے بھرا ہوا کلا۔ وہی گھومتی پھرتی آنکھیں ——— زمرد میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ پہلے سے کچھ دُبلی ہو گئی تھی۔ اور آنکھوں کے گرد چھوٹے چھوٹے سیاہ حلقے پڑ گئے تھے جن سے بقول خالہ جانی اس کے چہرے کی کشش میں اضافہ ہو گیا تھا۔

ایک دن میں دفتر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرا کمرہ مجھ سے چھین لیا گیا ہے اور میرا سامان ایک دوسرے کمرے میں لگا دیا گیا ہے۔ قبل اس کے کہ میں اس تبدیلی کی وجہ دریافت کروں امی جان نے مجھے الگ لے جا کر بتایا کہ خالہ جانی مع زمرد کے ہمارے ہاں اٹھ آئی ہیں اور چونکہ میرا کمرہ الگ تھلگ ہے یعنی دوسری منزل پر ہے اس لئے انہیں یہ کمرہ الاٹ کر دیا گیا ہے۔

میں نے اس انتقال کا سبب دریافت کیا تو امی جان نے بتایا کہ خالہ جانی کی سردار بھائی سے لڑائی ہو گئی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بقول خالہ جانی کے ان کی بہو نے ان کے لڑکے سے ان کا جھگڑا کروا دیا۔ اور بات یہاں تک پہنچ گئی کہ انہوں نے اپنے بیٹے کے گھر میں ایک لمحہ ٹھہرنا بھی اپنی بے عزتی تصور کیا۔ اس لئے وہ اور زمرد اپنا بستر بوریا باندھ کر ہمارے ہاں براجمان ہو گئیں۔ ہوا یہ تھا کہ سردار بھائی نے جو عرصے سے زمرد کے رشتے کی تلاش میں تھے ایک لڑکا ڈھونڈھ نکالا تھا۔ جو ان کی اور ان کی بیوی کی نظر میں ہر لحاظ سے زمرد کے لئے موزوں تھا۔ مگر خالہ جانی کی نظر میں وہ کسی لحاظ سے بھی زمرد کا مستحق نہیں تھا۔ سردار بھائی کا خیال تھا کہ لڑکا چونکہ رنڈوا ہے اس لئے زمرد کا بہت خیال کرے گا۔ اور ان کی بیوی کی رائے بھی کہ ویسے بھی اس عمر میں زمرد کو کوئی بہت اچھا

بخت ملنے سے رہا۔ اس لئے رشتہ منظور کر لینا چاہئے۔ رنڈوا تھا تو کیا ہوا۔ اکیلا تھا۔ اور سب سے خوبی کی بات یہ تھی کہ پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہیں تھی۔ آمدنی بھی معقول تھی۔ سرکاری دفتر میں ملازم تھا۔ مگر خالہ جانی اس بات پر ہرگز تیار نہ تھیں کہ ان کی لڑکی کی شادی ایک ایسے "مردوے سے ہو جو اپنی پہلی بیوی کو کھا چکا ہے" مزید یہ اس کی آمدنی بھی کم تھی۔ یعنی صرف دو سو روپے ماہوار۔ ان کی زمرد کی شادی کلرک سے ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ "ایسی چاند سی لڑکی اور ایسا لڑکا !" اور نہ جانے انہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکے کی ایک آنکھ میں کچھ عیب ہے جس کی وجہ سے انہوں نے اسے "کانے خاں" کا خطاب عطا کر دیا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ خوب تو تو میں میں ہوئی۔ سردار بھائی اور ان کی بیوی نے ان تمام لڑکوں کی فہرست گنا کر رکھ دی جو زمرد کے لئے تلاش کئے گئے تھے۔ اور جنہیں خالہ جانی نے رد کر دیا تھا۔ اور خالہ جانی نے وہ تمام عیوب گنا ڈالے جن کی بنا پر وہ لڑکے رد کئے گئے تھے۔ معاملہ جب یہاں تک پہنچ گیا تو لامحالہ اور باتوں کا ذکر بھی آیا۔ "جوان لڑکی"۔ "پرایا دھن"۔ "کون عمر بھر گھر بٹھا کر کھلاتا ہے"۔ قسم کے دلائل پیش کئے گئے۔ مگر خالہ جانی اپنی "مینا مکھی نہیں نگلی جاتی" اور "جب تک میں زندہ ہوں زمرد کو جہنم میں نہیں ڈھکیلا جا سکتا" پر اڑی رہیں۔ اسباب و دلائل کی جگہ تلخی نے لے لی جو یہاں تک بڑھی کہ خالہ جانی نے گھر چھوڑنے کا الٹی میٹم دے دیا۔ ان کے بیٹے اور بہو نے طنزیہ پوچھا "جاؤ گی کہاں ؟" ان کا خیال تھا کہ آپا اور طاہر صاحب کے ہاں جانے سے رہیں کیونکہ وہاں سے ایک دفعہ بھاگ چکی ہیں۔ اور آپا اور طاہر صاحب کے علاوہ ان کا اس ملک میں اور کون ہے ؟ مگر خالہ جانی کو معلوم تھا کہ ان کا اس ملک میں اور کون ہے۔

"جاؤں گی کہاں۔ اپنی بہن کے ہاں۔ اور کہاں۔ تم لوگ سمجھتے ہو گے کہ پردیس میں میرا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ مگر ابھی میری بہن زندہ ہے۔ سگی نہ سہی مگر تم جیسے سگوں سے اچھی ہے"

اور گھر چھوڑتے وقت انھوں نے اعلان کر دیا کہ "مرتے مر جاؤں گی مگر اس چوکھٹ پر اب ہرگز قدم نہ رکھوں گی"

اس اعلان کا جواب بقول خالہ جانی کے ان کی بہو نے یہ دیا کہ "دیکھیں کب تک ٹکڑے تڑواتی ہیں آپ کی بہن۔ ایک نہ ایک دن یہیں لوٹ کر آنا پڑے گا۔"

سردار بھائی اور ان کی بیوی کا خیال ہو گا کہ اس وقت خالہ جانی غصے میں ہیں۔ جب غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو وہ واپس آ جائیں گی۔ ہم لوگوں کا بھی شروع شروع میں یہی خیال تھا کہ ماں بیٹے کی لڑائی ہے۔ کچھ وقت گذرا نہیں کہ ماں بیٹے پھر ایک ہو جائیں گے۔ اور ایک دن خالہ جانی مع زمرد کے پھر سردار بھائی کے ہاں واپس چلی جائیں گی۔ اگر یہ وہم نہ ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ امی جان خالہ جانی اور زمرد کی ذمہ داری لینے

سے کتراتیں۔

مگر یہ خیال غلط نکلا۔ کیونکہ جب چھ ماہ بعد میرا تہران تبادلہ ہوا تو خالہ جانی اور زمرد دونوں ہمارے گھر تھیں اور امی جان کو یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ ہرگز سردار بھائی کے پاس واپس نہیں جائیں گی۔ کیونکہ اس دوران میں سردار بھائی کئی بار انہیں واپس لیجانے کی کوشش کر چکے تھے مگر بے سود۔ اگر زمرد بیچ میں نہ ہوتی تو وہ ہرگز خالہ جانی کو اپنے ہاں رکھنے سے نہ گھبراتیں۔ لیکن زمرد کی وجہ سے انہیں خالہ جانی کی موجودگی بھی بوجھ لگتی تھی۔ حالانکہ منہ سے کچھ نہ کہتی تھیں کیونکہ بہن کا معاملہ تھا۔ سگی نہ سہی رشتے کی سہی۔ مگر تھیں تو بہن۔

میں تہران میں لگ بھگ سال بھر رہا۔ اس عرصے میں امی جان کے خطوں سے خالہ جانی اور زمرد کے حالات کا پتہ چلتا رہا۔ خالہ جانی کی صحت بہت خراب رہنے لگی تھی۔ کوئی خاص بیماری نہ تھی مگر ان پر کئی چھوٹی چھوٹی بیماریوں نے ایک ساتھ حملہ کر دیا تھا۔ نزلہ۔ زکام۔ کھانسی۔ بخار۔ جوڑوں کا درد۔ معدے کی خرابی وغیرہ وغیرہ۔ ان کی بینائی بھی کم ہو گئی تھی۔ چلنے پھرنے سے معذور تو نہیں ہوئی تھیں مگر بہت کم چلتی پھرتی تھیں۔ اور وہ بھی سہارا لے کر۔

زمرد کے بارے میں صرف اتنا پتہ چلا کہ بہت کمزور ہو گئی ہے اور اس کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی۔

سال بھر بعد میں چھٹی لے کر گھر پہنچا تو میرے ساتھ ایک ایرانی بیوی بھی تھی۔ گھر کے سب لوگ اس کے فوٹو دیکھ چکے تھے۔ مگر تصویروں سے کہاں تسلی ہوتی ہے۔ ہر ایک شخص چلتی پھرتی ہنستی بولتی جیتی جاگتی بہو یا بھابی کو دیکھنے کا مشتاق تھا۔ خالہ جانی بھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ گھر کے سب لوگوں نے میری پسند کو سراہا۔ خالہ جانی نے بھی۔ حالانکہ انہیں میری بیوی میں ایک سقم ضرور نظر آیا وہ یہ کہ اس میں نمک نہیں تھا جو اپنے طرف کی لڑکیوں میں ہوتا ہے۔

خالہ جانی ابھی تک اس کمرے میں مقیم تھیں جس میں کبھی میں رہتا تھا۔ مگر زمرد نیچے آ گئی تھی۔ اس کمرے میں جس میں میری چھوٹی بہن ثمینہ رہتی تھی۔ خالہ جانی کی بیماری کی وجہ سے انکے ساتھ ایک ہی کمرے میں رہنے سے تکلیف ہوتی تھی۔ اس لئے وہ نیچے آ گئی تھی۔

خالہ جانی کی تیمار داری زیادہ تر امی جان کرتی تھیں۔ اور کبھی کبھار گھر کے لڑکے اور لڑکیاں اور زمرد بھی اس نیک کام میں شامل ہو کر ثواب حاصل کر لیا کرتے تھے۔ خالہ جانی امی جان کے سلوک سے بہت خوش تھیں اور زمرد سے انہیں کوئی شکایت نہیں تھی۔ کیونکہ یہ اسکے کھیلنے کودنے کے دن تھے۔ وہ کیسے اپنا سارا وقت ایک بیمار کی تیمار داری میں صرف کر دیتی۔

خالہ جانی اب چلنے پھرنے سے قاصر ہو چکی تھیں۔ ہر دوسرے تیسرے روز انہیں بخار ہو جاتا تھا۔ کھانا ٹھیک سے

ہضم نہیں ہوتا تھا۔ ہر وقت کراہتی رہتی تھیں اور امی جان کو دعائیں دیا کرتی تھیں۔

مگر اس زمرد میں جس کا ذکر امی جان اپنے خطوط میں کرتی تھیں اور اس زمرد میں جسے میں نے تہران سے واپس آکر دیکھا بہت فرق تھا۔ وہ نہ تو کمزور تھی۔ نہ اس کی رنگت زرد تھی۔ اور نہ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ایک روز یونہی امی جان سے ذکر بھی کیا کہ زمرد کی صحت تو اب بہت اچھی ہے اور اب تو وہ بہت خوش اور چونچال نظر آتی ہے۔ مگر امی جان نے صرف "ہاں" کہہ کر مجھے ٹال دیا۔

زمرد کی ایک سہیلی گھر میں تھی اور ایک پڑوس میں۔ گھر کی سہیلی ثمینہ تھی اور پڑوس کی سہیلی کا نام نکہت تھا۔ کام کاج سے فارغ ہوئی تو ثمینہ کے کمرے میں گھس جاتی یا نکہت کے ہاں چلی جاتی۔ مگر جب سے میں آیا تھا وہ فرصت کا وقت زیادہ تر نکہت کے گھر گذارا کرتی تھی۔ نکہت کو اور اس کے گھر والوں کو ہم لوگ اچھی طرح سے جانتے تھے۔ گھر پر والدین کے ساتھ اکیلی رہتی تھی۔ اس کا ایک بھائی تھا جو سلسلۂ ملازمت کراچی میں مقیم تھا۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ شریف لوگ تھے۔ باعزت لوگ تھے۔ اس لئے ان سے میل جول بہت بڑھ گیا، یہاں تک کہ ان کا نوکر ہمارے کام کردیتا۔ اور ہمارے نوکر ان کا کام۔

جاڑوں کی گھپ اندھیری رات تھی۔ سارا گھر سو چکا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔

میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ نہ معلوم کتنی دیر سے ہو رہی تھی۔ میں نے لیمپ آن کیا اور دروازہ کھولنے سے پہلے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بج رہا تھا۔

امی جان اور ثمینہ دروازے پر کھڑی تھیں اور ان کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمودار تھے۔ امی جان اور ثمینہ اندر آئیں تو میری بیوی بھی جاگ گئی۔

میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

امی جان نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر بولیں: "ذرا میرے ساتھ آؤ میاں بیٹے"

میں ان کے ساتھ ہولیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر انھوں نے کہا "زمرد ابھی تک نہیں لوٹی!"

"نہیں لوٹی؟ کہاں سے نہیں لوٹی؟"

"نکہت کے ہاں سے"

"تو اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ دیر ہوگئی ہوگی"

"آج تک اتنی دیر کبھی نہیں ہوئی"

"شاید وہیں سو گئی ہوگی"

"یہ بھی آج تک اس نے کبھی نہیں کیا۔"

"تو مل کر دیکھے لیتے ہیں۔"

امی جان نے کہا "ثمینہ کو ساتھ لے جاؤ۔"

نکہت کا گھر ہمارے گھر سے چند قدم پر تھا۔ راستے میں ثمینہ نے بتایا کہ وہ پڑھتے پڑھتے بغیر لیمپ بجھائے سو گئی تھی۔ ذرا دیر ہوئی اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ زمرد کا بستر خالی ہے۔ وہ یہ سمجھ کر کہ زمرد نکہت کے گھر یا کسی اور کمرے میں ہوگی۔ لیمپ بجھا کر پھر سونے ہی والی تھی کہ اسے خیال آگیا کہ وقت تو دیکھے۔ گھڑی دیکھی تو پتہ چلا کہ ایک بجنے والا ہے۔ پھر تو اسے تشویش ہوئی اور اس نے جاکر امی جان کا دروازہ دھڑ دھڑایا۔

دس بارہ منٹ دستک دی تب کہیں نکہت کے گھر کا دروازہ کھلا۔ اور وہ بھی اس کے نوکر نے نہیں بلکہ اس کے والد نے کھولا۔

جب ہم لوگ ڈرائینگ روم میں پہنچ گئے تو میں نے دریافت کیا کہ زمرد تو نہیں ہے آپکے ہاں۔"

کہنے لگے نہیں مگر پھر بولے کہ نکہت سے اور پوچھ لیا جائے۔ شاید اس کے کمرے میں ہو یا شاید اسے پتہ ہو۔

نکہت کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی باہر آئی۔ مجھے اور ثمینہ کو اتنی رات گئے اپنے گھر میں دیکھ کر حیران ہوئی۔

اس کے والد نے پوچھا کہ زمرد تو نہیں اس کے ساتھ۔

وہ بولی "نہیں تو"

پھر انہوں نے پوچھا کہ اسے زمرد کی کچھ خیر خبر معلوم ہے۔"

وہ پھر بولی "نہیں تو۔ مگر کیوں؟ کیا ہوا؟"

ہم لوگ کوئی الٹا سیدھا جواب دے کر واپس آگئے۔ امی جان انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں بتایا کہ نہ تو زمرد نکہت کے ہاں ہے اور نہ ان لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ پتہ ہے۔

امی جان سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور بولیں "میرا تو اسی وقت ماتھا ٹھنکا تھا۔"

گھر میں اچانک دن ہوگیا سب لوگ جاگ پڑے۔ قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ پریشانی کے اظہار ہونے لگے۔ اتنے میں باہر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ہم لوگ سب دروازے کی طرف دوڑے مگر نکہت۔ اس کی والدہ اور اس کے والد کو دیکھ کر سخت مایوس ہوئے۔ وہ پوچھنے آئے تھے کہ آخر بات کیا ہے۔ زمرد کو کیا ہوگیا۔ یہ تو انہیں معلوم ہی ہو چکا تھا کہ زمرد گھر پر نہیں ہے۔ اس لئے ان سے کیا چھپاتے۔ پوری بات بتا دی جو کچھ پتہ

تھا انہیں بتانا پڑا۔
تب نکہت کے والد مجھے۔ نکہت کی والدہ امی جان کو، اور نکہت ثمینہ کو الگ الگ کمروں میں لے گئے۔
پانچ سات منٹ بعد ہم سب پھر اس کمرے میں جمع ہو گئے جس سے لے جائے گئے تھے۔ نکہت کے والد نے مجھے نکہت کی والدہ نے امی جان کو اور نکہت نے ثمینہ کو بتایا تھا کہ ——
ان کے خیال میں زمرد ان کے نوکر نادر کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔
میرے اور ثمینہ کے واپس آنے کے بعد انہوں نے نادر کی کوٹھری کا معائنہ کیا تو پتہ چلا کہ نہ صرف نادر غائب ہے بلکہ اس کا ٹرنک اور بستر بھی غائب ہے۔ ان کے شبہ کو تقویت نکہت کے اس بیان سے پہنچی کہ اس نے اکثر زمرد کو نادر کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تھا۔ ثمینہ نے نکہت کو بتایا کہ اسے بھی زمرد کا ایک نوکر کے ساتھ اس طرح بے تکلفی سے بات کرنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ امی جان نے نکہت کی والدہ سے کہا کہ مجھے تو وہ نادر کا بچہ شروع ہی سے آوارہ سا لگتا تھا اور میں نے نکہت کے والد سے کچھ نہیں کہا۔ مجھے شروع ہی سے نہیں یقین تھا۔ اتنے میں باورچی خانے کی گھنٹی بجنے شروع ہو گئی۔ جب سے خالہ جان کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی گھنٹی کا بٹن ان کے کمرے میں لگوا دیا گیا تھا۔ تاکہ وقت بے وقت اگر انہیں کسی چیز کی ضرورت ہو یا کسی کو بلانا ہو تو وہ گھنٹی بجا دیں۔ تھوڑی دیر بعد خانساماں دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ "بڑی بیگم صاحب بلا رہی ہیں۔"

امی جان نے پوچھا "کسے؟"

کہنے لگا "آپ کو۔"

امی جان نے میری طرف دیکھا اور میں نے ان کی طرف۔

میں نے کہا "آپ ہی جائیے۔"

کہنے لگیں "تم جاؤ۔"

میں "اچھا" کہہ کر چلنے لگا تو بولیں "ٹھہرو۔ کیا کہو گے؟"

میں نے کہا "کچھ بھی نہیں۔"

کہنے لگیں "کب تک چھپاؤ گے؟"

میں بغیر جواب دیئے باہر نکل گیا۔

خالہ جانی لیٹی ہوئی کراہ رہی تھیں۔ میرے قدموں کی آواز سنی تو بولیں "کون؟ میاں بیٹے؟"

میں نے کہا "جی۔"

کہنے لگیں: "یہ رتجگا کیوں ہو رہا ہے؟"

میں نے کہا: "رتجگا!"

کہنے لگیں: "یہ اس وقت باتوں کی آوازیں کیوں آ رہی ہیں —— چار بجے ہوں گے۔"

میں نے کہا: "نہیں۔ دو۔"

بولیں: "اتنی رات گئے جاگ کیوں پڑ گئی؟"

میرا ارادہ تھا کہ خالہ جانی سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ جو کچھ ہوا ہے انہیں صاف صاف بتا دوں گا۔ مگر نہ جانے کیوں جب وقت آیا تو میں گھبرا گیا۔ اور میں نے جھوٹ بول دیا: "محلے کی ایک لڑکی بھاگ گئی۔"

خالہ جانی کراہ رہی تھیں۔ ان کا کراہنا بند ہو گیا۔ انہوں نے آنکھیں کھولدیں اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ میں نے بڑھ کر مدد کی۔ تو مجھے پتہ چلا کہ ان کا جسم پھنک رہا ہے۔

"آپ کو تو بہت تیز بخار ہے۔"

"ہاں بیٹے۔ یہ کمبخت بخار پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ ہاں تو کون لڑکی بھاگ گئی؟"

میں اس سوال کے لئے یا تو تیار نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو پوری طرح سے نہیں۔ کیونکہ پہلا نام جو میرے ذہن میں آیا وہ نکہت کا تھا اور میں نے یہی نام خالہ جانی کو بتا دیا۔

نکہت کا نام سنکر ان کے چہرے پر اضطراب کی جھوٹ بہت واضح ہو گئی۔ انہوں نے بڑے پرمعنی انداز میں "اچھا" کہا اور پھر پوچھا "کس کے ساتھ؟"

پھر بغیر سوچے سمجھے میں نے کہہ دیا "اپنے نوکر کے ساتھ۔"

وہ سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"نادر کے ساتھ! سچ!"

میں نے کہا: "جی۔"

"لونڈیا کا دل آگیا ہو گا اس پر۔"

میں چپ رہا۔

"تھا تو نوکر مگر تھا بڑا بانکا جوان۔"

میں پھر چپ رہا۔

"اس کے باوا اماں آئے ہوں گے اسے ڈھونڈنے؟"

میں نے کہا: "جی۔"

"نہیں امی؟"

میں نے کہا "جی"

"چلو۔ مجھے نیچے لے چلو"

میں گھبرا گیا۔

"آپ کو بہت تیز بخار ہے۔ باہر بہت سردی ہے ایسے میں آپکو باہر نہیں نکلنا چاہئے"

وہ میری بات مان گئیں مگر انھوں نے مجھے روک لیا۔ اور پورے بیس منٹ تک مجھسے اس بھاگ جانے کے واقعے کی تفصیلات دریافت کرتی رہیں۔ کراہتی جاتی تھیں۔ مگر سوال پوچھے جا رہی تھیں۔ مجھ سے جتنا جھوٹ بولا گیا بولتا رہا۔

میں چلنے لگا تو خالہ جانی نے ایک سوال اور کیا۔

"زمرد کیا کر رہی ہے؟"

میں نے جواب دیا۔

"وہ بھی جاگ رہی ہے"

دوسرے دن صبح امی جان خالہ جانی سے ملنے بولنے گئیں تو انہوں نے دیکھا کہ خالہ جانی کو موت آ چکی ہے۔ ——————

# تازی

ناصر شمسی

ہفتہ، ۷ رجولائی ۱۹۵۸ء کو اماں جان کا خط ملا۔ خط میں لکھا تھا کہ جب سے میں گیا ہوں انہیں بہت یاد آتا ہوں۔ بچاری سب سے کہتی رہیں کہ کوئی تو ان کا مضمون مجھے خط میں لکھ دے لیکن ان کی کون سنتا تھا! مشکل یہ ہے کہ وہ خط لکھنے کو عموماً ایسے وقت کہتی ہیں جب دوسرا کسی کام میں مصروف ہو۔ یہ بھی نہیں کہ خط کا مضمون بتا دیں تاکہ وہ اپنی فرصت میں لکھ دے۔ فرصت کے وقت یاد دہانی کی بجائے جب کسی بات پر غصہ آتا ہے تو خط نہ لکھنے کی بھی شکایت کریں گی۔ اس سے دوسرا چڑ جاتا ہے اور نتیجہ یہ کہ مجھے اماں جان کے خط کے لئے طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔

خط میں اماں جان نے اپنی کیفیت لکھوائی تھی۔ میرے بمبئی چلے آنے کے بعد ان کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو گئی۔ بائیں بازو میں درد میرے سامنے ہی تھا۔ میرے آنے کے بعد بازو بالکل بے کار ہو گیا۔ اور بائیں ہاتھ سے کوئی کام نہیں لیا جا سکتا۔ اماں جان کے اعصاب بہت کمزور ہیں۔ اعصاب کی کمزوری کی وجہ سے، یا غالباً کسی اور وجہ سے، اب مجھے ٹھیک یاد نہیں ڈاکٹر نے کیا بتایا تھا۔ بہر حال بائیں بازو میں دورانِ خون خاطر خواہ نہیں ہے۔ اس لئے درد ہوتا ہے۔ علاج یہ تجویز کیا تھا کہ کیلشیم کے بارہ یا پندرہ انجکشن ایک دن بیچ تسلسل سے لگائے جائیں اور اس دوران میں پانچ مرتبہ بجلی لگائی جائے۔ ڈاکٹر نے متنبہ کیا تھا کہ اگر جلد علاج نہ کیا گیا تو خطرہ ہے کہ بایاں بازو بالکل معطل ہو جائے۔ ہم سب بھائی بہن چاہتے تھے کہ اماں جان کو بازو کے درد سے نجات مل جائے۔ اور تشویش بھی کہ بازو بالکل معطل نہ ہو جائے۔ میں نے بھی کتنی ہی بار تاکید کی کہ اماں جان مسلسل علاج کرا لیں۔ میرے بھائی، اجمل نے بھی کہا۔ بار بار میری بہن ارجمند بھی کہتی رہیں۔ اماں جان نے بھی بیٹا کہا کہ ہاں اب تو باقاعدہ علاج ہونا ہی چاہئے۔ چنانچہ میں ڈاکٹر کے پاس گیا اور پہلے انجکشن کا دن اور وقت مقرر کیا۔ پھر میں اپنے سفر کی تیاری میں اتنا مصروف ہوا کہ اماں جان کو ڈاکٹر کے ہاں نہ لے جا سکا۔ چونکہ درد اتنا شدید نہ تھا کہ روزمرہ کے معمول میں حارج ہو اس لئے اماں جان نے

بھی کوئی التزام نہیں کیا۔ وہ چاہتیں تو اجمل کو ساتھ لے کر انجکشن لگوا آتیں۔

اماں جان ضعیف ہو رہی ہیں۔ اب ان کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان ہوگی۔ بڑھاپے میں انسان بچپن کی حرکتیں دوبارہ کرنے لگتا ہے۔ بچے کی طرح بوڑھا انسان بھی یہ چاہتا ہے کہ کوئی دوسرا اس کے دکھ سکھ کا خیال رکھے۔ ضرورت اور آرام کا بندوبست کرے اور اگر طبیعت ناساز ہو تو منت سماجت سے علاج کے لئے راضی کرے اور اصرار سے دوا پلائے۔ دست و بازو کی بڑھتی ہوئی طاقت کے زعم میں انسان اپنے کو ہر چیز پر قادر سمجھتا ہے۔ یہ زعم نوجوانی میں اپنے کمال پر ہوتا ہے لیکن جب جدوجہد کی کمند تمناؤں تک نہیں پہونچتی تو ناکامی انسان کو بے بسی کی تلخ حقیقت سے روشناس کرتی ہے۔ ناکامیوں کی اوسط زندگی میں اتنی محیط ہے کہ ایک حساس معمر انسان اپنے کو اتنا ہی لاچار پاتا ہے۔ جتنا ایک بے دست و پا طفل۔ عمر کے ساتھ جب اعصاب اور اعضا بھی کمزور ہو جائیں تو یہ احساس اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اماں جان کے اعصاب کمزور ہیں۔ اور عمر زیادہ۔ اس لئے اکثر وہ بچوں کی سی باتیں کرتی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہم بھائی بہن اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں ایسے رندھے رہتے ہیں کہ ان کی دلجوئی اس یکجہتی سے نہیں کرتے جس طرح ماں اپنے بچوں کی کرتی ہے۔

اماں جان نے خط میں لکھوایا تھا کہ کچھ دن پہلے انہیں سردی سے بخار بھی آیا۔ اب میں سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ اس قدر جلد بائیں بازو معطل ہو جانے اور بخار کا باعث غالباً کراچی سے دو سال کے لئے میری روانگی ہو۔ مجھے یاد آتا ہے کہ پہلی مرتبہ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں دو سال کے لئے انگلستان جانے والا ہوں تو وہ بہت پژمردہ ہوئیں۔ ان کی دور اندیشی مانع تھی کہ مجھے جانے سے منع کرے۔ وہ جانتی تھیں کہ انگلستان کی تعلیم کے بعد میرا مستقبل بہتر ہو جائے گا۔ لیکن پھر بھی یہ بات ان کے لئے کچھ کم تکلیف دہ نہ تھی کہ میں اتنی مدت اس قدر دور، غیر ملک میں مقیم رہوں گا انسان کی انا اس کے وجود کو بہت اہمیت دیتی ہے اور اس خود فریبی میں مبتلا رکھتی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش کا اگر اہم ترین نہیں تو بہت اہم رکن ضرور ہے۔ ممکن ہے کہ میں اسی قسم کی خود فریبی میں گرفتار ہوں جو یہ سمجھتا ہوں کہ اماں جان کو میں بہت عزیز ہوں اور میری مفارقت ان پر بہت گراں گذرتی ہے۔ اتنی کہ وہ اکثر بیمار ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ ماں کو اپنا بیٹا اتنا عزیز تو ضرور ہوتا ہے کہ ایک طویل مدت کے لئے جدائی اعصاب زدہ ماں کو چند دن کے لئے بیمار کردے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اماں جان روزمرہ کے معمول میں اس

قدر مصروف رہتی ہیں کہ ایک بیٹے کے موجود ہونے یا نہ ہونے کا احساس زیادہ نہیں رہتا۔ قدرت اگر ماں کو کمزور حافظہ نہ دیتی تو غالباً آنکھ اوجھل بچوں کی ماتا ماں کو زندہ نہ رہنے دیتی۔ میں نہیں سمجھتا کہ قدرت میری انا کی تسکین کے لئے کوئی رعایت کرے گی اور نہ میں چاہتا ہوں کہ میری جدائی کی وجہ سے اماں جان کی زندگی دوبھر ہو جائے۔ لیکن پھر بھی یہ پڑھ کر مجھے کچھ آسودگی خاطر ضرور ہوئی کہ اماں جان کی طبیعت تھوڑی خراب ہے۔ اور میں نے سمجھ لیا کہ ضرور میری مفارقت اس کا باعث ہے

میں اب سوچتا ہوں تو کیسی بیہودہ معلوم ہوتی ہے۔ مجھے یہ بھی صحیح نہیں معلوم کہ میری اماں مجھے کس قدر عزیز رکھتی ہیں۔ یہ میں جانتا ہوں بلکہ خود اماں نے بتایا تھا کہ میری پیدائش سے قبل تین مہینے تک انہوں نے سورہ یسین پڑھی تھی اور خدا سے دعا مانگی تھی کہ خوبصورت لڑکا ہو۔ لیکن میں نقش و رنگ دونوں اعتبار سے اپنے بڑے بھائی اور بہن سے ابتر کر ہوں۔ بچپن میں رنگ کچھ زیادہ ہی میلا ہوگا۔ ضرور اماں کو شدید ناامیدی ہوئی ہوگی۔ لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ اماں مجھے سب سے عزیز رکھتی ہیں۔ ممکن ہے کہ اسے یقین کہنا صحیح نہ ہو۔ ایمان کہنا زیادہ موزوں ہو۔ کیونکہ انسان خود کتنا ہی نااہل ہو لیکن خدا کی رحمتوں اور نعمتوں کے لئے اپنے کو منفرد سمجھتا ہے۔ اسی کو انسان اکثر ایمان کہتا ہے۔

خط میں اماں جان نے لکھوایا تھا کہ سب اچھی طرح ہیں۔ البتہ ارجمند بیچاری بہت کمزور ہے۔ کوٹھی کا باغ بالکل ٹھیک ہے۔ ارجمند کے کمرے کی جانب پپائی کے درختوں میں خوب پھل آرہے ہیں اور چنبیلیوں میں اس قدر پھول آرہے ہیں کہ سفید ہو جاتی ہیں۔ ترکاری کے قطعے میں مالی نے ٹماٹر، مرچ اور سلاد کی نئی پود لگائی ہے۔ کینا (canna) کی باڑھ اونچی ہوگئی ہے اور آج کل کھل رہی ہے۔
خط کے اختتام پر اماں جان نے لکھوایا تھا کہ تازی کی نسبت ہوگئی ہے اور شادی ستمبر کے آخر میں طے پائی ہے۔ منگنی میں اماں جان بھی گئی تھیں۔ دولھا کے عزیز و اقارب ضلع قطع میں بہت معقول اور باحیثیت لوگ ہیں۔
اماں جان نے لکھوایا تھا کہ باقی سب خیریت ہے۔

میں کراچی سے بمبئی سمندر کے راستے آیا تھا۔ جب جہاز نے لنگر اٹھایا اور ساحل سے دور ہونا شروع ہوا تو میرے بھائی کا ہلتا ہوا رومال لحہ بہ لحہ مختصر ہوتا جا رہا تھا۔ میں ان کا حلیہ دیکھ سکتا تھا۔

لیکن خدوخال دھندلے ہو چکے تھے۔ لحظہ بہ لحظہ میری آنکھیں مجھے زیادہ مایوس کر رہی تھیں۔ میرا دل بے قرار تھا۔ یہ خیال کہ یہ شکل میں آئندہ دو سال نہیں دیکھ سکوں گا۔ مجھے بے تاب کئے دیتا تھا۔ میری نگاہیں کوشاں تھیں کہ فاصلے کے دھندلکے میں سے اس چہرے کو ایک بار پھر دیکھ لیں۔ جہاز کی رفتار کافی تیز ہو گئی تھی اور ساحل بہت دُور رہ گیا تھا۔ آنکھیں مایوس ہو چکی تھیں اور حسرت سے کراچی کے ساحل کی لکیر کو تک رہی تھیں۔ کیماڑی کی گودی سے جہاز منوڑا کے جزیرے کی طرف جا رہا تھا۔ دُور کلفٹن کی برجی نظر آ رہی تھی۔

جوں جوں کراچی دور اور افق پر ساحل کی لکیر باریک ہوتی جاتی تھی۔ آنکھیں آہستہ آہستہ بے بصر ہوتی جاتیں اور احساسات کا ایک سیلاب تھا کہ امنڈتا چلا آتا تھا۔ سر بفلک موجیں چاروں طرف سے گھیرے تھیں اور میں اتھاہ سمندر میں ڈوبا جا رہا تھا نیچے اور نیچے۔ احساسات کی موجوں کے اور نیچے۔ جذبات کا دباؤ اتنا شدید تھا اور میں اس سرعت سے ڈوب رہا تھا کہ میرا شعور بالکل معطل تھا۔ مجھے احساس نہیں کہ یہ جذبات کس کس چیز سے متعلق تھے۔ میں کسی کو بھی منفرد نہیں کر سکتا تھا۔ کسی احساس کو بھی کسی ایک فرد یا چیز یا مقام سے منسوب نہیں کر سکتا تھا۔ بیک وقت یہ سب احساسات میرے سارے ماضی سے متعلق معلوم ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ماضی ایک گٹھلی بن کر دل میں اٹک گیا اور حرکت قلب بند ہوا چاہتی تھی۔

میں نے دیکھا کہ سمندر کا رنگ گہرا نیلا ہو کر سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ جذبات کا ہجوم منتشر ہو رہا تھا اور میرا شعور انہیں تاش کے پتوں کی طرح چھانٹ کر واقعات سے منسلک کر رہا تھا۔ اس ہجوم میں سے ایک ہیولا ابھرا۔ اس کا حجم اور تمام جذبات سے زیادہ تھا۔ وہ بڑی تیزی سے شعور کی طرف بڑھا اور میں دم بخود تھا۔ جوں جوں وہ شعور کے قریب آ رہا تھا ایک ایک کرکے تازی کے خدوخال میری نظر کے سامنے آ رہے تھے۔ اس کے مقابل اور سب احساسات بے وزن تھے اور تازی کے بڑھتے ہوئے قدم کے ساتھ ہوا ہو رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ تازی میرے روبرو کھڑی تھی اور میں بے حال ہوا جاتا تھا۔

تیسرے دن صبح جہاز نے بمبئی کی بندرگاہ بلیرڈ پیئر (Ballard Pier) کے مقابل سمندر میں لنگر ڈال دیا۔ سمندر کے سفر میں سب چکر آتے ہیں اور تمام سفر میں سر اوندھائے پڑا رہا۔ چکروں کے ساتھ میرے ذہن میں تازی کا خیال بُری طرح خلط ملط تھا۔ جذبات مصر تھے کہ میں بار بار تازی کے متعلق سوچتا رہوں۔ میں سوچتا تھا تو جذبات کے ماسوا حالات کا بھی جائزہ لینا پڑتا۔ اس جائزہ کا نتیجہ جذبات کے لئے تسکین کا موجب بننے کی بجائے مایوس کن ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود جذبات مجھے

برابر اکساتے رہتے اور میں تازی کے متعلق سوچتا رہتا۔

مجھے یقین تھا کہ تازی مجھ سے بالکل مایوس ہو چکی تھی۔ اُسے کوئی اُمید نہ رہی تھی کہ اس کی شادی میرے ساتھ ہو سکے گی۔ میرا خیال تھا کہ انگلستان کے لئے میری روانگی تازی کے لئے زیادہ تسلی دہ ہوئی ہو گی۔ ممکن تھا کہ طویل مدت کے لئے مجھ سے دوری کو وہ اپنے لئے بہتر سمجھتی ہو اور کوشش کرے کہ مجھ سے بے نیاز ہو جائے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میری روانگی کے بعد اُسنے ایک ٹھنڈا سانس لیا ہو، اپنے سینے پر گردن کو جھکا کر اپنے محبوس جذبات کو ایک نظر دیکھا ہو اور پھر پیٹھ موڑ کر اپنا سر پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے بالکنی میں چلی گئی ہو اور تازہ ہوا میں لمبے لمبے سانس لے رہی ہو۔ تازی سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ ناک چڑھا کر آہستہ سے کہا ہو "خس کم جہاں پاک" اور سر جھکا کر اپنا دوپٹہ ٹانکنے لگی ہو گی گھنٹے مسلسل ٹانکتی رہی ہو اور سر نہ اٹھایا ہو۔ جب کسی نے کہا ہو تو اٹھ کر کوئی اور کام کرنے لگی ہو، کوئی بات کرتا ہو تو جواب دے دیتی ہو لیکن جواب میں تلخی کی آمیزش ہو۔ طبیعت زود رنج زیادہ ہو گئی ہو۔ ذرا ذرا سی بات پر بے طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی ہو، اُس کا رنگ اور بھی زیادہ سفید ہو گیا ہو۔ رخساروں پر سے زندگی کی تمتماہٹ اور بھی مفقود ہو گئی ہو، سینے کا حجم اور بھی مختصر ہو گیا ہو، ہاتھ اور پاؤں اب پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈے رہتے ہوں۔ اب پہلے سے بھی زیادہ کھوئی کھوئی رہتی ہو۔ لیکن جب کبھی میرا ذکر آجاتا ہو تو ناک سکیڑ اور تیوری چڑھا کر ضرور ایک نہ ایک تلخ اور ترش بات مجھے کہہ دیتی ہو۔

تازی کی یہ تصویر مجھے حقیقت سے بہت زیادہ مشابہ معلوم ہوتی تھی۔ کاش میں جان سکتا کہ میری روانگی کے بعد تازی کے جذبات کی کیا نوعیت تھی۔ اُن میں کتنا حجم تھا۔ کتنی گہرائی تھی اور کتنے دیرپا تھے۔ اگر مجھے تذبذب نہ ہوتا اور حقیقت میرے سامنے آشکار ہو جاتی تو میں ذہنی کشمکش سے فراغت پا لیتا۔ مجھے مسلسل کاوش تو نہ رہتی۔ کبھی راکھ کے نیچے دبی چنگاری کی طرح دہکتی اور کبھی بالکنی میں کھڑی تازہ ہوا کے لمبے لمبے سانس لیتی تازی میرے دماغ کو پریشان نہ کرتی۔

اس تذبذب کے باوجود بھی میں مجبور تھا کہ کوئی ایسا حل سوچوں جس سے انگلستان کو میری روانگی بھی ملتوی نہ ہو اور تازی بھی مایوس نہ ہو۔ لیکن جب اپنے حالات کا جائزہ لیتا تو مایوس ہو جاتا۔ ۱۹ اگست کو بمبئی سے جہاز انگلستان روانہ ہونا تھا۔ وقت کی تنگی کے ماسوا میں خود بھی بہت تنگ دست تھا۔ دہلی کی آبائی جائداد کے معاوضہ کے کاغذات داخل کئے جا چکے تھے لیکن کوئی امید نہ تھی کہ ان کی جانچ پڑتال جلد ہو جائے گی۔ اور کسی صورت میں بھی یہ امکان نہ تھا کہ آئندہ دو سال میں بھی معاوضہ ملے گا۔ میرے پاس جو اندوختہ تھا، وہ بھی اس قدر ناکافی تھا کہ مجھے یقین نہ تھا کہ انگلستان

میں دو سال میری گذر ہو سکے گی۔ جو فن سیکھنے میں انگلستان جا رہا تھا۔ اس کے لئے محنت اور کوشش سے زیادہ جبلی موزونیت کی ضرورت تھی۔ مجھے یقین نہ تھا کہ میں اس فن کے لئے واقعی موزوں بھی ہوں اور پھر یہ فن ایسا تھا جس میں انسان کو یا تو ید طولیٰ حاصل ہو نہیں تو کنکر کی طرح بے وقعت ہے۔ میرا مستقبل غیر معروف تھا۔ میں نے اپنی زندگی کا جوا کھیلا تھا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ کوڑی چت پڑے گی یا پٹ۔ اس مرحلے میں میرے لئے ناممکن تھا کہ میں تازی کو اپنا شریک حیات بنا کر اسکی زندگی کی بھی بازی لگا دوں

جب میں اپنے حالات سے نظر ہٹا کر تازی کا خیال کرتا تو بے اختیار طبیعت چاہتی کہ اُسے خط لکھوں مجھے معلوم تھا وہ کیا جواب دے گی۔ اس کے ہاتھ کے لکھے ہوئے جملے میری آنکھوں کے سامنے آجاتے تازی سے یہ بھی بعید نہ تھا کہ وہ بدلہ لینے کے لئے اور اپنی سرفرازی کو کچھ اور بلند کرنے کے لئے انکار بھی لکھ دے لیکن اتنا وقت تو تھا کہ میں ہوائی ڈاک سے ایک اور خط لکھتا اور تازی راضی ہو جاتی۔ میں تازی کی خوشی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ تازی کی زندگی کی یہ سب سے بڑی آرزو ہو جو بر آئے مجھے توقع تھی کہ تازی کی امی کو کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ انہیں معلوم تھا کہ تازی کے لئے یہ شادی زندگی کے مترادف تھی۔ میں ہوائی جہاز سے کراچی جاتا۔ شادی ہو جاتی اور انگلستان جانے کیلئے میں واپس بھی آجاتا۔

میری خودداری مجھے اس اقدام سے روکتی۔ بار بار ارادہ کر لینے کے بعد بھی میں تازی کو خط نہ لکھتا۔ وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے اطمینان تھا کہ جب میں انگلستان سے واپس آؤں گا تو تازی کو اپنا منتظر پاؤں گا مجھے معلوم تھا کہ تازی کی امی کی نظر بہت بلند ہے۔ اس لئے ممکن تھا کہ انہیں کوئی رشتہ پسند نہ آئے تازی ایم اے میں پڑھ رہی تھی۔ یہ بعید بھی نہ تھا کہ لکچرر بننے کے بعد وہ اپنی شادی کو میری واپسی تک ٹالتی رہے۔ مجھے کچھ یہ خوش فہمی بھی تھی کہ تازی کسی اور کے ساتھ شادی کے لئے راضی نہ ہوگی۔

لیکن اماں جان نے خط میں لکھوایا تھا کہ ستمبر کے شروع میں تازی کی شادی ہو جائے گی۔

۱۸ نومبر ۱۹۵۵ء کو میں نے لاہور سے تازی کو کراچی لکھا تھا۔

"مجھے یاد ہے کہ آج تمہاری سالگرہ ہے مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ۱۹۵۳ء میں تمہاری سالگرہ پر میں نے تمہیں ایک تحفہ دیا تھا۔ لیکن اسی دن سے سوئے اتفاق کشیدگی شروع ہوئی اور بڑھتی گئی۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں تمہارے اصرار پر میں نے تمہاری تصویریں اور خطوط تمہیں واپس کر دیئے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی ہو گئے۔ آخری دفعہ گذشتہ سال ستمبر میں ہم ملے تھے ایسے کہ نہ ایک دوسرے سے نظریں چار کیں اور نہ خطاب کیا۔

اب اسے بھی ایک سال ہو گیا۔ اتفاقات زمانہ مجھے لاہور لائے اور لائل پور میں پھر آمنا سامنا ہوا۔ وہاں تکلم کے بند قفل کھلے۔ لاہور میں دونوں سے ضبط نہ ہو سکا۔ اور ہمارے لب مل گئے۔ لیکن ہم دونوں کو ایک دوسرے سے شکوہ تھا۔ تم نے صفائی پیش کی کہ حنیف کے ساتھ شادی کے لئے تم نے کبھی اقرار نہیں کیا۔ تمہیں شکایت تھی کہ میں نے تم سے پوچھے بغیر یقین کیوں کیا۔ میں نے اپنی غلطی کا اعتراف تو کیا لیکن یہ خیال ضرور تھا کہ خود تمہارے رویہ نے بھی تو مجھے اس غلطی میں ڈالے رکھا۔ اگر تم اس قدر سرد مہری سے کام نہ لیتیں تو تم سے استفسار کی جرأت بھی کرتا۔ اس شکوہ شکایت کے باوجود لائلپور کے قیام کے دوران میں ہم دونوں کشاں کشاں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے جذبات کی کچھ زیادہ ہی شدت کے ساتھ کم از کم میں نے یہی محسوس کیا۔ ماضی کو کبھی یکسر بھلایا نہیں جا سکتا۔ یہ حقیقت ہے کہ اب تک ہم دونوں ایک دوسرے کے وجود پر چھائے رہے۔ اور یقیناً ہمارا مستقبل ہمیں ایک دوسرے کی زندگیوں میں دخیل رکھے گا۔ ممکن ہے کہ ہم ڈراؤنے خواب کی طرح ایک دوسرے کی نیندوں کو پریشان کرتے رہیں۔ اس سے پہلے کہ ہم ایک دوسرے کے لئے بھوت بن جائیں کیوں نہ کوشش کریں کہ اچھے دوست ہی بن جائیں۔"

یہ خط میں نے بہت پس و پیش کے بعد لکھا تھا۔ تازی کو خط لکھتے ہوئے مجھے بہت تامل تھا۔ خطوط کا سلسلہ تازی کی درخواست پر ۱۹۵۴ء کے شروع میں بند ہوا تھا۔ لاہور سے روانگی کے وقت تازی سے میں نے کہا تھا کہ کراچی پہونچکر مجھے خط لکھے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتہ میں تازی کراچی گئی تھی اور ہنوز اس کا کوئی خط مجھے نہیں ملا تھا۔ خط لکھنے میں پہل کرتے ہوئے میں اپنی سبکی محسوس کرتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر تازی خط لکھنا چاہتی تو ضرور لکھ سکتی تھی۔ ممکن تھا کہ نانی اماں ہر وقت تازی کو نظر میں رکھتی ہوں۔ یہ بھی خیال آتا تھا کہ تازی مجھے خط لکھتی تو گھر کے پتہ پر لکھتی۔ میں اسد بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ تازی کی لکھائی اسد بھائی اور بھابی دونوں پہچانتے تھے۔ خط میرے نام گھر پر آتا تو لفافہ پر دونوں میں سے کسی کی ضرور نظر پڑتی۔ ممکن تھا کہ تازی نہ چاہتی ہو کہ اس کے ماموں اور ممانی کو معلوم ہو کہ مجھے خط لکھتی تھی۔ نسوانی حیا مانع ہو رہی ہو۔ مجھے امید تھی کہ اگر تازی کو میرے دفتر کا پتہ معلوم ہو جائے تو ممکن ہے کہ وہ مجھے خط لکھے۔ لیکن مجھے ڈر تھا کہ میرا خط نانی کے سامنے تازی کو ملا تو وہ شرم سے ڈوب جائے گی۔ اور سر نہ اٹھا سکے گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ نہ چاہتی ہو کہ میں ایک خط بھی اسے لکھوں اور اسی لئے خط و کتابت کا سلسلہ شروع نہ کر رہی ہو۔ اس کے باوجود میں تازی کو خط لکھنا چاہتا تھا۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ تازی ایک مہلک روگ میں مبتلا ہے جو اندر ہی اندر اُسے کھلائے جا رہا ہے۔ گذشتہ ایک سال میں تازی نے اپنے کو یقین دلایا تھا کہ میں ذرہ برابر بھی اس کی پرواہ نہیں کرتا۔ شدید احساسِ شکست نے اس کے وجود کو سرنگوں کر دیا

تھا۔ وہ اپنے حسن جسم کے دل آویز خطوط، محبت، التجاؤں اور آنسوؤں کی ناکامی سے دل برگشتہ ہو چکی تھی۔ اور اس ناکامی کو توہین کے مترادف سمجھتی تھی۔ عورت کے لئے غالباً اس سے زیادہ شدید زخم کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کی محبت کی توہین ہو۔ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ تازی نے اس زخم کو اپنا گہنا ناسور بنا لیا۔ جو اس کے وجود کو کھائے جا رہا تھا۔ یہ احساس مجھے مجبور کر رہا تھا کہ تازی کو خط لکھوں اور بتاؤں کہ حقیقت کس قدر مختلف تھی اور وہ میرے وجود پہ کس طرح چھائی ہوئی تھی۔ مجھے شبہ تھا کہ اگر میں تازی کو اپنی محبت کا یقین بھی دلاؤں گا تو اسے اسقدر جلد یقین نہ آ جائے گا۔ وہ میرا اعتبار نہ کرے گی۔ اس لئے میں نے خط میں صرف دوستی کے لئے ہاتھ بڑھایا تھا۔

تازی نے میرے خط کا جواب نہ دیا۔ کچھ دن بعد بھابی کے پاس تازی کا خط آیا۔ بھابی نے بتایا کہ میرا خط تازی کو مل گیا۔ اور شکریہ ادا کیا ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ تازی دوستی کے لئے بھی آمادہ نہیں اور میری پیش کش رد کر دی۔ میری خودداری کو بہت اذیت پہونچی۔ مجھے بہت رنج تھا کہ تازی اس قدر برگشتہ ہوئی کہ میرے ساتھ کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ میری خودداری مصر تھی کہ میں بھی تازی کی طرح ضبط سے کام لوں اور چپ سادھ لوں۔

۲ جنوری ۱۹۵۱ء کو اسد بھائی اور بھابی کے ساتھ میں لاہور سے کراچی پہونچا۔ تازی بھی اسٹیشن پر آئی تھی۔ کچھ دیر تو ہم نظریں بچاتے رہے۔ لیکن پھر ہم نظر نہ ہٹا سکے۔ مجبور و بے بس ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ میں نے تازی کے سراپے کو اپنی نگاہوں میں سمیٹ لیا۔ اسکے صندل بال، بڑی آنکھیں، لب، رخسار۔ سبز ٹوپی اور (PULL OVER) میں سے سینے کا ہیجان۔ میں ہاتھ لگائے بغیر بھی تازی کے ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھوں کا لمس محسوس کر سکتا تھا۔ میری طبیعت بے تاب تھی کہ ان ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خوب رگڑوں یہاں تک کہ وہ اسکے آنسوؤں کی طرح گرم ہو جائیں۔ نہ معلوم کیوں مجھے اسکی مسکراتی ہوئی آنکھوں میں آنسو چھلکتے محسوس ہوتے تھے۔

بھابی حسب معمول کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں اور اسد بھائی مذاق میں مشغول تھے۔ اسد بھائی اور بھابی گزشتہ پانچ ماہ کے ساتھ رہنے میں مجھ سے بہت بے تکلف ہو گئے تھے۔ انہیں احساس تھا کہ آئندہ بے تکلفی کے مواقع کم ملیں گے۔ اس لئے اس آخری موقع سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ میں بھی قہقہے لگا رہا تھا کیونکہ ان کے ساتھ قہقہے لگانے میں مجھے بھی لطف آتا تھا۔ کچھ یہ بات بھی تھی کہ میں اپنے قہقہے ضبط نہ کر سکتا تھا۔ تازی کو دوبارہ دیکھ کر میں بہت خوش تھا۔ چونکہ یقین تھا کہ اب

ہم دونوں ایک ہی شہر میں ہوں گے۔ اور ملاقات برابر ہوتی رہے گی۔ اس لئے خوشی اور بھی زیادہ تھی۔ میرے قہقہوں میں اس خوشی کے ماسوا ایک طنز بھی تھا۔ میں قدرت کی ستم ظریفی پر قہقہے لگا رہا تھا۔ جس نے ہم دونوں کو پھر ایک بار روبرو لا کھڑا کیا۔ ہم دونوں بے بس ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

ہر شام کشاں کشاں میں تازی کے ہاں جاتا۔ چند ہی دن کراچی آئے ہوئے تھے کہ میں نے محسوس کیا کہ ہمارے درمیان ایک خلیج ہے جو وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ تازی اپنی پوری قوتِ ارادی کے ساتھ مجھ سے دور کھینچنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مجھ سے اس لئے خائف معلوم ہوتی تھی کہ میرے سامنے اپنے کو بے بس پاتی تھی۔ مجھے گمان ہوتا تھا کہ مجھ سے ملنے کے بعد اپنے کو ملامت کرتی ہوگی۔ مجھے شبہ تھا کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے کو مجھ سے محبت کرنے سے باز نہ رکھ سکتی تھی۔ تازی کے لاہور اور کراچی کے رویہ میں بہت فرق تھا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا تھا کہ اس کا موجب میں ہوں۔ لیکن میں حیران تھا کہ میرے اس قدر آگے بڑھنے کے باوجود تازی کیوں پیچھے ہٹتے جا رہی تھی۔ آگے بڑھنے پر میں اپنے کو مجبور پاتا تھا لیکن جب تازی کو پیچھے ہٹتے ہوئے دیکھتا تو میری خودداری مجروح ہوتی تھی۔ اسکے باوجود اس پس وپیش کے مسلسل درد و کرب کو کسی نہ کسی طرح برداشت کر رہا تھا۔

وسط مارچ میں تازی کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں عنقریب دو سال کے لئے انگلستان جانے والا ہوں۔ وسط اپریل تک سب انتظامات ہو گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنے انگلستان جانے کے متعلق کہا کرتا تھا "جاٹ کو مرا تب جانو جب اس کا تیجا ہو جائے" وسط مئی میں فیصلہ کیا کہ پہلے چند ماہ کے لئے بمبئی چلا جاؤں اور پھر وہاں سے انگلستان۔ اس کے بعد میں تازی سے ملنے گیا لیکن وہ باہر گئی ہوئی تھی۔ چند دن بعد ۳۰ مئی کو میں دفعتاً بمبئی روانہ ہو گیا۔

روانگی سے قبل تازی سے ملاقات نہ ہوئی۔ ہوتی بھی تو مجھے یقین تھا کہ نہ اس کی نظر سیر ہو سکتی تھی اور نہ میری۔ مجھے ایک بات کا افسوس ہوتا ہے۔ تنہائی میں تازی سے باتیں کرنے کا مجھے کراچی میں موقعہ نہیں ملا۔ کاش میں تازی کی روئداد سن سکتا۔ اور اپنی سنا سکتا۔ ممکن تھا کہ چند گھنٹے کی گفتگو میں ہی تازی اپنے دل کا غبار نکال دیتی اور شادی کا وعدہ بھی کر لیتی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہو جاتے۔ کاش تازی کی نانی اماں کی نظر اس قدر کڑی نہ ہوتی۔ کاش ہمارا ماحول اس قدر تنگ نظر نہ ہوتا۔ کاش ہم دونوں میں سے کوئی جرات کر سکتا۔ کاش قدرت ہی ہماری مدد کر دیتی۔

•

راولپنڈی سے ۱۰ اگست ۱۹۵۲ء کو میں کراچی پہونچا تھا۔ ٹرین جب ایرپورٹ کے اسٹار گیٹ

سے گذر کر کراچی کنٹونمنٹ کے اسٹیشن کے قریب پہنچ رہی تھی تو اچانک میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ اور جب میرے ذہن سے شدتِ احساس کا دھند لکا ہٹا تو تازی کی بڑی بڑی کرنجی آنکھیں میرے سامنے آگئیں۔ مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ میں تازی کو اس قدر بھلا چکا تھا کہ راولپنڈی کے قیام کے آخری دنوں میں، وہاں سے روانگی کے وقت اور راستے میں کراچی پہونچنے تک مجھے تازی کا خیال بھی نہ آیا۔ میرا تصور، امنگیں اور شوق سب منہ اوندھائے سو رہے تھے۔ مجھے یقین نہ آتا تھا کہ زندگی اس قدر بے جان ہو سکتی تھی۔ انسان کا قلب اس قدر ساکت بھی ہو سکتا تھا۔

۲۰ اپریل ۱۹۵۳ء کو میں کراچی سے راولپنڈی پہنچا تھا۔ یہ میری عادت تھی کہ میں پردیس میں بالکل اجنبی کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ راولپنڈی کے قیام میں بھی کسی سے بے تکلف نہ ہوا تھا۔ اور فرصت کا بہت کانی وقت میں تنہا گذارتا تھا۔ تنہائی میں کراچی کی مانوس فضا کی یاد مجھے اداس کرتی تھی اور جب اجنبیت، تنہائی اور اداسی بہت ناگوار ہو جاتی تھی تو میں چند دن کے لئے کراچی ہو آتا۔ یہ عمل ہر تیسرے چوتھے مہینے کرنا پڑتا تھا۔

میں کراچی سے دور ہوتا تو تازی کے خطوط میرے لئے بہت جانفزا ہوتے۔ اِن خطوط کی چاشنی کچھ دن ضرور مجھے شگفتہ رکھتی۔ میرے دل کی دنیا آباد رہتی تھی۔ میرے جواب میں دیر ہو جاتی تھی لیکن تازی خط لکھنے میں تاخیر نہ کرتی تھی۔ ان خطوط کے سہارے میں پردیس کے دن، ہفتے اور مہینے گذار دیتا اُس مرتبہ مجھے توقع نہ تھی کہ تازی مجھے خط لکھے گی پھر بھی میں منتظر رہا۔ لیکن تازی نے مجھے کوئی خط نہ لکھا۔ میری زندگی بہت اداس ہو گئی تھی۔ میرا دل ویران تھا۔ تازی کی خاموشی ٹوٹتی نہ تھی۔ آہستہ آہستہ تازی کے خط کی امید بھی ٹوٹ گئی۔

پھر کچھ عرصہ بعد زندگی حساب کے ایک سوال کی طرح حل ہونے لگی۔ راولپنڈی میں صرف چند اشخاص سے راہ و رسم تھی۔ اُن کے گھر چلا جاتا تو بہت خوشی سے خاطر تواضع کرتے۔ نہ جاتا تو شکایت نہیں۔ انکار بھی نہیں۔ نہ جانے سے مجھے بھی کوئی کسک محسوس نہ ہوتی تھی۔ دن بھر کام کرتا۔ رات کو اخبار اور کتابیں پڑھتا۔ کتابوں میں اتنی دلچسپی ضرور تھی کہ جب تک پڑھتا رہتا، وقت محسوس نہ ہوتا تھا۔ دن بھر کام میں بھی کوئی نہ کوئی دلچسپی کی صورت نکل آتی۔

کراچی سے راولپنڈی کی مسافت بھی کس قدر عجیب چیز تھی۔ تازی سے قطع تعلق کی تلخی اس مسافت نے آہستہ آہستہ بہت کم کر دی۔ کم از کم یہ تلخی ہر وقت وجود پر چھائی نہ رہتی تھی۔ میں کسی قدر اپنے کو آزاد محسوس کرتا تھا۔ دل کے بندھن بھی کچھ ڈھیلے ہو گئے تھے۔ ایک تنہا انسان جس کا دائرہ احباب صرف

چند اشخاص پر مشتمل تھا۔ اپنا وقت معاش و استراحت میں گذار دیتا۔ جیسے نہ خرچ کی تنگی تھی۔ نہ دوستوں کی قلت۔ نہ اپنوں میں سے کسی کی یاد تڑپاتی تھی نہ کسی کو اپنانے کی پیہم کوشش۔ اکیلے، ویسے ہی معصوم بے آزار طریقے پر کام، آرام کرتے دن گذار دیتا۔ مہینے گذار دیتا۔ اس حال کا نہ ماضی تھا نہ مستقبل۔ جو وقت گذرجاتا اس میں کوئی لمحہ ایسا نہ ہوتا جس کی یاد زندگی کا سرمایہ ہو۔ نہ کوئی ایسا درخشاں مستقبل جس کے لئے طبیعت بے تاب ہو۔ ——— غالباً میری زندگی بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

کوئی چیز تھی جو مجھے کشاں کشاں کراچی جانے پر مجبور کرتی تھی۔ میں نے جون کے پہلے ہفتہ میں فیصلہ کیا تھا کہ کراچی منتقل ہو جاؤں۔ کراچی جانے کے لئے میں نے ریل کا برتھ بھی مخصوص کرا لیا تھا لیکن پھر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اور راولپنڈی میں قیام پر صبر کیا۔ یک بیک مجھے اُس حبسِ دم سے نفرت ہو گئی تھی۔ میں اپنے وجود میں محبوس تھا۔ رقیق القلبی بڑھ گئی تھی تنہائی احساسات کو اور بھی دیر پا بنا رہی تھی۔ بے رنگ اور بے لطف زندگی نے طبیعت کو مکدّر کر دیا تھا۔ شاید تازی سے قطع تعلق کو اس میں دخل تھا یا مسلسل تنہائی کو، یا میری مضمحل حالت کو، لیکن بات یہ تھی کہ میں زندگی کی خوشیوں سے بہت دُور ہو گیا تھا۔ خوشی کے فطری جذبے سے بالکل بے حس ہو گیا تھا۔ یہ بے حسی ہی مجھ پر چھائی ہوئی تھی جو ۱۰ اگست ۱۹۵۲ء کو کراچی پہنچنے تک مجھے تازی کا خیال بھی نہ آیا تھا۔

میرا معمول تھا کہ کراچی پہنچنے کے پہلے ہی روز چھوٹی ممانی کو اپنی آمد کی خبر ٹیلی فون پر سنا دیتا تھا۔ اس دفعہ بھی میں نے پہلے ٹیلی فون کیا اور دوسرے ہی دن تیسرے پہر ان سے ملنے پہنچ گیا۔ ابھی چند منٹ ہی باتیں ہوئی تھیں کہ انہوں نے بتایا کہ تازی کی بات طے ہو گئی اور ۵ دسمبر شادی کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ شادی حنیف کے ساتھ ہو رہی تھی۔

۱۹۵۱ء کے آغاز میں حنیف ملتان سے کراچی منتقل ہوئے تھے۔ چھوٹی ممانی کے خاندان کے ساتھ دیرانہ مراسم تھے۔ دونوں کے والد بہت گہرے دوست تھے۔ چھوٹی ممانی کو حنیف کے کراچی آنے کی اطلاع پہلے ہی مل چکی تھی۔ اور وہ اپنا فرض سمجھتی تھیں کہ حنیف کو کراچی کے قیام میں ہر ممکن سہولتیں پہنچائیں۔ حنیف نے تکلفاً ان کے ہاں قیام کی پیش کش تو قبول نہ کی لیکن ہر دوسرے تیسرے روز ملنے ضرور آتے تھے۔ میں بھی بہت پابندیٔ وضع کے ساتھ ہر تیسرے چوتھے دن چھوٹی ممانی کے ہاں جاتا تھا اس لئے حنیف سے میری ملاقات اُن کے کراچی آنے کے پہلے ہی ہفتہ میں ہو گئی تھی۔

ملاقات سے پہلے غائبانہ طور پر پوری طرح مجھے حنیف سے متعارف کرا دیا گیا تھا۔ ان سے متعلق کئی دلچسپ مذاحیہ واقعات سنائے جا چکے تھے۔ مبالغہ آمیز مزاح کے ساتھ۔ مجھے بھی حنیف سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ چھوٹی ممانی کو بخار تھا۔ حنیف ان کی مزاج پرسی کو شام کے وقت آئے تھے۔ اس شام جب حنیف کمرے میں داخل ہوئے تو شرم سے جھکے ہوئے تھے۔ گردن جھکی ہوئی تھی۔ نظریں جھکی ہوئیں اور چہرہ شرم سے گلال ہو رہا تھا۔ حنیف کا شرمانا یقیناً بہت مضحکہ خیز تھا۔ ایک کہنہ مشق شاعر کی طرح سر کے بال بڑھے ہوئے اور بے ترتیب تھے۔ چہرہ پھولا ہوا۔ ایک نوزائندہ بچے کی طرح لیکن بدنما طور پر۔ ان کے چہرے پر ان کی عمر ایک طنز تھی۔ یا اس عمر میں وہ چہرہ ایک طنز تھا۔ حنیف کا قد پست تھا۔ شانے تنگ اور جھکے ہوئے اور جسم شانوں سے ڈھلکتا ہوا گاؤدم کی طرح قدموں کی طرف پھیلتا آتا تھا۔ اسکی وجہ یہ بھی ہے کہ حنیف کی پتلون کی موریاں پھیلی تھیں اور دونوں موریوں کے درمیان خلا نظر نہ آتا تھا۔ اور ستم یہ کہ حنیف کا جسم قد کی مناسبت سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ حنیف کے چہرے کے دہر جا بجا سے رنگ پر شرم کا گلال پھیلا دیکھ چھوٹی ممانی مسکرائیں۔ نسرین نے تمسخر سے نقل اتاری اور تازی سے ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ وہ جلدی سے اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ لیکن جب حنیف نے جھجکتے جھجکتے باتیں کرتے یک بیک بلند قہقہہ لگایا تو وہ قہقہہ نہیں واقعی ایک مضحکہ معلوم ہوتا تھا۔ جب تک اُس کی طوالت مدھم سروں تک پہنچتی میں بھی بے تاب ہو گیا کہ مذاق اڑاؤں حنیف کے ساتھ کوئی نہ ہنستا تھا۔ اُن کے قہقہہ کے بعد سب بے اختیار ہنستے نہیں بلکہ مضحکہ اڑاتے نظر آتے تھے۔

حنیف کا سب مذاق اڑاتے تھے۔ کوئی اسکے بھاری بدن کا، کوئی اس کی لاابالی طبیعت کا، کوئی اسکے بے موقعہ قہقہوں کا۔ تازی، اس کی چھوٹی بہن نسرین، خود ممانی اور ماموں بھی اس مذاق میں شامل رہتے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود مجھے حنیف بہت بہتر انسان نظر آتا تھا۔ اس میں غیر معمولی صفت یہ تھی کہ نہ صرف وہ دوسروں کے مذاق کا ہدف بنتا بلکہ اکثر خود اپنا مذاق بھی آپ اڑاتا اور بہت لطف اندوز ہوتا۔ ممکن تھا کہ اس طرح غیر شعوری طور پر وہ اپنی خودی کو اپنے وجود سے الگ کر کے اپنی خودداری برقرار رکھتا ہو۔ بہرصورت نفس کشی کی یہ ایک عجیب مثال تھی۔ مجھے حنیف کے ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ حنیف کے کراچی کے دائرہ احباب میں غالباً میں واحد شخص تھا جس نے اسکے ساتھ ابتداء سے ہمدردانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ حنیف اور میں اچھے دوست تھے۔

حنیف لکھنؤ کے ایک پرانے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ اس خاندان میں شرافت اور ثقافت

کی دیرینہ روایات قائم تھیں۔ حنیف کی عجیب الخلقت حرکتوں کے باوجود ان روایات کا پر تو نظر آتا تھا۔ اس کے پاس جو خطوط آتے ان سے معلوم ہوتا تھا کہ اس خاندان کے افراد میں ادب خوب رچا ہوا ہے۔ حنیف کی چھوٹی بہن ہر ماہ خط کے ساتھ خود نوشت ایک اخبار ملفوف کرتی جس میں خاندان کی گذشتہ ماہ کی خبریں صحافت کے اصول کے تحت مرتب ہوتیں۔ اس اخبار میں کالم ہوتے۔ خبروں کی سرخیاں ہوتیں عنوانات کی ترتیب ہوتی اور واقعات پر تبصرہ ہوتا۔ یہ اپنی قسم کا واحد اخبار تھا جو میری نظر سے گذرا تھا۔ اس کی صحافت کا معیار خاندان کی ادب دوستی پر دلالت کرتا تھا۔ پردیس میں مقیم خاندان کے ایک فرد کے لئے اس کی افادیت بھی ظاہر تھی۔ اس اخبار سے یہ بھی ظاہر تھا کہ اس خاندان میں رشتہ کا بندھن ابھی استوار ہے۔ حنیف کا خاندان بہت خوشحال تھا۔ اس کے بڑے بھائی پشاور میں مقیم تھے اور ایک اچھے عہدے پر فائز تھے اور ان کے ایک قریبی عزیز کپاس کے بہت بڑے تاجر تھے۔

بہت دلچسپ انداز میں تفریحاً مجھے بتلایا گیا تھا کہ پہلی دفعہ جب حنیف چھوٹی ممانی کے ہاں کھانے پر گئے تھے۔ تو میز پر باتیں کرتے ہوئے ہکلا رہے تھے۔ پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے ہاتھ کانپتا تھا۔ کھانا چڑیا کی جیب اور مانڈے کے پھپھوے کے برابر کھایا۔ میں حنیف کی حالت کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ حنیف کے سابقہ ماحول کی فضا قدامت پسند تھی۔ ان کے لئے کراچی کی آزاد روش ہی توازن متزلزل کرنے کے لئے کافی تھی۔ کجا کہ دو نوجوان لڑکیوں کے ساتھ کھانا۔ لڑکیاں بھی ایسی جو مرد کو شرما دینے کا ملکہ رکھتی ہوں اور فضا میں اجنبیت کے باوجود یک طرفہ بے تکلفی کی افراط ہو۔ غالباً حنیف کی جبلی شرافت کا یہ ثبوت تھا کہ وہ کھل کھیلنے کی بجائے شرما رہا تھا۔ ممکن تھا کہ ان حالات میں کوئی دوسرا شخص بھی ایسی دہشت تو ضرور محسوس کرتا۔ جھجک تو ضرور ہوتی۔ یک بہ یک بے محابا نظروں سے نظریں چار ہو کر جھک تو ضرور جاتیں۔ ممکن تھا کہ کھانے پر ایک دو مرد اور بھی مدعو ہوتے تو حنیف کو سانس لینے کی مہلت مل جاتی۔ ایک وقت میں ایک بہن کی موجودگی کی تاب لے آتا۔ لیکن ایک ہی میز پر دو بہنوں کی بہ یک وقت موجودگی حنیف کے لئے یقیناً جان لیوا ہو گی۔ میں ان دونوں بہنوں کو بچپن سے جانتا ہوں۔ ہم ساتھ کھیلتے بڑے ہوئے تھے۔ انہیں تو خیز کلی سے شگوفہ بنتے دیکھا تھا۔ ایک حد تک ان کا سحر مجھ پر زیادہ اثر بھی نہ کرتا تھا۔ دونوں میں لطیفے لطیف کافی تھی۔ ان کی خصوصیت تھی تو یہ کہ ان میں جھجک نہ تھی۔ فرداً فرداً دونوں میں سے ایک بھی ایسی سحر کار نہ تھی کہ نظر ملتے ہی انسان کا دم اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جاتا۔ لیکن بیک وقت دونوں کی موجودگی، بے محابا نظریں، پر لطف گفتگو اور بے ساختہ ادائیں انسان کو ایک دفعہ تو بالکل مسحور کر لیتی۔ مگر حنیف

بھی اپنے کو کھو بیٹھا تو حیرت کی بات نہ تھی۔

اُسی سال اپریل کے آغاز میں چھوٹی ممانی کے اصرار پر حنیف اُن کے ہاں آ کر مقیم ہو گئے تھے لیکن تازی پندرہ دن بعد ہی مری چلی گئی اور جون کے پہلے ہفتے میں واپس آئی تھی۔ میں وسط جون میں پشاور منتقل ہو گیا۔ چھوٹی ممانی کے ہاں قیام کے دوران میں حنیف کو تازی کو قریب سے دیکھنے کا کوئی تین ماہ کا عرصہ ملا تھا دو ہفتے تازی کے مری جانے سے پہلے اور ایک ہفتہ میرے پشاور جانے سے قبل۔ اس مختصر مدت میں چند دفعہ ہی میں چھوٹی ممانی کے ہاں گیا ہوں گا۔ لیکن حنیف کو محسوس ہو گیا تھا کہ تازی کو مجھ سے محبت تھی۔

اکتوبر کے آغاز میں ہفتے عشرے کے لئے میں کراچی آیا تھا۔ حنیف سے سرسری سی ایک ملاقات ہوئی تھی۔ دوستی ہونے کے باوجود حنیف سے میری بے تکلفی نہ تھی۔ جب میں پشاور واپس پہنچا تو حنیف نے مجھے بہت طویل خط لکھے جن میں تازی کا بہت تفصیل کے ساتھ ذکر ہوتا۔ دوسرے ہی خط میں مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ حنیف کو تازی سے محبت تھی۔ اس کے بعد حنیف کے خطوط بہت واضح ہو گئے وہ مُصر تھے کہ میں انہیں بتا دوں کہ میں تازی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہوں یا نہیں۔ مجھے گمان ہوتا تھا کہ حنیف نے چھوٹی ممانی کو بتا دیا تھا کہ وہ تازی کے ساتھ شادی کے متمنی تھے۔ چھوٹی ممانی جانتی تھیں کہ تازی مجھ سے محبت کرتی تھی۔ اگر کسی وجہ سے تازی کے ساتھ شادی کا میرا ارادہ نہ تھا، تو چھوٹی ممانی کی نظر میں حنیف کا رشتہ یقیناً قابلِ قبول ہی نہیں بلکہ قابلِ فخر بھی تھا۔ غالباً ان ہی کے ایما پر حنیف نے مجھ پر خطوں کی ڈاک بٹھا دی تھی۔

ان خطوں کے بعد اپریل ۱۹۵۲ء میں چند دن کے لئے میں کراچی گیا تھا چھوٹی ممانی کے ہاں حنیف سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں نے خطوط کا جواب نہ دینے کی معذرت بھی کی لیکن خطوط کے مضمون کا ذکر نہ میں نے کیا اور نہ حنیف نے، ہم دونوں بڑی دیر تک دلچسپ باتیں کرتے رہے۔ بہت خلوص کے ساتھ۔ کمرے میں تازی بھی بیٹھی تھی اور اس کی چھوٹی بہن بھی۔ اس کے بعد حنیف سے کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ چند ماہ بعد ستمبر میں پھر کراچی گیا تو سرراہے ملاقات کئی بار ہوئی، بہت خلوص کے ساتھ اور بس۔ میں دسمبر کے آخر میں پشاور سے کراچی منتقل ہو گیا۔ اول دو تین ماہ حنیف سے آمنا سامنا ہی نہ ہوا۔ ان دنوں غالباً حنیف نے چھوٹی ممانی کے ہاں جانا بہت کم کر دیا تھا۔ ایک سہ پہر سرِراہے صدر میں ملاقات ہو گئی۔ میں حنیف کے خطوط کا مضمون

بھولا نہ تھا۔ چاہتا تھا کہ کبھی تنہائی میں تفصیلی ملاقات ہو تو اس کے واردات قلب کا صحیح اندازہ لگاؤں۔ میں نے حنیفہ کو چائے پر مدعو کیا۔ لیکن وعدہ کر لینے پر بھی متعینہ شام وہ نہ آئے اور میرا انتظار بھی بے سود ثابت ہوا۔ میں آغاز جولائی ۱۹۵۵ء میں راولپنڈی منتقل ہو گیا۔ منتقل ہونے سے قبل کئی بار ایسا ہوا کہ میں چھوٹی ممانی کے ہاں موجود ہوا اور حنیفہ بھی آ گئے یا وہ وہاں موجود ہوئے اور میں جا پہنچا۔ ان ملاقاتوں میں ہمیں تنہائی میں بات کرنے کا کبھی موقع نہ ملا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ حنیفہ کے آنے پر تازی اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی جاتی اور پھر میں بھی وہاں چلا جاتا۔ یا اگر حنیفہ پہلے سے موجود ہوتے تو میں دیکھتا کہ تازی کمرے میں موجود نہ ہوتی۔ اور میں تازی کے پاس دوسرے کمرے میں چلا جاتا۔ راولپنڈی کے قیام کے دوران میں بھی میں دو مرتبہ کراچی گیا لیکن مجھے یاد نہیں کہ حنیفہ سے ملاقات ہوئی ہو۔

نہ معلوم کیوں مجھے خیال ہوتا تھا کہ شاید حنیفہ نے اپنی کمزوری پر قابو حاصل کر لیا تھا اور اُسے تازی سے محبت نہ رہی تھی۔ حنیفہ کے خطوط کو جو اُسنے مجھے ۱۹۵۴ء کے آخر اور ۱۹۵۵ء کی ابتدا میں لکھے تھے، ایک زمانہ گذر چکا تھا۔ اسکے بعد کبھی کنایتاً بھی حنیفہ کی محبت کا ذکر میرے سامنے نہ آیا۔ تازی تو حنیفہ کا نام لینا ہی غالباً گناہ سمجھتی تھی۔ چھوٹی ممانی نے مجھ سے تازی کی شادی کے متعلق عام پیرائے میں ایک دو مرتبہ ذکر کیا لیکن اس طرح کہ جیسے انہیں میرے اور تازی کے تعلقات کا علم ہی نہیں۔ حنیفہ کا ذکر انہوں نے بھی کبھی نہیں کیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ حنیفہ نے چھوٹی ممانی کے ہاں آنا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ تازی اسکو رُخ بھی نہ دیتی تھی۔ ابتدا میں جب تازی کو علم ہوا کہ حنیفہ کو محبت تھی تو وہ اور بھی زیادہ بے رحمی سے حنیفہ کا مذاق اڑاتی۔ تازی کو حنیفہ کے کپڑے میں سے مرے ہوئے چوہے کی بو آتی۔ وہ پاس سے گذرتا تو اپنی ناک پر دوپٹہ رکھ لیتی۔ اُسکے بعد تو تازی کو نفرت ہی ہو گئی۔ اغلباً تازی حنیفہ سے اس قدر نفرت نہ کرتی اگر حنیفہ کو تازی سے اس قدر محبت نہ ہوتی۔ اگر محبت ہوئی تھی تو ظاہر نہ ہونے دیتے۔ ظاہر ہو بھی جاتی تو خودداری کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ مرد جب گڑگڑانے پر بھی محبت کرتا ہے تو اپنا وقار کھو دیتا ہے۔ ممکن ہے عورت پہلے عزت کرتی ہو اور پھر محبت۔ یا جس سے محبت کرے اُسے عزت کے لائق ہونا بھی ضروری سمجھتی ہو۔ لیکن تازی حنیفہ کی نہ عزت کرتی تھی، نہ لحاظ اور نہ رحم۔ اُسنے حنیفہ کو بالکل نظرانداز ہی کر دیا۔ نہ اس کی طرف دیکھتی اور نہ بات کرتی۔ آخر میں تو اُسنے حنیفہ کے سامنے آنا ہی ترک کر دیا۔ حنیفہ کو تازی کی پرچھائیں بھی نظر نہ آتی تھی۔

اور تازی کی شادی حنیف کے ساتھ طے پائی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ حنیف کو ہنوز تازی سے محبت تھی۔ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تازی کو مجھ سے محبت تھی۔ تازی کے ساتھ شادی کر رہا تھا۔ تازی میری نہ ہو سکی تو اس کی ہو رہی تھی جو اس کے پانے کے لئے بے چین تھا۔ میں حنیف کی خوشی کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ ناکام محبت کے سر کامرانی کا سہرا بندھ رہا تھا۔ میں محسوس کر سکتا تھا کہ تازی کے لئے حنیف کے ساتھ شادی کیا معنی رکھتی تھی۔ جس سے سخت ترین نفرت کرتی رہی ہو اس کو اپنا جسم سپرد کر دینے کا خیال ہی تازی کو کس قدر اذیت دیتا ہوگا۔ وہ جس کی پرچھائی سے بچتی رہی اسکو گلے لگا کر جانے دینا یقیناً بہت دشوار تھا۔ میں متعجب تھا کہ تازی نے شادی کے لئے کیسے اقرار کیا۔ اور شادی جسم کی سپردگی کے ساتھ سارے وجود کی سپردگی طلب کرتی ہے۔ مجھے محسوس ہوتا کہ تازی اپنے کو قربان کر رہی تھی، اپنے کو بھینٹ چڑھا رہی تھی صرف اس لئے کہ اس کی محبت ناکام رہی تھی۔ مجھے یاد نہ آتا تھا کہ تازی اپنی ہر خواہش، ہر آرزو اور ہر ارمان کے ساتھ خون کی ہولی کھیلنا چاہتی تھی —— محض لذتِ درد کے لئے۔

مجھے یہ بھی یقین نہ تھا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ ہو سکتا تھا کہ میں نے واقعات کو غلط روشنی میں دیکھا ہو۔ یہ بھی امکان تھا کہ میرا مفروضہ ہی غلط ہو اور تازی کو مجھ سے محبت نہ رہی ہو۔ میں نے اپنی غلط فہمی میں واقعات کی غلط تعبیر لی ہو۔ جذبات سے قطع نظر حقیقت یہ تھی کہ جب سے حنیف نے تازی کی زندگی کے دائرے میں قدم رکھا تھا میں زیادہ عرصے کراچی سے باہر رہا۔ حنیف ۱۹۵۱ء کے آغاز میں کراچی آئے تھے اور میں اسی سال وسط جون میں پشاور منتقل ہو گیا تھا۔ پشاور سے میری واپسی دسمبر ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ اس ڈیڑھ سال کی مدت میں صرف دو مرتبہ میں کراچی آیا۔ ایک دفعہ اکتوبر ۱۹۵۱ء میں دوسری مرتبہ اپریل میں۔ صرف چند دن کے لئے۔ ابھی کراچی آئے مجھے چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ آغاز جولائی ۱۹۵۳ء میں مجھے باہر جانا پڑا۔ —— اس دفعہ راولپنڈی۔ اگست ۱۹۵۴ء تک میں راولپنڈی رہا۔ وہاں کے قیام کے دوران میں بھی صرف دو مرتبہ کراچی آ سکا۔ نومبر ۱۹۵۳ء میں اور پھر اپریل میں —— وہ بھی صرف چند دن کے لئے۔ ۱۹۵۱ء کے آغاز سے حنیف مسلسل کراچی میں تھے اور میں عموماً کراچی سے دور۔ اس ساڑھے تین سال کی مدت میں تازی سے ملنے کے مجھے زیادہ مواقع نہ ملے تھے۔ ہو سکتا تھا کہ میری دوری نے اس کی محبت کو سرد کر دیا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس طویل انتظار سے وہ اکتا گئی ہو۔ یہ بھی کیا بعید تھا کہ حنیف نے اس کے دل کے ویرانے میں ذرا سی جگہ اپنے لئے پیدا کر لی ہو۔

تذبذب میرے دماغ پر بُری طرح حادی تھا۔ قوت فکر مفلوج تھی۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ حقیقت کی اصل نوعیت کیا تھی۔ میں سوچتا تو اس تذبذب میں اور اضافہ ہی ہوتا۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل تھی کہ گذشتہ نومبر کے وسط سے تازی نے مجھ سے کشیدگی اختیار کرنی شروع کی تھی اس کشیدگی کی کوئی وجہ بھی نہ تھی۔ کم از کم اس کشیدگی کا موجب میں نہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ گذشتہ جولائی میں دوبارہ میرے کراچی سے منتقل ہونے پر تازی دل برگشتہ ہو گئی تھی۔ ممکن تھا کہ حنیف نے شادی کے لئے اصرار اور بھی زیادہ کر دیا تھا اور تازی نے اسی لئے مجھ سے کنارہ کشی کی تھی۔ اس کے بعد مارچ میں تازی نے مُنہ ہو کر اپنے خطوط اور تصویریں مجھ سے واپس منگالی تھیں۔ غالباً اس لئے کہ میرے پاس اس کی محبت کی کوئی نشانی نہ رہے۔ اس نے پھر مجھے کوئی خط نہ لکھا شاید اس لئے کہ اس کی توجہ حنیف کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ گذشتہ آٹھ ماہ کی مدت میں، جبکہ میں راولپنڈی میں تھا، تازی اور حنیف میں کوئی مفاہمت ہو گئی تھی۔

جب میں دوبارہ گذشتہ واقعات پر نظر ڈالتا تو یقین ہوتا جاتا کہ میں ایک عظیم غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ گذشتہ سال، شروع کے چھ ماہ کے کراچی کے قیام میں تازی کے رویہ کو غلط سمجھا۔ جسے میں تازی کی بے رُخی سمجھ رہا تھا وہ شاید محض نسوانی حیا تھی جو لڑکی کو اپنے منسوب سے ہوتی ہے۔ اسی حیا کی وجہ سے وہ حنیف سے نظر نہ ملاتی تھی اور پھر اتنی شرم آنے لگی کہ سامنے آنا بھی بند کر دیا تھا۔ تازی کی حنیف کے ساتھ شادی کے خیال سے مجھے بہت اذیت ہوتی۔ مجھے گمان ہوتا تھا کہ تازی جان بوجھ کر مجھے اذیت پہنچانے کے لئے ہی حنیف کے ساتھ شادی کر رہی تھی افسوس تو یہ تھا کہ مجھے خود بھی اس سے پہلے اندازہ نہ تھا کہ تازی میرے وجود پر کس طرح غالب تھی۔ اور یہ خیال کہ اب تازی میری نہ رہی تھی، میری زندگی اجیرن کئے دیتا تھا۔

میری بے حد کوشش تھی کہ تازی سے آمنا سامنا نہ ہو۔ میں چھوٹی ممانی کے ہاں بھی نہ گیا لیکن ماموں کا تبادلہ لائل پور ہو رہا تھا اور وہ سب جانے سے پہلے ہمارے ہاں ملنے آئے۔ میں جانتا تھا کہ تازی بھی ضرور آئے گی۔ لیکن میں نے اپنی کوشش کے باوجود بھی اپنے کو تازی کا منتظر پایا۔ ممکن تھا کہ ہم دونوں طویل مدت تک ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں۔ کیونکہ حنیف کا تبادلہ چاٹگانگ ہو چکا تھا۔ اور شادی کے بعد نہ معلوم وہ کتنے عرصہ وہاں رہتی۔ غالباً یہی وجہ تھی جو میں بیٹھا رہا تھا۔ بے بس، ساکت، منتظر۔ میں تازی کو ایک بار دیکھنا چاہتا تھا حسرت سے مایوسی سے۔ لیکن جب تازی سامنے آئی تو میری آنکھ نہ اٹھتی تھی —— میں کلام کی تاب نہ رکھتا تھا۔ بہت مشکل

سے میں نے اپنے حواس جمع کئے۔ پھر جرأت کر کے چاہی کہ تازی کو ایک نظر دیکھ لوں۔ ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی بھی تھی لیکن پھر میں بالکل انجان بن گیا جیسے تازی وہاں موجود ہی نہ تھی۔ میں نے اپنی کسی حرکت سے، اپنی آواز سے، اپنے چہرے سے اپنے حقیقی احساسات کو ظاہر نہ ہونے دیا۔ یہی ایک طریقہ تھا جس سے میں اب تازی کی مدد کر سکتا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ وہ ہماری محبت کو بالکل بھول جائے۔ میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد لڑکی بہت جلد محبت بھول جاتی ہے۔ مجھے امید تھی کہ اگر میں اپنی کمزوری ظاہر نہ ہونے دوں تو تازی اور بھی جلد بھول جائے گی۔ حنیف کو میں بہت بہتر انسان سمجھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی محبت تازی کو بہت جلد اپنا لے گی۔

میں نے تازی کو ایک نظر بھی نہ دیکھا اور وہ منجھلے ماموں کے ساتھ لائلپور منتقل ہو گئی۔

۱۶ دسمبر کی دوپہر کو کوٹھی کے باغ میں درخت سے چھنتی ہوئی دھوپ میں ٹانگیں کرسی پر پھیلائے میں کچھ جاگ رہا اور کچھ سو رہا تھا۔ طبیعت پر غنودگی چھائی تھی۔ آسمان گہرا نیلا اور شفاف تھا۔ فضا دھوپ کی تیزی میں آئینہ کی طرح چمک رہی تھی کہ یک بیک میرا شعور چونکا۔ مجھے یاد آیا تھا کہ تازی کی شادی ۲۵ دسمبر کو ہونے والی تھی ـــــــ صرف ایک عشرے بعد۔

اگلے روز ۱۷ دسمبر کو میں ہوائی جہاز سے دہلی پرواز کر رہا تھا۔ مجھے تار ملا تھا کہ ابا جان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ اور میں ان کے خاطر خواہ علاج کا بندوبست اور تیمارداری کے لئے دہلی جا رہا تھا۔

میں دہلی پہنچا تو میں نے ابا جان کی حالت بہت نازک دیکھی۔ میں دنیا و مافیہا کو بھول کر ان کے علاج اور تیمارداری میں محو ہو گیا تھا۔ دن بھر ڈاکٹر اور دوائیوں کی جستجو میں ساری دہلی اور نئی دہلی میں پھرتا۔ شب میں ہر دو گھنٹے بعد دوائی پلانی ہوتی اس لئے میرے لئے نیند سے یک بیک بیدار اور جاگتے جاگتے سو جانا معمول ہو گیا تھا۔ متواتر ایسی راتیں بسر کرتے میں بالکل بے حس ہو گیا تھا۔ مجھے صرف ایک چیز کا احساس تھا۔ وہ ابا جان کی تیمارداری تھی۔ ایک رات دفعتاً ابا جان کا انتقال ہو گیا۔ میں انہیں سنبھالے ہوئے تھا کہ ان کی روح پرواز کر گئی۔ میں نے موت کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ آدھ گھنٹے تک میں تذبذب میں رہا اور پھر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ سکتہ نہیں، بے ہوشی نہیں، موت تھی۔ آدھی رات سے زیادہ گزر چکی تھی۔ صبح ہوئی تو فروری کی ۱۹ تاریخ تھی۔ دادا جان کے قدموں میں ابا جان کو سپرد خاک کر کے میں واپس کراچی چلا آیا۔

ابا جان کی وفات نے مجھ پر بہت گہرا اثر کیا۔ اب میں کوشش کرتا ہوں تو بھی یاد نہیں آتا کہ

کراچی واپس پہنچنے کے بعد میں کیا کرتا رہا تھا۔ میں سوتا جاگتا، اٹھتا بیٹھتا، کھاتا پیتا ضرور ہوں گا لیکن میرے حافظہ میں کوئی فعل کوئی حرکت، کوئی قول بھی ثبت نہیں۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی مدت اس سانحہ کے غم میں کھویا رہا تھا۔

مجھے بھولا سا یاد پڑتا ہے کہ کراچی واپس آنے کے بعد میں نے چھوٹی ممانی کو خط لکھا تھا جس میں اباجان کی وفات کی خبر تحریر کی تھی۔ شاید میں نے تازی کی شادی ہو جانے پر انہیں مبارک باد بھی دی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ ۲۵ دسمبر کو تازی کی شادی حنیف کے ساتھ ہو چکی تھی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے چھوٹی ممانی کو کب خط لکھا تھا اور اس میں کیا لکھا تھا، لیکن یہ مجھے یاد ہے کہ مارچ کے شروع میں ان کا خط آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ تازی کی شادی نہیں ہوئی کیونکہ حنیف نے یک بیک بالکل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ چھوٹی ممانی کے خطوط کا جواب بھی حنیف نے نہ دیا۔ دسمبر کی ۲۵ تاریخ آئی، اور گذر بھی گئی لیکن حنیف کا نہ کوئی خط آیا تھا اور نہ کوئی خبر ملی تھی۔ میرے ذہن میں ابا جان کی وفات کا سانحہ اس وقت تک تازہ تھا اور میرے احساسات کی تمام قدریں بدلی ہوئی تھیں۔ اس لئے یہ خبر پڑھ کر بھی شاید میں بے حس ہی رہا تھا۔ وہ ماضی میرے حافظہ سے بہت دور تھا جب مجھے تازی سے محبت تھی۔ اور غالباً یہی وجہ تھی کہ میرا ذہن اس واقعہ کے تاثرات اور آئندہ امکانات سے یکسر خالی تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میری یہ کیفیت کب تک رہی تھی۔

اگست کے وسط میں کراچی سے کچھ ماہ کے لئے میں لاہور گیا۔ وہاں میرا قیام چھوٹی ممانی کے بھائی اسد صاحب کے ہاں تھا۔ مجھے لاہور پہنچے تیسرا ہی دن تھا کہ تازی کا خط بھابی کے پاس آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ چھوٹی ممانی کراچی چلی گئی تھیں۔ عجیب اتفاق تھا کہ جب میں ٹرین میں کراچی سے لاہور آ رہا تھا تو چھوٹی ممانی لائل پور سے کراچی جا رہی تھیں۔ ہماری ٹرینیں راستہ میں مقابل سمت میں رُخ کئے پاس سے گذر گئیں۔ تازی نے یہ بھی لکھا تھا کہ کراچی میں رہائش کا بندوبست ہوتے ہی باقی افراد بھی کراچی منتقل ہو جائیں گے۔ یہ قدرت کا ستم تھا کہ میں تازی کے قریب آیا تو تازی مجھ سے دور جا رہی تھی۔

لاہور پہنچنے کے ایک ہفتہ بعد ہی اسد بھائی لائل پور گئے تھے۔ دو دن بعد واپس آئے تو بتایا کہ چھوٹے ماموں نے مجھے لائل پور مدعو کیا تھا۔ مجھے کچھ پس و پیش تھا۔ تازی سے بات کئے مدت گذر چکی تھی۔ محسوس تو یہی ہوتا تھا۔ قطع کلام کا وقفہ اتنا طویل معلوم ہوتا کہ اس کے مقابلے میں محبت کی سرگوشیوں کی مدت چند روزہ معلوم ہوتی۔ میرا خیال تھا کہ میں بے وجہ جذباتی ہو گیا تھا مجھے خدشہ

تھا کہ میرے لئے تازی کے دل میں وہ جذبات نہ تھے جو میں اپنے دل میں بے تاب پاتا۔ اسی تذبذب میں دن گذرے جا رہے تھے کہ تازی کا ایک اور خط آیا۔ اس میں لکھا تھا کہ ۲۷ ستمبر کو وہ لائل پور سے لاہور آئے گی۔ اور پانچ دن قیام کر کے کراچی چلی جائے گی۔ اتنے عرصے کے فراق کے بعد صرف پانچ دن کی قربت بہت ہی مختصر معلوم ہو رہی تھی۔ میرے دل کی تشنگی اور بھی زیادہ دلگیر ہو گئی اور ہفتہ کا دن آتے ہی میں لائل پور چلا گیا۔

دن کے دو بجے تھے۔ کوٹھی کے باغ کا بڑا دروازہ بند تھا۔ میں نے اندر کی جانب دھکیلا تو اتنا خلا پیدا ہو گیا کہ میں ہاتھ ڈال کر کنڈا کھول سکوں۔ دروازہ کھول کر میں اندر گیا۔ کوٹھی میرے سامنے تھی۔ میں برآمدے تک پہونچا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ وہاں کوئی نہ تھا اور برآمدے کے دروازوں اور کھڑکیوں پر چلمنیں پڑی تھیں۔ اور خاموشی تھی سیڑھیاں چڑھ کر میں ایک لمحہ کے لئے رکا۔ میں فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ کس دروازے کا رخ کروں۔ میں نے دائیں جانب چلمن کی طرف رُخ کیا ہی تھا کہ کمرے میں سے بھی کوئی اسی چلمن کی طرف آیا۔ میں نے تازی کے خد و خال چلمن کی تیلیوں میں سے فرداں دیکھے۔ تازی چلمن اٹھا کر برق کی طرح میرے سامنے آگئی۔ میں دم بخود رہ گیا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ میں نے تازی کی آنکھوں میں اس ایک لمحہ میں کیا کیا دیکھا۔ اس ایک نظر میں تازی نے میرا محبت سے استقبال بھی کیا تھا۔ اب تک نہ آنے پر باز پرس بھی کی تھی۔ میرے سابقہ رویہ پر ملامت کی اور پوچھا بھی تھا کہ کیا تمہیں اپنی محبت یاد تھی۔ اس ایک نظر میں محبت اور فراق، مایوسی اور بے پناہ غم، انتظار کی جانکنی، دفورِ شوق کی طلب اور دید کی بے خودی کی ایک دنیا میں نے دیکھی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ سب میرے تصور کی کارفرمائی تھی یا میرے اپنے احساسات کا محض پرتو تھا۔ جو سراب کی طرح خود فریبی مجھے تازی کی آنکھوں میں دکھا رہی تھی۔ ممکن تھا کہ تازی کی نظر میں صرف استعجاب ہی تھا کیونکہ میں اچانک جا پہنچا تھا۔ لائل پور جانے کی اطلاع میں نے پہلے نہ دی تھی۔

چند لمحے تازی سکتے میں رہی۔ ایک قدم وہ میری طرف بڑھی۔ اسکے بند لب کھلے جیسے بات کیا چاہتی ہو کہ اندر سے چھوٹے ماموں نے پوچھا کہ کون آیا ہے۔ تازی الٹے پیر اندر چلی گئی۔ چھوٹے ماموں جلدی سے باہر آئے اور بہت شفقت سے مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ بے تکلفی سے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے اندر لے گئے۔ اور باتوں کا دفتر کھل گیا۔ ایک سال میں لائل پور کے پانی اور ہوا نے چھوٹے ماموں کے رنگ کو بہت نکھار دیا تھا اور چہرے کے گوشے اور شکنیں قدرے دھندلی ہو گئی تھیں۔ انکی وضع داری

میں کوئی فرق نہ آیا تھا براق سا سفید ململ کا کرتہ اور چست پاجامہ پہنے تھے اور منہ میں پان رچا تھا۔ نسرین دوپٹہ سے سینہ ڈھانکے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ نسرین دو سال تازی سے چھوٹی تھی اور دونوں کی شادی تقریباً ساتھ ساتھ طے پائی تھی۔ نسرین کی شادی لائل پور منتقل ہونے کے چند ہفتے بعد ہی ہو گئی تھی۔ ایک ماہ ہوا تھا کہ اس کے ہاں بچہ بھی ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ نسرین کے چہرے پہ ماں کی شفقت، محبت کی نرمی اور تابندگی کے بجائے سختی تھی۔ اس کا رنگ بدمزہ معلوم ہوتا تھا وہ پہلے سے بھی زیادہ دبلی ہو گئی تھی۔ اور لمبے لمبے بازو اور ٹانگیں دبلاپے میں اور بھی زیادہ بدنما معلوم ہوتے۔ میرا خیال تھا کہ شادی کے بعد کچھ عرصہ کے لئے بدصورت لڑکی میں بھی جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک گونہ زیادہ گداز ہو جاتی ہے ایک کیف چھایا رہتا ہے لذتِ ازدواج کی شدت سے۔ نسرین تو بیوی ہی نہیں ماں بھی بن چکی تھی۔ زچگی کی نقاہت عورت میں نسوانیت کو معراج پر پہنچا دیتی ہے جو ممتا دودھ بنکر سینہ میں ابلتی ہے وہ نور بنکر چہرے کو منور کر دیتی ہے۔ لیکن نسرین کا چہرہ دودھ پلاتے ہوئے بھی بے آب تھا۔ کچھ دیر بعد تازی نے نسرین کے بچے کو اپنی گود میں لیا اور بہت محبت سے اسکو چوما۔ میرا دل یک بیک منہ میں آ گیا اور بڑی مشکل سے میں اُسے واپس نگل سکا۔

باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ نسرین بھی باتوں میں شریک تھی لیکن تازی نے بات نہ کی تھی۔ وہ خاموش تھی۔ پھر اسے کچھ خیال آیا اور جھک کر چھوٹے ماموں سے آہستہ سے کچھ کہا۔ چھوٹے ماموں نے فوراً مجھ سے پوچھا کہ تم نے کھانا تو ابھی نہ کھایا ہوگا۔ مجھے بھی معاً محسوس ہوا کہ بے حد بھوک لگ رہی تھی۔ ہم سب اپنی وارفتگی پر بے ساختہ ہنس پڑے اور میرے کھانے کا انتظام کرنے تازی باورچی خانے کی طرف خاناماں کو آواز دیتی چلی گئی۔

دوسرے دن میں بھی فاروق (نسرین کے خاوند) کے ساتھ ان کی مل گیا۔ جہاں وہ اسسٹنٹ منیجر تھے۔ راستے میں حنیف کا ذکر میں نے چھیڑا۔ فاروق بھی حنیف سے واقف تھے اور حالات سے باخبر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ لائل پور آنے کے بعد اکتوبر کے آخر تک ٹھیک ٹھاک حنیف کے خطوط چھوٹی ممانی کے پاس برابر آتے رہے۔ اُن خطوط میں جھلک بھی نہ تھی کہ وہ عنقریب اپنا ارادہ تبدیل کرنے والے ہیں اس کے برعکس حنیف کا شوق مضحکہ خیز ہو چلا تھا۔ ان کا خط آتا تو کئی دن تفریح رہتی وہ ہر اس کپڑے اور زیور کی تفصیل لکھتے جو وہ تازی کے لئے خریدتے تھے ساتھ یہ بھی لکھتے کہ ان ملبوسات اور زیورات میں تازی کس قدر حسین معلوم ہو گی۔ ہر خط میں جو وہ شاعری فرماتے تھے بہت دلچسپ ہوتی۔ اس کے بعد نومبر کا آدھا مہینہ گذر گیا اور حنیف کا خط نہ آیا۔ چھوٹی ممانی نے جوابی تار دیا اس کا جواب بھی نہ آیا۔

یہاں تک کہ دسمبر کا وسط ہو گیا اور حنیف کی کوئی خبر نہ ملی تھی۔ اس کے بعد چھوٹی ممانی بھی خاموش ہو گئیں۔ حنیف کی یک بیک خاموشی میری سمجھ میں نہ آئی تھی۔ میں نے فاروق سے وجہ پوچھی تو وہ بھی کوئی جواب نہ دے سکے۔

فاروق کو بل میں چھوڑ کر واپس پہنچا تو چھوٹے ماموں اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے۔ جب وہ تاش کھیلتے تو دنیا و مافیہا کا ہوش نہ رہتا۔ میں بیٹھا نسرین سے باتیں کرتا رہا۔ تازی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد باورچی خانے کا چکر لگا آتی۔ وقت بہت سست رفتاری سے گزرتا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے گھڑی میں دیکھا تو ساڑھے گیارہ ہی بجے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ چھوٹے ماموں کا تاش تمام دن ختم نہ ہوگا۔ فاروق شام کو پانچ بجے سے پہلے واپس نہ آئیں گے۔ نسرین سے باتیں کرنے کے لئے موضوع بہت محدود تھے اور خاموشی کے وقفے طویل ہوتے جا رہے تھے۔ فاروق کی چھوٹی بہن یاسمین جو عمر میں تقریباً آٹھ سال کی تھی بیٹھی تاش کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اُسے تاش کھیلنا نہ آتا تھا۔ وقت گزارنے کے لئے میں نے اُسے اپنے پاس بلایا اور ہم دونوں تاش کھیلنے لگے۔ نسرین کا بچہ سو گیا تھا اور وہ خود بھی اپنے کمرے میں جا سوئی تھی۔ تازی ہمارے پاس آ بیٹھی اور تاش میں دلچسپی لے رہی تھی چنانچہ ہم نے رمی کھیلنی شروع کی۔ تاش کے پتے یاسمین کے ہاتھ میں تھے اور تازی پتے اٹھاتی اور پھینکتی جاتی۔ یہ سلسلہ کچھ دیر اسی طرح چلا۔ پھر تاش کے پتے بھی تازی نے اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے۔ تازی اور میں تاش کھیل رہے تھے۔ یاسمین بیٹھی کھیل دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں ساتھ کھیلنے کے باوجود ایک دوسرے سے ہم کلام نہ ہوتے تھے۔ پھر اکتا کر یاسمین برآمدے میں چلی گئی تھی۔ اب تازی اور میں کمرے میں تنہا تھے۔ مجھے کھیل میں دلچسپی نہ رہی تھی۔ میں کھیل رہا تھا لیکن [illegible] تازی کو دیکھ رہا تھا۔ ہماری نظریں بار بار ملتی تھیں۔ میں متوجہ تھا۔ اس لئے پتہ پھینکنے میں دیر ہو جاتی تھی۔ تازی آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے جلدی پتہ پھینکنے کے لئے کہتی۔ کچھ دیر بعد میں پہلی دفعہ تازی سے مخاطب ہوا۔ ہم دونوں تاش سے متعلق ایک ایک دو دو باتیں کر لیتے۔ اس دوران میں یاسمین کمرے میں آتی جاتی رہی۔ نسرین کا بچہ جاگا، رویا، سویا اور پھر جاگ چکا تھا۔ نسرین ایک نیند لے کر واپس آ گئی تھی لیکن تازی اور میں تاش کھیل رہے تھے یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہو گیا۔

کھانے کے بعد کچھ دیر تو نسرین ہمارے پاس بیٹھی باتیں کرتی رہی پھر اُسے نیند آنے لگی۔ غالباً ماں بھی اسقدر سوتی ہے جس قدر خود بچہ۔ وہ اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ بڑی دیر یاسمین ہمارے پاس بیٹھی گڑیوں سے کھیلتی رہی پھر اکتا کر برآمدے میں چلی گئی۔ تازی اور میں نے دوبارہ تاش کھیلنا شروع

کر دیا۔ کمرے میں گرمی نہ تھی۔ اس کے باوجود میں نے پنکھا چلایا تھا۔ سرسراتی ہوئی ٹھنڈی ہوا مجھے اچھی معلوم ہوتی۔ پنکھے کی ہوا سے تازی کے ہاتھ ٹھنڈے ہو گئے۔ اسلئے اپنے پانوں شلوار کی موریوں میں سکیڑ لئے۔ میں نے اصرار بھی کیا کہ پنکھا بند کر دوں لیکن تازی نے قبول نہ کیا۔ تازی کے ہاتھوں کی ٹھنڈک کو بغیر چھوئے میں محسوس کر رہا تھا۔ جب تازی تاش کے پتے تقسیم کر رہی تھی تو میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تازی کے ہاتھ ہمیشہ خنک ہو جاتے تھے اور میرا معمول تھا کہ میں اپنے ہاتھوں میں لے کر ان کو گرم کرنے کی کوشش کرتا۔ تازی نے ہاتھ بہت پُرمعنی سپردگی کے ساتھ دیا تھا۔ میں اس قدر بے خود ہوا کہ نہ معلوم اسکے بعد کیا کیا باتیں کرتا رہا۔ میری طبیعت چاہی کہ اُن لبوں کو محسوس کروں جنہیں پہلے میں چوم چکا تھا۔ میری لرزش انگلیوں کی پوریں تازی کے لب، رخسار، ابرو اور زلفوں کی بھول بھلیوں میں کھو گئیں۔

اسی رات میں واپس لاہور چلا گیا۔

میں کوٹھی میں داخل ہوا تو اسد بھائی کی چھوٹی لڑکی اسما خوشی سے بے خود دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور پوچھا۔

"آپ ہماری اِن بہن کو جانتے ہیں؟"

اُس نے برآمدے کی طرف اشارہ کیا اور اپنی چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی آنکھوں کو جھپکا کر بتا رہی تھی۔

"یہ لائل پور میں رہتی ہیں۔ آج ہی آئی ہیں۔"

میرے دونوں ہاتھ چاء اور بسکٹ کے ٹن سے گھرے ہوئے تھے۔ میں برآمدے میں سے گذر کر سائڈ بورڈ کی طرف جا رہا تھا۔ اسما خوشی سے بے خود پھدکتی ہوئی میرے ساتھ چل رہی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ مجھے گھسیٹ کر لائل پور سے آئی ہوئی اپنی بہن کے پاس لے جائے۔ جب ٹن میں سائڈ بورڈ پر رکھ چکا تو اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنی بہن کے پاس لے گئی۔ میں تازی کے روبرو کھڑا تھا۔ اسما میرا ہاتھ چھوڑ کر تازی سے لپٹ گئی۔

"یہ ہمارے بھائی ہیں۔" اسما نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ پھر یک بیک پوچھا۔

"آپ انہیں جانتی ہیں؟"

اسما کے اس سوال پر تازی اور میں دونوں بے اختیار ہنس پڑے۔

گذشتہ ڈیڑھ ماہ کے قیام میں اسمآء، مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔ میں جب لاہور آیا تھا تو اس کے لئے بالکل اجنبی تھا۔ وہ مجھ سے شرماتی تھی۔ اسنے پہلے مجھے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اُسے حیرت بھی کہ پہلے دن سے ہی سب مجھ سے بے تکلف ہو گئے تھے۔ چنانچہ اسنے اپنی امی سے اکیلے میں پوچھا بھی تھا کہ یہ کون ہوں۔ اسمآء کی عمر آٹھ سال کے قریب تھی۔ لیکن اس میں وہ تمام احساسات بیدار ہو چکے تھے جو خوبصورتی کے مقابلے میں بے توجہی بدصورت لڑکی میں پیدا کر دیتی ہے۔ اسمآء کو احساس تھا کہ وہ خوبصورت نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سب اس کی بڑی بہن سعیدہ سے لاڈ کرتے تھے، اس لئے کہ وہ نسبتاً زیادہ خوبصورت تھی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لئے وہ غیر شعوری طور پر کوشش کرتی لیکن بہت دلچسپ انداز میں وہ دلچسپ باتیں کرتی، ہر چیز میں زیادہ دلچسپی لیتی اور اپنی بساط سے زیادہ ہوشمندی کے ساتھ ہر ایک کو خوش کرنے کی کوشش کرتی۔ ہر کام سلیقہ سے کرتی۔ میں بہت توجہ سے اسمآء کی حرکات دیکھتا رہا۔ اس نے بہت خوبصورتی کے ساتھ مجھے اپنا گرویدہ کر لیا۔ وہ سب کو اپنا گرویدہ کر لیتی۔ تازی کو بھی اسمآء بہت پسند تھی

اسمآء کے معصومانہ تعارف پر بے خود ہو کر تازی نے اُسے چوم لیا۔ اس طرح کہ تازی کے لب اسمآء کے رخسار پر تھے اور آنکھیں مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ کاش میں بھی چند لمحے کے لئے اسمآء کے برابر چھوٹا ہو جاتا تو وہ مجھے بھی اسی آزادی سے چوم لیتی۔ تازی کے حسنِ طلب پر میں مسرور بھی تھا اور قدرے متعجب بھی۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ وہی تازی تھی جو پندرہ روز قبل لائل پور میں بے حس تھی۔ جس کی نظریں محبت کے عرفاں سے خالی تھیں۔ لب آہنی سانچے میں ڈھلے تھے۔ چہرے پر زردی اور پژمردگی تھی اور سینے میں محبوس کبوتر جو نحیف پردوں میں چھپائے سوئے ہوئے تھے ——— جیسے تحریری ان کا شیوہ ہی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی کہ گذشتہ پندرہ دن میں تازی نے اپنے حبسِ طویل سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ تصوّر کے دوش پر سوار محبت کی وسیع پہنائیوں میں دُور تک سیر کر آئی تھی۔ اسکی آنکھوں میں تابندگی تھی۔ لبوں کے بند کھلے ہوئے، رخساروں پر پیاز کی سی تیزی جو سیدھی دماغ کو جا چڑھتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ہمارے درمیان پھر پہلی سی یگانگت قائم ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا کبوتر گردن پھلائے گونج رہے تھے۔

اور پھر تازی نے اسمآء کو ستانے کے لئے کہا۔

"بس یہ ہیں تمہارے وہ بھائی جن کی تم اس قدر تعریف کر رہی تھیں۔ ہمیں تو ذرا بھی پسند نہ آئے۔ ذرا دیکھو تو ان کی ہئیت ..... "

اور ذرا سی دیر میں تازی نے میرا خاکہ اڑا دیا۔ استاد رونکی ہو گئی۔ تازی نے مجھے کچھ اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ کاش وہ کہہ سکتی کہ میں اسے کس قدر پسند تھا۔ اور استاد کو اس شدت کے ساتھ چوم رہی تھی کہ اس غریب کا سانس گھٹ گیا۔

اس واقعہ پر ہم بہت دیر تک ہنستے رہے۔

دوسرے دن صبح اتوار تھی۔ مجھے چند خطوط لکھنے تھے۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر میں آفس کے کمرے میں جا بیٹھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ باہر برآمدے میں کھلتا اور دوسرا ملاقات کے کمرے میں۔ کوٹھی کے اس حصہ میں کھانے کا کمرہ تھا۔ اور اس سے ملحق مہمانوں کا کمرہ۔ کوٹھی کے دوسرے حصے میں سونے کے کمرے تھے۔ اور بیچ میں گیلری۔ آفس کے کمرے میں داخلہ یا تو برآمدے میں سے تھا یا ملاقات کے کمرے میں سے اور اس لحاظ سے یہ کمرہ ساری کوٹھی سے زیادہ الگ تھا۔ میں بیٹھا خط لکھنے میں مصروف تھا کہ تازی کمرے میں آئی اور دیوار کے پاس رکھے سوٹ کیس کو کھول کر کپڑے لگانے میں مصروف ہو گئی۔ مجھے بہت حیرت ہوئی۔ اس سوٹ کیس پر میری نظر کیا سا پڑی تھی۔ میں نے دیکھا تھا کہ لائل پور سے گذشتہ روز جس قدر سامان آیا تھا وہ اندر گیلری میں رکھا تھا۔ یہ عجیب اتفاق تھا اور نہ معلوم کس طرح عمل میں آیا کہ صرف تازی کا سوٹ کیس آفس کے کمرے میں رکھا تھا۔ تازی ایک قمیص اپنے اوپر رکھ کر دیکھ رہی تھی کہ پہنے ہوئے کیسی معلوم ہو گی۔ میں تازی کو دیکھ رہا تھا لیکن وہ بہت کوشش سے انجان بنی قمیص کو دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی تھی کہ میری موجودگی کا اسے علم ہی نہ تھا۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ جان بوجھ کر وہ میرے پاس اس کمرے میں آئی تھی۔ سوٹ کیس میں سے کپڑے نکالنا تو محض ایک بہانہ تھا۔ پیڈ اور قلم میز پر رکھ کر میں تازی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یک بیک تازی میرے بازوؤں کی گرفت میں تھی۔ اپنے لب میں نے اس کے لبوں پر رکھ دیئے۔ میرے لبوں کو اس نے مقناطیس کی طرح جذب کر لیا۔ تازی کا تنفس میری مونچھوں میں سرسرا رہا تھا۔ میری گردن اس کے بازوؤں کی گرفت محسوس کر رہی تھی۔ میرا تمام بدن تازی کے جسم کی آنچ میں تپ رہا تھا۔ دفعتاً تازی کانپ اٹھی۔ اس نے اپنا جسم مجھ سے الگ کر لیا۔ وہ مسرت سے سرشار تھی۔ لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے میری جسارت پر مجھے ملامت بھی کی۔ وہ سہمی تھی۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔ میں واپس آ بیٹھا اور تازی کپڑوں کی الٹ پلٹ میں مصروف ہو گئی۔

گذشتہ شام استاد کے دلچسپ تعارف کے بعد ہم نے چائے ساتھ پی۔ تازی اپنے مخصوص دلفریب انداز میں مجھ سے چہل کرتی رہی۔ اس کے بعد ہم سب گھاس پر جا بیٹھے۔ اور رات کی سیاہی گہری ہونے

تک باتیں کرتے رہے۔ رات کو کھانے کی میز پر تازی میرے پاس بیٹھی۔ اُسنے حسب معمول بہت کم کھایا کیونکہ اپنی کمر کو وہ بہت مختصر رکھنا چاہتی تھی۔ وہ تمام وقت اسد بھائی کے ساتھ مجھ پر ہنستی رہی۔ صرف اس لئے کہ نوالہ بناتے اور کھاتے میری ایک انگلی الگ رہتی۔ جب کبھی اسد بھائی کا قہقہہ بہت بلند اور طویل ہو جاتا تو تازی میز کے نیچے سے میرے چٹکی لیتی۔ کھانے کے بعد اسد بھائی اور چھوٹے ماموں ڈرائنگ روم کے قالین پر رم کو بیٹھ گئے اور رمی شروع کردی۔ مجھے تاش سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں نے بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ بھابی اور تازی نے سازش کی کہ میرے ساتھ رمی کھیلیں اور دونوں مل کر مجھے خوب ہرائیں۔ میں تازی کے ساتھ کھیل کر بہت کچھ ہارنے کو تیار تھا۔ میں نے چیلنج فوراً منظور کیا اور ہم تینوں تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ بھابی کا دل بہت کمزور تھا۔ اس لئے سازش کے باوجود بھی سٹیک زیادہ نہ رکھا۔ مجھے تو اُس وقت ہر بات قبول تھی۔ میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ تازی کے وجود کی لَو کے گرد ہالہ کئے رہوں۔ بھابی اپنے پتوں میں منہمک تھیں۔ اسد بھائی اور چھوٹے ماموں کی رمی کا سٹیک بہت زیادہ تھا۔ وہ ہاتھ کے پتوں کے عدد کم کرنے میں مشغول تھے۔ مجھے تاش میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں سود و زیاں سے بالکل بے فکر تازی کے مقابل بیٹھا ایک ایک شعاع جذب کر رہا تھا۔ بہت دیر ہو چکی تھی۔ گھنٹہ ایک بج چکا تھا لیکن ہم تاش کھیل رہے تھے۔

نہ معلوم کیوں مجھے محسوس ہوتا کہ تازی کسی خلش کو مجھ سے چھپا رہی تھی۔ کبھی وہ یک بیک نظریں پھیر لیتی۔ جیسے میرے چہرے پر کوئی خوفناک تحریر ہو۔ کبھی وہ چند لمحوں کے لئے کھو جاتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ وہ مجھ سے بہت دور چلی جاتی اور میں اُسے کھو بیٹھتا۔ یہ حقیقت تھی یا میرا وہم۔ میں تازی سے پوچھنے کے لئے مضطرب تھا۔ تازی نے سوٹ کیس میں سے ایک جوڑا نکالا تھا اور غسل بند کر رہی تھی۔ میں نے موقع غنیمت سمجھا اور پوچھ ہی لیا۔ وہ بات ٹالنا چاہتی لیکن میں مصر تھا۔ تازی کو کمرے میں آئے کافی دیر ہو چکی تھی اور خدشہ تھا کہ مزید توقف مشتبہ نظروں سے دیکھا جائے۔ لڑکی کے لئے عیب کا ذرا سا واہمہ بھی جان لیوا ہوتا ہے۔ تازی اس خدشہ کی آڑ لے کر میرے سوال سے جان بچانا چاہتی تھی۔ مجھے امید نہ تھی کہ ان چند دنوں میں پھر کبھی تنہائی میں بات کرنے کا موقع ملیگا میں نے تازی کی قمیض چھین لی۔ مجھے یقین تھا کہ تازی قمیص لئے بغیر کمرے سے نہ جائے گی۔ تازی نے چند لمحوں میں ہی مجھے بتا دیا۔ وہ یہ حقیقت بھول سکی تھی کہ میں بہت سخت دل تھا۔ میں نے اپنے پورے خلوص کے ساتھ ایک بار پھر یقین دلایا کہ مجھے تازی سے محبت تھی۔

ملن کا سلسلہ اگلی شب کھانے کے بعد شروع ہوا تھا۔ اسد بھائی اور چھوٹے ماموں تو تاش

کے دھتی تھے ہی لیکن بھابی پر نہ معلوم کیوں رمی کھیلنے کا جنوں سوار تھا۔ دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد ہی بھابی نے تازی سے کہا کہ دوپہر کھانے کے بعد پھر تاش کھیلیں گے۔ وفورِ شوق سے ان کے چہرے پر پھلجھڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ بھابی مہمان کے آنے سے بہت خوش ہوتیں۔ اور کھلانے کا انتظام بہت انہماک سے کرتیں۔ غالباً اچھے کھانوں کا بھابی کو خود بھی بہت شوق تھا۔ باورچی خانے کی تپتی ہوئی فضا میں ان کے تمتمائے چہرے پر مسرت کی افشاں چمکتی رہتی۔ رمی کا دوسرا دور دوپہر کے کھانے کے بعد شروع ہوا۔ ڈرائنگ روم کا وہی بڑا قالین۔ بیچ کی گول میز رات سے ہی بخاری کے پاس رکھی تھی۔ اسد بھائی اور چھوٹے ماموں ایک صوفے کا سہارا لئے رمی کھیل رہے تھے۔ دوسرے صوفے کے سہارے میں بیٹھا تھا۔ بھابی بک شیلف کے قریب بیٹھی اپنے پتوں پر جھکی تھیں۔ تازی میرے مقابل بیٹھی تھی۔ وہی قمیض پہنے جو میں نے صبح آفس کے کمرے میں کھینچی تھی۔ اس قمیض کو دیکھ کر میری طبیعت ... گدگدی ہوتی۔ مجھے محسوس ہوتا کہ قمیض ہماری ہمراز تھی۔ اور ہنوز اس مختصر لمس کی جذباتی شدت ... کو محسوس کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی جو اس کا رنگ نسوانی شرم سے گلابی تھا۔ کبھی تو وہ اس قدر شرماتی کہ سرخ ہو جاتی۔ اس کا ایک ایک پھول شرم سے منہ چھپاتا نظر آتا۔ پھر وہ اپنے کو سنبھال لیتی۔ اس کے پھول مسکراتے۔ اس دلچسپ انداز میں جو محبت جیسے حسین راز سے آگہی پیدا کر دیتی ہے۔ پھر میں دیکھتا کہ وہی پھول شرارت سے بے خود ہو جاتے اور بڑی بے باکی سے چشمک کرتے مجھے محسوس ہوتے کہ وہ قمیض پھر میرے ہاتھوں میں تھی اور یک بیک اس قمیض میں تازی سما جاتی۔ اس کا تنفس میری مونچھوں میں سرسراتا۔ میری طبیعت گدگداتی۔ تازی میرے سامنے بیٹھی تھی، سر اٹھائے، سیدھی، لیکن اس کے سینے میں بند کبوتر بار بار کلبلاتے۔ بغل میں سے ہاتھ لے جا کر وہ بند ڈھیلا کرنے کی بار بار کوشش کرتی تھی۔

رمی کا دور چلتا رہا۔ دن ڈھل چکا تھا۔ کمرے کے کونوں میں اندھیرا ابھرتا جا رہا تھا۔ چائے کا وقت ہوئے دیر ہو چکی تھی اور طلب بے قرار تھی۔ لیکن تاش بھی ہاتھ سے نہ چھٹتا۔ چنانچہ چائے ڈرائنگ روم کے قالین پر ہی پی گئی۔ چائے کے بعد میں نے سینما کی دعوت دی۔ وقت کم رہ گیا تھا۔ عورتیں لباس کی تبدیلی اور سنگھار میں عجلت کی قائل نہیں۔ تازی کو بھابی سے بھی زیادہ اہتمام تھا۔ بھابی کو تیار ہوئے مدت ہو چکی تھی لیکن تازی کے کمرے کا دروازہ ہنوز بند تھا۔ سینما شروع ہونے میں بہت کم وقت رہ گیا تھا۔ اسد بھائی اور بھابی نے انتظار سے تنگ آ کر تقاضوں کی یورش کر دی۔ بالآخر تازی جوتی پیر میں ڈالتی کمرے سے باہر آئی۔ بھابی نے تازی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ حیران

تھیں کہ تازی نے کس تقریب میں اس قدر اہتمام سے سنگھار کیا تھا۔ انہوں نے استفہامیہ انداز میں تازی کو دیکھا لیکن تازی نے شرم سے سر جھکا لیا۔ اس کی نظریں مجھے ڈھونڈھ رہی تھیں اور داد حسن چاہتی تھیں۔ بھابی نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا جیسے کہتی ہوں کہ چور پکڑا گیا۔ میں کوشش کے باوجود بھی تازی پر سے نظر نہ ہٹا سکا تھا۔

شب میں ہم سینما سے آئے تو تازی کی نانی اماں بہت جزبز ہو رہی تھیں۔ وہ اپنی ناراضگی الفاظ میں نہیں بلکہ لہجہ کی تلخی سے ظاہر کرتیں۔ اس شب ان کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ اسد بھائی نے تو اپنی امی جان کی خفگی پر توجہ نہ دی۔ زندگی کی اس قدر معمولی بے اعتدالیوں کی وہ غالباً پرواہ نہ کرتے تھے۔ بھابی البتہ گھبرائی تھیں۔ ناراضگی کی ساری وجہ یہ تھی کہ اس شب داماد کی خاطر بھابی کی غیر موجودگی میں کھانے کا انتظام انہیں کرنا پڑا تھا۔ میرے قیام کے دوران میں یہ پہلا اتفاق تھا جو میں نے انہیں اس قدر برافروختہ دیکھا۔ مجھے حیرت تھی کہ اس قدر معقول، متحمل اور فرشتہ خصلت ہونے کے باوجود اتنی معمولی سی بات پر وہ اس قدر غصہ ہو گئی تھیں۔

شب کو کھانے کے بعد ہم پھر دو ٹکڑیوں میں بٹ گئے اور ڈرائنگ روم کے قالین پر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ رمی کا دور پھر شروع ہو گیا۔

اسد بھائی اور ان کے ساتھ ان کی بیوی اور بچیاں سارے سال کمرے میں سوتے۔ ڈرائنگ روم کے مقابل ان کے سونے کا کمرہ تھا۔ گذشتہ شب چھوٹے ماموں ڈرائنگ روم میں پنکھے کے نیچے سوئے تھے۔ ان دونوں کمروں کے درمیان گیلری میں پنکھے کے نیچے تازی سوئی تھی۔ اسد بھائی کے ابا جان اوپر کی منزل میں رہتے تھے۔ چھت بہت کشادہ تھی۔ میں بھی چھت پر سوتا تھا۔ اکتوبر کا آغاز تھا راتوں کو اوس بہت پڑتی تھی ——— اتنی کہ بستر نم ہو جاتا۔ اگر پلنگ برآمدہ میں کرلیتا تو گرمی محسوس ہوتی۔ کیونکہ شب میں ہوا کی رمق بھی نہ ہوتی۔ گرمی کے باوجود چادر سے جسم ڈھانکے بغیر سونا محال تھا۔ مچھروں کی بہت افراط تھی۔ رمی کے دوران میں مجھے خیال آیا کہ میں بھی ڈرائنگ روم میں پنکھے کے نیچے سوجاؤں۔ میرے خیال کو سب نے سراہا۔ اسد بھائی ابتدائے قیام سے مصر تھے کہ میں پنکھے کے نیچے کمرے میں سویا کروں۔ لیکن مجھے کھلے آسمان کے نیچے سونے کا بہت شوق تھا۔ یک بیک میری اس تبدیلیٔ خیال پر اسد بھائی نے بہت بلند قہقہہ لگایا۔ اور خوش تھے کہ بالآخر میں ان کا مقلد ہو ہی گیا۔ چھوٹے ماموں بھی خوش تھے کہ کمرے میں ایک سے دو ہو جائیں گے۔ کمرے میں تنہا سونے سے انہیں شاید خوف محسوس ہوتا تھا۔ بھابی کو خوشی تھی کہ رمی بہت رات تک کھیل سکیں گے۔ گذشتہ شب میں

سونے کے لئے اوپر گیا تو اسد بھائی کی امی بیدار تھیں۔ انہوں نے مجھ سے وقت پوچھا تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ تاش سے گھر میں نحوست پھیلتی تھی ـــــ اسد بھائی کے تاش کھیلنے سے نہیں بلکہ اس نحوست کا باعث بھابی ہوتیں۔ بھابی خوش تھیں کہ میں اوپر سونے نہ جاؤں گا تو انہیں معلوم نہ ہو سکے گا کہ ہم کتنی رات تک تاش کھیلتے رہے۔ چنانچہ میرا بستر اوپر سے نیچے منگا لیا گیا۔

میرا بستر نیچے آنے کے تھوڑی دیر بعد اسد بھائی کی امی نیچے آئیں۔ زینے پر ان کے قدموں کی آواز سے ہی بھابی کا خون خشک ہو گیا۔ ڈرائنگ روم میں وہ آئیں تو ہونٹ بہت شدت سے بھینچے ہوئے تھے۔ اسد بھائی نے حسب معمول توجہ نہ دی۔ چھوٹے ماموں سگریٹ نکال کر سلگانے لگے۔ بھابی نے گردن جھکا کر پتوں کی آڑ لی۔ تازی کی پیٹھ تھی۔ اور اس کی شریر آنکھیں مجھے بتا رہی تھیں کہ آفت آنے والی ہے۔ اسد بھائی کی امی کو میں دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی باراں دیدہ نگاہوں سے ایک ساعت میں پورے منظر کا جائزہ لیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ انہیں جو شبہ تھا اس کا ثبوت مل گیا۔ انہوں نے فرداً فرداً سب کو غور سے دیکھا لیکن مجھ پر اچٹتی ہوئی بھی نظر نہ ڈالی۔ پہلے تو میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ لیکن یک بیک مجھ پر عیاں ہو گیا کہ ان کی ناراضگی کی وجہ کیا تھی۔ تازی کا میرے اتنے قریب رہنا انہیں سخت ناگوار تھا۔ اول شب بھی ان کی ناراضگی کی وجہ یہی تھی۔ ہمارے ساتھ تازی کا سینما جانا انہیں بالکل نہ بھایا تھا۔ میں حیران تھا کیونکہ تازی کے لاہور آنے سے قبل وہ مجھے بہت پسند کرتی تھیں اپنے بیٹے اسد بھائی سے بھی زیادہ۔ نہ معلوم کیوں تازی کا میرے اتنے قریب رہنا انہیں ناگوار تھا۔ غالباً اسے وہ ایک شریف لڑکی کے لئے صد درجہ بے حیائی کہتی تھیں۔ میں اسی تذبذب میں تھا کہ وہ الٹے قدم لوٹ گئیں۔ زینے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تازی کو آواز دی اور چند ہی منٹ بعد تازی اور تازی کا بستر دونوں اوپر چلے گئے۔

اسد بھائی کی امی کے اس اقدام نے صورتِ حال یکسر بدل دی۔ رات کے واقعہ کی ہیبت دوسرے دن بھی سب پر طاری تھی لیکن میری طبیعت بغاوت پر مصر تھی۔ غالباً وہ بغاوت نہیں جنوں تھا جس نے مجھے اس قدر دلیر کیا۔ پیر کی شام میں گھر آیا تو سب کو آئس کریم کے لئے شہزان مدعو کیا۔ تازی کو آئس کریم بہت پسند تھی اور میں ہر ممکن تواضع کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بھابی نے سکیم کا نوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ خلافِ معمول اسد بھائی بھی خوفزدہ ہو گئے۔ چنانچہ ارادہ ترک کر دینا پڑا۔ اس شام تمام وقت تازی اپنے نانا ابا اور نانی کے پاس بیٹھی رہی۔ اسد بھائی اور میں بھی ان کے پاس بیٹھے کھانے کے وقت تک باتیں کرتے رہے۔ اس رات اسد بھائی اور چھوٹے ماموں نے بھی تاش دیکھی

کھانے سے فارغ ہوتے ہی تازی اپنی نانی اماں کے ساتھ اوپر چلی گئی۔ مجھے بہت ملال تھا کہ گنتی کے پانچ دن کے قیام میں تین دن گذر چکے تھے اور ہمارے درمیان ایک وسیع خلیج حائل تھی۔

دوسرے دن صبح میری آنکھ کھلی تو مایوسی مجھے بُری طرح گھیرے ہوئے تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ آئندہ شب تازی کراچی چلی جائے گی۔ اور پھر نہ معلوم کب ملاقات ہو۔ گذشتہ دن کی محرومی نے میری ساری امیدوں کو خاکستر کر دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ باقی دو دن بھی اسی محرومی سے گذر جائیں گے۔ میرا وجود میرے لئے بہت گرانبار ہو گیا۔ میں بستر سے اٹھا، پنکھا بند کیا اور ڈرائنگ روم سے باہر آیا۔ دن نکلے دیر ہو چکی تھی۔ اور دھوپ کی چمک سے آسمان روشن تھا۔ میں اپنے بھاری قدموں کو گھسیٹتا لوٹے میں پانی لے کر زینے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ ایک پاخانہ پہلی منزل کی چھت پر بھی تھا اور ہر صبح میں اُسے استعمال کرتا تھا۔ زینہ مڑتا ہوا چڑھتا تھا۔ نیچے سے اوپر جاتے ہوئے پہلی پانچ سیڑھیوں کے بعد زینہ مڑتا اور آٹھ سیڑھیاں ایک نیم دائرہ بناتی اوپر جاتیں۔ اس دائرے کے اختتام پر مقابل دیوار میں روشن دان تھا جس میں سیمنٹ کی جالی لگی تھی۔ اور پہلی منزل کی سطح کے متوازی تھا۔ اس روشن دان کے عین نیچے سے پانچ سیڑھیاں پہلی منزل تک سیدھی چڑھتیں۔ میں پہلی پانچ سیڑھیاں چڑھ کر سیڑھیوں کے ساتھ آدھا دائرہ گھوم رہا تھا کہ مجھے چھت پر سے زینے کی طرف کسی کے آنے کی آواز آئی۔ مایوسی کی وجہ سے میں بے حس تھا۔ روشن دان کے مقابل پہنچا تو مجھے چھت پر سے زینے کی طرف آنے کسی کی جھلک بھی نظر آئی۔ میرے بھاری قدموں نے ابھی آدھا دائرہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ میں نے تازی کو سیڑھیاں اترتے دیکھا۔ میں دم بخود رہ گیا۔

تازی کے گھنے بال نیند میں الجھے تھے۔ اور صبح کے سنہرے میں بالکل سنہری معلوم ہوتے تھے۔ آنکھوں میں رات کا خمار تھا اور صبح کی بیداری۔ چہرے پر خود فراموشی تھی۔ نیند کی غفلت تھی۔ کبوتروں نے کلبلا کر چونچیں اٹھائیں لیکن پَر ہنوز نیند میں ڈوبے تھے۔ تازی کا جسم رات کی آسودگی سے ابھی جاگا نہ تھا اور زیادہ گداز تھا۔ تازی سیڑھیاں اترتی آئی۔ ایک، دو، تین، چار، پانچ ——— جیسے خواب میں سیڑھیاں اتر رہی ہو۔ اسنے مجھ سے نظر نہ ملائی تھی۔ سیڑھیاں اترتے نہ رفتار میں عجلت تھی اور نہ تامل۔ پانچویں سیڑھی پر پہونچی تو اسنے اپنے بازو کھولے اور میرے سینے سے آلگی۔ اس کی سپردگی مکمل تھی۔ اتنی مکمل کہ خود اسے اپنے وجود کا احساس نہ تھا۔ وہ مجھ میں جذب ہو رہی تھی۔ اس کا تمام جسم ایک امنگ کی طرح ابھر آیا۔ پسینے کی تیز مہک میرے دماغ کو چڑھ گئی۔ مجھے محسوس ہوتا تھا کہ

تازی کا گرم گرم خون میری رگوں میں آ گیا تھا۔ میں ایک آگ میں زندہ جل رہا تھا۔ کبوتر میرے دل کو دانے کی طرح چگ رہے تھے۔ کھُٹ، کھُٹ، کھُٹ۔ تازی کے نرم اور مرتعش لب نیم وا تھے۔ منتظر، جن پر لعاب دہن کا لا کھا جما تھا۔ میں نے اپنے لب تازی کے لبوں پر پیوست کر دیئے۔ ایک سر بہ فلک موج اٹھی۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ تازی کا سارا وجود دو لبوں میں سے نکل کر میرے قالب میں آیا چاہتا تھا۔ میں بالکل بے خود ہو گیا۔

میرے بائیں ہاتھ میں لوٹا تھا جس میں سے پانی ٹپکتا تھا۔ پانی کی بوندیں مشتبہ طور پر جمع ہو کر سیڑھی پر دائرہ بڑھا رہی تھیں۔ تازی بھی یک بیک خواب سے بیدار ہو گئی۔ اس کی سینڈلوں کی آواز رُکے دیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں پھر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اور تازی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

فضا بدل گئی تھی۔

اُس روز میں دوپہر کے کھانے سے قبل گھر آ گیا۔ تازی کی اداؤں میں احتیاط کا شائبہ بھی باقی نہ رہا تھا۔ اسد بھائی اور چھوٹے ماموں کو تاش کی طلب دوبارہ ہو گئی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم سب پھر ڈرائنگ روم کے قالین پر تاش کھیلنے بیٹھ گئے۔ تازی میرے مقابل تھی اور میں خوشی سے بے خود تھا۔

اُس روز مُہر تو بہ ٹوٹ رہی تھی۔ شام ہوئی تو مال روڈ جانے کا پروگرام تیار تھا۔ تھوڑی دیر ہم نے مال پر چہل قدمی کی۔ اسد بھائی اور بھابی آگے تھے۔ اور تازی اور میں پیچھے چل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد اسد بھائی اور بھابی کے قدم سُست ہو گئے۔ یا غالباً ہماری رفتار زیادہ ہو گئی۔ ہمارے اور ان کے درمیان کچھ فاصلہ ہو گیا۔ تازی اور میں ایک دوسرے کو چھیڑتے، باتیں کرتے اور ہنستے چلتے رہے انہوں نے ہمیں مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اور کچھ دیر بعد جب فاصلہ کچھ اور بڑھ گیا تو تازی اپنی شرارت، اپنی باتوں اور ہنسی میں بالکل بے باک ہو گئی۔ کچھ دیر کے لئے ہم ساری بندشیں بھول گئے۔

بھابی کو اون خریدنا تھا۔ سردی قریب تھی اور بچیوں کے لئے نئے پُل اوور (PULLOVER) بننے تھے۔ اُون خریدنے بھابی اور اسد بھائی ایک دکان میں گئے۔ تازی اور میں دکان کے باہر درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔ میرا رُخ دکان کی جانب تھا اور تازی میرے روبرو کھڑی تھی۔ دفعتاً مجھے خیال آیا اور میں نے تازی سے پوچھا۔ وہ بہت جز بز ہوئی اور بتانے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتی تھی کہ مجھے اب پوچھنے کا کوئی حق نہ تھا کہ حنیف نے اس کے ساتھ شادی کیوں نہ کی۔ میں بھی خاموش تھا۔ مجھے یہ سوال پوچھنے کا واقعی کوئی حق نہ تھا۔ میری خاموشی سے وہ اور بھی زیادہ ناراض ہوئی۔ وہ غصے سے

بے خود تھی اور میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح اس کی خفگی دور کروں۔ مجھے احساس تھا کہ یہ سوال پوچھ کر میں نے اُسے بہت تکلیف پہنچائی ہے۔ غالباً عورت کے لئے یہ سب سے بڑی اذیت تھی کہ کوئی اس سے پوچھے کہ اس کے منسوب نے اسکے ساتھ شادی کیوں نہ کی لیکن مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ تازی کو حنیف پسند نہ تھا۔ اسی لئے میں نے سوال کی جرأت بھی کی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ تازی کے غصہ کی وجہ میری سمجھ میں نہ آتی تھی۔ لیکن تازی کے غصہ کی مجھے تاب بھی نہ تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ بُری طرح مجروح معلوم ہوتی۔ کسی نہ کسی طرح میں اسکے غم و غصہ کو رفع کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسی کوشش میں حنیف کی اس نازیبا حرکت کی برائی کی۔ لیکن میں مشکل سے چار لفظ بھی نہ کہہ پایا کہ تازی کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اب میرے بس کی بات نہ رہی۔ میں بالکل لاچار تھا! در سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ میں تازی سے نظر نہ ملا سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم میں کتنی دیر سر جھکائے کھڑا رہا۔ بالآخر تازی نے بھی محسوس کیا کہ مجھے بھی سخت تکلیف ہو رہی تھی اور میں اپنی حرکت پر نادم تھا۔ اُسے غالباً مجھ پر رحم آ گیا۔ وہ اپنا غصہ بھول گئی۔ اسنے مجھے بتایا کہ حنیف کے ساتھ کے لئے اُس نے کبھی اقرار نہ کیا تھا۔ سب کے اصرار کے باوجود راضی نہ ہوئی تھی۔ چھوٹی ممانی کو امید تھی کہ شادی کی تاریخ آنے تک راضی ہو جائے گی۔ لیکن تازی اپنے انکار پر قائم رہی اور اسکے مسلسل انکار کی وجہ سے بالآخر شادی منسوخ ہو گئی۔ یہ بتاتے ہوئے تازی کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے اور چہرہ ناگفتہ بہ اذیت سے بری طرح مسخ ہو رہا تھا۔ میرے لئے یہ انکشاف بالکل غیر متوقع تھا۔ میرے وہم میں بھی یہ امکان نہ تھا لیکن جب تازی نے بتایا تو مجھے حیرت تھی کہ اب تک میں کیوں نہ یہ بات سوچ سکا۔ جب میں اس حقیقت کی ماہیت کو سمجھ گیا تو محسوس ہوا کہ گذشتہ ایک سال سے میں کس عظیم غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ مجھے اپنے پر غصہ آ رہا تھا۔ اپنی نا سمجھی پر۔ اپنی بے وقوفی پر۔ میں اپنے کو ملامت کر رہا تھا کہ حنیف کے ساتھ شادی طے پانے کی خبر سنکر میں نے کیوں یقین کر لیا کہ تازی کی رضامندی بھی اسمیں شامل تھی مجھے اپنی کوتاہی پر افسوس تھا۔ کیوں نہ میں نے اسی وقت تازی سے تصدیق کرائی۔ مجھے حیرت تھی کہ میں کس دل سے یک بیک تازی کے لئے بالکل اجنبی ہو گیا۔ مجھے جس قدر اپنا ستم نظر آتا اسی قدر تازی کی محبت کا یقین ہوتا جاتا۔ یہ سوچنے کی مجھے تاب نہ تھی کہ میری اجنبیت پر تازی کی کیا حالت ہوئی۔ میں معترف تھا کہ میری سنگ دلی کے باوجود تازی حنیف کے ساتھ شادی سے انکار پر قائم رہی۔ اپنی کوتاہی اور تازی کے خلوص کے بارے میری گردن اور بھی جھک گئی۔ ایک مدت بعد جب میں نے سر اٹھایا تو تازی رو یا چاہتی تھی۔ وہ ساری تکلیف، اذیت، درد اور جانکنی جو گذشتہ ایک سال

میں اس نے برداشت کی تھی دوبارہ زندہ ہو کر اسکے وجود میں بیک وقت مجتمع تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپکا چاہتے اور ہچکی رندھے ہوئے گلے میں سے نکلا چاہتی۔ میں کانپ اٹھا۔ میں نے تازی کی باہیں پکڑ لیں۔ مضبوط، پوری طاقت سے، میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ تازی کو رونے سے کیسے روکوں۔ میری گرفت اور شدید ہو گئی۔ غالباً اتنی شدید کہ تازی کو برداشت نہ رہی۔ وہ حیران تھی کہ میں کیا کرنے والا تھا۔ گرفت کی شدت کے درد میں وہ اپنا رونا بھول گئی۔ میں نے تازی کو ایک بار زور سے ہلا دیا۔ میری اس حرکت میں بہت بچپن تھا۔ غالباً ہم دونوں کو اپنا بچپن یاد آ گیا۔ اور ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ میں نے تازی کی باہیں چھوڑ دی تھیں کہ اسد بھائی اور بھابی اسٹور سے نکل آئے ہم دونوں ایک دوسرے سے معقول فاصلہ پر انکے پاس چلے گئے۔

اگلی شب تازی کراچی جا رہی تھی۔ ہم دونوں کی زندگیوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ اتنے دن ساتھ رہے تھے۔ گذشتہ پانچ دن کی متنوع کیفیات کا مجموعہ شدید ہجوم تھا۔ میرے اعصاب، دماغ، قلب، احساسات میرے وجود پر تازی کا اثر چھایا تھا۔ میرے ارادے، میرے خیالات، میرا تصور اسکے علاوہ نہ کچھ سوچتے تھے۔ نہ چاہتے تھے اور نہ تصور ہی کر سکتے تھے کہ تازی کے بغیر زندہ رہ سکوں گا۔ سگنل کی سبز روشنی نظر آ رہی تھی۔ اور ٹرین رینگنا شروع ہو گئی۔ تازی کا چہرہ اور سرخ ریشمی ململ کے دوپٹہ کا پلو رات کے اندھیرے میں ٹرین کے ساتھ غائب ہو گیا۔

۱۹ر اگست آئی۔ جہاز بیلرڈ پائر (Ballard Pier) پر لنگر ڈالے کھڑا تھا۔ کسٹم سے سامان گذر کر جہاز میں جا چکا تھا۔ بھائی جان کو انگلستان وداع کرنے میں کراچی سے گیا تھا۔ بھائی جان گینگ وے (Gang way) پر سے جا رہے تھے۔ اور میں ان کے پیچھے تھا۔ شام ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ اور گینگ وے کے نیچے سمندر کا پانی بالکل سیاہ نظر آ رہا تھا۔ دفعتاً بھائی جان نہ معلوم کس طرح گینگ وے سے پانی میں گر گئے۔ ایک آواز آئی اور چاروں طرف غل مچ گیا۔ جہاز کی روانگی کا وقت آیا اور گذر گیا۔ جہاز کا عملہ اور بندرگاہ کے ملازم تلاش میں لگ گئے تھے۔ تیز روشنی سے گینگ وے کے نیچے کی جگہ روشن تھی۔ غوطہ خور لاش اوپر لائے۔ جہاز اور بندرگاہ کے دونوں ڈاکٹروں نے فوراً معائنہ کیا لیکن بھائی جان اس دنیا سے وداع ہو چکے تھے۔

میں نے انہیں اس دنیا سے وداع کیا تھا۔ میں ہی اس حزینہ کی آخری سطریں لکھ رہا ہوں۔ میرا نام اجمل ہے۔ ان کا چھوٹا بھائی۔

# شہر ممنوع

واجدہ تبسّم

# تِل

سارا جھگڑا یہ تھا کہ نوری کی گوری گوری پنڈلی پر ایک کالا کالا تِل تھا۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی، بہتوں کی پنڈلیوں پر تِل ہوتے ہیں۔

اصل جھگڑا یہ تھا کہ مدّن میاں نے نوری کی پنڈلی کا تِل دیکھ لیا تھا۔ اصل جھگڑا یہ بھی نہ تھا۔ بات دراصل یوں تھی کہ نوری کی پنڈلی کے تِل سے، مدّن میاں نے اور بھی کئی سلسلے ملائے۔ کچھ یوں سوچا، کہ ہوسکتا ہے نوری کے اور بھی کئی جگہ تِل ہوں ـــ مثلاً کھلے گلے کے کرتے میں سے جو گوری گردن نظر آتی ہے، اُس کے آتار پر کوئی خوبصورت سے نشیب میں کوئی چم چماتا تِل ہو، اور بس ادھر ادھر کے خیال جو آتے چلے گئے تو انہوں نے کہہ سُن کے اپنی اماں کو راضی کیا۔ اور پندرہ ہی دنوں کے اندر اندر جھٹ منگنی پٹ بیاہ کروالیا۔

اور یہ سب کچھ ہوتا بھی نا، اگر اُس دن مدّن میاں کا ادبدا کے نماز پڑھنے کو جی نہ چاہ جاتا۔ لگ بھگ چار پانچ بجے کے انداز میں انہوں نے عصر کی نماز کے لئے لوٹا اٹھایا، پانی بھرا اور وضو بنانے بیچ آنگن جا بیٹھے۔ آنگن کے بازو دیوار تھی۔ دیوار سے لگ کے بیری کا چھتنار درخت تھا، جس پر دنادن پتھر برس رہے تھے۔ ایک بیر پٹ سے آکر ان کے سر پر لگا۔ انہوں نے سر سہلا لیا۔ دوسرا بیر چٹ سے آکر ان کی پیٹھ پر گرا، انہوں نے تن تنا کر منہ پھیر کر ایک آدھ گالی بکنی ہی چاہی تھی کہ تڑ سے ایک بیر ان کی ناک پر آ گرا۔ اب تو ان کا ڈھول چھلک گیا۔ چلّا کر بولے :۔

”کون تیس مار خاں ہے یہ ـــ ٹانگ سیدھی کردوں گا ابھی آکے ـــ!“

معلوم تھا گھر میں سوائے لڑکیوں کے ایسی مستی کوئی نہیں مچاتا۔ دھولوں کی سن سناتی دوپہریں ہوں یا جاڑوں کی برفیلی چاندنیاں، یہ چھوکریاں سدا کد کڑے لگاتی پھرتیں۔

مدّن میاں کے جواب میں ادھر سے ٹھُمن ٹھُناتی ہوئی نوری آئی۔ نیلی شلوار جس کے پائنچے چڑھائے ہوئے۔ لال کھلے گلے کا کرتا۔ لال اوڑھنی ـــ آتے ہی بولی:۔

"ہاں ہاں جھڑائیں گے بیر۔ تمہارا کیا جاتا ہے جی۔ بڑے آئے ٹانگ سیدھی کرنے والے۔"

"اچھا۔ تیری اتنی بڑی زبان؟ ۔ ٹھہر تو سہی"

مدن میاں بڑی گرمی میں آستینیں چڑھاتے ہوئے نوری پر لپکے۔ سوچا ہوگا نوری آتا دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوگی۔ مگر وہ تو ویسی ہی تنی کھڑی رہی ۔ انہوں نے اس کی چٹیا گھسیٹ لی۔

"اب بول۔ کرے گی زبان درازی ۔ ایں؟"

"اوں ۔اوں" وہ چلاّئی ۔" بڑے کہیں کے آئے۔ اس دن بھی لے کے اٹّا مارا۔ اور آج بھی چٹیا نوچ ڈالی۔ ابھی اماں سے جاکہ کہتی ہوں۔"

مدن میاں سٹ پٹا گئے۔ یہ پرکالہ چھوکری اب خالہ بی سے جانے کیا کیا جا لگائے ذرا نرم پڑ کر بولے ۔

"کہاں مارا تمہارے میں نے؟"

"ہاں ہاں ۔ اس دن ہم آنگن میں "چڑی چھپا کا" کھیل رہے تھے تو کس نے یہ ماتا بڑا بنڈا پھینک کے مارا تھا" ۔ اکدم وہ تیکھی ہو کر بولی ۔ "کیوں جی یہ آنگن تمہارے باپ کا ہے؟"

مدن میاں صاف مکر گئے "جھوٹ بکتی ہے۔ میں نے تجھے تو کیا آج تک کسی فو کر کبھی پتھر نہ مارا ہوگا"

"اوں۔ جھوٹے کہیں کے ۔ یہ دیکھو تو ۔۔۔ !" اور اس نے جھٹ اپنی نیلی شلوار کا پائینچہ گھٹنوں تک چڑھا لیا۔

"یہ دیکھو۔ یہ نیلا نیلا نشان۔ پتھر کی چوٹ کچھ کم نہیں ہوتی۔ جی ۔۔۔۔۔۔ ہاں ۔۔۔۔۔۔!"

وہ کمبخت تو پتھر کی چوٹ بتا رہی تھی اور یہاں دل چوٹ کھا گیا۔ بڑی اجلی اجلی ڈھل ڈھلی سی پنڈلی تھی ۔۔۔ اور غروب ہوتے سورج کی پیلی پیلی دھوپوں میں نہا کر تو سونا جیسی بن گئی تھی۔ نیل ویل کچھ بھی نہ تھا۔ ہاں ایک تل ضرور چمک رہا تھا ۔۔۔ کالا کالا ۔۔۔

——— اور قبل اس کے، کہ مدّن میاں کچھ سنبھلتے یا کسی حیلے مٹولے سے ابھی تھوڑی دیر اس کی پنڈلی ہی دیکھتے رہتے، وہ پُیر پٹختی، تیزوں بیر سمیٹتی، اپنی لال لال اوڑھنی کا آنچل اُڑاتی یہ جا وہ جا۔

مدّن میاں کئی منٹ تک تو وہیں کھڑے رہے عصر کا وقت ٹلا جا رہا تھا۔ ہڑبڑا کر نماز کو چل دیئے۔

# ایک تھی شہزادی

"ہا ——— بے چاری ———" دادی بی کو شہزادی پر بڑا ترس آیا۔ سر وتہ بیج کر وہ ساکت ہی ہوگئیں۔

"تو آگے ہوا کیا؟" کسی نے بیچ میں ٹوکا دیا۔

"ارے ہوتا کیا؟ نصیبوں جلی کی قسمت میں تو ٹھوکریں ہی لکھی تھیں۔ کبھی تو بھول کے مسکرانا نصیب نہ ہوا اس کو!"

"بھئی اللہ، دادی بی ——— آپ تو ایسے ترس کھا رہی ہیں کہ وہ سچ مچ کی ہی شہزادی تھی جیسے۔ پھر آگے سنائیے نا ———"

"کیا سناؤں، مجھے نیند آرہی ہے اب" ——— دادی بی نے منہ پھاڑ کے جمائی لی۔

"دادی بی اگر آپ نے کہانی پوری نہ کی نا تو یاد رکھیئے ہم کل آپ کا پاندان چھپا دیں گے، پھر لیتی رہیئے گا دن بھر جمائیاں۔ ہاں!"

دادی بی نے پھر ڈوری پکڑی۔

"اے ہے بڑی کرموں جلی تھی۔ پیدا ہوتے وقت کوئی منحوس مارا کھڑا ہوگا تبھی تو۔ اب آہا کے رانی کو یہی سوجھا کہ نہ سہی کوئی شہزادہ، کسی وزیر زادے سے ہی نکاح پڑھوا دیں۔ اے کرتی بھی کیا بے چاری، بال جو پکتے جا رہے تھے شہزادی کے ادھر رانی چپکے چپکے راجہ کی جان کھائے جاتی۔

"اجی سنتے ہو — لڑکی دکھائی نہیں دیتی سامنے — جیسے سفید دانت ہیں ایسے ہی سفید بال بھی ہولیں تب اُٹھانا۔ ہاں آ گے تم جانو۔"

"مگر راجہ کہاں سُنتا اس کی بات — وہ تو محل میں بھی بھولے بسرے ہی آتا۔"

"تو وادی بی — بیچ میں شجّو ماں نے بات کاٹی —" آخر اُس غریب شاہزادی کی شادی ہوئی بھی کسی سے؟"

"اے لو اور سُنو — کہانی کا انجام پہلے ہی سے سُنا دیا تو کیا مزہ رہا — ؟ ویسے تھی نصیبوں کی پوری بے چاری —"

ہاں تو رانی نے سوچا کہ یوں تو بات نہیں بنتی۔ ایسا کریں گے کہ ایک دن اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بڑی چچی سے بولے :-

"اجی سُنتی ہو بھابی جان — وہ مدن میاں نے اپنی خلیری بہن نوری سے شادی رچالی۔"

"ہائیں؟ کیا کہتے ہو میاں؟ وہ نیند میں جھپکیاں لیتی پڑی تھیں، ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں — "ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟"

"ہو سکنے کی بات تو جانے ہی دیجئے — ہو چکا ہے!"

بڑی چچی چڑ کر بولیں — "موئی گن کی نہ ڈھنگ کی۔ کس بات پر ریجھ گئے صاحبزادے سارا دن تو گلی کے پوتوں کے ساتھ ہڑ ونگ مچاتی پھرتی ہے — لو کیسا زمانہ آ لگا ہے۔ بچپن کی نسبت بغیر پوچھے گچھے توڑ پھینکی۔ موئی نسبت نہ ہوئی پتنگ ہو گئی جب دل چاہا اُتار لی مگر یہ ہوا کیسے؟"

"بھابی جان — اب پسلی کا جوڑ تھا مل گیا — جو ہوا سو ہوا۔ مگر اب ہماری شجّو ماں کا کیا ہو گا؟ اور پھر شجو ماں کی وجہ سے رقو ماں کا کیا بنے گا؟ رقو کے سسرال والے تو یوں ہی ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں۔ جیسے تیسے انہیں تھاپ دے دے کر روکے ہوئے تھے، اب تو وہ صاف کہہ دیں گے "نہ بابا، ہم اور انتظار نہیں کر سکتے، ایسے کیا ہیرے جڑے ہیں تمہاری بیٹی میں" — کیوں جھوٹ کہتا ہوں؟"

بڑی چچی نے بڑی حسرت سے شجّو ماں کی طرف دیکھا جو بدنصیب شہزادی کی کہانی

آنکھوں میں نمی لیئے سُن رہی تھی ۔

# گرتی دیوار

ابھی شبّو ماں بغدادی قاعدہ ہی پڑھتی تھی کہ مدّن میاں سے بات پکی ہوگئی ۔۔ رتّو جو شبّو ماں کے لگ بھگ تین برس بعد پیدا ہوئی تھی، ابھی بالکل ہی تو گڑیا جیسی تھی مگر وہ بھی اپنے چچا کے بیٹے کو منگی ہوئی تھیں ۔ادھر بغدادی قاعدہ سامنے دھرا ہوتا اور اُدھر شبّو ماں کی، مدّن میاں سے نوکا جھونکی چلتی رہتی ۔ پہاڑے یاد ہونے رہتے اور مدّن میاں سے ٹھولا ٹھالی چلتی رہتی ۔ دیکھنے والے دیکھتے اور ہنس دیتے ۔ بڑی چچی کہتیں ۔۔ "اے تمہارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا اسی لیئے ہنسی آتی ہے نا ۔۔ ہمارے ماموں تو اپنی ہونے والی دولھن کو گود دوں میں اُٹھائے پھرتے تھے ۔ ہاں اور کیا ۔۔ اور بھئی یہ تو ہونا ہی چاہیئے میاں بی بی کی عمر میں اور کچھ نہیں تو دس برس کا فرق تو ہو!! ورنہ یہ کیا ہے ۔بی بی صاحبہ کے تو دانت بھی کُھل کھلے ہوگئے اور میاں ہیں کہ وہی تنی ہوئی کاٹھی اور کوّے کے پروں ایسا سر لیئے گھوم رہے ہیں ۔ اسی سے تو نا چاقی بڑھتی ہے، میاں تو دیکھنے میں جوان اور بی بی بوڑھی ۔ یوں نظروں سے بی بی گرے تو رنڈی کی ہنڈی تو تیار ہے ہی ۔۔ مرد کی کاٹھی کو عورت کہاں پائے ؟"

مدّن میاں اور شبّو ماں کا بھی اچھا خاصہ فرق تھا ۔ سب کے ساتھ شبّو ماں بھی اپنا بھولا بھولا منہ اٹھا کر انہیں مدّن بھائی کہتی ۔ مگر کوئی نہ کوئی اسے ٹھوکا دے ہی دیتا ۔

" اری کل جبھی ۔۔ بھائی پکارتی ہے ہونے والے دولھے کو "۔ اب شبّو ماں کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ دولھا کیا ہوتا ہے ۔مگر اتنا ضرور معلوم تھا کہ دولھے کے نام پر شرمایا جاتا ہے ۔بس وہ گٹھری سی بن جاتی ۔

مدّن میاں وکالت پڑھ رہے تھے ۔گویا بڑی انہونی بات کر رہے تھے ۔مگر ساس سسرے خوش تھے ۔ پڑھے لکھے داماد تو اُن دنوں بولتی سپاری اور ہنستی لونگ کی طرح عنقا تھے ۔اب تو یہ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے کہ شبّو ماں کو تو وکیل دولھا ملے اور رتّو بیچاری کو

جاہل جٹ گنوار کا لٹھ۔ ماں تو یہی سوچ کر نڈھال ہوئی جاتیں کہ کیسے یہ سپوت نبھے گی۔ کیوں کہ اور کچھ نہ سہی مگر ربّو خیر سے بغدادی قاعدہ اور کلام مجید تو پڑھ ہی چکی تھی۔ دو کتابیں اُردو کی، اور پھر دس تک پہاڑے بھی تو یاد تھے اُسے۔

ادھر شبّو ماں نے سولھویں میں اور ربّو نے تیرھویں میں قدم رکھا نہیں کہ ادھر سے ربّو کے سسرال والوں نے اودھم مچا دی۔ "اے ہے دیکھو تو سہی۔ جان جوان بیٹی یوں ہی بٹھال رکھی ہے، آخر کب اٹھانے کا ارادہ ہے؟"

پیغام تو دونو ہی کے موجود تھے، مگر مدّن میاں کی امّاں کہتی تھیں۔ امّاں کیا کہتی تھیں خود مدّن میاں کہتے تھے کہ پہلے ایل۔ ایل۔ بی کی خلعت پہن لیں پھر کر لیں گے شادی وادی بھی۔ ربّو کے سسرال والوں نے کیا کیا گھاتیاں نہیں کھالیں۔

"اے ہم تو پچھتائے ان کے گھر کی بیٹی اٹھا کر۔ نوج کوئی اس عمر کو ٹل جانے دے۔ اب تو ٹانگ سے باندھ رکھا ہے، پھر ڈھلتی میں اُٹھاتا؟"

بڑی چچی نے انہیں بڑی صلاحیت سے ٹلا دے دیئے "بات کرتے میں تین برس نکل جائیں گے۔ پھر دیکھو دو منڈوے ساتھ ہی ساتھ پڑیں گے۔ اے بہن تم اپنی ہی والی ہو۔ ذرا سوچو تو سہی، چھوٹی کو وداع کر کے بڑی کو نہ اُٹھایا تو کہنے والے کیا تھوکیں گے میرے منہ پر کہ ہو گا بڑی میں کوئی عیب، تبھی تو چھوٹی کو اٹھا دیا، اب اللہ سمجھے تم لوگوں سے کیا پردہ۔ بس ایک یہی مجبوری ہے۔ اور اتنا تو تمہیں معلوم ہے بہن کہ کرنے دھرنے والی اکیلی میں ہی میں ہوں۔"

یہ بڑی چچی کے میاں سید رزاق بھی بڑے گنوں کے تھے۔ اب بڑھاپے میں آ کر بڑے سیدھے بن گئے تو کیا ہوا۔ کیا کیا جلاپے انہوں نے بڑی چچی کو نہیں دیئے۔ بس کھولتے پانی میں ڈال کر جوش تو نہیں دیا۔ باقی سب کھیل کھیل ڈالے۔ ساس نندیں تو بیٹے بھائی کے کرتوت سے کاہے پردہ اُٹھاتیں۔ مگر چھوٹی نند نے، بھولپن سے ایک بار کہا بھی تھا کہ "بھائی میاں نے گوری بھاوج کے چرکے بھی لگائے تھے دست پناہ سے"

اب جھوٹ سچ تو اللہ ہی جانے۔ اس جھنجھٹ کے پیچھے کیا گل کھلے ہوئے تھے۔ بات وہی ایک بات۔ عشق و محبت کی یہ وارداتیں آج کل سے نہیں اس گھڑی سے چلی آ رہی ہیں جب کہ آدم نے بی بی حوّا کی کھوج کی تھی۔ یہ رزاق میاں اپنی ماں کی گوری چٹی ٹپکے پان جیسی

اجلی بھانجی کے لئے وقف تھے ــــ اب بہن دل پر کس کا بس چلا ہے ـــــ یہ کھیتوں پر نگرانی کے لئے جاتے تھے ـــ وہیں جھونپڑا پار کلوے کسان کی لونڈیا سے آنکھ لڑ گئی ـــــ ان کا تو کیا گیا، برس پیچھے وہ ضرور ایک حرامی پلّے کی ماں بن گئی، اس کو تھاپ پر تھاپ دیئے جاتے تھے کہ بس شادی کروں گا تو تجھی سے ورنہ زہر کھالوں گا، اس کو تو بیچاری کو یوں ہی برادری والوں نے نکال باہر کیا تھا۔ کرتی بھی کیا؟

اب ادھر ماں باپ نے شادی کی بات اٹھائی۔ پہلے والے تو اپنی بات کے پورے ہوتے تھے۔ رزاق میاں کی ایک نہ چلی باپ نے یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ "اسلام میں چار چار جائز ہیں۔ ارے میاں بہت ہوا تو اس سے نکاح پڑھوا لینا مگر کھلے بندوں چھپی تو انہوں نے بھی منڈی سپید تھے بات کیسے گرنے دیتے

بڑی چچی بیاہ کر بھی آ گئیں مگر میاں کے تیور وہی رہے۔ اب بھی لپ چھپ کر جھونپڑا پار جاتے۔ مگر مارے باندھے کے چار چھ بچے بڑی چچی سے بھی ہو گئے۔ یہ بیچاری بڑی صابر تھیں، کبھی منہ سے نہ پھوٹتیں، جو جو پڑی وہ جھیل گئیں۔ کبھی بھولے بسرے ایک حرف شکایت کا زبان پر لاتیں بھی تو سننے والیاں یوں اچھالتیں۔

"اے واہ، یہ اچھی سُنائی بوا۔ کیا محبت نہیں۔ پیار پیرت نہیں تو پھر یہ بچے کیسے ہوئے؟"

بڑی چچی ایک بار تو جل کر بول گئیں۔ "اے بہن بچوں کا نہ کہو، بچے تو کتے بلیوں کے بھی ہو جاتے ہیں۔ ہمارا کیا ہے؟"

پورے سسرال میں وہ تھڑی تھڑی ہوئی کہ بڑی دلہن نے تو اپنے بچوں کو کتے بلیوں کے مقابل بٹھا دیا۔ ایمان کی بات تو یہ تھی کہ کتے بلیوں کی بھی تو اپنی مرضی ہوتی ہو گی۔ یہاں تو یہ حال تھا دادا حضرت زبردستی اندر لوٹ کر باہر سے کنڈی چڑھا دیتے اور مارے باندھے کی جوں توں، رزاق میاں کو رات بی بی کے ساتھ بسر کرنی ہی پڑتی۔ مگر سورج شام کو تو ڈھلتا ہی ہے۔ دن بھر کتنا ہی جگمگا لے۔ اب تو رزاق میاں راستے پر آ گئے تھے، جھونپڑا والی سے بھی نیچے اوپر تین تین بچے ہوئے مگر چچوڑی ہوئی ہڈی کو کون دستر خوان کی زینت بنا لیتا ہے؟ دودھ جیسا بے داغ اور سنگ مرمر ایسا پتھریلا اور سفید جسم جب تک ساتھ دے گیا، دے گیا۔ پھر وہ آپ ہی آپ دل سے، نظروں سے اتر گئی۔ گاؤں

کے حاکم تھے کس کی مت ماری گئی تھی کہ فضول پر چول کرتا پھرتا۔
یوں تو ربّو کے سسرال والے اُس گھڑی مان گئے مگر اُدھر مدن میاں نے وہ ترقی پسندی دکھائی کہ بڑی چچی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، اب تو کوئی ٹھور ٹھکان بھی نہ تھا منگی ہوئی لڑکی کا پیام ٹوٹ جانا یہاں تو ایسا سمجھا جاتا کہ حرام کا پاپ جننے والی اُس سے اونچی تھی۔ لوگ باگ یہی تو پوچھتے کہ آخر ایسی کون سی خرابی تھی کہ ٹھیکرے کی مانگ ٹوٹ گئی۔ پھر وہ غیر کُفو والے ہی بیاہ لے جائیں، اپنے والے تو بھول کے بھی نہ کرتے، بلکہ موقع ملے تو اوریر دے اٹھاتے۔ اور یہاں تو سوال بڑی بیٹی کا آپڑا تھا۔ ربّو ہوتی تو ایک بات بھی تھی، وہ پھر بھی چھوٹی تھی۔ پہلے تو شجّو مان یوں ہی بڑی اور اس پر سے پیام بھی جاتا رہا۔ بڑی چچی تو حواس ول ہونے بھی پاگل ہو کر رہ گئیں۔ پلّو پسار پسار کے مدن میاں کی کڑیل جوانی کو کوسے دیتیں۔ پھر آپا کے نوری پر صلواتیں پڑتیں۔
"اے بی ہمیں سب معلوم ہے۔ آج کل موا یہی چلن ہو گیا ہے، کھُلے بندوں چڑھا ہو کے بیلوں کی طرح جوان جہاٹ لڑکیاں چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ ہی لڑکوں کی نگاہ پڑے گی اور من مانی کریں گے۔ کیا ہم نے دیکھا نہیں اتنی بڑی سنڈی کی سنڈی آنگن بیچ کڈ کڑے لگاتی پھرتی تھی۔ اب میں کہوں خالہ کا چھوکرا ہوا تو کیا غضب ہو گیا، ہے تو نامحرم معلوم ہے جی۔ یہ سب چال پہلے ہی چلی ہوئی تھی۔
اب یہ تو اوپر والے کو ہی معلوم تھا کہ چال واقعی چلی ہوئی تھی یا اچانک ہی وہ سیاہ تِل شجّو مان کی تقدیر کی سیاہی بن کر ان کے وجود کو کھا گیا۔ مگر کوسنوں سے ہونا بھی کیا تھا؟ چڑا تو ہاتھ سے اُڑ گیا تھا۔

کاگا رے کاگا — تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا
میرے بھاگوں کوئی مہمان آتا ہو تو تو اُڑ جا

ہائے۔ بے چاری شہزادی — روزانہ محل کے چھجّے پہ کھڑی ہو کر یہ آواز لگاتی۔ سینکڑوں کوّے منڈیر پر بیٹھے کے بیٹھے ہی رہتے، کوئی بھی تو نہ اُڑتا۔"
"ہائے تو دادی بی، ایسا کہنے سے کیا ہوتا ہوگا بھلا"۔ یہ ربّو بیچ میں دادی بی کو ٹوک ٹوک دیتی تھی۔
"پھر مجھے ٹوک دیا نا — اری کلموہی، کوّے کو پکار کر اس کے پیروں سونے کے دھاگے

باندھنے کا لالچ دے کر اس سے پوچھو میرے گھر کوئی مہمان آنے والا ہے؟ اگر اُڑ جائے تو سمجھو بالم کو سندیسہ پہنچانے اُڑ گیا اور بیٹھا ہی رہے تو سمجھو بالم ٹالم کوئی ہے ہی نہیں۔ اُڑے بھی تو سندیسہ کیسے دے۔ ہاں اب سے بیچ میں نہیں بولنا" تو بس بیچاری شہزادی کھڑے کھڑے تھک جاتی مگر اس کے نصیب کھلنے تھے نہ کھلے۔ اور بیچاری کو شہر ممنوع میں جانے کی اجازت کبھی نہ ملی۔ اللہ کا نام بڑا اس کا کام بھی بڑا — ایک دن . . .

"یہ شہر ممنوع کیا ہوتا ہے دادی بی —" شجّو مان نے بہت ہی سادگی سے سوال کیا —

دادی بی نے یوں ٹوکے جانے پر گھور کر دیکھا مگر چونکہ شجو مان بہت کم کوئی سوال کرتی تھی اس لئے پیار سے بولیں۔

"اے تم میں سمجھ بھی کیا — بادشاہ کی مملکت میں ایک بڑا سا باغ کا شہر ہوتا تھا۔ بڑا رنگ برنگا۔ وہاں صرف وہی لوگ جا سکتے تھے جن کی شادیاں ہو چکی ہوں — اور پھر وہ جوڑے وہاں ایک رات گذار کر واپس آجاتے تھے۔ اور پھر وہ شہر ان کے لئے شہر ممنوع نہ رہ جاتا تھا"۔

"تو دادی بی وہاں کنواری لڑکیاں نہ جا سکتی ہوں گی"

"لو اور سنو! وہاں بھلا کنواریوں کا کام، شہر ممنوع جو نام پڑا تو تم ایسی کنواریوں کی وجہ سے ہی پڑا۔ کھلی بستی ہوتی تو کیا بیاہی کیا اَن بیاہی سبھی دھول اڑاتی پھرتیں۔ مگر وہ تو شہر ممنوع تھا

توبہ ہے۔ بیچ بیچ میں سو رخنے پڑ جاتے ہیں — ہاں تو اللہ کا کرنا ہوا یہ کہ . . .

اسحٰق میاں ہمیشہ کلائیمکس کے لگ بھگ پہنچ کر ایک آدھ زوردار ہوائی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اُتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بولے :-

"اجی سنتے ہو بھابی جان، وہ حمزہ میاں کے ابا ملے تھے — ربّو کی شادی کے بارے میں کہہ رہے تھے — یہ بھی صاف صاف سنا دیا کہ اگر جلد ہی شادی نہ کی تو سمجھو پیام ٹوٹا ہوا ہے۔"

"ہائیں — بڑی چچی جھپکیاں سی لے رہی تھیں — ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔" ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔"

ہو سکنے کی بات جانے دو، اور جو ہو گیا تو سر پکڑ کر جھیکتی رہنا۔ میں کہتا ہوں کر ہی دو نا رتو کے ہاتھ پیلے۔ اب اُس بے چاری کے نصیب تو دغا دے گئے۔ تم ہی سوچو۔ ایک تو یوں ہی بیٹھی ہی ہے دوسری بھی چھاتی پر مونگ دلے گی۔ کیوں جھوٹ کہتا ہوں میں ؟"

ناممیاں ۔ تم جھوٹ کاہے کو کہو گے، مگر یہ تو سوچو شجو مان بڑی ہے۔ آنکھوں ہوتے دیکھے گی کہ چھوٹی گھر بار برت رہی ہے، بچے جھُلا رہی ہے تو اُس کے دِل پر کیا بیتے گی ؟"

بھابی جان اِتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں مگر تم ذرا گہرائی میں تو جھانکو۔ ایک کے ساتھ دوسری کی بھی زندگی تباہ کرنا کہاں کی ایسی دانش مندی ہے۔ اس کے نصیبوں کا ابھی کوئی بلخ کا شہزادہ آ ہی جائے گا۔ ہم ایک گُنا فکر کرتے ہیں تو اوپر والا ہزار گُنا کرتا ہے۔ ہاں آگے تم سمجھو۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو بیٹھی رہے گی تمہارے کوٹھے سے لگ کر — شکر میں دب کر کوئی مر نہیں جاتا۔"

" کہتے تو ٹھیک ہو میاں۔ ابھی تو اللہ ہی جانے اور کیا کیا دیکھنا اور سننا پڑے کنواری بیٹی اور پہاڑ کو تولو، پھر بھی پہاڑ ہی اوپر اوپر اُٹھتا چلا جائے۔ یہ پلڑا بڑا بھاری ہوتا ہے میاں۔"

# اندھیرا

بچپن سے شجو مان، یہی سُنتی آئی تھی کہ دو منڈوے ساتھ ساتھ پڑیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہلدی چڑھے گی، مہندی لگے گی اور دونوں ساتھ ساتھ ڈولی میں چڑھیں گی۔ یہاں تو بیچ میں ہی ڈور کٹ کے رہ گئی۔ کان تو شجو مان کے بھی تھے۔ بڑے ٹھنڈے دِلوں سُنا کہ رتو کی شادی ہو رہی ہے۔ جس کا ابھی صرف سولہواں ہی تھا اور یہاں شجو مان تو اٹھارواں بھی پھلانگنے کی سوچ رہی تھی۔

سر جھکائے جھکائے شجو مان نے رتو کی کرتی میں لچکے کا سرا لگایا اور ٹپ سے دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اسی کی گود میں گر پڑے۔ وہ تو اچھا ہوا کسی نے یہ جگنو چمکتے دیکھے نہیں، ورنہ کہنے والوں کے منہ تو بند نہیں ہیں۔ کچھ بھی اُڑا جاتی۔

ڈنک لگائے گا تو چہرے پر، گالوں پر، ہونٹوں پر۔ کیوں ہے نا رتّو بی بی —"

رتّو بی بی مسکرا کر اور بن کر شرماتی ہوئی اُسے مارنے کو لپکیں اور شبّو ماں کی آنکھوں میں رات کی بھرپور سیاہیاں تیر تیر گئیں۔

"شبّو ماں کو کب تک یوں ہی بٹھائے رکھو گی۔ کہیں کر ڈالو نا بہن"

"اللہ رکھو چھوٹی تو جھولا جھلانے کو ہو رہی ہے اور بڑی ابھی تک بیٹھی ہی ہے"

آنے جانے والیاں جان بوجھ کر، جان جان کر، سوئیاں سی چبھوتیں۔ اور بڑی چچی کا منہ نہ اُٹھتا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکیں۔

"سلیمن، توبہ ہے، اتنی شکر کیوں بھر دی حلوے میں؟ دیکھتی نہیں رتّو کو ابکائی پر ابکائی چلی آ رہی ہے —"

"اجی بی بی۔ یہ ابکائی پھیکا کھانے سے نہیں رُکنے والی ہماری بی بی کی اللہ رکھے گود ہری ہونے والی ہے — سلیمن ہاتھ چلا چلا کر بولنے لگی۔

شبّو ماں اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت لیئے کبھی رتّو کا منہ دیکھتی تو کبھی سلیمن کا۔ دوسرا قدم جو اس کا اُٹھا تو وہ مشین پر جا بیٹھی — دبلے پتلے کانپتے ہاتھوں سے اس نے پھولدار گلابی ریشم اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے کرتے قطع کرنے لگی۔

# بڑھاپا

بلی اور وقت، چلتے ہیں تو پاؤں کی آواز نہیں پیدا ہوتی — مگر چلتے دونوں ہی ہیں وقت دبے پاؤں گذرتا چلا گیا، بالکل دبے پاؤں۔ بلی کتنی ہی اونچائی سے گرے پنجوں کے بل گرتی ہے، آواز نہیں پیدا ہوتی — وقت اور زمانے کے کوڑے بھی دل پر کیسے ہی برسیں آواز نہیں پیدا ہوتی — ہاں آنکھیں ضرور دھندلا جاتی ہیں اور بالوں پر راکھ جم جاتی ہے۔

باورچی خانے سے شبّو ماں نکلی تو سلیمن بولی:۔

"بی بی — سر تو جھاڑ لیجیے — راکھ جم گئی ہے۔" شنجو مان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا مگر یہ آخری تیر تھا — چپکے سے، یوں ہی، شنجو مان نے آئینہ تھاما تو کئی زمانے اس کی آنکھوں کے آگے سے گذرتے چلے گئے۔ گذرتے چلے گئے۔ اور اپنے نظر نہ آنے والے قدموں کی سفید سفید سی دھول چھوڑ گئے جو اور کوئی مناسب مقام نہ پاکر شنجو مان کے سر پر جم گئی۔

وقت گذرتا ہے تو اپنے ساتھ وہ ولولے اور آرزوئیں بھی لئے جاتا ہے جن سے دل کی بستی آباد ہوتی ہے۔ مگر شنجو مان کا دل کیسا نگر تھا کہ کبھی تو ویران نہ ہوا۔ آگے سے، پچھواڑے سے، جہاں موقع ملتا وہ گھر کے چھجے پر چڑھ جاتی اور گھگھیا گھگھیا کر ایک ایک کوے سے مخاطب ہوتی :-

کاگا رے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا
میرے بھاگوں کوئی مہماں ہو تو تو اُڑ جا

مگر سونے کی پائل کا لالچ بھی انہیں نہ رجھاتا — مزے سے بیٹھے کائیں کائیں کیے جاتے۔ کوئی تو ایسا نہ تھا جو اُڑ کر بالم کا سندیسہ لاتا، اور اس شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے —

"ہا —— بیچاری ——" دادی بی کی شہزادی کو اب تک بھی شہزادہ نہ ملا تھا۔ وہ اپنی مخصوص ادا سے، اب بھی پان چباتے ہوئے۔ "ہائے بیچاری شہزادی —" کہہ کر پھر سے کہانی شروع کر دیتیں۔

کبھی کبھی شنجو مان محسوس کرتی کہ اس کہانی کی شہزادی اور کوئی نہیں وہ خود ہے۔ جسے کبھی شہزادہ نہیں ملا — نہیں ملے گا — دل میں ڈر لئے، کبھی کبھی، وہ چاہتی کہ اس کہانی کا انجام پوچھ لے۔

"دادی بی — پھر اُس شہزادی کے لئے شہر ممنوع کے دروازے کھلے؟ مگر یہاں پہنچ کر وہ آس بھی دھواں بن کے اُڑ جاتی تھی جس کے سہارے وہ جی رہی تھی — شنجو مان کے منہ کا تالا کبھی تو نہ کھل سکا۔

"ہا، بیچاری شہزادی —— دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ گذرا اور ایسا گذرا کہ شہزادی کے بالوں پر برف سی پڑ گئی —"

شنجو مان نے گھبرا کر اپنا مرجھائے پھول ایسا چہرہ، پاندان میں لگے آئینے میں دیکھا

" دادی بی ــــ وہ چلاّ اُٹھی " کوئی دوسری کہانی سُناؤ ـ دوسری کہانی ـ دادی بی ـ یہ کہانی تو برسوں سے ادھوری ہے ـ شہزادی کو شہزادہ نہیں ملے گا ـ کبھی نہیں ملے گا مجھے معلوم ہے ـ مجھے سب معلوم ہے دادی بی " اور وہ تکیہ میں مُنہ چھپا کر رونے لگی ـ

## (۶)

# سہارا

بچپن میں شجّو ماں نے بغدادی قاعدہ پڑھا تھا ـ پھر اُردو کی اور چار چھ کتابیں پڑھ ڈالیں ـ ماموں بچا سے پہلے تو رفت ـ رفتن کی گردان پڑھی ـ پھر شیخ سعدی کی گلستان بوستان بھی پڑھ ڈالی ـ ماں نے منع بھی نہ کیا ـ کیونکہ معلوم تھا کہ ہونے والے دولھے میاں بھی پڑھ رہے ہیں ــــ دو سے شروع کیا اور بیس تک پہاڑے بھی رٹ ڈالے ــ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ تختہ ہی اُلٹ جائے گا ، اور پڑھا لکھا سب خاک میں مل جائے گا ـ اب گھر میں بیٹھے بیٹھے کوئی کام تو تھا نہیں ـ آسحق چچا کی بیٹیوں کو الف ، بے کی تختی یاد کروانی شروع کی ــ آسحق چچا کی بیٹیوں کی ساتھ کھیلنے والیاں بھی تھیں وہ بھی پاس آ کر بیٹھنے لگیں ــ پھر ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ شجّو ماں کی اچھی خاصی جماعت جڑ گئی ــ دس برس کے اندر کے لڑکے بھی آنے لگے ، اور یوں ادھر اُدھر کے ملا کے بیس پچیس بچے ہوگئے اور شجّو ماں باقاعدہ " آپا جی " بن گئیں ـ بڑے پیار سے وہ ہر ایک کو بغیر گھُر کے ، جھڑکے ، پڑھاتی ـ دل تو سدا کا پھوڑا تھا دکھتا ہوا ـ جس کا دل دکھا ہو گا وہ کسی کو کیا کچھ کہے گا ؟ سارے بچے ایسے ہل مل گئے گویا آپا جی سے برسوں کی جان پہچان ہو ـ پڑھانے کا وقت صبح دس بجے سے پانچ بجے تک تھا ـ مگر ادھر صبح ہوتی نہیں کہ اکدم دو دو تین تین بچوں کی ٹکڑیاں آنی شروع ہو جاتیں ـ اور سب آ آ کے دیوان خانے میں بیٹھتے جاتے ، اور شام کو پانچ تو کیا ، سات آٹھ بھی بج جاتے تو بچے جانے کا نام نہ لیتے ـ اتنے دل جمعی سے پڑھنے لگے اور گھروں کو بھجواتے وقت اتنے ڈھیٹ بن جاتے کہ شجّو ماں کو مجبوراً رات کو بھی پڑھانا پڑا ـ جس میں دادی بی کی کہانی بھی شامل ہوتی ـ

اتنی مصروفیت میں بھی شجّو ماں کو کوئی خیال ایسا بھی تھا کہ کبھی بھلائے نہ بھولتا ـ

اور یوں جیسے وہ بھی نماز روزے کی طرح زندگی کا ایک اہم فریضہ ہو۔ آپ ہی آپ وہ چھجے پر جا کھڑی ہوتی اور ہولے ہولے پکارتی۔

کاگا رے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا

کوّے دھوم مچاتے، کائیں، کائیں، کائیں، مگر وہیں بیٹھے رہتے۔ بالم کا سندیسہ کبھی نہ آیا اور اب تو شجو ماں کی آنکھیں بھی روتے روتے دھندلا گئی تھیں۔ ایک طرف آنسو تھے، ایک طرف انتظار، کس کا انتظار؟ یہ تو اُسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ بس روئے جاتی اور پکارے جاتی

تو تو اُڑ جا ــــــ کاگا رے کاگا

مگر کوّوں کو چھجے کی منڈیر ایسی بھائی تھی کہ اُڑنا تو دُور رہا۔ پَر بھی نہ پھٹ پھٹاتے۔

"ہا ــ بیچاری شہزادی ــ بڑی کرموں جلی تھی بیچاری۔ راجہ رانی کی تو کبھی بنی نہیں، ارے جس کے سر پر باپ کا سایہ ہو اُسے کا ہے کا ڈر ــ یہ چھتر چھاؤں تو ایسی ہوتی ہے کہ ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ مگر راجہ تو بس اپنی ہی جگ مست تھے۔ انہیں کیا فکر ــ بیچاری باپ کے ہوتے بھی یتیم ہی تھی"

"وہ کیوں دادی بی؟" جماعت کی کوئی معصوم سی بچی پوچھ بیٹھتی۔

دادی بھی گھورتیں۔" پھر تُو کا دبا نا چھجے؟ ارے راجہ کی پسند کی رانی کہاں تھی؟ بس تبھی سے یہ کھوٹ چلی آتی تھی"۔ پھر دادی بی اس خیال سے بیگانہ کہ سامعین ننھے منے سے بچے ہیں بکے چلی جاتیں۔

"اور کھوٹ بھی ایسی ویسی تھی؟ ارے اُلٹے سیدھے دو چار بچے ہی کیسے ہو گئے سو ہو گئے۔ ورنہ اب تو یہ حال تھا کہ راجہ جی اپنی رانی سے باقاعدہ ماں بہنوں جیسا برتاؤ رکھتے۔ ہاتھ تک نہ لگاتے۔ ارے پاؤں تک نہ بیٹھتے تو بچوں کچوں کا کیا سوال؟" مزید ثبوت کو وہ سب کی طرف گردن گھما گھما کر دیکھتیں اور بولتیں:۔

ارے پاس آگے بیٹھیں گے ہی نہیں تو پھر اولاد کیسے پیدا ہو بھئی؟ ہاں تو پھر یہ دُوری اِتنی بڑھی، اِتنی بڑھی کہ راجہ باہر کے ہو کر رہ گئے اور رانی اندر کی۔ اب ماں کو جتنا درد بیٹی کا تھا اتنا باپ کو کہاں تھا۔ ماں گھلتی رہتی مگر فکر دُور نہ ہوتی۔

"ہاں، تو پچھلی بار میں نے کہاں تک کہی تھی کہانی؟"

ہاں تو اللہ کا نام بڑا، اس کا کام بھی بڑا ــ ایک دن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ

ایک مصیبت کا مارا کوئی شہزادہ، شہزادی کے محل تک آنکلا۔
شبّو ماں، ربّو کی چوتھی بیٹی کے لئے اون کے موزے بن رہی تھی۔ اکدم چونک پڑی۔ سلائیاں اور اون کا گولہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا منہ مارے حیرت کے کھلا رہ گیا تھا۔ کیا شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے، شہزادی کے لئے کھل سکتے ہیں؟

"تو دربان نے آکے اطلاع دی کہ کوئی شہزادہ مصیبت کا مارا آیا کھڑا ہے اور شہزادی کی خدمت میں باریابی چاہتا ہے۔" شہزادی نے اُسے خاص اپنے حرم میں بلوالیا۔

"اور اس نے شہزادے سے پردہ نہیں کیا" عائشہ بول اٹھی۔ جواب دسویں میں تھی اور اسے بار بار سینے پر دوپٹہ رکھنے کی تاکید اور گلی میں نکلنے کی ممانعت کی جاتی تھی۔

"اے تو بی بی اب شہزادی خود تو اتنی سمجھ دار تھی بھلا اُسے پردے جھبر دے کی کیا ضرورت ہاں تو بھئی شہزادی نے شہزادے کو بُلا ہی لیا، مگر شہزادی کو یقین نہ ہوا کہ یہ شہزادہ ہو سکتا ہے کیوں کہ اُس کے بدن پر بڑے بُرے کپڑے تھے، اور سفر سے اس کی صورت بھی بڑی ہو نق ہوگئی تھی۔ بال بھی بڑھ گئے تھے۔ شہزادہ تو کیا ہاں صورت سے قیدی ضرور لگتا تھا۔

دادی بی نے خود ہی زور کا قہقہہ لگایا، اور سب کی طرف دیکھا۔ بچے بھی ہنسنے لگے مگر شبّو ماں منہ کھولے کہانی کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتی رہی۔

"اب تم جانو، شہزادی سو عقل مندوں کی ایک عقلمند۔ اس نے سوچا اونہوں ایسے نہیں، اس کا امتحان لیا جائے کہ واقعی یہ شہزادہ ہے؟ بس تو شہزادی نے نوکروں کو حکم دیا کہ راتا راتی کپڑا خرید لائیں۔ ہر ہر قسم کا کپڑا۔ اور اس کے گدّے تیار کریں۔ بس بھئی نوکر خریدی کے لئے دوڑے۔ پورے شہر دل میں ستّر رنگوں کا کپڑا ملا۔ چھٹ پٹ اُس کے گدّے تیار کیے گئے۔ شہزادے کو نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے گئے اور پھر شہزادی نے بطور خاص یہ اہتمام کیا کہ اپنے ہاتھوں بستر لگوایا۔ معلوم کیسا بستر"

دادی بی کی کہانیوں میں دل بھر کے ناقابلِ یقین باتیں ہوتی تھیں پھر بھی سب بڑے چاؤ سے سُنتے۔

ہاں تو بستر کیسا تھا معلوم؟ شہزادی نے ایک کے اوپر دوسرا، دوسرے پر تیسرا، تیسرے پر چوتھا، ایسے ستّر گدّے ایک پر ایک رکھوا دیئے اور اس کے نیچے چنے کا ایک

دانہ اُلٹا کر کے رکھ دیا۔

"چنے کا دانہ۔ وہ کیوں؟" پھجو حیرت سے بولا۔

ارے آگے سنو نا۔ بیچ بیچ میں مُنہ کیوں مارتے ہو رے۔ تو بھئی شہزادی نے چنے کا دانہ ستر گدّوں کے نیچے رکھ دیا۔ رات ہوئی سب سو گئے۔ صبح ہوتی، شہزادی نے مُنہ ہاتھ دھویا نہ کپڑے بدلے، اور شہزادے کی خبر لینے اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ پوچھا ——

"کیوں جی، آپ کی رات کیسی گذری؟"

شہزادے نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "جی رات تو آپ کی بدولت اچھی ہی گذری۔ مگر —" اور اتنا کہہ کر وہ رُک گیا۔

"مگر کیا؟" شہزادی نے پوچھا

"مگر کوئی چیز رات بھر میری پیٹھ میں چُبھتی رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ سے میری پیٹھ میں نیل بھی پڑ گیا ہو گا"

شہزادی نے اس کی قمیص اُلٹ کر دیکھی تو واقعی پیٹھ نیلی ہو رہی تھی، تب شہزادی کو یقین آ گیا کہ واقعی یہ سچا شہزادہ ہے۔ کیونکہ شہزادے اور شہزادیاں ہی اتنے نازک مزاج ہو سکتے ہیں کہ ستر گدّوں کے نیچے سے بھی ایک چنا ان کے نیل ڈال دے۔

جب شہزادی کو پتہ چل گیا کہ یہ سچ مچ کا ہی شہزادہ ہے اور اس نے جھوٹ موٹ نہیں کہا تھا تو شہزادی کے دل میں شہزادے کی محبت پیدا ہو گئی۔ شہزادی خود اچھی عمر کی تھی اور شہزادہ بھی خاصی بڑی عمر کا تھا۔ تو تم جانو دھان کا پودا گھٹنے گھٹنے پانی میں ہی پروان چڑھتا ہے۔ ادھر شہزادی نے یہ چلن اٹھا رکھا تھا کہ چوڑیاں زیور اور رنگ برنگی کپڑے و پڑے پہننا سب ترک کر دیا تھا گویا بیوگی اٹھالی تھی۔ اب تو اس نے رنگ برنگی جھکا جھول کپڑے پہنے۔ چم چماتی کھن کھناتی چوڑیاں پہنیں۔ جھومر لگایا۔ شہزادے نے بھی یہ سب کچھ دیکھا، اور اس وقت تو بڑا مزہ آیا جب . . . . . . .

اسحٰق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اُتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بہت تیز لہجے میں بولے :-

"اجی بھابی جان سُنتے ہو، غیر کریں تو پھر غیر ہیں۔ یہ تو اپنے والے ہیں نا۔ کیا کیا اڑاتے پھر رہے ہیں۔ سالے کہتے ہیں" —— اکدم وہ رُک سے گئے۔

"کیا کہتے ہیں؟" بڑی چچی نے ہولا کر پوچھا:
دیوان خانے میں کرسی پر بیٹھی شجو مان انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آواز نیچی کر کے بولے:۔

"کہتے ہیں، رتو سدا اپنے میکے رہتی ہے اور وہاں اس کے میاں کا بھی آنا جانا ہے"
اور وہ معنی خیز انداز میں خاموش رہ گئے۔

"اوہ وہ تمہاری میری بہن ہے" وہ پھر بول اُٹھے "کمینی کدھر کی، کہتی تھی شجو مان کی آنکھوں میں یہ حلقے کیسے پڑے ہیں اور کھانا تو برائے نام کھاتی ہے"

"میاں"۔ بڑی چچی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔" اللہ ہی ان سے سمجھے تو سمجھے۔ مگر تمہی کہو۔ میری شجو مان ایسی ویسی لڑکی ہے"

"ارے نہیں جی بھابی جان، میں یہ کب کہہ رہا ہوں، میں تو تمہیں ذرا سُنانا چاہ رہا تھا۔ کہ تمہارے والے ایسے گنوں کے ہیں"

"میاں" بڑی چچی پھر بڑے سہمے ہوئے لہجے میں بولیں، جس میں گھگھیاہٹ بھی شامل تھی "بلا سے عمر ڈھل گئی آج بھی کوئی ملے تو ہاتھ پیلے کر دیں اس کے، تمہاری نظر میں کوئی نہیں؟"

"بھابی جان، بھلے کو شجو مان کوئی حرامی پلّہ ہی جن ڈالتی تو اتنی خرابی نہ ہوتی مگر منگی ہوئی بیٹی کی بات ٹوٹ کر تو۔۔ اونہوں، یہ تو بڑی ناممکن سی بات ہے"
جلتے تیل کی بوندیں سی شجو مان کے کانوں میں گر رہی تھیں۔

"اوہ خدا ـــ یہ جوانی۔! کیا میں اب بھی جوان ہی دکھائی دیتی ہوں کہ لوگ یوں نام دھر سکیں" اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ ڈھلتا سورج زبان، حال سے کہہ رہا تھا "بس شام ابھی ہوا چاہتی ہے۔" پھر یہ دُنیا۔ اور دنیا والے۔

امّاں نے ایک بار پھوپھی بی کے رنڈاپا چڑھایا تھا۔ پھوپھا میاں راتوں رات چٹ پٹ ہو گئے تھے۔ اماں بی نے پھوپھی بی کی کچ کچاتی ہری ہری چوڑیاں پتھر مار مار کے پھوڑی تھیں۔ گلابی ریشم کی پھولدار ساڑی نوچ کر بیوگی کی موٹی سی سفید چادر اُڑھا دی تھی۔ کالی کالی پوت کا لچھا کھینچ کر گلا سونا سونا کر دیا تھا۔ اور کلّیاں کروا کروا کے مسّی کی دھڑی چھڑوائی تھی!

"میں بھی رنڈاپا چڑھا لوں گی"

"مگر وہ کہاں ہے جس کے نام سے مجھے رنڈاپا اور رنڈاپے کی ویرانی مل رہی ہے۔"

اُس نے بھرے دل سے سوچا، پھر پچھواڑے کے آنگن میں جا کر اس نے پتھر سے کاسنی کاسنی چوڑیاں کرچی کرچی کر ڈالیں۔ بالوں میں گلابی موباف تھی، اُسے پھاڑ پھینکا۔ پھر کمرے میں آ کر زعفرانی اوڑھنی اُتار کر سفید کفنی جیسی موٹی ململ کی اوڑھنی اوڑھ لی۔

اِتنا ہی ہوتا تو بس نہ تھا۔ مگر دوسرے دن سارا کیا دھرا اپنی جگہ رہ گیا۔

نصیرالدین کا بھانجا بڑا نکھٹو تھا۔ پڑھنے لکھنے میں بڑا بودا۔ اسکول میں چھپن مرتبہ تو بٹھایا ہوگا مگر اُٹھ اُٹھ کر بھاگ آتا۔ نصیر میاں باجری کے بھٹوں کی طرح اُسے دنا دن ٹھوکتے آٹھ چوروں کی مار اُس اکیلے کو پڑتی مگر وہ الف بے کی تختی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ نو برس کا ہو رہا تھا۔ نویں برس تو بچے چوتھی پانچویں بھی پاس کر لیتے ہیں۔ شجو مان کی میٹھی زبان کی ہر جگہ تعریف ہو رہی تھی کہ دو دو کلاسیں ہو رہی ہیں۔ ماں نے بھائی سے کہا۔

"بٹھا دو لے جا کے شاہجہان بیگم کی جماعت میں۔ لگ جائے گا راستے سے۔"

نصیر میاں کے دل کو بھی بھا گئی۔ ستھرے صاف کپڑے پہنائے، بغل میں بستہ دبوا کے، شجو مان کے گھر آئے۔ یہ دیوان خانے میں اپنی فوج کو پڑھاتی بیٹھی تھی۔ دروازے پر دستک دی، شجو مان نے ایک منٹ سب بچوں کو ہاتھ بتا کر خاموش کیا اور دستک دینے والے کو کہا۔

" اندر آ جاؤ "

آگے آگے رؤف میاں اور پیچھے پیچھے ماموں نصیر میاں۔ اک دم شجو مان سٹ پٹا کر کھڑی ہو گئی۔ الف بے کا قاعدہ ہاتھ سے گر گیا اور نگاہیں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔ سفید آنچل سر پر لرز رہا تھا اور وہ سمٹی سمٹائی کرسی کا ہتھا تھامے کھڑی تھی۔

یہ ..... ب ... ب ... بچہ۔ پڑھتا ہی نہیں ..... ب۔ بالکل ... وہ ہے۔" نصیر میاں کی زبان تالو سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہی تھی۔

"جی ــ م ــ م ــ میں، پڑھا لوں گی ــ یہاں تو سبھی ایسے ڈھیٹ آتے ہیں۔" وہ گھبرا کر ہنس پڑی۔

نصیر میاں بھی مسکرا دیئے ــ "جی ہاں ــ ذرا دھیان سے پڑھا دیجیے گا، آپ کی

بہت تعریف سنی ہے "۔ اور وہ سلام کرکے، جواب کا انتظار کیئے بغیر باہر نکل گیئے۔

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے" — !

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے" — !!

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے" — !!!

شبّو ماں کے دل سے ایسی خوشی پھوٹی کہ وہ پاگل ہوتے ہوتے رہ گیئں،

"ہاں بچو، تم نے بھی میری تعریف سُنی ہے؟"

"ہاں آپا جی — آپ بہت — بہوت اچھی ہیں" — سب آگے پیچھے بول اُٹھے

یہ نصیر میاں جو تھے، اب تو جیسے کچھ بھی تھے — تھے — مگر جوانی میں ان کا بڑا زور تھا۔ جانے کون سی عینک آنکھوں پر چڑھائے بیٹھے تھے کہ کوئی صورت من کو نہ بھاتی۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس کے اوپر ہونے کو آئے مگر اب تک بھی آدم بنے کسی گم نام حوّا کو کھوجتے رہتے۔ ہزاروں ہی بھلی بُری صورتیں تو آنکھوں سے گذری ہوں گی مگر دل پر کوئی نہ چڑھی۔ بڑی بچی کے قریب ہگوں میں آتے تھے۔

بڑے پڑھے لکھے تھے، ان کی بیٹھک میں ایسی بڑی بڑی آڑی چوڑی کتابیں تھیں کہ ضرورت پڑنے پر چاہو تو تکیہ بنا کر لے لو۔ کتے والے سید صاحب کے بیٹے تھے۔ قریبی عزیز داری تھی مگر آنا جانا سب موقوف تھا۔ بات کچھ بھی تو نہ تھی۔ نصیر میاں کے باپ علی گڑھ جا کر پڑھ آئے تھے، اُس زمانے میں علی گڑھ جانا، لندن جانے سے کم نہ تھا۔ اور پھر یہ یوں ہی کورے تو نہ چلے آتے تھے، ایم۔ اے، ایل ایل بی کی لانبی چوڑی ڈگری ساتھ لائے تھے، اور ایک فوٹو بھی تھا۔ کالا کالا جبہ سا پہنے، سر پہ ترچھی ٹوپی لگائے، — پورے خاندان والوں میں وہ فوٹو گھومتا پھرا۔ اور کئی لوگوں نے تو کچھ آس بھی باندھ لی، مگر بیچ میں یہ کتے آن پڑے۔ علی گڑھ سے آتے آتے انور میاں اپنے ساتھ ایک ولایتی کتا اور کتیا بھی لے آئے تھے جو ان کے کسی انگریز دوست نے بطور تحفہ دیئے تھے۔ یہ بڑے بڑے جھابرے کتے، کہ دور سے دیکھو تو شیر سے نظر آتے۔ اُس زمانے میں پورے خاندان پر دادا حضرت کی حکومت تھی۔ نماز روزے کے وہ بڑے پابند تھے۔ دو دو حج کیئے وہ الگ مہینے کے چار پانچ روزے تو کہیں نہیں گئے تھے، ہر جمعہ کو روزہ ہوتا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میاں انور اپنے ساتھ کتے بھی اٹھا لائے ہیں تو پہلے پیار دلار سے سمجھایا کہ "دیکھو میاں

جس گھر میں کتے ہوں وہاں رحمت کے فرشتے نہیں اُترتے۔ فضول ناپاکی ہوتی ہے۔ بڑا نجس جانور ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے "۔ مگر انور میاں نے ایک نہ سنی۔ بس داداحضرت کو تاؤ ہی تو آ گیا۔ انور میاں کا گھر میں آنا جانا ہی بند ہو گیا۔ اب یہ بات اتنے غصے پنے کی بھی نہ تھی مگر غصہ میں تو ایک فرشتہ بھی شیطان بن جاتا ہے۔ داداحضرت نے جڑہی اکھاڑ پھینکی، اور ان کو گویا ذات باہر ہی کر دیا۔ انور میاں بھی دھن کے، زیادہ صحیح لفظوں میں اپنی ضد کے ایسے پکے تھے کہ ذرا بھی تو اثر نہ لیا۔ اور تو اور اوپر سے غیر کفُ کی بیگم بھی بیاہ لائے۔

انور میاں کا جب بھی ذکر نکلتا تو بڑے گھروالے طعنے سے " اجی وہی کتے والے سید انور " کہہ کر یاد دلاتے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ مٹتے مٹتے انور میاں کا نام ہی " کتے والے سید صاحب " پڑ گیا۔ مگر یہ ضرور تھا کہ کتے تو پلے مگر کیا مجال ہے جو اپنے معمولات میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ دیوان خانے کے باہر ہی ایک چبوترہ سا بنا دیا گیا تھا۔ جہاں دن بھر یہ دو نو کتا کتیا بیٹھے آنے جانے والوں کی پرِ یڈ لیا کرتے تھے۔ یوں تو علی گڑھ سے انگریزی پڑھ آئے تھے۔ ڈھیر ساری کتابیں چاٹ ڈالی تھیں مگر تھے وہی سچے سیدھے مسلمان — اور خود ہی تو بولتے " ارمیاں یہ علم ہمیں یہ تھوڑی ہی سکھاتا ہے کہ اپنے دین اور مذہب چھوڑ کر عیسائی بن جائیں " یوں پہننے کو کوٹ پتلون بھی کبھی کبھار پہن لیتے مگر مرتے مر گئے وضع داری نہ چھوڑی۔ وہی شرعی پاجامہ، کھلی آستینوں کا کرتا چار کلی والا، سر پر رام پوری کالی ٹوپی اور ہاتھ میں نانا باوا کی دی ہوئی چھڑی۔ صبح کی نماز بھی شاذ ہی قضا ہوتی۔ ہاں عشا کی نماز میں اکثر غچہ مار دیتے۔ بولتے " کھانے کے بعد کم بخت کسی کام کا نہیں رہ جاتا میں۔ بڑی گنگی آ جاتی ہے آنکھوں میں "۔

انہی کی اولاد یہ نصیر میاں تھے۔ جیسا بیج ویسا پودا۔ ان کے دماغ میں بھی ڈھیر سارا علم بھرا پڑا تھا۔ عمر کہاں کی کہاں پہنچ رہی تھی مگر اب تک کنوارے سانڈ بنے پھر رہے تھے۔ باپ چڑ چڑاتے۔

" ارے کم بخت، تجھے تیرے علم نے یہی سکھایا ہے کہ سب کو سونگھ سونگھ کر چھوڑ دے "

ہنس کر رہ جاتے۔ باپ تو اس عمر میں چھ چھ بچوں کے باپ بھی ہو گئے تھے، یہ

ابھی تک پتنگیں اڑاتے پھرتے تھے۔ کہتے تھے" جب تک کنوارے ہو، نچے ہو! شادی ہوئی کہ بڑھاپے نے آگھیرا" اپنے بھلائے اب تک بھی بچے ہی بنے پھر رہے تھے!

شام کو چار بجے رؤف میاں گھر لوٹنے لگے تو شجو مان نے کہلوا بھیجا

" اپنے ماموں میاں کو سلام کہہ دینا ہمارا" رؤف میاں نے گردن اٹھا کر اُسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔

یہ سلام کلام یہاں تک بڑھے کہ اب شجو مان جان جان کر پہاڑے بھولنے لگیں حساب غلط کر کر جاتیں تو پھر نصیر میاں ہی ایسے ہوتے جو غلطیاں نکالتے۔

" واہ بھئی واہ۔ یہ کوئی حساب ہوا۔ سولہ دونی بتیس ہوتے ہیں آپ چھتیس بتا رہی ہیں" یہ جھینپ کر رہ جاتی۔ مسکراہٹوں پر سے راشن اٹھ گیا تھا۔ جی کھول کے مسکراتی قہقہے لگاتی۔ مگر حیرت کی بات یہ تھی شجو مان سوچتی کہ ہزار منتوں سے پکارنے کے باوجود ایک بھی کوا تو نہ اڑا تھا

اور پھر بڑی اَن ہونی سی بات یہ بھی ہوئی کہ شجو مان نے بقرعید پر اپنی پسند سے ہری بانکیں پہنیں، اُس کے آگے پیچھے سرخ رنگ کے گوٹ چڑھوائے۔ اور پیسے ادا کر کے منہارن کو جب سلام کیا تو اُس نے بھی دل بھر کے دُعائیں دیں۔

" اللہ سہرے کے پھول کھلائے۔ دولہن بنائے۔ جی کے ارمان نکالیں۔ ہمارا بھی بھلا ہوئے۔" اور شجو مان جو کسی کے بھی منہ سے یہ دُعائیں سُن سُن کر سفید پڑ پڑ جاتی تھی شرم سے تپ کر دُودھ میں اُبلی گاجر کی طرح لال لال ہو گئی۔

اور بڑی بات یہ کہ شجو مان جو پورے خاندان میں گھر گھُسی مشہور تھی، ٹھیل ٹھیل کر ماں سے کہتی:-

" اماں، آخر انور چچا نے کتے پال لیئے تو کیا گناہ کر ڈالا تھا۔؟ مذہب تو نہیں بدل لیا تھا نا؟ اب کرنے والے تو مر کھپ کے مٹی میں مل گئے فضول آپس کی بُرائی سے کیا فائدہ؟ آپ ان کے گھر آتیں جاتیں کیوں نہیں؟

نصیر میاں جو بھانجے کی خبر لینے آتے تو گھنٹوں خبر ہی لیتے رہتے۔ کبھی کھانا۔ کبھی چاء اور کبھی یہ نہیں تو خالی پان ہی سہی۔ شجو مان جو ساری دُنیا سے مُنہ موڑے، راہبہ بنی بیٹھی تھی، پھر آدم حوا کی ہنستی گاتی دُنیا کو پلٹ رہی تھی۔

اور اب تو ایسا بھی ہوا کہ نصیر میاں کو کھانے پر روک لیا اور خود ہی کوئی میٹھا بنانے لپک پڑی۔

بات چیت کا موضوع بدلتے بدلتے اس پر بھی آ گیا:-

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"پسند کی کوئی لڑکی ہی نہ ملی۔ اور جب لڑکی مل گئی تو اپنی عمر ڈھل گئی، مگر کوشش کریں گے کہ تقدیر بدل جائے۔" نصیر میاں مسکرا کر بولے "آپ بھی دعا کیجئے۔"

صاف اشارہ تھا، اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ شبجومان شرما گئی۔ منہ تپ گیا، آنکھیں اٹھا کر بولی:-

"آپ کوشش کیجئے میں دعا کروں گی، آپ کے لئے۔"

پورے خاندان میں اڑ گئی کہ رزاق میاں والوں اور کشتے والے سید صاحب کی آپس میں میل ملاقات ہو گئی، اور جو ذرا سنسنی خیز خبریں سننے اور سنانے کے دلدادہ تھے انہوں نے یہ بھی اڑا دیا کہ نصیر میاں گھنٹوں رزاق میاں کی جوان بیٹی، جو ان بیاہی ہے، کے ہاں جا جا کر بیٹھتے ہیں۔ اب آگے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سنا ہے کچھ بات بھی ہونے والی ہے۔

لاکھ بات بھی ہونے والی تھی مگر تھی تو کنواری ہی شبجومان۔ ماں نے اونچ نیچ سمجھانے کے لئے الفاظ ڈھونڈے بھی مگر ملے نہیں۔ شبجومان ایسی ویسی عمر اور چال کی تو تھی نہیں کہ سمجھانے بجھانے کی ضرورت پڑتی، بولتیں بھی کیا۔ پھر بھی دبی زبان سے کبھی کبھار کہہ دیا کرتیں:-

"زمانے والوں کے منہ کھلے ہیں بیٹی۔ ہماری پھوپھی بی بیاہی بھری، دو بچوں کی ماں صاف لگا ہی دیا، لگانے والوں نے کہ انو میاں سے ہنستی ہیں۔ انو میاں ان کے رشتوں کے بھائی آتے تھے۔"

شبجومان نے سنا ضرور۔ مگر یہ نہ سمجھا کہ یہ صاف اُن پر ہی چوٹ ہے۔

نصیر میاں بھی مسکرا مسکرا کر بات کرتے، تعلیم یافتہ تھے۔ ڈگری یافتہ تھے۔ ہزاروں میں اٹھنا بیٹھنا تھا، بات کرتے ہیں منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دل کے کھوٹے نہ تھے بیچارے ورنہ ہزار بار تو کفر توڑ تنہائیاں میسر آئیں، کوئی جیسے ہوتے تو کچھ تو نیت میں فتور آتا۔ مگر انہوں

نے تو کبھی ہاتھ کو ہاتھ تک نہ لگایا، پان بھی یہ بنا کر دتیں تو کہتے :-

" وہاں میز پر رکھ دیجیئے۔ ابھی حساب میں اُلجھا ہوا ہوں "

نصیر میاں کی قدر و قیمت انہی باتوں سے شبو ماں کے دل میں دُگنی ہو گئی تھی۔

شبو ماں کی دھندلائی آنکھیں جو نیند سے بیگانہ تھیں، اب سپنے دیکھتیں۔ ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا شہزادہ ان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ یہ دروازہ کھولتی ہیں وہ چُپ چاپ کھڑا مُسکراتا ہے ــــ پھر یہ مُسکراہٹ اتنی پھیل جاتی کہ خواب ٹوٹ جاتا۔ پھر نظر آتا کہ وہ پیچھے پرکھڑی کوّوں کے پَیروں میں سونے کی پائلیں باندھ رہی ہے اور ہزاروں کوّے اپنے کالے کالے پر پھٹ پھٹاتے، کائیں کائیں کرتے اُڑے چلے جا رہے ہیں ــــ پروں کی پھٹ پھٹ اتنی تیز ہوتی کہ شبو ماں کی آنکھ کُھل جاتی۔

# شہر ممنوع

دادی بی نے ادھر کئی دنوں سے کہانی نہیں سُنائی تھی آج وہ پھر پامدان گود میں لیئے کہانی سُنا رہی تھیں۔

" ہا ــــ بے چاری شہزادی ــــ تھی نانصیبوں کی پوری۔ شہزادے کو ہر ہر طرح ناز و نعمت سے رکھا۔ کھلایا پلایا، اس کی محبت اپنے دل میں پالی۔ اور آخر کو وہ دغا دے گیا پیاروں پیٹا کبوتر کی طرح پھُر سے اُڑ گیا یہ کہہ کر کہ :-

" چین دیش کی شہزادی نے اُس سے کہا تھا کہ جب تیرے لوہے کے جوتے گھس جائیں گے تب شادی کروں گی ــــ اب اس کے جُوتے سفر میں گھس گئے تھے ــــ چلو شہزادہ چین دیش کو چلا گیا اور کہانی ختم!

آج اسحٰق چچا کلائمکس میں گڑ بڑ پیدا کرنے عین موقع پر نہ ٹپکے۔ بڑے آرام سے آئے۔ ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری۔ اچکن اتار کے کھونٹے سے ٹانگی اور بولے :-

" کیا زوردار شادی کی بھئی، دُلہن والوں نے مسہری کے ڈنڈے سونے کے دیئے

اور سونے کے پازیب کے علاوہ پاندان بھی سونے کا دیا۔"

"کس کی شادی کا ذکر ہے میاں ؟" بڑی چچی چھالیاں لینی پڑی تھیں، کروٹ بدل کر بولیں۔

" ارے آپ کو نہیں معلوم، نصیر میاں کی شادی سے ہی تو آرہا ہوں "

" ہائیں! بڑی چچی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔" نصیر میاں کی شادی — ہمیں تو رقعے بھی نہیں آئے مگر "

اسحق میاں نے بہن کی زوردار گالی دی " وہ کتے کے بچے حمید میاں کے ہاتھوں میں انتظام تھا نا، وہ تو ہم سے کانٹے کھاتا ہے، مجھے تو جلیل میاں راستے سے پکڑ لے گئے"

"کس کی بیٹی کی؟" بڑی چچی نے دبتے لہجے میں پوچھا

" غیر کُف کی ہے — نواب جانی کی پوتی ہے نا — اتنے دنوں سے یہی تو جھنجھٹ چل رہی تھی، بڑی کوشش سے ہوا یہ پیام ! "

ہاں، تو بھئی وہ کہانی ختم ہوئی، اب یہ دوسری سنو — ایک تھا . . . .

" دادی بی ! آنسو بھری آنکھیں لیئے، دونوں ہاتھوں سے اپنا دل پکڑے شجو مان پوری طاقت سے چلا اٹھی " آپ یہ کہانیاں مت کہا کیجیے، آپ اپنا وقت الگ برباد کرتی ہیں اور دوسروں کی زندگیاں بھی تباہ کرتی ہیں "

شجو مان اتنی زور سے چلائی تھی کہ کئی بچوں نے سہم کر اپنے چہرے قاعدوں کی آڑ میں کر لئے۔

" اوئی — میں نے کس کی زندگی تباہ کی ؟ کہانی جیسی کہانی تھی شادی —— اے لو اور سنو — "، اور وہ منہ میں پان دبا کر کٹ کٹ چھالیہ کاٹنے لگیں۔

اک دم شجو مان کے سارے بال سفید پڑ گئے — چوڑیاں آپ ہی آپ ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئیں — آنکھیں دھندلا گئیں۔ اور گالوں پر جھریاں پڑ گئیں — ! اور پھر کانپتے ہاتھوں سے شجو مان نے بغدادی قاعدہ اٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز سے پڑھانے لگی :-

پڑھو میرے بچو !

الف سے انار

ب سے بکری

ت سے تلوار

# لہو کے چراغ

صادق حسین

# پہچان کی گونج

کشمیر کی رنگینیوں میں بھی پرویز کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار نہ ہوتی۔ وہی اداس اداس نظریں، وہی کبھی کبھی آنکھوں میں آنسو بھر آنا، وہی آدھی آدھی رات کو اٹھ بیٹھنا اور گھنٹوں کچھ سوچتے رہنا۔ زندگی کے کسی موڑ پر جب کوئی خاص بات، کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آ جاتا تو اس کا تاثر پرویز کے سوچ میں داخل ہو کر مسلسل کئی دن کے لئے اس کی زندگی کا ایک اہم جزو بن جاتا۔ بایں ہمہ اس کے سوچ میں ایک قرینہ تھا۔ جب وہ دل ہی دل میں تصفیہ کر لیتا کہ وہ خاص بات، وہ غیر معمولی واقعہ تو گذرے ہوئے حادثات اور بیتے ہوئے دنوں کی دھوپ چھاؤں میں کھو کر ماضی کے سمندر میں ڈوب بھی چکا، تو اس منزل پر پہونچ کر اس کا ذہن ایک کروٹ بدلتا اور پھر آناً فاناً وہ خواب و خیال کی فصیل پھاند کر جیتی جاگتی دنیا میں در آتا، جہاں نسبت روڈ پر اختر کی بیٹھک میں برج کی بازیاں ہوتیں، باتونی الطاف اور لاابالی رفیق کی صحبت میں زندگی مسکراتی، شطرنج کھیلی جاتی، ڈرافٹ بیئر پی جاتی، پانچ سو پچپن کے ٹن کھلتے، ریڈیو گرام پر منتخب ریکارڈ سنے جاتے۔ جمود حرکت میں بدل جاتا۔ پرویز بھولو قہقہوں میں سب کچھ بھول جاتا، باپ کی آزردگی، ماں کے آنسو، آپا کی التجائیں، تایا جان کی ناراضگی، یہ سب سگریٹ کے دھوئیں میں اڑ کر بہت دور چلے جاتے۔ پرویز مجسم باغ و بہار بن کر اختر کی بیٹھک میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دیتا۔ اس کے دوست اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ انتہا پسند ہے۔ اس نے کبھی اعتدال سے کام نہیں لیا۔ ورنہ وہ اتنی اچھی سرکاری ملازمت کو ٹھکرا کر خاندان بھر کو غیر مطمئن اور ناخوش نہ کرتا۔ یوں تو وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا، کسی چیز کی کمی نہ تھی مگر ان کے ہاں خاندانی روایات کے مطابق سرکاری ملازمت کو طرۂ امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ دادا مرحوم کلکٹر رہ چکے تھے۔ تایا جان ریٹائرڈ تحصیلدار تھے۔ ابا جان نے بڑے ٹھاٹھ سے سی۔ آئی۔ ڈی میں نوکری کی تھی۔ جرأت اور بہادری کا ثبوت دے کر اعزازی تمغے حاصل کئے تھے، صوبے کے گورنر سے ہاتھ ملانے کا شرف حاصل کیا تھا۔ چنانچہ جب پرویز کالج سے نکلا تو اچھی خاصی سرکاری ملازمت اس کا انتظار کر رہی تھی۔

خاندانی اثر و رسوخ، دھن دولت کی جادوگری، مقامی حکام کے دائرے میں ابا جان کی جی حضوری، تایا جان کا میل جول سب نے مِل جُل کر اس کے لئے محکمۂ مالیات میں ایک اہم کرسی حاصل کر لی۔ مگر اُس کُرسی پر بیٹھتے ہی پرویز کا دم گھٹنے لگا۔ جب عمر خیام کی رباعیات پڑھتے پڑھتے یک بیک اس کی میز پر فائلوں کے انبار لگ گئے تو وہ مسلسل کئی دن گہرے سوچ میں ڈوبا رہا اور پھر ایک دن چُپ چاپ استعفا دے کر اختر کی بیٹھک میں جا پہنچا۔ پرویز کو سمجھنا بڑا آسان تھا۔ پرویز کو سمجھنا بڑا مشکل تھا۔ چُپ ہے تو ہفتوں چُپ، رنگ رلیاں ہیں تو دنوں جاری۔ جب اُس پر چُپ کا بھوت سوار ہوتا تو اختر کی بیٹھک اُجڑ جاتی۔ ایک عجیب اُداسی چھا جاتی۔ اختر دن بھر جماہیاں لیتا رہتا۔ شطرنج کھیلتے کھیلتے بساط اُلٹ کر پلنگ پر لیٹ جاتا۔ دراصل پرویز کے بغیر کسی کا جی نہ لگتا۔ پرویز کے لنگوٹیے اس کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اس کے متعلق کامیاب پیشین گوئی کر سکتے تھے۔ مثلاً لاہور سے سری نگر آنے سے چند ہی روز پہلے کا واقعہ تھا کہ یارانِ طریقت مل کر ایک نئی طوائف کا گانا سننے ہیرا منڈی گئے۔ پرویز نے کوٹھے پر قدم رکھتے ہی طوائف کی جانب غور سے دیکھا۔ وہ بھیرویں کے سروں میں تھا۔ شیریں شیریں، مدھم مدھم، سرتاپا شگفتہ سرور، جس میں ارتکاز کی اکائی نے اِدراک کی وسعتوں کو شہ دے کر زماں و مکاں کے بندھن توڑ دیئے تھے۔ پرویز کی چوڑی پیشانی پر لکیریں سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آگئیں۔ آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اور اس چمک سے تجسس کی چنگاریاں پھوٹ نکلیں۔ متناسب بدن، سانولے رنگ کی طوائف بھی ٹکٹکی باندھ کر پرویز کی طرف دیکھنے لگی۔ احباب بھانپ گئے کہ معاملہ نازک ہے۔ پرویز کا خوش و خرم چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ چند لمحے پہلے جن ہونٹوں سے پھول جھڑ رہے تھے۔ بات کی بات میں خاموش ہو گئے۔ کسی نے پیشین گوئی کر دی کہ آج پھر چُپ کا بھوت سوار ہونے والا ہے اور وہ بات سچ ہی نکلی۔

"آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔" پرویز نے طوائف سے مخاطب ہو کر کہا۔

"جی میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔"

طوائف سچ مچ سوچ رہی تھی۔ الماری کے آئینے میں اُس کا عکس بھی سوچ رہا تھا۔ کھونٹی پر لٹکی ہوئی سیاہ مخمل کی کورتی پر ننھے ننھے ستارے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ پلنگ پوش پر موتیا کے پھولوں کا باسی ہار پڑا ہوا تھا۔ تکیے کے اُجلے غلاف پر دھانی، زرد اور گلابی رنگ کے دھاگوں کی کڑھت بڑی خوشنما معلوم ہو رہی تھی۔ تپائی پر پڑی ہوئی ٹوکری میں سے سلائیوں پر چڑھا ہوا لاجوردی اُون کا سویٹر باہر جھانک رہا تھا۔ وہ طوائف کے سونے کا کمرہ تھا۔ ساتھ والا بڑا کمرہ جس میں اُجلی چاندنی کا فرش بچھا ہوا تھا۔ گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے، بند تھا۔ اُس دن چونکہ ایک طوائف مر گئی تھی اس لئے گانا بجانا منع

تھا چنانچہ ڈیرے ڈیرے پرخواب گاہوں میں بالا بالا دھندلا ہو رہا تھا۔ بند کمروں میں ساز آہستہ آہستہ بج رہے تھے۔ انترے گھٹ گھٹ کر فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ پرویز۔ اختر۔ الطاف اور رفیق دری پر بیٹھ گئے۔ طوائف بھی ان کے مقابل دو زانو بیٹھ گئی۔ سانولی، نرم و نازک انگلیوں نے چاندی کی طشتری تھام کر پان پیش کئے۔ اتنے میں ساز ندے آگئے۔ فرشی سلام، کاروباری مسکراہٹیں پیشہ ورانہ انکسار، الطاف کا ایک آدھ چٹکلا رفیق کے دو چار چلبلے فقرے، چند لمحوں میں تکلفانہ ماحول بے تکلفی میں مل گیا۔

طوائف نے مسکرا کر نہایت شیریں اور نرم لہجے میں پوچھا۔ "کون سی چیز پیش کر دوں؟"

"جو آپ کا جی چاہے" الطاف بولا۔

طوائف نے ایک طرف جھک کر سارنگی نواز سے کچھ کہا۔ اور پھر ساڑھی کو شانوں پر درست کرنے لگی۔ طبلہ نواز نے ہتھوڑی سے کونڈوں پر ضربیں لگا لگا کر تسموں سے کسی ہوئی طبلے کی پڑی کا کھنچاؤ تناؤ کیا۔ سارنگی نواز نے سارنگی کی کھونٹیاں مروڑیں، تاروں پر گز کی پھینک اور کھینچ تولی۔ ہارمونیم والے نے انگلیاں نچا کر ساتوں سروں کی جانچ کی۔ طبلہ نواز نے طبلے کی تھاپ اور چانٹ کا وزن کیا۔ سارنگی نواز نے بائیں ہاتھ کی درمیانی تین انگلیوں کے ناخنوں سے سرپنچم، اور کھرج کی زبان سے سوز و گداز کی ندی بہا دی۔ سازوں کا مجموعی تاثر سحر پھونکنے لگا۔ طوائف سُر اور تال کی سنگت میں اپنا دایاں ہاتھ دائیں گھٹنے پر آہستہ آہستہ بجا کر درباری الاپنے لگی اور پھر ساز کے صحیح مقام پر سنہری آواز بلند ہوئی۔

"ہم ردلتِ ہستی کا سامان گنوا بیٹھے"

یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس خوش گلو مغنیہ نے ان سات لفظوں میں نئی روح پھونک دی ہو، جیسے بیٹھے بیٹھے درد کی چنگاریاں سلگنے لگی ہوں، جیسے غنائی جادو سے دنیا کے باسی پھولوں میں ابھر سے تازگی آنے لگی ہو۔ اور سیاہ مخمل کی کوٹی پر ننھے ننھے ستاروں کی چمک دمک دونی ہو گئی ہو۔

یکایک آداب محفل کے خلاف پرویز بیچ میں بول اٹھا۔ "کیا آپ بنگلہ گانا گا سکتی ہیں۔"

ساز خاموش ہو گئے۔ سکوت چھا گیا۔

"جی ہاں" طوائف کے پتلے پتلے ہونٹوں سے آواز آئی۔ اور پھر وہ ہونٹ گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح کانپ گئے۔ سفید جارجٹ کی ساڑھی کا پلو سنبھالتے ہوئے لانبی لانبی انگلیوں میں دو ایک بار لرزش پیدا ہوئی۔ چند لمحوں کے لئے پرویز کی نگاہیں الماری کے آئینہ پر جم کر رہ گئیں۔ جیسے وہ ان نیچی نظروں کے عکس میں کچھ تلاش کر رہا ہو۔ کسی بات کے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کیا آپ کبھی راج شاہی میں رہتی تھیں۔" پرویز نے ایسا سوچا جیسے وہ واقعات کا تسلسل قائم کر رہا ہو۔

"جی ہاں" گلاب کی پنکھڑیوں سے آواز آئی۔ اور پھر ایک بار طوائف نے بھرپور نظروں سے پرویز کی طرف دیکھا۔ اور پھر اس کے سانولے چہرے کے آئینے میں اس کی اندرونی کش مکش کی جھلک گہری ہونے لگی۔ جیسے وہ اپنے دماغ پر زور دے کر کوئی بھولی بسری بات یاد کر رہی ہو۔ جیسے وہ ماضی کی دھند میں کھوئی ہوئی کوئی واردات ڈھونڈھ نکالنے کی سعی کر رہی ہو۔

اختر، الطاف اور رفیق چُپ سادھے بیٹھے تھے۔ سازندے حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔

پرویز نے عکس پر سے نگاہیں ہٹا کر طوائف کے چہرے پر گاڑ دیں۔ تلازم خیالات کی لہریں کہاں سے کہاں نکل گئی تھیں۔ بیتے ہوئے لمحات زندگی کی کتنی راہوں اور پگڈنڈیوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ ان راہوں میں چند سنگ میل تھے جن میں سے ایک اُبھر کر سامنے آ گیا تھا۔

"شنتی!" پرویز بے اختیار پکار اٹھا۔

"شنتی نہیں، الماس" طوائف نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا اور پھر اپنا منہ سفید جارجٹ کی ساڑھی میں چھپا لیا۔ اُس کے گھنیرے جُوڑے میں سفید گلاب کا پھول حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو چند خاموش لمحوں کے طویل خلا کو پُر کر رہی تھی۔

"شنتی کیا تم پدما کی لہروں کی آواز ہیں سن سکتی ہو۔" پرویز نے کہا جیسے وہ عالمِ خواب میں بول رہا ہو۔

"اب نہیں، پرویز صاحب" شنتی نے جیسے پدما کے اُس پار سے جواب دیا ہو۔ اور پدما کی لہریں رکتی بھی تو نہیں۔ وہ تو آگے ہی بڑھتی جاتی ہیں۔ شنتی الماس بن جائے۔ سسکیاں لیتی رہے۔ سفید جارجٹ کی ساڑھی میں اپنا منہ چھپا کر آنسو بہاتی رہے۔ پدما کبھی نہیں رکتی۔ پرویز کے ہونٹ سِل جائیں اور وہ اُن نرم و نازک سانولے ہاتھوں کی طرف دیکھتا رہے جن ہاتھوں کو اس نے کچھ سال پہلے پدما کے کنارے پہلی بار چھُوا تھا۔ پدما کبھی نہیں رُکتی۔ کھونٹی پر لٹکی ہوئی سیاہ مخمل کی کوٹی پر ننھے ننھے ستارے اُسی طرح جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ پلنگ پوش پر موتیا کے پھولوں کا! اسی ہار جوں کا تیں پڑا تھا۔ سارنگی نواز ... بھوں چڑھائے، الماس کی طرف دیکھ رہا تھا اور الماس چند لمحوں ... پھر شنتی بن گئی تھی اور اس کی آنکھوں سے بہتی ہوئی پدما رکنے میں نہ آ رہی تھی۔ طبلہ نواز چپکے ۔۔۔!

گا، انسا نگل کر جانے کی جُھسکی کا تعدد باندھنے لگا۔ ہارمونیم والے نے کان میں اٹکایا ہوا پاسنگ شو کا سگریٹ سلگا کر فضا میں چرس کی بدبو پھیلا دی۔ سارنگی نواز کی قوتِ شامہ پھڑک اٹھی۔ سارنگی کے پیندے پیٹ اور پسلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ چانڈو کا دم لگانے کے لئے بے قرار ہو گیا۔ اُس ماحول میں پرویز کا جی گھبرانے لگا۔ وہ اٹھ کر منچی میں چلا گیا۔ پردوں سے روشنی چھن چھن کر دیوار کے پاس پڑی ہوئی صراحی سے کھیل رہی تھی۔ اینٹوں کے فرش پر سمینٹ کی بے شمار مستطیلیں بنی ہوئی تھیں۔ ان مستطیلوں پر ہر شب اجنبی قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہوگی۔ یہ سوچتا ہوا پرویز سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔ ایک تانگے میں بیٹھ کر سیدھا گھر پہونچا۔ روشنی گل کر کے بستر پر لیٹ گیا۔ تمام رات نیند نہ آئی۔ خیالات کے تانے بانے میں الجھا رہا۔

اس مرتبہ باوجود شعوری کوشش کے پرویز یہ تصفیہ نہ کر سکا کہ وہ خاص بات وہ غیر معمولی واقعہ تو گزرے ہوئے حادثات اور بیتے ہوئے دنوں کی دھوپ چھاؤں میں کھو کر ماضی کے سمندر میں ڈوب بھی چکا۔ اب کے تو واردات کی نوعیت ہی جداگانہ تھی۔ حال ماضی میں گم ہو جانے کے بجائے ماضی کا پھیلاؤ حال کے جزو کل پر چھا گیا تھا۔ برسوں پہلے کی ایک رومان انگیز داستان ابھر کر آنکھوں کے سامنے آگئی تھی۔ جب وہ طلباء کے ایک وفد کے ساتھ شمالی بنگال گیا تھا راج شاہی پہونچ کر زندگی کا ایک پڑاؤ آگیا تھا، جہاں وہ چند ہفتوں کے لئے رک گیا تھا، جہاں اس نے زندگی کی گرمی محسوس کی تھی، جہاں سے وہ شستی کے ہمراہ چاپائی نواب گنج گیا تھا، وہاں سے بیل گاڑی میں بیٹھ کر شب گنج اور وہاں سے نارائن پور۔ جہاں دریا اکثر اپنا رخ بدل کر وہاں کی جغرافیائی صورت کو الٹ پلٹ دیتا ہے۔ مرشد آباد کی حدوں کو چھو کر وہ راج شاہی لوٹ آئے تھے۔ اُس سفر میں انہیں چاندنی رات میں کئی میل ریت پر چلنا پڑا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے شستی سستانے کے لئے بیٹھ گئی تھی۔ پانی میں چاند مسکرا رہا تھا۔ چاروں طرف سکوت چھایا ہوا تھا۔ تاحدِ نظر ریت کا نرم اور ٹھنڈا فرش بچھا ہوا تھا جس فرش پر برسات میں پانی کی یلغار ہوتی تھی۔ اس فرش پر اس چھوٹی سی جھیل کے کنارے شستی نے وفورِ مسرت میں کہا تھا "یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے" پھر اُس نے ایک گیت گایا تھا۔ ایک ناچ ناچا تھا۔ ناچتے وقت وہ بید کی ٹہنی کی طرح جھک جاتی اور پھر لقا کبوتری کی طرح سینہ تان کر ٹھمک ٹھمک کر چلنے لگتی۔ گیت کی لے میں وہ یوں کھو جاتی تھی جیسے وہ چاندنی کی ایک شعاع بن گئی ہو۔ جیسے وہ اپنے کل میں کھو جانے کے لئے کائنات کا ابدی گیت گا رہی ہو۔ اس کے بعد جب وہ مرشد آباد کی حدوں کے قریب پہونچے تھے تو شستی نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا تھا "اس پار گاؤں ہے جہاں میں پیدا ہوئی تھی

جہاں میرا بچپن گذرا تھا۔" اور پرویز نے جلتا ہوا سگریٹ احتراناً پھینک دیا تھا۔ اور اس نے سوچا تھا "کاش میں مرشد آباد دیکھ سکتا۔ اُن راہوں کو تک سکتا جن راہوں پر شبنمی نے قدم قدم چلنا سیکھا ہے۔ جو قدم اب رقص کے گھماؤ، دائروں، دفعتہً رُکنے اور پھر حرکت کرنے سے ریت کے ذرّوں کو جگمگا دیتے ہیں" اور پھر راج شاہی پہونچ کر شبنمی نے پیلی ساڑھی پہنے تالاب میں ڈبکیاں لگائیں۔ وہ کتنی دیر تک پانی سے کھیلتی رہی۔ پرویز کنارے پر بیٹھا دیکھتا رہا سوچتا رہا۔ کتنا پرسکون ماحول تھا وہ، تالاب کے چاروں طرف ناریل کے قدآور درخت کھڑے تھے۔ ایک کھجور کے خمیدہ پیڑ کے پتے سطح آب کو چھو رہے تھے۔ شبنمی ایک بار تو غوطہ مار کر پانی میں گُم ہی ہوگئی اور پرویز کو یوں لگا جیسے کائنات کی تمام دلکشی دفعتہً روپوش ہوگئی ہو۔ پھر شبنمی ہنستے ہنستے کھجور کے خمیدہ پیڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ پانی کی ننھی ننھی بوندیں اُس کے رخساروں پر تھرتھرا رہی تھیں۔ اس کے سر کے سیاہ اور لانبے بال چمک رہے تھے۔ بھیگی ہوئی ساڑھی بدن سے چپک گئی تھی۔ ترشے ہوئے جسم کے خطوط نمایاں ہو کر کسی بت تراش کا حسین تخیل پیش کر رہے تھے۔

"شبنمی" ! اندر سے ماں نے آواز دی اور شبنمی دھم سے پانی میں کود گئی اور پھر ایک جل پری تیر کر کنارے پر آگئی۔ شبنمی "ماں" سے بہت ڈرتی تھی۔ شبنمی نے اپنی ماں کو دیکھا تھا نہ باپ کو، وہ تو اس کے بچپنے ہی میں چل بسے تھے۔ ایک دُور کی رشتہ دار نے اُسے پالا پوسا تھا۔ اسی کو وہ ماں کہہ کر پکارتی تھی۔ اور اس بڑھیا کو ماں پکارتے پکارتے اب وہ تھک گئی تھی۔ بعض اوقات تو اُس کا جی چاہتا کہ وہ اُس "ماں" کے منہ پر تھوک دے۔ یہ سوچ کر وہ دل ہی دل میں نادم ہوتی اور اپنے آپ کو احساس فراموش گردانے لگتی۔ یہ تمام باتیں اسنے پرویز کو سنائی تھیں۔ اُسنے کہا تھا "اس ماں سے مجھے نفرت ہوگئی ہے۔ اس گھر سے، اس تالاب سے، ہر شے سے، "ماں" کی نظروں سے بچ کر میں کہیں بہت دُور جانا چاہتی ہوں، میں کہیں بہت دور اپنا ایک گھر بسانا چاہتی ہوں۔ جہاں مکمل سکون ہو بھرپور زندگی ہو، رقص ہو، گیت ہوں اور ننھی ننھی زندگیوں کی چہل پہل۔ ہر روز اس ماں کا کوئی نہ کوئی منہ بولا بھتیجا یا بھانجا گھر میں آٹپکتا ہے جس کی خاطر تواضع کے لئے مجھے اکیلے چھوڑ کر وہ گھنٹوں غائب رہتی ہے اور جب تک وہ لوٹ کر نہیں آتی میں دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھی اپنے نصیبوں کو روتی رہتی ہوں" یہ قصہ سُنکر پرویز نے اظہار افسوس کیا اور شبنمی اتنی سی ہمدردی حاصل کرکے خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ اور ماں کی مرضی کے خلاف نارائن پور کا چکر لگا آئی۔ شبنمی نے ان چند دنوں میں خوابوں کے کتنے محل بنائے۔ پرویز کی معیت میں اسے ہوائیں گیت سناتی رہیں۔ اور پرویز نے سمجھا کہ زندگی میں پھول

ہی پھول ہیں، رس بھرے گیت ہیں، رقص کی چھا چھم ہے، گھنیری زلفیں ہیں، اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، بنگال کے سرسبز و شاداب گرد و نگھتے ہوئے پس منظر میں اس نے ایک جیتی جاگتی زندگی کو بہت قریب سے دیکھا۔ ایک نرم و گداز اور مترنم زندگی کشتی ہی کشتی جس کے پاس ایک مکار بڑھیا ماں کا روپ دھارے ناگن کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ پرویز تو اس بڑھیا کی پرچھائیں تک سے گریز کرتا تھا۔ اور بڑھیا بھی اُسے قہر آلود نگاہوں سے دیکھتی۔ ایسا اکثر ہوتا کہ کشتی جسے اچھا سمجھتی بڑھیا اُسے بُرا جانتی اور بڑھیا جب کسی منہ بولے بھتیجے یا بھانجے کی تعریف کرتی تو کشتی نفرت سے زمین پر تھوک دیتی۔ اس تضاد سے کبھی کبھی ایک دھماکا سا اٹھتا۔ بڑھیا اور کشتی میں تو تو میں میں ہو جاتی۔ پھر میل ملاپ ہو جاتا۔ زندگی پھر اپنے ڈھرّے پر چلنے لگتی۔ ایک دن پرویز راجشاہی کو خیر باد کہہ کر اپنے وطن لاہور چلا گیا۔ اُسے واپس تو آنا ہی تھا یہ تو وہ بھی جانتا تھا اور کشتی بھی جانتی تھی۔ اس کے باوجود اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کا کھڑا کیا ہوا تاج محل دفعتہً بیٹھ گیا ہو۔

اور کشتی کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ اُس نے چپ چاپ پرویز کو آخری سلام کیا، اور اُس کے ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی ہنسی آن کی آن میں عورت کی صدیوں کی داستان دہرا گئی۔ لاہور پہونچ کر پرویز ایک عرصے تک دوستوں سے کشتی کے تذکرے کرتا رہا۔ ایک مدت تک راجشاہی کی باتیں اس کے حافظے میں محفوظ رہیں۔ اور پھر آہستہ آہستہ راجشاہی کے پڑاؤ سے وابستہ یادیں اور گذرے ہوئے حادثات، بیتے ہوئے دنوں کی دھوپ چھاؤں میں کھو کر ماضی کے سمندر میں غوطے مارنے لگے رفتہ رفتہ یادوں کی جزئیات موٹے موٹے عنوانوں میں بدل گئیں اور پھر سب عنوان سمٹ کر ایک مرکز پر آگئے۔ وہ مرکز جس نے ایک ناچ ناچا تھا۔ ایک گیت گایا تھا اور پھر وہ مرکز بھی ماضی کے دھندلکے میں چھپ گیا۔ کشتی کے خد و خال پر دھند چھا گئی۔ گیت کی گونج زندگی کے شور و غوغا میں کھو گئی۔

اب ایک طویل مدت کے بعد آناً فاناً پرویز نے کشتی کو طوائف کے روپ میں دیکھا تھا وہ کافی بدل چکی تھی۔ اُسکا نام بھی بدل چکا تھا۔ اب وہ الماس تھی۔ جس کی آواز بکتی تھی۔ جسکی مسکراہٹ محفلوں کو گرماتی تھی۔ جس کی اداؤں کے چرچے ہوتے تھے راجشاہی والی کشتی مر چکی تھی۔ صرف الماس زندہ تھی۔ مگر وہ کشتی مری کیسے؟ یہ سوال مہینوں اُس کی زندگی کا اہم جزو بنا رہا۔ جیتی جاگتی زندگی کی فصیل پھاند کر وہ پھر جمود کی دنیا میں آگیا جہاں جسمانی حرکت کم تھی مگر ذہن کے وسیع و بسیط صحرا میں خیالات کے قافلے دوڑ رہے تھے۔ دل کی اس نئی بے چینی کو کم کرنے کے لئے اب وہ سرینگر پہونچا تھا۔ ڈل کے نیلے نیلے پانی پر، پیراڈائز کے صاف ستھرے کمرے میں پناہ لی۔ ہاؤس بوٹ کے ماتھے پر لکھا

ہوا نام "پیراڈائز" اُسے بہت پسند آیا۔

"ہاں صاحب یہ پیراڈائز ہے۔ جنت ہے جنت" مانجھی نے ہاؤس بوٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ اور پرویز نے بغیر کسی حیل وحجت کے مسکراتے ہوئے "پیراڈائز" ہی میں اپنا سامان رکھوا دیا تھا مگر تلاش تھی کہ بڑھتی ہی چلی جاری تھی۔

"صاحب رات کو کیا کھائیے گا؟" مانجھی نے نہایت ادب سے پوچھا۔

پرویز نہ جانے کیا سوچ رہا تھا اُسے یہ خلل اندازی ناگوار گزری۔ جواب دینے کے بجائے وہ سامنے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے تختِ سلیمان کی طرف دیکھنے لگا۔ مانجھی اُدھر ہی دیکھتے ہوئے بولا "یہ ایک ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ پتھر کی ہشت پہلو عمارت، روایت ہے کہ بادشاہ سلیمان کا تخت ہوا کے دوش پر اڑتا اڑتا یہاں پہونچ کر رک گیا تھا۔

پرویز نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی نگاہیں تختِ سلیمان سے ہٹ کر دیودار کے بلند و بالا درختوں کا جائزہ لینے لگیں اور پھر وہ سامنے بلوارڈ روڈ پہ دوڑتے ہوئے تانگے کی طرف دیکھنے لگا۔

مانجھی اُس وقت تو ہکا بکا رہ گیا مگر دو چار روز ہی میں پرویز کی طبیعت سے واقف ہو گیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُس کو ایسے انوکھے سیاح سے واسطہ پڑا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پرویز کی بہت سی عادتوں کا جواز سوچ چکا تھا مگر ایک بات وہ بالکل نہ سمجھ سکا۔ پرویز تمام دن رو پہ لانگ ہی کیوں گذار دیتا ہے۔ آخر وہاں دھرا ہی کیا ہے۔ لے دے کر چنار کے دو چار درخت کھڑے ہیں، چاروں طرف ڈل کا شفاف پانی ہے۔ اور پانی میں کہیں کہیں کنول کے پھول۔ سامنے پہاڑی پر پری محل کے کھنڈرات ہیں اور اس کے بائیں جانب شاہی چشمہ۔ ہر روز وہاں سے واپس آتے وقت پرویز کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے اور وہ مغلیہ سلطنت کی اُن یادگاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہر روز یہی فقرہ دہراتا۔ "مانجھی جانتے ہو یہ داماشکوہ کی شوکت و عظمت کے نوحہ گر ہیں" اور یہ سنکر مانجھی یوں ہی گردن ہلا دیتا اور سوچتا کہ یہ آخر آنسو بہانے کا کون سا مقام ہے۔ انسان کی آنکھوں میں آنسو تو اس وقت آتے ہیں جب اُس کا کوئی ذاتی نقصان ہو جائے، جب اس کے کھیت چوری ہو جائیں یا جب اسکی ہاؤس بوٹ کا کرایہ ملنا بند ہو جائے۔ خیر کوئی ہنسے یا روئے اُسے اِن باتوں سے کیا مطلب، اُسے تو پیسوں سے سروکار ہے۔ ہاؤس بوٹ سے رو پہ لانگ تک آنے جانے میں اُسے چار روپے مل جاتے ہیں۔ چاندی کے چار چمکتے ہوئے سکے جن کو وہ لکڑی کے صندوق میں رکھ کر اوپر کالا ٹرنک رکھ دیتا تھا۔ وہ کالا ٹرنک جس میں اس کی پہلی بیوی کے فرغل پڑے ہوئے تھے۔ بھورے سلیٹی اور بادامی رنگ کے فرغل جن پر کہیں کہیں گانگڑی

کی تپش نے ہلکی ہلکی سیاہی کی مُہریں ثبت کردی تھیں۔ اُسے اُن روپوں سے اتنا ہی پیار تھا جتنا اُن سُنہرے، سلیٹی اور بادامی رنگ کے فرغلوں سے، اور اُن سے کہیں زیادہ اپنی چوتھی بیوی سے جس کے رخساروں میں سرخ گلاب کھلا ہوا تھا جس کی گھنی گھنی پلکوں تلے دو صاف وشفاف جھیلیں تھیں جس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر کنول کے پھول شرم کر سرنگوں ہو جاتے تھے جس کے چہرے کا عکس ڈل کے پانی میں چپکے سے نمودار ہو کر لہروں میں بٹ جاتا تھا۔

ہاؤس بوٹ چار کمروں پر مشتمل تھی۔ چھوٹی سی بالکونی سے گزر کر پہلے گول کمرہ پڑتا تھا اس کے وسط میں ایرانی قالین بچھا ہوا تھا۔ قالین کا نقشہ، سُرخ، سبز اور نیلے رنگوں کا حسین امتزاج۔ دروازے کے مقابل، دیوار کے قریب صوفہ سیٹ نصف دائرے کی صورت میں رکھا ہوا تھا۔ اس کے دونوں طرف لکڑی کی تپائیاں تھیں جن پر راکھ دانیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے کے مشرقی کونے میں ایک مستطیل میز پر ریڈیو رکھا ہوا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں میں ہلکے سبز رنگ کے پردے لٹک رہے تھے۔ کمرے کی چھت چوبی نقش ونگار سے مزین تھی۔ گول کمرے سے نکل کر کھانے کا کمرہ پڑتا تھا جس کے بیچ میں ساگوان کی میز کے اردگرد چار بے بازو کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ کھانے کے کمرے کے ساتھ نعمت خانہ تھا اور اس سے ملحقہ دو کمرے اور تھے ایک کمرہ خالی پڑا تھا۔ دوسرے میں پرویز ٹھہرا ہوا تھا۔ دونوں کمروں کے سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جس کی دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔ وہ کھڑکی مانجھی کے کھیت میں کھلتی تھی جس میں کرم ساگ، مرچ، کدو، بینگن، خربوزہ اور تربوز اُگے ہوئے تھے۔ مانجھی کے کہنے کے مطابق وہ کھیت پچھلے سال چوری ہو گیا تھا اور پھر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد نند پورہ کے قریب ویرانی کی حالت میں پایا گیا تھا۔ کھیت کے پاس ایک ڈونگا تیر رہا تھا جس میں مانجھی اپنی چوتھی بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ ڈونگا اور ہاؤس بوٹ کو لکڑی کے تختوں سے منسلک کر دیا گیا تھا۔ پرویز جب بھی پکارتا تو مانجھی اس راستہ سے دوڑتا ہوا جھٹ آ پہنچتا اور پھر کاروباری مسکراہٹ کے ساتھ جھک کر سلام کرتا۔

پرویز صبح سویرے بالکونی میں کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا۔ پانی پر تیرتی ہوئی دوکانیں اس کے قریب سے گذر جاتیں مگر پھولوں والے کا شکارا ہر روز پرویز کی ہاؤس بوٹ کے قریب پہونچ کر رُک جاتا۔ پرویز حسب معمول سفید گلاب کے پھول خرید کر اپنے سونے کے کمرے میں گل دان میں سجا دیتا اور ہر رات سونے سے پہلے ان پھولوں کی طرف بار بار دیکھتا اور سوچتا کہ کل تک یہ پھول مُرجھا جائیں گے۔ کل تک ان نرم و نازک پنکھڑیوں کی ترو تازگی باقی نہ رہے گی۔ ایک رات جب وہ لحاف اوڑھے ہوئے سفید گلاب کے

پھولوں کی نرم و نازک پنکھڑیوں کی طرف دیکھ رہا تھا تو اُسے ایک ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ وہ چونک گیا۔ پھر پے در پے نسوانی آوازیں آئیں۔ دبی دبی گھٹی گھٹی جیسے کوئی شخص کسی عورت کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کا گلا دبا رہا ہو۔ پرویز لحاف سے نکل کر برآمدے میں چلا گیا۔ کھڑکی کھول دی۔ مانجھی کے ڈونگے کا دروازہ اور ایک کھڑکی بند تھی۔ دوسری کھڑکی پر چق پڑی ہوئی تھی۔ مگر کمرے کا اندرونی حصہ صاف نظر آرہا تھا۔ پرویز نے اپنے کمرے اور برآمدے کی روشنی بجھا دی۔ بجلی کی روشنی میں مانجھی کی چوتھی بیوی بستر پر پڑی تڑپ رہی تھی۔ اُس نے اپنی سپید کلائی دانتوں کی گرفت میں لے رکھی تھی۔ مانجھی نہایت پریشانی کے عالم میں اپنی بیوی کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ اتنے میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت اندر داخل ہوئی۔ مانجھی باہر نکل گیا۔ کھڑکی بند ہو گئی پھر لگاتار کئی آوازیں بلند ہوئیں۔ ان آوازوں میں زندگی اور موت کی کش مکش تھی ناقابل بیان درد و کرب اور زخموں سے بہتے ہوئے خون کی دل دوز چیخیں۔

دوسرے دن مانجھی نے پرویز کو بتایا کہ گزشتہ رات اس کے ہاں ایک بڑی خوب صورت بچی پیدا ہوئی ہے۔ یہ سنکر پرویز نے چاہا کہ وہ مانجھی کے منہ پر تھپڑ مار دے لیکن تھپڑ مارنے کے بجائے اُس نے مانجھی سے مخاطب ہو کر کہا "مبارک ہو" یہ سنکر مانجھی کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ نکلے۔ پھر پرویز ڈل کے نیلے نیلے پانی کی طرف دیکھنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی لہریں بن بنکر ٹوٹ رہی تھیں۔ اُس پانی میں ایک دن اس نے مانجھی کی چوتھی بیوی کے چہرے کا عکس دیکھا تھا۔ ایک نہایت خوبصورت چہرہ جو سطح آب پر نمودار ہو کر لہروں میں بٹ گیا تھا۔ وہ سوچنے لگا کچھ مدت کے بعد وہ چہرہ مرجھا جائے گا اور مانجھی کی خوب صورت بچی کا چہرہ اس کی جگہ لے لے گا۔ پانی کی سطح پر دو اور چہرے نمودار ہوگئے۔ ششی کا چہرہ۔ ششی جو مر چکی تھی۔ وہ جو راجشاہی سے بھاگ کر کہیں دور چلی جانا چاہتی تھی جس کو اپنی بڈھی ماں سے، اس گھر سے اس تالاب سے، وہاں کی ہر شے سے نفرت تھی۔ جو کہیں دور اپنا ایک گھر بسانا چاہتی تھی۔ جہاں مکمل سکون ہو۔ بھرپور زندگی ہو۔ رقص ہو۔ گیت ہوں اور ننھی منی زندگیوں کی چہل پہل۔ اب وہ سچ مچ راجشاہی سے بھاگ آئی تھی۔ اور اُس نے لاہور کی ہیرا منڈی میں اپنا گھر بسا لیا تھا۔ وہ ششی جس نے چاپائی نواب گنج سے شب گنج تک اُس کے ساتھ سفر کیا تھا جس نے چاندنی رات میں ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے ایک گیت گایا تھا۔ ایک ناچ ناچا تھا۔ دوسرا چہرہ اُس کی منگیتر زینت کا تھا جو اس کی تایا زاد بہن تھی۔ ابھی وہ اسکول ہی میں پڑھتے تھے کہ ان کی منگنی میکانکی طور پر خود بخود طے ہو گئی تھی۔ چھوٹے بھائی کے ہاں پرویز پیدا ہوا تو بڑے بھائی نے لڈو بانٹے جب بڑے بھائی کے گھر لڑکی تولد ہوئی تو چھوٹے بھائی نے زردے کی دیگیں پکوا کر برادری کی ضیافت کی کسی

کو منہ سے بولنے کی ضرورت بھی نہ پڑی محفل کے ایک کونے سے ہنسی مسکراتی چہ میگوئیاں شروع ہوئیں۔ اور دوسرے کونے تک پہنچتے پہنچتے بات پکی ہو گئی۔ دونوں بھائیوں نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔ پھٹکنے میں نسبت قرار پا گئی۔ بعد میں پرویز کا فیصلہ ہو گیا لیکن جب سے پرویز نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیا تھا تایا جان اس سے کچھ کھچے کھچے رہتے تھے۔

پرویز سوچنے لگا۔ کیا زندگی کا مقصد یہی ہے کہ انسان ملازمت کرے، پیسے کمائے، شادی کرے، بچے پیدا کرے اور پھر ایک دن چپ چاپ اس دنیا سے کوچ کر جائے۔ مالجی کی بیوی کی چیخیں اسکے کانوں میں گونجنے لگیں۔ ایک نئی زندگی معرضِ وجود میں آنے سے پہلے کتنے آنسوؤں، کتنی ہچکیوں، کتنی چیخوں، کتنی سسکیوں اور کتنے خون کے قطروں کا خراج لیتی ہے۔ شنتی کے نئے گھر کے تصور میں بھی ننھی منی زندگیوں کی چہل پہل شامل تھی۔ پرویز نے سوچا اگر میں نوکری کر لوں تو تایا جان خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے میں پھر باعثِ فخر ہو جاؤں گا۔ تایا جان زینت کا مجھ سے بیاہ کر دینگے تاکہ اُس نرم و نازک کلی سے خون کے قطرے نچڑ نچڑ کر ننھی ننھی جانوں کی تشکیل کر پائیں۔

"حضور چائے تیار ہے۔" مالجی کی آواز سنکر پرویز چونکا اور پھر کھانے کے کمرے میں جا کر بے بادل کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اُس دن نشاط باغ میں پرویز کی گل نواز سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ایک طویل مدت کے بعد اچانک ملاقات ہونے پر دونوں دوست پلٹ کر کالج کی فضا میں جا پہونچے "پلیزنٹ سرپرائز" گل نواز نے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"واٹ اے تھرل" پرویز نے یہ کہتے ہوئے گل نواز کو اپنے بازوؤں کی لپیٹ میں لے کر اُسے زمین سے اٹھا لیا۔

وہ کافی دیر تک چنار کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر گپ شپ کرتے رہے۔ پھر بیئر کی بوتلیں لیکر شکارے میں بیٹھ گئے۔ ہلکا ہلکا ابر چھایا ہوا تھا۔ ہوا میں خنکی پیدا ہو چکی تھی۔ بیئر کا سرور چھنے لگا۔ پرویز خواب و خیال کی فصیلیں پھاند کر پھر جیتی جاگتی دنیا میں آ گیا۔ جہاں شکارے کی چھت سے رنگ برنگ کے موتیوں کی جھالریں لرز رہی تھیں۔ دائیں بائیں اور پشت پر اُجلے اُجلے کمانی دار گدے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے سامنے گل نواز کا مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ زندگی حرکت کر رہی تھی۔ اس کا ذہن کروٹ بدل کر قرینے پر آ گیا۔ پرویز کو احساس ہوا کہ اب سے پہلے جو کچھ ہوا ماضی تھا اور اس کے متعلق سوچنا بے معنی ہے۔ "اب" "اب" ہے اور اُسے زندہ رہ کر بسر کرنا چاہئیے۔ چنانچہ اُس نے جی کھول کر زندگی سے بھرپور قہقہے لگائے۔

کم گفتاری کے ڈھرتے سے ہٹ کر خوب باتیں کیں۔ عمر خیام کی رباعیاں گنگنائیں۔ گل نواز کے تازہ رومان کا قصہ مزے لے لے کر سنا۔ گل نواز نے بتایا کہ اس کی رضیہ سے پہلی ملاقات سری نگر سے آٹھ میل دور پانپور میں زعفران کے کھیتوں میں ہوئی تھی۔ جب چاندنی رات میں زعفران کے ننھے ننھے پودوں پر زرد زرد پھول دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ فضا میں بھینی بھینی خوشبو پھیل رہی تھی اور جب گل نواز نے کہا "میں رضیہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا" تو پرویز کے ہونٹوں پر ایک طنز آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ کہنے لگا "گل نواز یہ فقرہ اب بہت پرانا ہو چکا ہے۔ تمہیں اپنی رضیہ کو کھو کر بھی جینا پڑے گا۔ تم جیسے ہزاروں اپنی رضیہ کو کھو کر جی رہے ہیں۔ اور پھر جب انہیں دوسری رضیہ مل جاتی ہے تو وہ پہلی رضیہ کو بھول جاتے ہیں۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ رضیہ اپنے پہلے گل نواز کو کبھی نہ بھول سکے گی۔ زعفران کے ابھرتے اور ڈوبتے ہوئے کھیتوں کی مہک اس کے دماغ میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ وہ مرد کی فطرت ہے یہ عورت کی۔"

"اماں چھوڑو اس فلسفے کو۔ ذرا آنکھیں تو سینک لو۔" گل نواز نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مقابل سے آتے ہوئے شکارے میں ایک فربہ عورت گدوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ دو نوجوانوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر ایک شوخ مسکراہٹ اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر کھیل گئی۔

"وھاٹ اے سپورٹ" گل نواز نے فقرہ کسا اور پھر نئی بیئر کی بوتل کا کاگ اڑا کر پانی میں پھینک دیا۔ گلاس ترچھا کر کے بوتل کا منہ اس میں رکھ دیا۔ جھاگ اٹھنے لگے۔ مست مست بو ہوا میں پھیل گئی۔ پرویز دل میں سوچنے لگا "ششی جیتے جی مر گئی۔ ذینت مر مر کر زندہ رہ رہی ہے اور گل نواز کی رضیہ مر کر زندہ رہے گی اور زندہ رہ کر مرتی رہے گی۔"

گل نواز کو اس کی ہاؤس بوٹ میں چھوڑ کر پرویز پیراڈائز کے قریب پہونچا تو سورج غروب ہو رہا تھا۔ شفق کی سرخی نے پانی میں آگ لگا رکھی تھی۔ چپوؤں کی شپ شپ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں پُراسرار مدغم ہو رہی تھی۔ مانجھی کے ہاتھ دھیرے دھیرے حرکت کر رہے تھے۔ وہ پانی پر نظریں گاڑے کچھ سوچ رہا تھا اور چوپ کی تیلیوں کے پیچھے دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ آسمان کی بلندیوں میں کونجوں کی ایک ڈار اڑتی ہوئی مغرب کی جانب جا رہی تھی۔ زیادہ بیئر پی لینے کی وجہ سے پرویز کے قدموں میں لغزش سی تھی۔ جب اس نے پیراڈائز کی بالکونی میں قدم رکھا تو پانی پر بستی ہوئی دنیا دو ایک بار گھومتی ہوئی نظر آئی۔ ہوا کا ایک تیز جھونکا اس کے ماتھے سے ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے گہرے سرخ ہو گئے۔ سنبھل سنبھل کر چلتا

ہوا وہ اپنے کمرے میں پہونچا اور پھر جوتوں سمیت پلنگ پر دراز ہو کر خراٹے لینے لگا۔

دوسرے دن مانجھی نے پرویز کو جگایا تو دن چڑھ چکا تھا آفتاب کی روپہلی کرنیں کھڑکی کے پردوں سے چھن چھن کر سفید گلاب کے پھولوں سے کھیل رہی تھیں۔ پرویز نے اٹھ کر ایک انگڑائی لی۔ بار بار منہ پر ہاتھ پھیرے۔ اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ کنپٹیوں میں کھنچاؤ سا محسوس ہو رہا تھا۔ حلق میں جلن ہو رہی تھی۔ اس نے جوتے اور موزے اتار کر سلیپر پہنے۔ ٹائی کھول کر میز پر رکھ دی۔ کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ غسل خانے میں جا کر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا۔ پانی کو چھوچھو کر آتے ہوئے ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکوں میں پپوٹوں کا بوجھ ہلکا ہونے لگا۔ اس نے غسل خانہ کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ بید کے درخت جھوم رہے تھے۔ پرندے ہواؤں میں اڑانیں بھر رہے تھے۔ نیلے آسمان میں کہیں کہیں بادلوں کے سفید سفید گلے تیر رہے تھے۔ غسل خانہ سے نکل کر اس نے بالوں میں کنگھی کی۔ صراحی سے شاہی چشمہ کا پانی، کانچ کے گلاس میں بھر کر غٹ غٹ پی گیا۔ حلق کی جلن بجھنے لگی۔

مانجھی چائے لے کر آگیا۔

گل دان میں سفید گلاب کے پھول جھکی جھکی نظروں سے پرویز کو تک رہے تھے۔ ہلکے سبز رنگ کے پردے ہوا کے جھونکوں میں لہرا رہے تھے۔ کمرے کی چھت چوبی نقش و نگار سے گلزار بنی ہوئی تھی۔ دیوار پر لٹکی ہوئی کشمیری دیہاتن کی تصویر مارے شرم کے سمٹی جا رہی تھی۔ مگو گوشہ، سیب، ناشپاتی، گلاس میوہ اور آلو بخارا کے درختوں کے پاس، بھورا فرغل پہنے، بغل میں گھڑا لئے، گھنی گھنی پلکوں، سرخ و سفید رخساروں اور بڑی بڑی آنکھوں والی کشمیری دیہاتن کسی کو دور سے آتے دیکھ کر رک گئی تھی۔ شرما گئی تھی۔ جھجک، جھینپ، چھپی چھپی مسرت، گرم گرم سانسوں کی آمد و رفت اور سینے کا اتار چڑھاؤ، مصور نے یہ تمام پہلو رنگوں میں اجاگر کر دیئے تھے۔ بالوں کی مینڈھیاں رخساروں کو چھوتی ہوئی سینے پر آگئی تھیں اور ان مینڈھیوں میں چاندی کے چھوٹے چھوٹے گھنگرو جیسے ابھی بج اٹھیں گے۔ سر پر کسابہ اور اس پر ڈیڑھ گز کا تہہ کیا ہوا دوپٹہ کانوں میں چاندی کی بالیاں، مصور نے بڑی چابکدستی سے جزئیات کو رنگوں میں سمو دیا تھا۔

پرویز اس تصویر میں نت نیا پہلو تلاش کر لیتا تھا۔ آج جیسے وہ تصویر کہہ رہی تھی "میں زندہ ہوں، میں زندہ رہوں گی، کشتی زندہ ہے، کشتی زندہ رہے گی۔"

"صاحب یہ تار آیا ہے" دفعتہً مانجھی کی آواز سن کر پرویز چونکا۔

مانجھی کے گھر سے نوزائیدہ بچے کے رونے کی آواز سنائی دینے لگی۔

ہاؤس بوٹ کے سامنے سے ایک شکارا بے فکروں کی ٹولی لئے گزر گیا۔ شکارے میں بجتے ہوئے گراموفون ریکارڈ کی صدا چند لمحوں تک پرویز کے کمرے میں گونجتی رہی اور پھر خاموش ہوگئی۔

پرویز نے تار کھول کر پڑھا، لکھا تھا "والدہ سخت بیمار ہیں فوراً چلے آؤ۔"

اسی دن پرویز لاہور روانہ ہوگیا۔ اُسکے چلے جانے سے کشمیر کی رنگینیوں میں کوئی فرق نہ پڑا۔ گل نواز کو ایک اور نیا دوست مل گیا۔ ماجھی کی ہاؤس بوٹ میں اُسی دن ایک مولانا آگئے جنہوں نے کمرے میں قدم رکھتے ہی کشمیری دیہاتن کی تصویر دیوار سے اتروا کر سیدھی ماجھی کے گھر بھجوا دی۔

# نغمے کی بغاوت

دورانِ سفر میں پرویز کے دل میں لاکھوں خیال آئے اُسے ماں کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔ ماں کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ گیا۔ وقت کا دریا پلٹ کر اپنے مخرج کی طرف بہنے لگا۔ یاد کی لہریں محبت کے مرغزاروں کا طواف کرنے لگیں۔ ماں کی عظمت لمحہ بہ لمحہ اُجاگر ہونے لگی۔ پرویز دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ اس کی تمنا تھی کہ وہ اپنی ماں کی خدمت کرے۔ اس کا کہا مانے لیکن اس سلسلہ میں اس نے ہمیشہ کل پر بات اٹھا رکھی۔ اب وہ صرف ایک بار اپنی ماں کو زندہ دیکھنا چاہتا تھا۔ فقط ایک مرتبہ اُن مہربان ہونٹوں سے دو باتیں سُننی چاہتا تھا۔ دل کی یہ کیفیت لئے ہوئے جب وہ لاہور کے ریلوے اسٹیشن سے نکلا تو اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ یہ خیال کہ کوئی اُسے بُری خبر نہ سُنا دے۔ بڑا روح فرسا تھا۔ جب اس کا تانگہ ماڈل ٹاؤن میں داخل ہوا تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ جب وہ تانگے سے اُتر کر اپنی کوٹھی کے پھاٹک کی طرف بڑھ رہا تھا تو عقب سے کسی نے اس کا نام لے کر پکارا۔ پرویز نے پلٹ کر دیکھا۔ الطاف تانگے سے اُتر کر اس کے قریب آیا۔ اس کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی: "اماں کس گاڑی سے آئے ہو۔ تمہاری راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئیں۔" پرویز کا جی چاہا کہ کس کر ایک تھپڑ الطاف کے منہ پر مار دے "تمہاری والدہ خیریت سے

ہیں۔" یہ کہتے ہوئے الطاف نے پرویز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبایا۔ "وہ چھوٹا تار یارو نے بھیجا تھا۔" الطاف یہ کہہ کر تانگے میں بیٹھ کر چلتا بنا۔

پورچ سے گذر کر جب پرویز ڈرائینگ روم میں پہونچا تو دیکھا کہ اماں سامنے آنگن میں تخت پر بیٹھی تربوز کاٹ رہی ہیں۔ خادمہ سویّوں کے لچھے دھوپ میں رسّی پر ڈال رہی ہے۔ دوچار پڑوسنیں تخت کے قریب مونڈھوں پر بیٹھی ماں سے باتیں کر رہی ہیں۔ ماں نے اٹھ کر پرویز کی بلائیں لیں۔ پڑوسنوں نے جھولیاں بھر بھر کے دعائیں دیں۔ خانساماں پرویز کی مرغوب ڈش، دھلی ماش کی دال پکانے میں جٹ گیا۔ آپا نے جھٹ پرویز کے پسندیدہ ریکارڈ ریڈیو گرام کے پاس رکھ دیئے۔ گھر کے کونے کونے میں زندگی عود کر آئی۔ آپا نے کہا: "چپکے سے چلے آئے۔ تار ہی دے دیا ہوتا۔" ایک پڑوسن بولی: "ہمارے شہزادے کے لئے رشتوں کی کیا کمی۔" اور پھر وہ تربوز کی قاش ہاتھ میں لے کر سرخ سرخ گودے کو تکنے لگی۔

پرویز چھوٹے تار پر قیاس آرائیاں کرتا ہوا، تولیا لے کر غسل خانہ میں چلا گیا۔ چند ہی لمحوں میں پڑوسنوں کی گفتگو ایک نئے اقدام کا انکشاف کرنے لگی۔ وہ پوری توجہ سے اُن کی باتیں سننے لگا اس کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ نہایت میکانکی، خرید و فروخت کی باتیں۔ پرویز نے اپنے سر کے بالوں منہ اور بدن کو صابن لگا کر شاور کھول دیا۔ ٹھنڈے پانی کی تیز پھوار کے نیچے بدن کا میل بہہ بہہ کر نالی کی طرف دوڑنے لگا۔ طبیعت بشاش ہوگئی۔ تولیئے سے بدن پونچھ کر پرویز غسل خانہ سے نکلا اور سیٹی بجاتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ جیسے کسی نے ایک بوجھ اس کے بدن سے اتار کر پھینک دیا ہو۔ جب وہ غسل خانہ سے کنسوئیاں لے رہا تھا۔ تو اسے یہ سنکر بڑی مسرت ہوئی کہ تایا جان زینت کی شادی کسی دوسری جگہ کر رہے ہیں۔ اسنے دل ہی دل میں تایا جان کے اس فیصلے کی داد دی۔ مگر اس کی ماں کو اس بات کا بڑا صدمہ تھا۔ پرویز کو قصہ سناتے سناتے وہ رو پڑی۔ اس نے بتایا "زینت کا باپ کہتا ہے کہ پرویز کے لچھن اچھے نہیں، نہ وہ نوکری کرے گا نہ میں اُسے اپنی لڑکی دوں گا۔" اس بات پر دونوں بھائی ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔ موت زندگی چھوٹ گئی۔ اُدھر آپا کچھ اداس اداس تھیں انہوں نے دبی دبی آواز میں کہہ ہی دیا "بھیا ہماری تو ناک کٹ گئی۔ ہماری بہو کوئی اور لے جائے، ڈوب مرنے کا مقام ہے۔" یہ سنکر پرویز کھل کھلا کر ہنس پڑا اور کہنے لگا "آپا اس میں میرا کیا قصور، اس میں زینت کا کیا قصور، ادھر دیکھو آپا" یہ کہتے ہوئے اس نے سنگار میز سے ایوننگ ان پیرس کی بوتل اٹھائی۔

"یہ کیا ہے آپا؟" پرویز نے بڑی سنجیدگی سے پوچھا۔

"بوتل!" آپا نے جواب دیا۔

"یہ بوتل اگر میں کسی کو دے دوں، تو اس میں بوتل کا کیا قصور، اسی طرح اگر تم سورج مکھی کا پھول توڑ کر میرے کوٹ کے کاج میں لگا دو اور کہو کہ میں ہمیشہ اسے سینے سے لگائے رکھوں حالانکہ مجھے صرف سفید گلاب کا پھول پسند ہے تو بتاؤ کیا میں یہ تحفہ پا کر خوش ہو جاؤں گا؟"

آپا نے پرویز کے ہاتھ سے بوتل لے کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا "یہ بوتل بول نہیں سکتی مگر ٹوٹ سکتی ہے تم جانتے ہو زینت میری تایا زاد بہن بھی ہے۔ اور سہیلی بھی۔ جب اس نے اپنے باپ کا فیصلہ سنا تو وہ منہ سے کچھ نہیں بولی مگر اس کے سرخ رخسار ہلدی کی طرح زرد ہو گئے۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اب اس کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو چھلکتے رہتے ہیں۔" آپا یہ کہہ کر صوفے میں دھنس گئیں۔ اور پرویز نے ریڈیو گرام کا پک اپ پہلے ریکارڈ پر رکھ دیا۔ والٹز کی دھن کمرے میں گونج اٹھی۔ پرویز نے سگریٹ سلگا لیا سامنے مینٹل پیس پر زینت اور پرویز کا بچپنے کا فوٹو رکھا ہوا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغیچہ کی روش پر کھڑے تھے۔ پس منظر میں بیل بوٹے پھول اور درخت نظر آ رہے تھے۔ زینت ٹیونک اور اسٹاکنگ پہنے ہوئے تھی گھونگھریلے اور سنہری بالوں کی دو لٹیں رخساروں کو چھوتی ہوئی گردن چوم رہی تھیں۔ اس کی ٹھوڑی میں ایک ننھا سا گڑھا تھا۔ وہ ایک چینی کی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ پرویز نکر قمیص اور موزے پہنے ہوئے تھا۔ پیچھے کو مڑے ہوئے بالوں نے چوڑی پیشانی کو نمایاں کر رکھا تھا۔ دونوں کے کندھوں سے بستے لٹک رہے تھے۔ اس وقت وہ کانونٹ میں پڑھتے تھے۔ ایک ساتھ اسکول جانا ہوتا۔ ایک ساتھ کھیلتے، کبھی کبھی آپس میں لڑائی جھگڑا بھی ہو جاتا۔ پرویز چونکہ زینت سے بڑا تھا وہ اسے پیٹ دیتا۔ زینت منہ بسور بسور کر رونے لگتی۔ اماں پرویز کو ڈانٹ پلاتیں۔ تھوڑی دیر بعد وہی پرویز اور وہی زینت ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اچھلتے کودتے نظر آتے۔ ان دنوں پرویز کے ابا اور تایا ایک ہی کوٹھی میں ٹیمپل روڈ پر رہتے تھے۔ بعد میں تایا جان نے اپنے لئے ماڈل ٹاؤن میں کوٹھی تعمیر کروائی اور وہیں اٹھ آئے۔ پھر ان کی کوٹھی سے کچھ دور پرویز کے ابا نے بھی اپنی کوٹھی بنوا لی۔ پرانی کوٹھی کرایہ پر دے دی گئی۔ گو زینت اور پرویز اب بھی قریب رہتے تھے۔ مگر پرویز نے برسوں سے زینت سے بات نہیں کی تھی۔ ان کے خاندان میں پردے کا رواج نہ تھا۔ تاہم زینت اس کے سامنے نہ آتی تھی۔

اختر کی بیٹھک میں پرویز کے آتے ہی بہار آ گئی۔ بیئر کا دور شروع ہو گیا۔ پرویز نے

سری نگر کے قصے مزے لے لے کر بیان کئے۔ اپنے مخصوص انداز میں گل نواز کے نئے رومان کا ذکر کیا۔ رو پہ لانگ کی تعریف کے پُل باندھ دیئے۔ کشمیری دیہاتن کی شباب تصویر کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ پری محل کے کھنڈرات اور شاہی چشمہ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ جذباتی سا ہو گیا، سامعین پر رقّت طاری ہو گئی۔ پھر ڈل کے شفاف پانی میں کنول کے پھول جھومنے لگے۔ پھر مانجھی کی چوتھی بیوی کی دردناک چیخوں کا ذکر آ گیا۔ ان چیخوں میں زندگی اور موت کی کشمکش تھی۔ ایک نئی زندگی معرضِ وجود میں آنے سے پہلے اَن گنت ہچکیوں، آنسوؤں اور خون کے قطروں کا بلیدان چاہتی ہے۔ اس کے باوجود ہر عورت میں جذبۂ تخلیق بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ جیسے اس کے بغیر وہ نامکمل ہو۔ یہ کہتے ہوئے پرویز کی نوکِ زبان پر شتی کا نام آ گیا۔ وہ لمحہ بھر کے لئے رکا اور پھر اسنے زبان پر آئی ہوئی بات کہہ ہی ڈالی۔ بہشتی بھی کہا کرتی تھی میں کہیں بہت دور اپنا گھر بنانا چاہتی ہوں۔ جہاں مکمل سکون ہو۔ بھرپور زندگی ہو۔ رقص ہو، گیت ہوں اور ننھی منی زندگیوں کی چہل پہل۔"

"تو چلو الماس یعنی تمہاری بہشتی کی صحت کا جام پی لیں۔" الطاف نے بیئر سے بھرا ہوا گلاس بلند کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر گلاسوں کے ٹکرانے کی آواز آئی۔

اختر نے ایک ہی گھونٹ میں آدھا گلاس خالی کر دیا۔ اور پھر بائیں ہاتھ کی پشت سے ہونٹ پونچھتے ہوئے بولا۔ "اماں یار الماس کی کچھ نہ پوچھو، جب جاتے ہیں بڑی آؤ بھگت کرتی ہے۔ مگر پیسے لینے سے انکار کر دیتی ہے۔ ہمیشہ یہی کہتی ہے 'آپ پرویز صاحب کے دوست ہیں۔ میں آپ کے پیسے نہیں لوں گی اور اسی وجہ سے اس کا جنازیا ناک بھوں چڑھائے رہتا ہے۔"

"جنازیا کون؟" پرویز نے سگریٹ کا کش لے کر پوچھا۔

"اماں اتنا بھی نہیں جانتے۔" اختر نے سگریٹ کا ٹن اپنی طرف کھسکاتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "ہر طوائف کا ایک جنازیا ہوتا ہے، جانتے ہو ہم تو بھونرے ہیں رس چوس کر اڑ گئے۔ وہ طوائف جو ہماری اُداس راتوں کو رنگین بناتی ہے۔ آخر ہماری طرح انسان ہے۔ وہ بیمار بھی ہوتی ہے۔ ایک دن مر بھی جاتی ہے۔ اس وقت کیلئے اسے تیار رہنا پڑتا ہے۔ فرض کرو آج الماس مر جائے تو ہم اس کے کوٹھے پر قدم رکھنا بھی اپنی ہتک سمجھیں گے۔ اس آنے والے وقت سے طوائف ہمیشہ ڈرتی ہے۔ اسی لئے وہ ایک مرد کو اپنے قابو میں رکھتی ہے جسے وہ کھلاتی پلاتی ہے۔ اس کی ناز برداریاں کرتی ہے۔ بس بھروسے پر کہ جب اس کی آنکھیں بند ہو جائیں تو وہ اسے چپ چاپ دفنا دے۔ اس کی مٹی ٹھکانے لگا دے۔ ایسی مرد کو اصطلاحاً جنازیا کہتے ہیں۔"

"تو چلو آج سالا قرض چکا آئیں" الطاف نے یہ کہتے ہوئے بٹوا جیب سے نکال کر میز پر رکھ دیا۔ غیر شعوری طور پر پرویز کو الطاف کا یہ فعل ناگوار گذرا۔ اس نے بٹوا اٹھا کر الطاف کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا "ہر قرض پیسے سے نہیں چکایا جا سکتا"

"واہ میرے یار" الطاف نے معنی خیز نظروں سے پرویز کی طرف تکتے ہوئے کہا۔

"جا تو چل جائیں گے" اختر نے فقرہ کسا۔ اور پھر جس کے جی میں جو آیا کہہ ڈالا۔ الکحل نے ملتے اندر کر پرے پھینک دیئے۔ دل کی باتیں زبان پر آنے لگیں۔ چند ہی لمحے میں پرویز پر واضح ہو گیا کہ شرنتی کے کہنے سے الطاف نے جھوٹا تار دیا تھا۔ یہ سنکر پرویز کی آنکھوں کے سامنے شرنتی کی مختلف تصویریں ابھرنے لگیں۔ اور پھر پیراڈائز کی ایک دیوار پر لٹکی ہوئی کشمیری دیہاتن کی تصویر بولنے لگی: "میں زندہ ہوں میں زندہ رہوں گی، شرنتی زندہ ہے، شرنتی زندہ رہے گی"

پرویز کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شرنتی ابھی مری نہیں۔ اسنے بالواسطہ مجھے جتلایا ہے کہ "مجھے یوں چھوڑ کر تم سری نگر چلے گئے۔ بڑے ظالم ہو۔ تم اسی طرح مجھے راجشاہی چھوڑ کر لاہور بھاگ آئے تھے" پرویز کو یہ احساس ہوا کہ شاید شرنتی اسے دیکھنے کے لئے بے چین ہے۔ اور یہ احساس آناً فاناً اُس جذبے میں بدل گیا جس کے تحت انسان اپنے دوست کی صورت دیکھنے کے لئے مجسم بے قراری بن جاتا ہے۔ جوں جوں سرور بڑھتا گیا طوائف کی زندگی کا گھناؤنا تصور بدلتا گیا۔ یہاں تک کہ جب بہت رات گئے محفل برخاست ہوئی اور لڑکھڑاتے ہوئے قدم اپنے اپنے گھروں کی طرف بڑھنے لگے۔ تو پرویز کی آنکھوں کے سامنے وہی بھولی بھالی شرنتی گھومنے لگی جس نے چاندنی رات میں ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے دفورِ مسرت میں کہا تھا "یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے" ہوا کے جھونکوں میں سرور نشے میں بدل گیا اور پھر نشہ مستی میں، جذبات کی آنچ تیز ہو گئی۔ ہموار زمین میں نشیب فراز پیدا ہو گئے۔ پرویز کے قدم بہکنے لگے۔ اسنے رک کر دائیں بائیں نظر دوڑائی، تمام دوست دور نکل گئے تھے۔ اُس کے قدم خودبخود ہیرا منڈی کی طرف بڑھنے لگے۔ اُدھر جدھر شرنتی رہتی تھی۔ شرنتی جس نے اُسے بالواسطہ بلوا بھیجا تھا۔ شرنتی جس نے اس کے دوستوں سے پیسے لینے انکار کر دیا تھا۔ پرویز ہیرا منڈی پہنچ کر رک گیا۔ بازار سونا پڑا تھا۔ طوائفیں دکانیں بڑھا کر سو گئی تھیں شرنتی کا کوٹھا اندھیرے میں گم تھا۔ سیڑھیوں کا دروازہ بند تھا۔ پرویز نے تھڑے پر چڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ پنواڑی کی دکان کے سامنے پڑے ہوئے کتے نے کان کھڑے کر لئے۔

پرویز نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون ہے" اندر سے آواز آئی۔ اور پھر زینے میں قدموں کی چاپ سنائی دی کسی نے دروازے کے قریب آکر پھر پوچھا "کون ہے؟"

"میں" پرویز نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے جواب دیا۔

"بائی جی سو گئی ہیں"

"ان سے کہہ دو پرویز آیا ہے"

"کل صبح کہہ دوں گی"



"ابھی کہہ دو"

"بائی جی کا حکم نہیں"

پرویز چپ چاپ چبوترے سے اتر کر آگے بڑھ گیا۔ دفعتہً اسے شدید احساس ہوا کہ وہ دنیا میں تنہا ہے۔ سب کے ہوتے ہوئے بھی اس کا کوئی نہیں۔ ماں باپ جو کچھ اسے بنانا چاہتے ہیں وہ کبھی نہیں بن سکتا۔ اور اگر وہ اس ڈھنگ کا بن بھی گیا تو وہ جیتے جی مر جائے گا۔ ایک شاندار بنگلہ، خوبصورت بیوی، ننھے منے بچے، کاریں، بیرے، خانساماں، یہی تو ان کا مطمعِ نظر تھا۔ اس نے سوچا یہ تو ایک عام انسان کا خواب ہے۔

"یا خدا" قریب سے ایک آواز آئی۔

پرویز نے پلٹ کر دیکھا۔

ایک دکان کے چبوترے پر ایک مزدور کراہ رہا تھا۔ اس نے سوچا شاید وہ بیمار ہے؟ وہ بھی خواب دیکھتا ہوگا؟

"تانگہ جناب" تانگے والے کی آواز سن کر پرویز چونکا۔ اور پھر بغیر بات کئے تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھ گیا۔

"ماڈل ٹاؤن" پرویز نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا اور تانگے والے نے چابک ہوا میں گھما کر گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔

پرویز کے ابا کے مزاج میں بے حد چڑچڑاپن پیدا ہو گیا۔ پیرانہ سالی، اکلوتے بیٹے کے کرتوتوں سے دل داغ داغ، بھائی کے چھوٹ جانے کا غم، بیٹے کی منگیتر کے کھو جانے کا چرکا، سب نے مل جل کر اسے نیم پاگل سا کر دیا۔ گھر کی چہل پہل کافور ہو گئی۔ ناخوشی، بے زاری اور مسلسل کرخت لہجوں

کی کوشش نے گھر کی جنت کو جہنم میں بدل دیا۔ اور اس جہنم سے دُور رہنے کے لئے پرویز زیادہ سے زیادہ وقت باہر گزارنے لگا اُدھر اختر کی بیٹھک زعفران زار بن گئی۔ پرویز اچھا خاصا برج کا کھلاڑی تھا۔ اسکے باوجود وہ ننانوے فی صدی بازیاں ہار جاتا۔ اور جب الطاف اس سے مخاطب ہو کر کہتا۔ "تم تاش میں بدقسمت ہو مگر محبت میں خوش قسمت" تو پرویز یہ سنکر ایک پھیکی سی ہنسی ہنس دیتا۔ اور مدافعت کے انداز میں کوئی چٹکلا چھوڑ کر محفل کو بے رنگ ہونے سے بچا لیتا۔ رفتہ رفتہ اختر کی بیٹھک میں برج کے بجائے پوکر اور بیئر کے بجائے وسکی کا دور دورہ ہو گیا۔ امیر گھرانوں کے چشم و چراغ جنہیں منہ مانگا روپیہ مِل جاتا تھا۔ جو صرف خرچ کرنا جانتے تھے۔ وقت کے ان گنت کھوکھلے لمحات کو وسکی کے تیز و تند نشے سے پُر کرنے لگے۔ ہر شب جب وہ اختر کی بیٹھک سے نکلتے تو نشے میں چور ہوتے۔ ڈگمگاتے ہوئے قدم ہیرا منڈی پہونچ جاتے۔ ایک آدھ ٹھمری سنکر جیبیں ہلکی کر لیتے۔ جب کبھی مستی کے عالم میں اختر۔ الطاف۔ اور رفیق ششی کے کوٹھے کا رُخ کرتے تو پرویز چپکے سے کھِسک جاتا۔ بسری نگر سے واپس آکر ششی کو دیکھنے کی جو خواہش اس کے دل میں تڑپی تھی وہ دوسرے دن تک ختم ہو گئی تھی۔ پرویز نے محسوس کیا کہ راج شاہی والی ششی مر گئی ہے۔ کشمیری دیہاتن کی تصویر جھوٹ کہتی ہے۔ ایک رات وہ ایسی ہی باتیں سوچتا ہوا ششی کے کوٹھے پر جا پہونچا۔ ششی کے کمرے میں برقی قمقمے جگمگا رہے تھے۔ چاندنی کا فرش لگا ہوا تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ گاؤ تکئے سجے ہوئے تھے۔ جن پر ارغوانی ساٹن کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ دائیں دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے قدِ آدم آئینہ میں مقابل کی دیوار پر لٹکی ہوئی کسی ماہر رقاصہ کی تصویر کا عکس صاف صاف نظر آ رہا تھا۔ دروازے میں کانچ کی نلیوں اور رنگ برنگ کے موتیوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ ششی ایک گاؤ تکئے کے پاس بیٹھی ہوئی سروتے سے چھالیہ کتر رہی تھی۔ اس کے سامنے مراد آبادی پاندان رکھا ہوا تھا دائیں جانب ایک طشتری میں پان کی گلوریوں پر چاندی کے ورق چمک رہے تھے۔ بائیں طرف ایک اگالدان پڑا ہوا تھا۔ ششی نے بادامی رنگ کی چولی اور اُسی رنگ کی جارجیٹ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ چولی کے نیچے ناف اور کمر کا کچھ حصہ برہنہ تھا۔ گھنیرے جوڑے میں سفید گلاب کا پھول۔ گلے میں سونے کا نکلس، ماتھے پر طلائی جھومر۔ کانوں میں بالیاں، ہاتھوں میں طلائی چھاپ چھلے۔ آنکھوں میں کاجل، ہلکا ہلکا میک اپ سینٹ کی بھینی بھینی خوشبو سب نے مِل جُل کر بلا کی دلکشی پیدا کر رکھی تھی۔ قدموں کی آہٹ پاکر اُسنے ہونٹوں پر بناوٹی مسکراہٹ پیدا کر کے نظریں جھکا لیں۔

"ششی!" دفعتہً کمرے میں ایک بہکی بہکی آواز بلند ہوئی۔

کانچ کی نلیوں اور رنگ برنگ کے موتیوں کی جھالروں کے بیچ پرویز کھڑا تھا۔ اسکے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔

ششی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

ایک عمیق سناٹا، ایک گمبھیر خاموشی چاروں طرف چھا گئی۔ چند پُراسرار لمحے بن بولے لاکھوں باتیں کہہ گئے۔ ایک مختصر وقفہ کئی طویل وقفوں کو روندتے چپکے سے گذر گیا۔

وسکی کے نشے میں پرویز کو ششی دنیا کی حسین ترین عورت نظر آئی۔ سانولے چہرے کو بادامی جارجٹ کی ساڑھی نے نکھار دیا تھا۔ چولی کے نیچے بدن کے برہنہ حصے کی نرم و گداز جلد سے تازگی پھوٹی پڑتی تھی۔ برقی قمقموں کی روشنی میں نگینوں کے چھوٹ آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے۔ تین پھیر دے کر باندھی ہوئی ساڑھی نے لمبے ہوئے قد کو جلا دے کر قیامت بنا دیا تھا۔ مستی کے عالم میں پرویز کو یوں محسوس ہوا جیسے عمر خیام کی کوئی غیر فانی رباعی صفحۂ قرطاس سے باغی ہو کر شباب و رعنائی کا پیکر بن گئی ہو اور بتِ آدم آئینہ میں اپنی ہی صورت دیکھ کر مجسمۂ حیرت بن گئی ہو۔ ششی کے جوڑے میں ٹکا ہوا سفید گلاب کا پھول پرویز کے ذہن کو تھپکی لگا کر راج شاہی لے گیا۔ جہاں ایک دن پیلی ساڑھی پہنے ششی نے تالاب میں ڈبکیاں لگائی تھیں، جہاں نارائن پور کے راستے میں، ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے اُس نے ایک ناچ ناچا تھا۔ ایک گیت گایا تھا۔

"تشریف رکھئے پرویز صاحب" ششی بولی۔

پرویز گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ششی جہاں سے اٹھی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ "پان سے شوق فرمائیے" ششی نے دو نرم و نازک ہاتھوں پر چاندی کی طشتری رکھ کر کہا۔

"شکریہ" پرویز نے یہ کہہ کر پان کی ایک گلوری اٹھا کر منہ میں ڈال لی۔

اتنے میں سازندے آگئے۔ سارنگی نواز نے فرشی سلام کیا۔ طبلہ نواز نے استاد کا نام لے کر ہتھوڑی سے اڑدوں پر ضربیں لگانی شروع کر دیں۔ ہارمونیم ماسٹر کمال پھرتی سے ہارمونیم کے سُروں پر انگلیاں نچا کر گاہک کی فرمائش کا انتظار کرنے لگا۔

"کون سی چیز سنئے گا" ششی نے کاروباری انداز میں پوچھا۔

"میں گانا سننے نہیں آیا" پرویز نے لفظ "نہیں" پر قدرے زور دے کر کہا اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا دایاں ہاتھ ہوا میں پھیلا کر دائیں بائیں دو چار بار گھمایا۔ اور پھر یکایک دیوار پر لٹکی ہوئی رقاصہ کی تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے جیب میں سگریٹ ٹٹولنے لگا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد

ششی سازندوں سے مخاطب ہو کر بولی " آپ لوگ چلے جائیے۔ سازندے جس دروازے سے داخل ہوئے تھے اُسی دروازے سے واپس چلے گئے۔

ششی یہاں میرے قریب آکر بیٹھو " پرویز نے گاؤ تکئے پر جھکتے ہوئے کہا۔

ششی چپ چاپ پرویز کے قریب جا بیٹھی۔

" ششی "

" اوں "

" تم جانتی ہو، میں تم سے ہزاروں باتیں پوچھنی چاہتا ہوں۔ بتاؤ وہ ششی جو میں نے راج شاہی میں دیکھی تھی کب مری ؟ کیوں مری ؟؟ کیسے مری ؟؟؟"

" پرویز صاحب " یہ کہتے ہوئے ششی کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ساون کی گھٹائیں اُمنڈ آئیں " میں اس وقت جو کچھ ہوں وہ نہیں ہوں اور جو کچھ نہیں ہوں وہ ہوں " یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر بغلی کمرے میں چلی گئی اور پلنگ پر اوندھے منہ گر کر زار وقطار رونے لگی۔ پرویز بھی لغزیدہ قدموں سے اُسکے پیچھے پیچھے چلا گیا۔

" ششی ! " پرویز ششی کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

" پرویز صاحب " یہ کہتے ہوئے ششی نے پلٹ کر دیکھا۔ دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں پدما موجیں مار رہی تھی۔ پرویز پائینتی بیٹھ گیا۔ ششی سسکیاں لے کر داستانِ حیات کے اوراق الٹنے لگی۔ اور پرویز کی آنکھوں کے سامنے بنگال کی ہریالی وشادابی میں آگ کے شعلے بلند ہونے لگے۔ نارائن پور کی راہ میں ایک چھوٹی سی جھیل کے کنارے بین سنائی دینے لگے۔ مرشد آباد سے سوگوار ہوائیں چلنے لگیں۔ اور ریت کے ذرّوں پر پاؤں کے نقوش گہرے زخم بن بن کر رقص کرنے لگے۔ بہت رات گئے جب پرویز گھر لوٹا تو وہ اس نتیجے پر پہونچ چکا تھا کہ ششی کی جگہ دنیا کی کوئی عورت بھی اگر ایسے حالات میں گھر جاتی تو وہی کچھ کرنے پر مجبور ہو جاتی جو ششی کر رہی تھی۔

" پرویز صاحب میں جو کچھ ہوں وہ نہیں ہوں اور جو کچھ نہیں ہوں وہ ہوں "

پرویز کی سوچ ایک دوراہے پر پہونچ کر رُک گئی۔ کہنیاں میز پر ٹکائے، ٹھوڑی دونوں ہاتھوں کے کٹوروں میں رکھے وہ خیالات کی رَو میں بہتا رہا۔ دو پتنگے ٹیبل لیمپ کی روشنی کا طواف کرنے لگے۔ سبز شیڈ کے سائے کا پھیلاؤ ٹیبل پر بکھری ہوئی کتابوں کو گھیرے ہوئے تھا۔ راکھ دانی میں تین ادھ جلے سگریٹ پڑے ہوئے تھے۔ مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ ہر شے اونگھ رہی تھی۔ ہر شے جاگ رہی تھی۔ لمحات کا قافلہ بڑی تیزی

سے دوڑا جا رہا تھا۔ یادوں کے سنگ میل پیچھے چھوڑ کر، تلخ تجربات کے گھاؤ ساتھ لئے لمحات کا قافلہ بڑی تیزی سے دوڑا جا رہا تھا۔

کھلی کھڑکی سے موتیا کے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی باہر اندھیرے میں لان پر، پکے راستے پر، ہر شئے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوٹھی کے اندرونی پھاٹک سے شروع ہو کر پورچ سے گزرتا ہوا پکا راستہ بیرونی پھاٹک تک چلا گیا تھا۔ اس راستے کے دونوں طرف پام کے پودوں کی قطاریں ہیبت ناک سائے میں دہشتناک معلوم ہو رہی تھیں۔ کوٹھی کے چاروں طرف کافی جگہ چھوڑ کر چار فٹ اونچی دیوار کھڑی تھی۔ بیرونی پھاٹک کے سامنے سڑک کے کنارے بجلی کا کھمبا ایستادہ تھا جس کا بلب گل مہر کے پتوں کی اوٹ میں جگمگا رہا تھا۔ دفعتہً چوڑیوں کی جھنکار پیدا ہوئی اور پھر ایک لفافہ کھڑکی کی سلاخوں میں سے نکل کر پلنگ پر آن گرا۔ پرویز نے اٹھ کر کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ کوئی شخص سفید لباس میں ملبوس پیوار پھلانگ رہا تھا۔ پرویز نے دروازہ کھولا، سوئچ دبایا۔ برآمدے میں نرم نرم روشنی پھیل گئی۔ پھر پورچ سے گذر کر بیرونی پھاٹک کھولا۔ اس کے سڑک پر پہونچنے تک وہ سفید لباس کوئی پچاس گز آگے نکل چکا تھا۔ پرویز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اور پھر اس نے دوڑ کر آگے بڑھنا چاہا۔ اتنے میں وہ سفید لباس ایک کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ پرویز کے قدم جہاں کے تہاں رک گئے۔ وہ اس کے تایا جان کی کوٹھی تھی۔ جیسے اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے ہوں۔ وہ چند لمحے جنبش نہ کر سکا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کوئی آہٹ نہ کوئی آواز مگر اس کے دل میں ان گنت آہٹیں، بے شمار آوازیں گونجنے لگیں۔ نہایت آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ لوٹ کر اپنی کوٹھی تک پہونچا۔ پام کے پتے اپنی ہتھیلیاں پھیلائے کھڑے تھے۔ اور ان ہتھیلیوں پر برآمدے سے آتی ہوئی روشنی کی شعاعیں ناچ رہی تھیں۔ سفید گلاب کا ایک پھول روشنی کی زد میں آکر دوسرے پھولوں سے ممیز ہو گیا تھا۔ پرویز سوچ میں ڈوبا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ پلنگ پر ایک آسمانی رنگ کا لفافہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا۔ آسمانی رنگ کے کاغذ پر چند سطریں تحریر تھیں۔ بغیر کسی القاب یا خطاب کے لکھا تھا۔

"میں نہیں جانتی کہ مجھ میں آپ کو خط لکھنے کی جرأت کہاں سے آئی۔ جب جنگل میں آگ لگ جاتی ہے تو ہوا کے تند جھونکوں سے درخت، پودے، جھاڑیاں، ڈال پات، ہر شئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ اسی طرح میرے اندر ایک آگ لگی ہوئی ہے جس میں

میری روح جل رہی ہے۔ میرا حال جل رہا ہے میرا مستقبل جل رہا ہے۔ میں نے ہوش سنبھالا تو آپ کو دیکھا۔ مجھے احساس دلایا گیا تھا کہ مجھے صرف آپ کو دیکھنا ہے۔ زندگی کی ہر سانس کے ساتھ یہ احساس محکم ہوتا گیا۔ شعور کی پختگی کے ساتھ ایک اُمید، ایک آرزو، ایک تمنا، میرے رگ و ریشے میں سرایت کر گئی۔ میری روح میں سما گئی میری زندگی کا جزوِ اعظم بن گئی۔ اور اب ... میرا قصور؟ ..... میری خطا؟ ......

پرویز کی نگاہیں مینٹل پیس پر رکھے ہوئے فوٹو کی طرف اٹھ گئیں۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ ٹیونک پہنے ہوئے تھی۔ سنہرے اور گھونگریالے بالوں والی چینی کی گڑیا اب بڑی ہو گئی ہے۔ بڑی اور دلیر، ابھی ابھی اندھیرے میں دیوار پھلانگ کر وہ مجھے خط دینے آئی تھی۔ تایا جان اگر اسے دیکھ لیتے تو شاید اسی وقت اُسے گولی کا نشانہ بنا دیتے؛ یہ سوچتے ہوئے پرویز کو آپا کی باتیں یاد آنے لگیں: یہ بوتل بول نہیں سکتی، مگر ٹوٹ سکتی ہے۔ جب زینت نے تایا جان کا فیصلہ سُنا تو وہ منہ سے کچھ نہ بولی مگر اس کے رخسار ہلدی طرح زرد ہو گئے۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا اور اب اس کی آنکھوں میں ہر وقت آنسو چلتے رہتے ہیں۔

"لیکن اس میں میرا کیا قصور، اس میں زینت کا کیا قصور" پرویز نے دل ہی دل میں یہ فقرہ دہرایا اور پھر دفعتہً ایسے لگا جیسے زینت کا کانپتا ہوا ہاتھ اس کے دل کے دروازے پر دستک دے رہا ہو۔ اور زینت کے سُرخ سُرخ ہونٹ پکار پکار کر کہہ رہے ہوں "دروازہ کھولو، دروازہ کھولو، یہ گھر میرا ہے یہ گھر میرا ہے"

پرویز نے اٹھ کر تمام کھڑکیاں اور دروازے کھول دیئے اسے کمرے میں ایک حبس سا محسوس ہونے لگا۔ اُسنے سگریٹ سلگا کر ایک کتاب ہاتھ میں لے لی مطالعہ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ کتاب میز پر اوندھی رکھ کر لکھنے بیٹھ گیا۔

"زینت مجھے تمہارے جذبات کا احترام ہے۔ تایا جان نے جو فیصلہ کیا ہے اسکے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔ اس میں تمہارا کیا قصور، اس میں میرا کیا قصور" یہاں تک لکھ کر پرویز کا ہاتھ رُک گیا۔ اور پھر اسنے خط کو پھاڑ کر پرے پھینک دیا۔ وہ سوچنے لگا "یوں خط لکھ کر زینت کو بھیجوانا کتنی گھٹیا سی بات ہے۔ زینت کوئی دوسرا پرویز پا کر مجھے خود بخود بھول جائے گی۔ دنیا میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے، ایسا ہمیشہ ہوتا رہے گا؛ میں جو کچھ ہوں وہ نہیں ہوں اور جو نہیں ہوں وہ ہوں؛ سامنے کی دیوار پر ایک سایہ نظر آنے لگا۔ خیالات کی شعاعوں نے اُس سائے میں

جان ڈال دی۔ اس سائے نے ایک ہاتھ بلند کرکے آسمان کی طرف دیکھا اور پھر ایک مترنم آواز کمرے میں گونجنے لگی۔

"یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے چلو ہم بہت دُور اپنا گھر بسائیں۔ جہاں مکمل سکون ہو، بھرپور زندگی ہو، رقص ہو، گیت ہوں اور ننھی مُنی زندگیوں کی چہل پہل۔"

دوسرے دن اختر اور دوسرے احباب پرویز کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے جھٹپٹا ہوتے ہی الطاف پرویز کے گھر پہنچا۔ سب پریشان تھے کہ پرویز کہیں بیمار نہ ہو گیا ہو۔ جب الطاف نے واپس جا کر اختر کی بیٹھک میں خبر سنائی کہ پرویز تو صبح سے گھر سے غائب ہے تو سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ لیکن تھوڑی سی بحث کے بعد پرویز کی غیر حاضری کی وجہ سمجھ لی گئی۔ پھر ساری چکڑی ششی کے کوٹھے پر جا پہنچی، جہاں پرویز چاندنی پر پڑا ہوا تھا۔ ششی پرویز کے پاس بیٹھی ہوئی اُس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھی۔ بغیر بناؤ سنگھار کے معمولی سی سفید ساری میں ششی بڑی پیاری معلوم ہو رہی تھی۔ اختر نے چلتے وقت کہا تھا: "میں پرویز کے تجدیدِ عشق کا افتتاح وہسکی کی آدھ درجن بوتلوں سے کروں گا۔" الطاف نے چُست چُست فقرے ذہن میں رکھ لئے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں سوچ رکھا تھا کہ ششی کے کوٹھے پر پہونچتے ہی "عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب" اونچے اونچے سروں میں گانا شروع کر دے گا۔ لیکن وہاں پہنچ کر کسی کے منہ سے بات نہ نکلی۔ کسی کو کمرے کے اندر قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ کوٹھے کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی انہوں نے جنازے سے سارا قصہ سن لیا تھا۔ پرویز وہاں صبح سویرے ہی پہنچ گیا تھا۔ ششی ابھی سو رہی تھی۔ پرویز نے اُسے پاگلوں کی طرح جھنجھوڑ کر جگایا۔ ششی گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

"تم کبھی نہیں مر سکتیں" یہ کہتے ہوئے پرویز زار و قطار رونے لگا۔ پھر اس نے شراب پینی شروع کر دی وہ شراب پیتا جاتا تھا اور بار بار کہتا جاتا تھا۔

"کشمیری دیہاتن کی تصویر سچ کہتی تھی" تم زندہ ہو، تم زندہ رہو گی۔" اور پھر اس نے اس قدر شراب پی کہ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ پھر وہ سو گیا۔ اور اب ششی اس کے پاس بیٹھی چپکے چپکے رو رہی ہے۔

جنازیا قصہ سناتے سناتے غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اور کہنے لگا "صاحب ایسے دھندا نہیں کیا جاتا۔ آثار اچھے نہیں۔ الماس اپنی نیا ڈبو کر رہے گی۔" اور اب اختر، الطاف اور رفیق ٹیکسی میں گھر کے

دیکھ رہے تھے۔ کانچ کی نلیوں اور رنگ برنگ کے موتیوں کی مرتعش جھالروں میں سے شستی اور پرویز دکھائی دے رہے تھے اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شستی کی روح کھینچ کر اُس کی انگلیوں میں آگئی ہے جن انگلیوں سے وہ پرویز کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے، سر کے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ رخساروں پر آنسوؤں کے قطرے تھرتھرا رہے تھے۔ دفعتہً پڑوس سے کسی گلے باز طوائف کی آواز بلند ہوئی نغمہ و ساز کے جھرنے فضاؤں میں زندگی بکھیرنے لگے۔ گھنگھروؤں کی چھاچھم دلوں میں ہل چل مچانے لگی۔ اختر، الطاف اور رفیق چپ چاپ سیڑھیوں سے اُتر کر اُس کوٹھے پر چلے گئے۔

# مائلِ پرواز

اُس رات پرویز گھر لوٹ کر نہ آیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ تمام رات گھر سے غائب رہا۔ پرویز کے ابا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ دنیا دیکھے ہوئے تھے۔ جوانی میں کیا کچھ نہ کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جوان بیٹیا رات ختم ہونے سے پہلے گھر لوٹ آئے تو بات پردے میں رہ سکتی ہے لیکن جب رات بیت گئی دن چڑھ آیا اور پرویز گھر لوٹ کر نہ آیا تو انہوں نے بیگم سے صاف صاف کہہ دیا: "اب تیرا بیٹا ہاتھوں سے نکل گیا" اور اُس دن سے پرویز کے گھر کے جہنم کی آگ کے شعلے بلند سے بلند تر ہوتے گئے۔ پرویز رات رات بھر گھر سے غائب رہتا۔ ابا ہزار لعنت ملامت کرتے مگر اُس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی۔ آپا نے رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ اماں نے پیار سے، نرمی سے، غصّے سے ہر طرح سے پرویز کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی مگر سب بے سود۔ پرویز مسکرا کر کہتا: "اچھا اب میں گھر سے باہر قدم نہیں رکھوں گا" وہ ہر روز یہی کہتا مگر اندھیرا ہوتے ہی چپکے سے باہر کھسک جاتا۔ شستی کے کوٹھے پر پہنچ کر اُسے ایک عجیب سا سکون میسر آجاتا۔ اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ سوتے میں کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ جیسے جاگتے میں کوئی حسین تخیل حقیقت بنکر اس کے سامنے آگیا

ہو۔ مگر جب کوئی تماش بین صحنچی میں آکر آواز دیتا تو پرویز کا وہ سہانا خواب، وہ حسین تخیل ایک تلخ حقیقت میں بدل جاتا۔ ششی دوڑ کر باہر چلی جاتی اور بڑی نرمی سے جواب دیتی "معاف کیجئے، میں رات بھر کے لئے بُک ہوں۔" "رات بھر کے لئے بُک۔" سُنکر پرویز کے تن بدن میں ایک آگ سی لگ جاتی۔ "اچھا میری جان کل سہی۔" کوئی تماش بین یہ کہتے ہوئے واپس چلا جاتا۔ پرویز غصہ سے دانت پیس کر رہ جاتا اور ششی جب صحنچی سے واپس آکر پرویز کے پاس بیٹھتی تو اس کی جھکی جھکی نظریں اور ماتھے پر پسینے کے قطروں کی نمود اس کی اندرونی کیفیت کی غمازی کر دیتی۔ کچھ دیر کے لئے خاموشی چھائی رہتی اور پھر کوئی بات چھڑ جاتی۔ سنجیدگی مسکراہٹوں میں بدل جاتی۔ وقت کا ہاتھ چھوٹی چھوٹی چوٹوں کی خود بخود مرہم پٹی کر دیتا۔ ششی منہ سے کچھ نہ بولتی مگر اس کی آنکھیں پکار پکار کر کہتیں۔ "چلو کہیں بہت دور اپنا گھر بسائیں، جہاں پر اسکون ہو بھرپور زندگی ہو، رقص ہو، گیت ہوں، ننھی منی زندگیوں کی چہل پہل۔" اور ایک دن پرویز نے اُن آنکھوں کی یہ باتیں جیسے سُن لی ہوں۔

"میں اب مکان تلاش کر رہا ہوں۔ میں اب تمہیں اس گندگی میں نہیں رہنے دوں گا۔" جب پرویز نے یہ کہا تو اس کی آنکھوں میں عزم واستقلال کی روشنی جھلک رہی تھی۔ یہ سُنکر ششی کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلکنے لگے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ مسرت کی اس اچانک یلغار کے لئے بالکل تیار نہ تھی۔ اُس کے انگ انگ میں لہو کی آگ دوڑنے لگی۔ اُس نے گہری دلچسپی سے اپنے چہرے کا عکس آئینے میں دیکھا۔ رُخساروں میں انگارے دہکنے لگے۔ ہونٹوں پر سُرخی دوڑ گئی۔ کسی نامعلوم جذبے کے تحت اس نے اپنی ساڑھی کے پلو سے سر ڈھانپ کر آنکھیں جھکالیں۔ اس کا جی چاہا کر پرویز اُسے ابھی بازو سے پکڑ کر کہیں دُور لے جائے۔ اس گندے ماحول سے بہت دور، اُس پر اسرار ماحول سے جہاں مرد کا وقار، سنجیدگی اور دبدبہ، بھیک مانگنے میں، سستے مذاق کرنے میں، جھوٹی شراب پینے میں تسکین پاتا تھا۔ یہ سوچتے سوچتے اُسے خیال آیا کہ اُس نئے گھر میں، اس نئی دنیا میں، جہاں صرف پرویز ہوگا۔ اور وہ ہوگی، ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ جہاں ماضی حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے گا۔ جہاں وہ اپنے تمام دکھ درد بھول جائے گی۔ اور جب پرویز پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر کہے گا "ششی"! تو وہ نیلے آکاش کی طرف اشارہ کرکے کہے گی "یہ دُنیا کتنی خوبصورت ہے۔" خیالات کی قوسِ قزح میں تیرتے تیرتے ششی کو احساس ہوا کہ آج کا دن عظیم دن ہے۔ آج وہ ایک ناچ ناچے گی جو اس گھر میں اس کا آخری ناچ ہوگا۔

"میں ابھی آتی ہوں" ششی یہ کہہ کر بغلی کمرے میں چلی گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر کے بعد

نارنجی رنگ کی ریشمی ساڑھی میں ملبوس، پاؤں میں گھنگرو پہنے چھم چھم کرتی اُجلی چاندنی کے وسط میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ دفعتہً گھنگروؤں کی چھنا چھن نے فضا کو لہرا کر زمان و مکاں کے بندھن توڑ دیئے۔ شوخ اور بھڑک دار ساڑھی میں ششی کا متناسب بدن متحرک متحرک کر گھنگروؤں کی آوازوں میں گھلنے لگا جیسے اُس کے رونگٹے رونگٹے میں جل ترنگ بج اٹھی ہو۔ چاندنی پر سانولے پاؤں، دائروں اور نصف دائروں کی صورت میں حرکت کرنے لگے۔ تیز اور تیز، مدھ نے دُرت سے پر جا پہنچی۔ آنکھوں کے ڈھیلے گھمن گھمنی حسینہ پلکوں کے سائے میں آنکھ مچولی کھیلنے لگے۔ رقص کے دھیلے پر سانولی باہیں لہریں بن گئیں اور جسم کی قوسیں اور خطوط جزر و مد، تیز اور تیز گھنیری زلفیں بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جھکولے کھانے لگیں۔ حرکت گھماؤ اور لوچ لچک کا سمندر موجیں مارنے لگا۔ قدِ آدم آئینے میں نارنجی ساڑھی کے شعلے کوندے بن بن کر جھپکنے لگے۔ پاؤں کی تنکار کے ساتھ اُس کا اندر والا ناچا، اُس کا حال ناچا، اُس کا مستقبل ناچا اور اُس کا بھیانک ماضی تاریک غاروں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اور پھر دفعتہً رقص کی لہروں کے بیچ لہرا کر ششی رک گئی۔ اور یوں معلوم ہوا جیسے کائنات کی گردش تھم گئی ہو۔ ہر شے ایک پڑاؤ پر پہنچ کر سستانے لگی ہو۔ ششی گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں لرز رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور اس کا جی چاہا کہ وہ گاؤ تکیے پر سر رکھ کر سو جائے۔ اور تمام رات سہانے خواب دیکھتی رہے۔ اور وہ خواب کبھی ختم نہ ہوں۔

جب رات گئے پرویز خدا حافظ کہہ کر چلا گیا تو ششی اسی گاؤ تکیہ پر سر رکھ کر کتنی دیر تک خیالات کی بھول بھلیوں میں کھوئی رہی۔ پھر اُس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی۔ چاندنی کا اُجلا فرش گاؤ تکیے جن پر ارغوانی ساٹن کے غلاف چڑھے ہوئے تھے۔ کانچ کی نلیوں اور رنگ برنگ کے موتیوں کی جھالریں، یہ سب کچھ دوسروں کی آسائش کے لئے تھا جس کی جیب میں پیسے ہوتے، کوٹھے پر چلا آتا۔ ششی کو ہر ایک کی فرمائش پوری کرنی پڑتی۔ ہر ایک سے مسکرا کر بات کرنا، بن سنور کر عشوہ و ناز کے تیر چلانا گرم گرم چائے پی کر راتوں کی نیند حرام کرنا۔ بعض اوقات اُس وقت رقص کرنا جب کہ اس کا جی چاہ رہا ہو کہ نرم نرم بستر پر آرام سے سو جائے، کبھی کبھی اس وقت گیت گانا جب کہ اس کا دل آنسو بہا رہا ہو۔ یہ سوچتے ہوئے ششی نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ پنواڑی پان کی گلوریاں بنا رہا تھا۔ چائے کی دوکان پر حسبِ معمول جمگھٹا لگا ہوا تھا۔ منچلے نوجوان للچائی ہوئی نظروں سے دریچوں کی طرف دیکھتے ہوئے سڑک پر چل رہے تھے۔ زہرہ کے کوٹھے کے سامنے عیاش تاجر کی کیڈلک کار کھڑی تھی۔ وہ تاجر کئی مرتبہ ششی کے ہاں بھی آ چکا تھا۔ اس نے ایک دفعہ دس دس کے نوٹوں کا ہار بنا کر ششی

کے گلے میں ڈالا تھا۔ مگر اب وہ صرف زہرہ کے کوٹھے پر جاتا تھا۔ اس لئے کہ جو کچھ زہرہ کر رہی تھی۔ وہ شششی نے کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شراب کے بھرے جام کا ایک گھونٹ طوائف کو پلا کر پھر وہ خود پیتا تھا۔ ہر سگریٹ اگر طوائف اپنے ہونٹوں میں رکھ کر سلگا کر پیش نہ کرے تو اُسے کش لینے میں لطف نہ آتا تھا۔ شششی شراب پیتی تھی نہ سگریٹ۔ سامنے کے کوٹھے کی کھلی کھڑکی میں سے نیلم نظر آ رہی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھی ہوئی میک اپ کر رہی تھی۔ اس کے سارے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ دن کے اجالے میں اس کی صورت دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ مگر رات کے وقت ان بدنما داغوں پر پاوڈر کے دبیز پردے پڑ جاتے تھے۔ قیمتی لباس اور گہنوں سے آراستہ ہو کر بجلی کی روشنی میں چم چم کرنے لگتی تھی۔ نیلم کی کم سن بہن کا نام پکھراج تھا۔ جس کی ناک میں سونے کی نتھ تھی۔ ابھی وہ اپنے خاندانی پیشہ کے ابتدائی گُر سیکھ رہی تھی۔ مثلاً تماش بینوں کو پان پیش کرنا۔ گانے کی سنگت میں تالی بجانا۔ کسی کے سر پر رکھا ہوا نوٹ مسکرا کر تھام لینا۔ کبھی کبھی اپنی بہن کے ساتھ مل کر کوئی چالو گیت گاتا اور گاتے گاتے ایک چھوٹی سی مُرکی لے کر خوب خوب داد حاصل کرنا۔ نیلم کے کوٹھے سے ملی ہوئی چھوٹی سی بالکونی سونی پڑی تھی۔ بالکونی کے وسط میں ایک دروازہ تھا جس پر سفید جالی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ مدھم مدھم روشنی میں اس پردے کے پیچھے ایک سایہ حرکت کر رہا تھا۔ اس سائے کے بازوؤں میں ایک ننھا سا سایہ تھا۔ ایک سایہ شبنم کا تھا اور دوسرا اس کی ننھی بچی کا۔ شششی کو اچھی طرح یاد تھا شبنم نے ایک دن اُسے طعنہ دیا تھا "تم جیسی بیسیوں چھوکریاں برساتی کھمبیوں کی طرح اُگتی اور دُھل جاتی ہیں" اور یہ تھی بھی ایک حقیقت۔ شششی ایک برساتی کھمبی تھی اور شبنم ایک خالص طوائف۔ شبنم کا تو یہ خاندانی پیشہ تھا۔ مگر جس طرح شبنم کا ایک باپ ہوتے ہوئے بھی کوئی باپ نہ تھا اسی طرح ننھے سائے کا باپ ہوتے ہوئے بھی کوئی باپ نہ تھا۔ یہ تو شبنم پہلے سے ہی جانتی تھی کہ ادھر طوائف کا پاؤں بھاری ہوا اُدھر اس کے چاہنے والے کے دل میں نفرت پیدا ہوئی۔ اس کے باوجود وہ پچے دل سے ایک تجربہ کر رہی تھی۔ آخرکار اس کی شکست ہوئی اور اس شکست کی آواز ابھی تک اس کے دل و دماغ میں گونج رہی تھی۔ اور اب وہ ایک گوشت کا ٹکڑا اپنے سینے سے لگائے نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ اس کے برعکس اس کی پڑوسن انوری بڑے ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہی تھی۔ انوری کی جوانی اور دل دونوں جوں کے توں صحیح و سلامت تھے۔ اس کا چاہنے والا ایک لکھ پتی تھا۔ جس کی ساری دولت کھنچ کر جب انوری کے پاس آگئی تو انوری میں آنکھیں جھپکاتی ہوئی عورت دفعتہً گم ہو گئی اور پیشہ ور طوائف تلوار کی طرح تن کر سامنے آگئی۔ اس کے دل میں کنگال لکھ پتی کے لئے ویسی ہی نفرت پیدا ہو گئی جیسی نفرت شبنم کے بچہ جننے پر اُسکے چاہنے والے کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب شبنم کا چاہنے

والا کسی اور طوائف پر جان دیتا تھا۔ اور انوری کا چاہنے والا اب انوری کے کوٹھے پر حقہ بھرتا تھا۔ ہیرا منڈی کی ایسی ہی بیسیوں واردانیں آئے دن سننے میں آتی تھیں۔ قدم قدم پر ہیرا پھیری۔ ڈیرے دار طوائفوں، نوچیوں، داشتاؤں اور کسبیوں کے عجیب غریب قصے سن سنکر بشتی سہمی سہمی رہتی تھی۔ آج اسے یہ باتیں زیادہ خوفناک معلوم ہونے لگیں۔ اُسنے انوری کے کوٹھے پہ سے نگاہیں ہٹا کر چائے کی دوکان کی طرف دیکھا۔ ایک ہٹا کٹا مسٹنڈا پاجامہ کرتا پہنے چائے کی دوکان کے سامنے کھڑا پان چبا رہا تھا۔ ایک دن وہ بھی بشتی کا گانا سننے آیا تھا۔ صرف ایک غزل سنکر ۵۰ روپے دے گیا تھا۔ دراصل دوسری طوائفوں کی طرح وہ بھی تو پیسے کو گانا سُناتی تھی۔ پیسے کو سلام کرتی تھی۔ وہ پیسہ خواہ ٹیکسی ڈرائیور کی جیب سے آئے یا کسی رئیس کی جیب سے۔ بشتی کو اپنے موجودہ ماحول سے گھن آنے لگی۔ اس نے کھڑکی بند کر دی۔ اب پرویز اُسے اُس تعفن سے نکال کر اپنے ساتھ لے جائے گا۔ اور پھر اُس کا وہ خواب جو اُس نے راج شاہی میں دیکھا تھا حقیقت میں بدل جائے گا۔ راج شاہی کا خیال آتے ہی اُسے وہ بڑھیا یاد آگئی۔ جسے وہ ماں کہہ کر پکارتی تھی۔ بڑھیا کا خیال آتے ہی بشتی کے نتھنوں میں سڑاندسی گھسنے لگی اور اسنے نفرت سے اپنے ہونٹ بھینچ لئے دفعتہً اُسنے اپنا سینہ تان کر قدِ آدم آئینے میں اپنا عکس دیکھا۔ جیسے وہ ماضی کے منہ پر تھوک رہی ہو۔ جیسے وہ حال کا منہ چڑا رہی ہو۔ جیسے سنہرا مستقبل اس کے قدم چوم رہا ہو۔ بشتی نے سوچا آج کا دن عظیم دن ہے آج مجھے نئی زندگی کا پیغام ملا ہے۔ آج میرا بھیانک ماضی تاریک غاروں میں گم ہو رہا ہے۔ میں اب اُس کے متعلق کچھ نہ سوچوں گی اب میرے خیالوں میں صرف میرا گھر ہوگا، میرا اپنا گھر جہاں میں اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر پرویز کو کھلاؤں گی۔ پرویز کے لئے سوئیٹر بنوں گی ملایک فاختئی رنگ کی خوب صورت سی کوزی بناؤں گی۔ میز پوش پر سبز اور گلابی رنگ کے دھاگوں سے بیل بوٹے کاڑھوں گی۔ پرویز کی قمیص کے بٹن ٹانکوں گی اور گھر کے صحن میں چمبیلی اور رات کی رانی کے پودے لگاؤں گی۔ اور پھر ایک خوبصورت بچہ ...... یہ سوچتے ہوئے اُسنے ایک جھرجھری سی لی۔ اس کے سینے میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ جیسے ننھے ننھے ہونٹ اُس کی چھاتیاں چوس رہے ہوں۔

اُس گھر میں مکمل سکون ہوگا۔ بھرپور زندگی ہوگی، رقص ہوگا۔ گیت ہوں گے۔ اور ننھی ننھی زندگیوں کی چہل پہل بشتی تکیئے پر سر رکھے سہانے خواب دیکھتے دیکھتے سوگئی۔ کانچ کی نلیوں اور رنگ برنگ کے موتیوں کی جھالریں ہوا میں لہراتی رہیں۔ دیوار پر لٹکی ہوئی کسی ماہر رقاصہ کی تصویر کا عکس آئینے میں مسکراتا رہا۔ زندگی کی ایک خوبصورت رات، زندگی کی ہزاروں راتوں پر چھاگئی۔ چاروں طرف تمناؤں کے پھول کھل گئے۔ امنگوں اور آرزوؤں کی قوس قزح نکل آئی اور خیالات کی حسین وادی میں جھرنوں کے گیت دُور

دُور تک سُنائی دینے لگے۔

اُدھر پرویز اپنے کمرے کی کھڑکی کی سِل پر کہنیاں ٹیکے ٹھوڑی کو ہاتھوں کی کٹوری میں رکھے کتنی دیر باہر دیکھتا رہا، سوچتا رہا۔ پورچ سے لے کر داخلی اور خارجی پھاٹکوں تک بنے ہوئے پکّے راستے کے دونوں طرف پام کے پودے اپنی ہتھیلیاں پھیلائے کھڑے تھے۔ چاندنی کی نرم نرم شعاعوں نے سفید گلاب کے پھولوں کو ایک طلسم انگیز حسن دے رکھا تھا۔ بیرونی پھاٹک کے سامنے سڑک کے کنارے برقی قمقمے کی روشنی گل مہر کے پھولوں کو اجاگر کر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آ رہے تھے۔ گھاس کی روشوں پر سڑک پر، بچھے راستے پر، جا بجا سفید دیوار پر درختوں کے سائے لرز رہے تھے — ٹائم پیس بدستور ٹِک ٹِک کر رہا تھا۔ پونے دو بج چکے تھے۔ چاندنی آہستہ آہستہ کم ہونے لگی۔ سائے گہرے ہو گئے۔ اور پھر چاروں طرف تاریکی پھیل گئی۔ سنّاٹا چھا گیا۔ فضاؤں کو ایک نیند سی آنے لگی۔ دو جگنو کھڑکی کے سامنے چکر کاٹنے لگے۔ پرویز کے دل میں جگنوؤں کے بے شمار دیئے اُڑنے لگے۔ وہ کھڑکی سے ہٹ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ سانولے پیروں کی محرابیں، سانولی باہنوں کی لہریں، متناسب بدن کا لوچ، بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی جنبش، گھنگروؤں کی چھاچھم اور پتلے پتلے ہونٹوں سے نکلتے ہوئے دل سوز نغمے سب مِل جُل کر ایک نقطہ پر آگئے۔ پرویز نے سوچا انسان کی زندگی کتنی پُرکیف ہے۔ ہم خواہ مخواہ زندگی کے ہر زخم کو کرید کرید کر ہر روز تازہ غم ڈھونڈھ لیتے ہیں جس دنیا میں شنتی ہوگی وہ دنیا ہمیشہ خوب صورت رہے گی۔ پرویز کو احساس ہوا کہ یہی آگ انسان کو کام کرنے پر اکساتی ہے اس کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ وہ محنت کر کے شنتی کے لئے ایک نئی دنیا پیدا کرے گا۔ شنتی کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے تیرنے لگا۔ کھٹ کھٹ کھڑکی کے پٹ پر کسی نے ہلکی سی دستک دی۔ پرویز نے پلٹ کر دیکھا زینت کی ٹھوڑی کھڑکی کی ایک سلاخ کو چھو رہی تھی۔ وہ سفید دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھی۔ تاریکی کے پس منظر میں یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے دفعتہً سفید گلاب کا ایک پھول کھڑکی کے چوکھٹے میں آ لگا ہو۔ اور جس کی شگفتگی اور تابناکی دیکھ کر جگنو پرے ہٹ گئے ہوں۔ ہوائیں شہنائیاں بجانے لگی ہوں اور فضا میں ایک ہل چل سی مچ گئی ہو۔ پرویز بھونچکا رہ گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر دیکھا جیسے کہیں قریب سے سورج اُبھر کر سامنے آگیا ہو اور اُس کی آنکھیں روشنی کی تاب نہ لا کر چندھیا گئی ہوں۔

زینت چُپ چاپ دیکھ رہی تھی اور اُس پُر وقار چُپ میں ایک محشر برپا تھا۔ جھجک، جھینپ اس کھڑکی کے چوکھٹے سے کوسوں دُور تھی۔ سفید پھول ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے کھڑا تھا۔ پرویز بات نہ کر سکا۔ جیسے کسی نے اس کے ہونٹ سی دیئے ہوں، وہ قدم نہ اٹھا سکا۔ جیسے اس کے پاؤں میں

سیسہ بھر گیا ہو۔

"دروازہ کھولو" زینت بولی۔ اس کی آواز میں صلابت کی گونج تھی۔ پرویز نے دروازہ کھولا زینت اندر آ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔ پرویز زینت کی طرف دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ وہ ایک نرم و نازک سفید گلاب کا پھول نظر آ رہی تھی۔ وہ بڑے وقار سے تن کر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بادلوں کی اوٹ سے بجلی چمک رہی تھی اور اس کے اندر جلتے ہوئے الاؤ نے اس کے سینے کے اتار چڑھاؤ کو نمایاں کر رکھا تھا۔

لمحات کا قافلہ ان گنت یادیں اور تلازم خیالات اپنے ساتھ لئے تیزی سے گذرا۔ وہ ہاتھ جو چینی کی گڑیا کو پیٹ دیا کرتے تھے کانپنے لگے۔ تپائی پر رکھا ہوا ٹائم پیس بدستور ٹک ٹک کر رہا تھا ایک ایک لمحہ ایک ایک ساعت خاموشی کی چیخ پکار مسلسل ختم جاری تھی۔

"زینت" پرویز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ زینت نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ اس کی ٹھوڑی میں ننھا سا گڑھا کانپنے لگا۔ اور اسکے پتلے پتلے حساس ہونٹ پھڑکنے لگے۔ اور پھر یکایک اس کی پتلیوں سے آگ کے شعلے لپک اٹھے۔

"میں صرف ایک بات پوچھنے آئی ہوں" زینت نے خود اعتمادی سے کہا۔

"کیا؟"

"آپ آپاجی کا فیصلہ مانتے ہیں؟"

"اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟"

"آپ بزدل ہیں"

"شاید"

زینت بغیر کچھ اور کہے تیز تیز قدموں سے دروازہ کی طرف بڑھ گئی۔ پرویز کا جی چاہا کہ وہ زینت کا آنچل پکڑ لے، اس کا راستہ روک لے، ان سنہرے اور گھنگریلے بالوں کو چھو لے، اس سپید کلائی کو اپنے مضبوط ہاتھ میں پکڑ لے جس کلائی کو اس نے بچپن میں کئی بار مروڑا تھا۔ مگر اب وہ گھروندا ایک تاج محل بن چکا تھا۔ وہ تاج محل جس کی شوکت و عظمت، وقار، دبدبہ، اور جلالی انداز خود نے اُسے اس قدر مرعوب کر دیا تھا کہ وہ ساکت و صامت تکتا رہ گیا۔ کھڑکی کے چوکھٹے میں صرف تاریکی کا سپاٹ منظر باقی رہ گیا۔ سفید گلاب کا پھول نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ باہر داستانوں کے تنوں کی مڑی مڑی دہشت ناک اندھیرے میں ابھرنے لگی اور پرویز کے ذہن کی کنوئیں پر لاکھوں تصویریں بن بن کر مٹنے لگیں اور

مٹ مٹ کر بجھنے لگیں۔

پرویز خواب و خیال کی دنیا سے کوسوں دُور جیتی جاگتی دُنیا میں سانس لینے لگا اور زندگی کی ہر سانس کے ساتھ وہ کشتی کے قریب ہوتا چلا گیا۔ ایک خلا، ایک کمی، ایک ادھوراپن جو اسے برسوں سے محسوس ہو رہا تھا رفتہ رفتہ کم ہونے لگا۔ جیسے بہار میں نئی کونپلیں پھوٹ نکلتی ہیں۔ نئے پھول کھلتے ہیں۔ نئی زندگی آتی ہے پرویز کی زندگی میں بہار آ گئی۔ امیدوں کی نئی کونپلیں پھوٹ نکلیں۔ آرزوؤں کے نئے پھول کھل گئے۔ کبھی کبھی پھولوں کے ساتھ کسی کانٹے کی چبھن محسوس ہوتی مگر فوراً ہی دُور ہو جاتی اور اس چبھن کو ختم کرنے کے لئے وہ تمام دن گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا۔ مکان کی جستجو میں سرگرداں و حیران رہتا اور پھر شام کو تھکا ماندہ کشتی کے کوٹھے پر دم لیتا۔ باوجود انتہائی کوشش کے مکان نہیں مل رہا تھا لیکن ہر دوسری صبح سورج کی پہلی کرن ایک نئی دنیا کا پیغام لے کر آتی۔ اور پرویز پھر کمرِ ہمت باندھ کر تلاش میں نکل جاتا۔ اُدھر کشتی چشم براہ بیٹھی رہتی۔ اُسنے اچھی اچھی ساڑھیاں، زری کی چپلیں اور گہنے پاتے ٹرنکوں میں بند کر دیئے تھے تاکہ مکان ملتے ہی وہاں سے اٹھ جائے۔ کیونکہ وہاں تو زندگی اجیرن ہو رہی تھی۔ جنازیا مارنے مرنے پر تُلا ہوا تھا۔ چودھری کئی بار دھمکی دے چکا تھا۔ سازندوں نے ساری ہیرامنڈی میں واویلا مچا رکھا تھا۔ اگر وہ کسی کی داشتہ ہوتی تو کسی کو اعتراض نہ تھا۔ دھندا تو جاری رہتا۔ پڑوس ہی میں زہرہ ایک بہت بڑے تاجر کی داشتہ تھی۔ ہر شام ہی اُس کے دروازے پر کیڈلک کار آ کھڑی ہوتی۔ جنازیا اور سازندوں کی مٹھی گرم ہو جاتی۔ پانچ دس روپے تو سوڈا شراب لانے والا ہی کتر لیتا۔ اور پھر تاجر تو ایک معین وقت پر آتا اور دلِ ٹھنڈا کر کے چلا جاتا۔ باقی وقت میں زہرہ کالے بازار میں زیادہ سے زیادہ روپیہ بٹورنے کی کوشش کرتی۔ کشتی کی آمدن تو درکنار بچا بچایا روپیہ بھی اُڑتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھار دن کے وقت گھاگ نائیکہ باتو کشتی کے کوٹھے پر چلی آتی۔ اور اُسے رازدارانہ لہجے میں سمجھاتی بجھاتی جب سے کشتی نے گانا بجانا چھوڑا تھا۔ زہرہ کا طوطی بول رہا تھا۔ جب کشتی دھندا کرتی تھی تو زہرہ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ ایک مرتبہ تو زہرہ نے کشتی کو سیندور کھلانے کی بھی کوشش کی مگر ناکام رہی۔ باتو اور زہرہ میں پرانا بیر تھا۔ اس لئے باتو چاہتی تھی کہ کشتی سیدھی راہ پر آ جائے۔ وہ راہ جس پر قدم رکھنے سے دولت قدم چومتی ہے۔ باتو کشتی کو سمجھاتی "وقت بیتا جا رہا ہے۔ یہی وقت کمانے کا ہے جب جوانی اور روپ ڈھل جائیں گے تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ مرد کا کوئی اعتبار نہیں۔ اُسے کبھی بھی ایک چہرے سے تسلی نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی مرد ایک چہرے سے مطمئن ہے تو سمجھ لو کہ اُسے کوئی نہ کوئی مجبوری ہے

میں بھی ہیرا منڈی سے اٹھ کر ایک نوجوان کے ساتھ چلی گئی تھی، شادی ہوئی میری دُنیا ہی بدل گئی۔ میں اپنے میاں پر دل و جان سے فدا تھی اور وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتے تھے۔ بس چند ہی دن میں میں ایک گھر عورت بن گئی۔ میاں کے کپڑے دھوئے، جوتے صاف کئے، برتن مانجھ مانجھ کر میری انگلیوں میں گٹے پڑ گئے۔ نماز پڑھی، روزے رکھے، توبہ کی، اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہی۔ خوش دامن کے پاؤں تلے ہاتھ رکھے۔ مگر آخر ہوا وہی جو ہونا تھا۔ میاں ایک چھوکری کے ہتھے چڑھ گئے اور چار و ناچار مجھے پھر ہیرا منڈی آنا پڑا۔"

شمشی ساری باتیں سن لیتی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ وہ دل ہی دل میں سوچتی کہ انہیں کیا معلوم کہ پرویز کیا ہے۔ بس میرا دل جانتا ہے اور پرویز جب شام کو آتا تو وہ اُسے دن بھر کی روداد سنا دیتی۔ اسی وجہ سے پرویز جلد از جلد اُسے وہاں سے باہر نکالنے کی فکر میں تھا۔ مگر اسے لیکر جائے تو جائے کہاں۔ ابا نے پیسے دینے بند کر دیئے تھے۔ دوست یار بھی چھوٹ چکے تھے۔ اختر کی بیٹھک ایک قصۂ پارینہ بن چکی تھی۔ اماں اور ابا سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے۔ ابا عاق کرنے پر تلے ہوئے تھے، بات عزیزوں رشتہ داروں میں پھیل چکی تھی۔ راہ چلتے اس پر انگلیاں اٹھتیں وہ ان تمام باتوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھا۔ کیوں کہ فطری طور پر وہ انتہا پسند تھا۔ وہ مزدوری کرنے کے لئے تیار تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنا خون پسینہ ایک کر کے شمشی کے لئے ایک نئی دنیا بسائے گا۔ مگر سب سے پہلے ایک مکان کی ضرورت تھی۔ آخر مایوس ہو کر ایک دن اُس نے شمشی سے کہہ دیا کہ اگر دس دن کے اندر اندر مکان نہ ملا تو کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔ یہ سنکر شمشی کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اور جہاز یا جو اس وقت کنوئیں سے رہا تھا یہ سنتے ہی سیدھا اختر کی بیٹھک میں پہونچا اور وہاں سے پیسے وصول کر کے غم غلط کرنے کے لئے دیسی شراب پینے چلا گیا اس کو پرویز کے ابا تک پہونچنے میں دیر نہ لگی اس رات اختر کے ابا جاگتے رہے، کچھ سوچتے رہے، اور جب مرغِ سحر نے اذان دی تو انہوں نے مصلّے میں آکر اپنی بیگم کو آواز دی۔ بیگم وضو کرنے جا رہی تھیں، میاں کی آواز سنکر ان کے کمرے میں چلی گئیں۔

"بیگم اپنے بیٹے کے لئے جلد سے جلد کوئی لڑکی تلاش کرو" میاں نے پُروقار لہجے میں کہا۔

"مگر وہ تو شادی کے نام سے بھاگتا ہے"

"یوں کیوں نہیں کہتیں ابھی تو وہ بچہ ہی ہے شادی کے قابل ہی نہیں ہوا"

"بچہ نہیں تو کیا بڈھا ہو گیا ہے آپ تو ستو باندھ کر اسکے پیچھے پڑ گئے ہیں"

مغیر مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ دیا"
بیگم وضو کرنے کے لئے چلی گئیں۔ گو ایک عرصہ سے میاں کے مزاج میں چڑچڑا پن آگیا تھا۔ مگر آج اُن کی باتوں نے تیور اُن کی سرکاری ملازمت کے ٹھاٹ یاد دلانے لگے۔ عہدِ ملازمت میں وہ سی۔آئی۔ڈی کے نہایت قابل آفیسر سمجھے جاتے تھے۔ عمر بھر قاتلوں کی گولیاں کانوں پر سنائی تھیں۔ نہ معلوم کتنے اوباش لفنگے تو اُن کے نام سے کانپتے تھے۔ معاملے کو اُلٹا کر دینا بھی اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ جدھر چاہتے کیس کا رُخ پھیر دیتے۔ گناہ گار کو بے گناہ ثابت کروا دیتے۔ اور بے گناہ کو گناہ گار۔ وہ شطرنج کے بہت بڑے کھلاڑی تھے۔ وہ چال چلتے کہ مدمقابل نرغے میں آکر بات کی بات میں مات کھا جاتا۔ ملازمت کے زمانے میں بھی انہوں نے وہ وہ چالیں چلی تھیں کہ آج تک محکمۂ پولیس میں اُن کی مثال دی جاتی تھی۔ اُس زمانے میں اُن کا لہجہ تحکمانہ تھا، بالکل آج کی طرح، جیسے اُن میں سویا ہوا پُرانا پولیس آفیسر جاگ پڑا ہو۔ بیگم دل ہی دل میں ہزاروں باتیں سوچتی رہیں۔ پرویز باہر سے آیا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ میاں نے اطمینان سے ناشتہ کیا۔ پھر خلافِ معمول انہوں نے زری کلاہ پر شہدی لنگی باندھی، ہاتھ میں ہنٹر لیا اور مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔ بیگم اس فوری تغیر کا راز نہ سمجھ سکیں۔ آج انہوں نے تُرکی ٹوپی کی جگہ زری کلاہ پر شہدی لُنگی باندھی تھی۔ ریٹائرڈ ہونے کے وقت سے لے کر آج تک ہاتھ میں چھڑی لے کر نکلتے تھے۔ مگر آج انہوں نے گودام سے پرانا ہنٹر نکال کر جھاڑا پونچھا اور پھر اسے بائیں ہاتھ میں لے کر دائیں ہاتھ سے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بڑے طمطراق سے باہر چلے گئے۔ ایک طویل مدت کے بعد ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی گئی تھی۔ بیگم تسبیح رولتی ہوئی پرویز کے کمرے کے سامنے پہونچ کر رُک گئیں۔ پرویز سو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے تلے سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ چہرے کی تر و تازگی ماند پڑ گئی تھی۔ مامتا بلبلا اٹھی۔ اس نے اندر جا کر پرویز کے چہرے کو قریب سے دیکھا۔ وہی سوئی سوئی آنکھیں، وہی ننھے ننھے ہونٹ ابھی تو کل کی بات ہے وہ گھٹنیوں چلتا تھا، توتلی زبان سے اماں اماں کہتا تھا، وقت کتنی جلدی بیت جاتا ہے، یہ سوچتے سوچتے ماں نے آہستہ سے بیٹے کا ماتھا اپنے ہونٹوں سے چھوا، اور پھر آنکھوں میں آنسو روک کر باہر نکل گئی۔

پرویز دوپہر کو سو کر اٹھا غسل کرنے کے بعد ناشتہ اور کھانا ایک ساتھ کھایا۔ باورچی پلیٹیں چن کر چپ چاپ چلا گیا۔ ابا آنگن میں آرام کرسی پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ اماں تخت پر پالتی مارے حوضن کا حساب چکا رہی تھیں۔

"بھیا" ایک آواز آئی اور دوسرے لمحہ آپا پرویز کی دھلی ہوئی قمیص ہاتھ میں لئے ہوئے اندر آگئی۔

"جی آپا" پرویز نے محبت بھرے لہجہ میں جواب دیا۔

"تیری قمیص کا بٹن ٹوٹ گیا ہے" آپا نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر؟"

"میں نیا بٹن ٹانک رہی ہوں"

"شکریہ"

"بھیا سنا تو نے، زینت کے بیاہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں"

"اچھا بڑی خوشی کی بات ہے"

"خیر اس قصہ کو جانے دے۔ دیکھ بھیا تجھے سفید گلاب کا پھول بہت پسند ہے نا"

"ہاں آپا"

"ہم تیرے لئے ایک سفید گلاب کا پھول ڈھونڈ رہے ہیں"

"پھر؟"

"پھر۔ پھر ہم وہ پھول تیرے کوٹ کے کالر میں لگا دینگے"

"لیکن آپا آج کل تو گرمی ہے میں کوٹ پہنتا ہی نہیں"

"یعنی آپ جان بوجھ کر انجان بن رہے ہیں" آپا بگڑ کر باہر جانے لگیں۔ پرویز نے راستہ روک لیا۔

"آپا" یہ کہتے ہوئے پرویز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پھر وہ ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

"ارے تو تو رو رہا ہے" آپا نے دوپٹے کا آنچل پرویز کی آنکھوں کے قریب لاتے ہوئے کہا

"آپا" یہ کہتے ہوئے پرویز کرسی پر بیٹھ گیا" میں جانتا ہوں آبا، امی اور تم سب میری وجہ سے پریشان ہو۔ مجھے اس کا احساس ہے، میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میں نکما اور آوارہ ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ میری بے چینی کو کب اور کیسے چین نصیب ہو گا۔ شاید میں وقت کے ساتھ نہیں چل سکتا شاید وقت میرے ساتھ نہیں چل سکتا"

"تو ہمیشہ اوٹ پٹانگ بکتا رہتا ہے"

"اچھا آپا میں کپڑے بدل لوں" یہ کہہ کر پرویز ڈریسنگ روم میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد لباس پہن کر باہر نکل گیا۔ شہر کے مضافات میں حسب نقشے پر اُس نے کل تک مکان کی تلاش کی تھی۔ آج وہیں سے پھر جستجو شروع کر دی۔ صرف نو دن باقی رہ گئے ہیں۔ اس عرصہ میں اگر اُسے مکان نہ ملا تو حسبِ وعدہ اُسے وہ شہر چھوڑ دینا ہوگا۔ چار بج گئے۔ ایک معمولی سے ہوٹل میں چائے پی کر اُسنے پھر تلاش شروع کر دی۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایک ایسے محلہ میں پہونچا جہاں پکّے اور صاف ستھرے مکان کم تھے۔ کچے اور غلیظ زیادہ، حفظانِ صحت کا جیسے وہاں کسی کو علم ہی نہ تھا۔ ننگ دھڑنگ، میلے کچیلے بچے اِدھر اُدھر کھیل کود رہے تھے۔ مکانوں کے دروازوں پر میلے ٹاٹ لٹک رہے تھے۔ نالیاں کثافت سے بھری پڑی تھیں۔ آہستہ آہستہ اندھیرا چھا گیا۔ گھر گھر میں دیئے اور لالٹینوں کی روشنیاں جھلملانے لگیں۔ اتنے میں ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی ہوئی پرویز کے قریب سے گذری اور پھر چند قدم دُور جا کر رُک گئی۔ اسنے پلٹ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ارے ونڈے کیا دیکھ رہا ہے"

"کچھ نہیں اماں مکان کی تلاش میں ہوں"

یہ سُنکر بڑھیا پرویز کے قریب آگئی "بال بچے ہیں؟"

پرویز شش و پنج میں پڑ گیا۔ بڑھیا کے استفسار پر جیسے منوں بوجھ پرویز کی گردن پر آ گرا ہو۔ اُسے ایک لمحہ کے لئے انجمی کی چوتھی بیوی کا خیال آگیا اور درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں اسکے کانوں میں گونجنے لگیں۔

"ارے میں پوچھتی ہوں بال بچے ہیں" بڑھیا نے زمین پر لاٹھی مارتے ہوئے کہا۔

"نہیں" پرویز نے صاف کہہ دیا۔

"تو پھر یہاں کیا لینے آئے ہو" بڑھیا نے لاٹھی بلند کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر بڑبڑاتی ہوئی چل دی۔

"لیکن میں اکیلا نہیں ہوں" پرویز نے ہمت کر کے کہا۔ بڑھیا کے قدم رُک گئے۔

"بیوی ہے؟" بڑھیا نے پلٹ کر پوچھا۔

"ہاں" اُس کے حلق میں آواز جھجک کر نکلی۔

"تو پھر یوں کیوں نہیں کہتے کہ نئی نئی شادی ہوئی ہے" بڑھیا کے لہجے میں نرمی آگئی "آؤ میرے ساتھ" یہ کہتے ہوئے بڑھیا آگے آگے چل پڑی پرویز اسکے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ گلی کے سرے پر ایک

کتا بھونکنے لگا۔ ایک چمگادڑ فراٹے سے پرویز کے قریب سے نکل گئی۔ کہیں قریب ہی ابابیلیں شور مچا کر چپ ہو گئیں۔

"تم یہاں ٹھہرو" یہ کہہ کر بڑھیا ایک ٹوٹے پھوٹے مکان کے اندر چلی گئی اور پھر چند ہی لمحے کے بعد لوٹ آئی اور کہنے لگی "اندر چلے آؤ" پرویز میلا ٹاٹ اٹھا کر اندر چلا گیا۔

گھر کا صحن کچا مگر صاف ستھرا تھا گوبر اور ملتانی مٹی سے لپا ہوا۔ مکان دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے کا دروازہ بند تھا اور دوسرے کا کھلا۔ صحن کے ایک کونے میں چولہے پر ہنڈیا چڑھی ہوئی تھی۔ چولہے کے پاس ہی ایک پیڑھی پڑی ہوئی تھی جس پر ایک کالا دوپٹہ نظر آ رہا تھا۔ سیڑھی کے پاس گھڑاویں ترچھی صورت میں رکھی ہوئی تھیں۔ سیڑھیوں کی ڈاٹ سے ایک چھینکا لٹک رہا تھا۔ الگنی پر دو چار پھٹے پرانے کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ کھلے ہوئے دروازے کی سردل سے تاگے میں پروئی ہوئی شلغم کی قاشیں لٹک رہی تھیں۔ چولہے میں جلتی ہوئی لکڑی دفعتہً چٹخی۔ آگ کا ایک شعلہ بلند ہوا اور کالے دوپٹے پر مقیش کے ستارے جگمگا اٹھے۔

"یہ کمرہ خالی ہے" بڑھیا نے کھلے ہوئے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "کرایہ دس روپے ماہوار۔ مگر اس محلہ میں آنکھیں نیچی کر کے چلنا ہو گا۔ باہر سے کھنکار کے اندر آنا ہو گا۔ اگر چھت پر سونا ہے تو منڈیر کے قریب نہیں جانا ہو گا۔"

"اچھا۔ اماں میں کل سامان لے آؤں گا۔"

"ایک مہینے کا کرایہ پیشگی۔"

پرویز نے دس روپے جیب سے نکال کر بڑھیا کے ہاتھ پر رکھے۔ سلام کیا اور پھر باہر جانے کے لئے قدم اٹھایا ہی تھا کہ بڑھیا بولی "ذرا تم جاؤ بیٹے۔"

پرویز رک گیا۔

"چاند بیٹیا ذرا یہ پیسے کھرے کرو" بڑھیا نے بند دروازے کے قریب جا کر کہا۔

دروازے کی چول نے ہلکی سی چیں چاں کی، ایک سپید ہاتھ باہر نکلا۔ ایک گوری گوری کلائی میں کانچ کی چوڑیوں نے کھنکناہٹ کی، اور پھر وہ سپید ہاتھ غائب ہو گیا۔ وہ گوری گوری کلائی پس پردہ چلی گئی۔ اندر دیئے کی لو ٹمٹما رہی تھی۔

"ٹھیک ہیں" اندر سے ایک نہایت مدھم مگر شیریں اور صاف و شفاف آواز آئی۔

"پرویز بڑھیا کو سلام کر کے باہر نکل گیا۔ جب وہ گلی سے گذر رہا تھا تو کہیں قریب سے ڈھولک

بجنے کی آواز آئی اور پھر ایک نسوانی آواز نے بلند ہو کر اندھیرے میں جگنوؤں کے بے شمار چراغ روشن کر دیئے۔ پرویز نے سڑک پر پہونچ کر ایک تانگہ لیا اور پھر سگریٹ سلگا کر تانگے کی پچھلی نشست پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔

"کہاں جانا ہے بابو جی؟" تانگے والے نے گردن موڑ کر پوچھا۔

"ہیرا منڈی۔"

"میں صدقے۔" تانگے والے نے بمبیڑی سے چابک نکالتے ہوئے کہا اور پھر راس کو ہولے سے جھٹک کر چھوڑ دیا۔ پنج کلیان گھوڑا قدم چال چلنے لگا۔ ٹاپوں کی آواز فضا میں گونجنے لگی۔ تانگے والے نے صافہ کھسکا کر ماتھے کے قریب کر لیا۔ اور پھر نشست پر ترچھا ترچھا بیٹھ کر چابک کا سرا متحرک اردوں پر ٹکا کر ٹک ٹک کی آواز پیدا کرنے لگا۔ اس نے باگیں باری باری جھٹک کر ڈھیلی چھوڑ دیں۔ گھوڑا دلکی چلنے لگا۔ سڑک کے دونوں طرف برقی قمقموں کی قطاریں تھیں۔ تانگے کے دونوں بموں کے کونوں پر پیتل کے خول، راس چھلے۔ گھوڑے کے ماتھے کے چاند، آنکھوں کی اندھیری اور دُمچی پر پیتل کی جنت روشنی میں چمک رہی تھی۔ گھوڑے کی ریشم جیسی ایال ہوا میں لہرا رہی تھی گلے میں گھنگھروؤں کی گانی بج بجکر راہ گیروں کو خبردار کر رہی تھی۔ تانگہ چوراہے کے قریب پہونچا تو سامنے سے ایک قبول صورت عورت دھانی دوپٹہ اوڑھے چلی آ رہی تھی۔

"بچ موڑ توں" تانگے والے نے موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"صدقے تیری ٹور توں" آواز کا یہ حصہ تانگے والے نے عورت کی حدِ سماعت سے بچ کر کہا اور پھر ٹاپوں کے تال پر کوئی ٹپا گنگنانے لگا۔ راستے بھر پرویز لاکھوں باتیں سوچتا رہا۔ کس قدر غلیظ تھا وہ علاقہ، مگر ہیرا منڈی کی سینٹ، عطر اور پھولوں کی خوشبو سے اس محلے کی بدبو بدرجہا بہتر تھی۔ ہیرا منڈی کے برقی قمقموں سے وہاں کا اندھیرا کہیں اچھا تھا۔ اور اس اندھیرے میں، ان ٹوٹے پھوٹے مکانوں میں بھی تو چاند طلوع ہوتے ہیں۔ اس ٹوٹے پھوٹے گھر میں کشتی کی نئی زندگی کا آغاز ہوگا۔ اور وہ گھر راجشاہی سے کس قدر دور تھا۔ مکان ملنے کی خوشخبری سن کر کشتی مارے خوشی کے پھولی نہ سمائے گی۔ یہ باتیں سوچتا ہوا وہ کشتی کے دروازے تک پہونچا۔ تانگے والے کو دو روپے تھما کر اوپر چلا گیا۔ آخری سیڑھی پر جانزیا آلتی پالتی مارے سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ بالوں کی ایک لٹ اُس کے ماتھے پر کنڈلی مارے بیٹھی تھی۔ گلے میں ریشمی رومال، لٹھے کی شلوار پر دو گھوڑے بوسکی کی قمیص، آج اس کی سج دھج میں کوئی کسر نہ تھی۔

جانزیا نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کھنکار کر کہا "ذرا رک جاؤ بابو جی۔" اندر سے چینی قہقہے

سنائی دے رہے تھے۔

"آج رات کے لئے بائی جی بک ہیں" جنا آریا نے بڑی لاپرواہی سے تیر چھوڑا اور وہ تیر زہر میں بجھا ہوا تیر جیسے پرویز کے سینے میں پیوست ہو گیا ہو۔ پرویز کا دماغ کھولنے لگا۔

"ہٹو راستے سے" پرویز نے انتہائی غصہ سے کہا۔ اور پھر جنا آریا کی ران پھلانگ کر منجی میں چلا گیا۔ جنا آریا نے کوئی مدافعت نہ کی۔ پرویز نے کانچ کی نلیوں اور رنگ برنگ کے موتیوں کی جھالروں میں سے اندر دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ششی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ وہ تقریب برہنہ تھی۔ وہ صرف پیٹی کوٹ پہنے ہوئے تھی۔ جو بائیں طرف سے پھٹا ہوا تھا اور اس کی بائیں ران کی چمکتی ہوئی جلد صاف نظر آ رہی تھی۔ اور جسم کے بالائی حصہ پر صرف محرم حد سے زیادہ شراب پی لینے کی وجہ سے اُسے اپنی سُدھ بُدھ نہ تھی۔ سر کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ بوجھل پپوٹوں تلے آنکھیں کھولنا دشوار ہو رہا تھا۔ ہچکی لگی ہوئی تھی۔ سامنے دونوں باہیں دیوار پر پھیلا کر اپنے پاؤں کو جھٹکا۔ گھنگھرو بج اٹھے۔

"مجرا ہو جائے پیاری الماس" کسی مرد کی آواز آئی۔

ششی نے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کے سامنے پانچ چھ مرد چاندنی پر بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ اُن کے قریب ہی ششی کی نارنجی رنگ کی ریشمی ساڑھی پڑی ہوئی تھی۔ سارنگی نواز نے طبلہ نواز کی طرف دیکھتے ہوئے ایک آتشیں نے چھیڑی۔ ششی نے سرمستی کے عالم میں ایک بول الاپا، دو چار بے تکے قدم لے کر گھنگھروؤں کا بے ہنگم شور پیدا کیا۔ پھر وہ نرت بھاؤ دکھاتی ہوئی ہنس پڑی۔

قہقہے پھر بلند ہونے لگے۔

پرویز بجلی کی سی تیزی کے ساتھ سیڑھیوں سے نیچے اُترا اور ایک تانگہ پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔

"کہاں چلوگے بابو جی" تانگے والے نے پوچھا۔

"ماڈل ٹاؤن"

سڑک کے دونوں طرف برقی قمقمے گھومتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ ٹریفک کا شور کانوں کے پردے پھاڑنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار اسے جیسے جی اپنے آپ کو آگ میں جلتے ہوئے محسوس کیا۔ جیسے اس کی رگ رگ پر دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیئے ہوں۔ جیسے وہ سوچنا چاہتا ہو اور کچھ نہ سوچ سکتا ہو۔ سمجھنا چاہتا ہو اور کچھ نہ سمجھ سکتا ہو۔ ہیرامنڈی کی حدود سے باہر نکلنے تک نغمہ و ساز کے شعلے لپک لپک کر اُس کے کانوں کو جھلستے رہے۔ جیسے اس کی روح میں زلزلہ آ گیا ہو۔ جیسے اعتبارات کے مرغزاروں میں آگ لگ گئی ہو۔

خوابوں کے محل اڑا اڑا کر گر پڑے ہوں۔

"نسبت روڈ" اُسنے دفعۃً چلا کر کہا۔

تانگہ والے نے باگ کھینچ لی۔ اُس نے گھور کر پرویز کی طرف دیکھا اور پھر تانگہ موڑ کر باگ ڈھیلی چھوڑ دی۔ گھوڑا دُلکی چلنے لگا۔ نسبت روڈ پہونچ کر اُس نے تانگے والے کو پیسے دیئے اور پھر سیدھا اختر کی بیٹھک میں چلا گیا۔ خلافِ معمول اختر تنہا تھا۔ پرویز کو دیکھتے ہی تعظیماً کھڑا ہو گیا۔

"آؤ دوست تم تو اس گھر کا راستہ ہی بھول گئے تھے"

"ہاں اختر صرف تمہارا گھر ہی نہیں، میں دُنیا کی اور بھی بہت سی چیزوں کو بھول گیا تھا۔ شاید اپنے آپ کو بھی"

دونوں دوست صوفے پر بیٹھ گئے۔

"اختر" پرویز نے اختر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر شدت جذبات سے کانپتے ہوئے کہا

"کیا بات ہے پرویز آج تم کچھ پریشان سے نظر آ رہے ہو"

"پریشان؟ نہیں تو۔ پریشانی تو زندگی میں ہوتی ہے۔ میں تو اب چلتی پھرتی لاش ہوں" اختر نے چند لمحوں کے لئے ٹکٹکی باندھ کر پرویز کی طرف دیکھا۔ اور پھر اٹھ کر ریفریجریٹر کھولا۔

وھسکی، سوڈا، اور گلاس نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ دونوں ایک ایک بڑا پیگ غٹ غٹ چڑھا گئے۔ خاموشی چھا گئی، منتشر اعصاب کو تسکین ملنے لگی۔ پھر کم وقت میں زیادہ وھسکی پی کر دونوں موڈ میں آ گئے۔ پرویز ڈرامائی انداز میں قصہ سناتے سناتے جب نقطۂ عروج پر پہونچا تو اس کی سُرخ سُرخ آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے اور اُس نے اختر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا "اچھا ہوا کہ تم آج تنہا ہو۔ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرے دل سے ایک بوجھ اُتر گیا ہے۔ جیسے تم نے میرا غم بانٹ لیا ہو۔ لیکن دوست مجھے آج معلوم ہوا ہے کہ دل میں آگ کیسے لگتی ہے۔ انسان کا بند بند کیسے جلتا ہے"

"لیکن پرویز ذرا سوچو تو سہی۔ یہ سب واویلا صرف ایک طوائف کے لئے! رنڈی کے گھر کا دروازہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہے۔ جو پیسہ خرچ کر سکتا ہے۔ رنڈی کا پیار ایک خطرناک جال ہے اور تم اس جال میں پھنس گئے تھے۔ آج کا دن مبارک دن ہے کہ تم نے خود ہی اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیا۔"

اختر نے یہ کہہ کر ایک سگریٹ سلگایا۔ اور پرویز کا جی چاہا کہ وہ وائٹ ہارس کی بوتل اٹھا کر اختر کے سر پر دے مارے۔ اس کی زبان گدی سے کھینچ لے۔ وہ زبان جس نے ششی کو رنڈی کہا تھا۔ لیکن فوراً

ہی اُس کی آنکھوں کے سامنے نیم برہنہ شیشی ناچنے لگی۔ یکایک اس کے ہونٹوں پر ایک حقارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ماتھے پر لکیریں سمٹ کر ایک دوسرے کے قریب آگئیں۔

"ہاں اختر تم سچ کہتے ہو۔ جب عورت کی حسِ لطیف مرجاتی ہے۔ اور وہ کوک بھرے ہوئے کھلونے کی طرح مردوں کا دل بہلا کر پیسہ کمانا شروع کر دیتی ہے تو پھر وہ کبھی زندہ نہیں ہوسکتی۔"

"یوں کیوں نہیں کہتے کہ جب عورت رنڈی بن جاتی ہے تو پھر وہ عورت کبھی نہیں بن سکتی۔"

یہ سنکر پرویز نے وسکی کا ایک بڑا پیگ حلق میں انڈیل کر اپنا سر صوفے کی پشت پر گرا دیا۔

دفعتہً الطاف اور رفیق آدھمکے۔ انہوں نے پرویز کو دیکھتے ہی ہلڑ مچا دیا۔ اختر کی بیٹھک پھر ایک بار زعفران زار بن گئی۔ الطاف نے ریڈیوگرام کا پک آپ ریکارڈ پر رکھ دیا۔ مغربی موسیقی کی ندی بہنے لگی۔ الطاف اور رفیق نے موسیقی کی دُھن پر تازہ تازہ سیکھا ہوا "سمبا" ناچ ناچا۔ اور پھر موسیقی کے خاتمے پر آخری اسٹیپ کرکے خود ہی تالیاں پیٹ کر واہ واہ کرنے لگے۔

اس کے بعد چھوٹے بڑے پیگ تقسیم ہونے لگے۔ مغربی ناچوں میں ٹینگو کی وارفتگی، رمبا اور سمبا کی مناسبت پر چہک چہک کر گفتگو ہونے لگی۔ "ممبا" کی میانہ روی پر رائے زنی ہونے لگی۔ باتونی الطاف کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی۔

بہت رات گئے اختر اپنی کار میں پرویز کو ماڈل ٹاؤن پہونچا آیا۔ راستے میں مختلف پہلوؤں پر باتیں ہوئیں۔ اختر نے بتایا کہ وہ جلد ہی لکڑی کا کاروبار شروع کرنے والا ہے۔ الطاف نے چھ لاریاں خرید لی ہیں۔ اور سفتہ عشرہ میں ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کی مہورت کرنے والا ہے۔ اس کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ شادی کرینگے۔ رہا رفیق تو وہ پہلے شادی کریگا۔ بعد میں کام۔

گھر پہونچ کر پرویز کو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کہیں راستہ بھول گیا تھا۔ اپنی منزل سے بھٹک گیا تھا۔ اور اب وہ سیدھی راہ پر آگیا ہے۔ آبا جان سچ کہتے تھے۔ "نوکری، شادی۔ بیوی بچے، یہی پریکٹیکل زندگی ہے۔ باقی خیالی پلاؤ ہیں۔" اسکا جی چاہا کہ دوڑ کر اباجی کے کمرے میں چلا جائے اور اُن کے پاؤں چھو کر کہہ دے۔ "ابا جان میں لوٹ آیا ہوں۔"

وہ کھڑکی میں جاکر کھڑا ہو گیا۔ اور اس چاندنی میں سڑک سنسان پڑی تھی درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ اس کی نگاہیں تایا جان کی کوٹھی کی طرف اُٹھ گئیں جس کوٹھی میں زینت کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پرویز کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر باہر چلا جائے۔ اور زینت کے گھر کے سامنے پکار پکار کر کہے۔ "میں تایا جان کا فیصلہ نہیں مانتا۔ میں بزدل نہیں ہوں۔ دیکھو میرے دل کا دروازہ

تمہارے لئے کھلا ہے۔ تم ہی میرا سفید گلاب کا پھول ہو۔ اور یہ سوچتے سوچتے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس عالم اضطراب میں وہ آتشدان کے سامنے کھڑا ہو کر زینت کا فوٹو دیکھنے لگا۔ وہ فوٹو جس میں وقت کا ایک معصوم دور قید تھا۔ آج اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ اور دل کے کونے کونے سے اٹھتے ہوئے درد کو اشکوں میں بہا ڈالے۔ اس نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا۔ دھوئیں کے مرغولے زینت کے فوٹو کا طواف کرنے لگے۔ ٹیونک پہنے ہوئے چینی کی گڑیا پر دھوئیں کے بادل منڈلانے لگے۔ اور پھر اُن بادلوں سے ایک تاج محل ابھر کر سامنے آگیا۔ وہ تاج محل جس کی شوکت و عظمت۔ وقار۔ دبدبہ اور جلالی انداز نمود نے پرویز کے ذہنی اور فکری کینوس پر مختلف نقش و نگار کو رواں دواں کر ڈالا تھا۔

# خوشبو کی نیند

پرویز کے ابا اب اطمینان سے آرام کرسی پر لیٹے لیٹے اخبار پڑھا کرتے۔ ہر ایک سے بڑے پیار سے پیش آتے۔ بات بات پر مسکرا دیتے۔ ریڈیو گرام پر جب ریکارڈ بجتا تو گانے کے بولوں پر داد دیتے اور بڑی دیر تک سر دھنتے رہتے۔ گو بھائی کی جدائی کا غم بڑا گہرا تھا۔ مگر گھریلو زندگی کے سلجھاؤ سے زخم خود بخود مندمل ہونے لگا۔ بڑی آپا بچپن نہ بیٹھتی۔ اماں کو بہو تلاش کرنے کا مشغلہ دن بھر مصروف رکھتا۔ دن میں ایک آدھ دفعہ ماں بیٹی کھسر پھسر میں لگ جاتیں۔ اور پھر زینت کا نام لیکر چپکے سے آنسو پونچھ لیتیں۔ اور پھر ایک رات زینت کے گھر سے ڈھولک بجنے کی آواز آئی اور کسی لڑکی کی سُریلی آواز فضاؤں میں بلند ہو کر پرویز کے گھر میں گونج اٹھی۔ اماں نے رو رو کر تکیہ بھگو ڈالا۔ آپا کی آنکھوں کے سامنے اپنی تایا زاد بہن اور سہیلی کا چہرہ ابھر کر کمرے کی دہشت ناک خاموشی میں زہر گھولنے لگا۔ ابا جان نے کروٹ بدل کر ایک آہ بھری۔ اور پرویز نے پلنگ پر لیٹے لیٹے کھلی کھڑکی میں سے زرد چاند کی طرف دیکھا۔ شفاف آسمان پر اِدھر اُدھر تارے جھلمل جھلمل کر رہے تھے۔ یکایک ایک ستارہ ٹوٹ کر

آسمان کی وسعتوں میں کھو گیا۔ ڈھولک کی دھمک اور گنگرو کی ٹک ٹک تیز ہو کر رس بھری آواز کے شانہ بشانہ صوتی حسن بکھیرنے لگی۔ پرویز نے کھڑکی بند کر دی مچھر دانی کے پردے گرا دیئے۔ روشنی بجھا کر آنکھیں موند لیں۔ تاکہ گھپ اندھیرا چاروں طرف پھیل جائے اور روشنی کی ایک کرن بھی اس تک پہونچ سکے۔ اور پھر دوسرے دن زینت کے گھر میں بڑی چہل پہل تھی۔ کاروں کی آمدورفت، کمخواب و اطلس کے ملبوسات، بنے سنورے نسوانی چہرے، ریکارڈ بجنے کی آوازیں، مردوں اور عورتوں کے ملے جلے قہقہے، مہندی میں رچے ہوئے ہاتھوں کی جھنک، رنگ برنگ کے دوپٹوں سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئی بھاری بھاری چوڑیوں کے مُوباف، طلائی گہنوں کی چمک، سینٹ کی بھینی بھینی مہک سب نے مِل جُل کر زینت کے گھر میں اچھا خاصا میلہ لگا دیا تھا اور پھر دو پہر کے بعد وہ رونق، وہ گہما گہمی، وہ رنگ و بو کی آمد آمد ایک سناٹے میں بدل گئی۔ زینت پالکی میں چپ چاپ بیٹھ گئی۔ اس کی ماں دھاڑیں مار مار کر روئی۔ اس کے باپ کے آنسو تھے کہ تھمنے میں نہ آتے تھے۔ ہر شخص رویا مگر زینت کی آنکھوں سے ایک آنسو بھی نہ نکلا۔ حسب روایات گھونگھٹ کاڑھے ہوئے، کسی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر، زینت کو جھکے جھکے آہستہ آہستہ چل کر پالکی تک جانا تھا، مگر وہ تن کر چلتی ہوئی پالکی میں جا بیٹھی۔ اس کے چہرے پر خوشی کی لہر تھی نہ غم کی۔ پر اس کی آنکھیں کہے دیتی تھیں کہ انسان جیتے جی مر جاتا ہے۔ میں آج مر رہی ہوں، میں آج نہیں روؤنگی۔ میری آنکھوں کی ندیاں سوکھ گئی ہیں۔ اور پھر شہنائیوں کی آوازوں کے بیچ جب اُس کی پالکی چھپنے کے گھر کے سامنے سے گذری تو اُسنے پردے کی اوٹ سے بند کھڑکی کی طرف دیکھا۔ اور اگر اُسے معلوم ہو جاتا کہ کھڑکی کی جھری میں سے پرویز کی نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اور پرویز کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب امڈ رہا ہے تو شاید زینت کے دل کو لمحہ بھر کے لئے تسکین مل جاتی۔ یا شاید اس کے انگ انگ میں چنگاریاں بھڑکتے ہوئے شعلوں میں بدل جاتیں۔ وہ غمناک آنکھوں سے بند کھڑکی کی طرف دیکھتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ذرا رک کر کچھ دیر اور اُدھر دیکھ لینا اب اسکے بس میں نہ تھا۔ وہ اُس منزل کی طرف بڑھ رہی تھی جس کی راہ میں کوئی پڑاؤ نہ تھا۔ وہ اس ٹھکانے کی طرف جا رہی تھی جہاں اجنبی چہرے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ جہاں چودہری کالے خاں کی دولت اُس کی راہ تک رہی تھی۔ وہ چودہری کالے خاں جو لاہور میں سب سے بڑا آڑھتی تھا جس کی آڑھت کے حساب کتاب کا کام درجنوں منشی کر رہے تھے۔ جس کے سر پر زری کلاہ اور شہدی لنگی ہوتی تھی۔ جس کے پاؤں میں زری جوتے کی نوک کمان کی طرح کھنچی رہتی تھی۔ جس کی لنگی کا طرّہ مور کے پروں کی طرح پھیلا رہتا تھا۔ جو دوسرے آڑھتیوں کی طرح زیادہ زیور نہیں پہنتا تھا، بس دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں سب ملا کر چار سونے کی انگوٹھیاں،

گلے میں طلائی زنجیر، قمیص کی پٹی میں چار سونے کے بٹن اور کفوں میں طلائی اسٹڈ۔ اسی سادگی پر تو زینت کی اماں ریجھ گئی تھیں۔ ہاں زینت کے ابّا کی اور بات تھی۔ انہوں نے پہلے کالے خاں کی شرافت کو دیکھا تھا۔ اور بعد میں اُس کی سلیٹی رنگ کی لمبی کار اور پانچ منزلہ عمارت، چنانچہ زینت جب اس پانچ منزلہ عمارت میں پہونچ گئی اور اُسے سلیٹی رنگ کی لمبی کار میں بیٹھ کر شاپنگ کے لئے انارکلی جانا شروع کر دیا۔ تو پرویز کے گھر میں زینت کا قصہ خود بخود پُرانا ہو گیا۔ مگر پرویز کے لئے وہ پرانا قصہ ہر روز نیا ہو جاتا۔ جب وہ آتشدان پر سجے ہوئے فوٹو کو دیکھتا، جب اس کی نگاہ کھڑکی کی سل پر جا پڑتی جس کو ایک رات زینت کی ٹھوڑی نے چھوا تھا۔ جب وہ نیلے رنگ کے کاغذ پر لکھی ہوئی چند سطروں کو دیکھتا تو ہر شے اُس سے پکار پکار کر کہتی "آپ بزدل ہیں، آپ بزدل ہیں" اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے مانجھی کی چوتھی بیوی اپنی سپید کلائی دانتوں کی گرفت میں لئے تڑپتی نظر آتی۔ اور وہ سوچتا اسی طرح زینت کو بھی تڑپنا ہوگا، اُسے بھی زندگی اور موت کی کش مکش سے گذرنا ہوگا، اور پھر دفعتہً سانولے پاؤں کی محرابیں فضا میں ابھر آتیں۔ ایک متناسب بدن تھرکنے لگتا۔ دو سانولی باہیں لہریں بنکر حرکت کرنے لگتیں۔ اور گھنگروؤں کی چھما چھم مسلسل سنائی دینے لگتی۔ پرویز اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا۔ اور اپنا سر جھٹک کر خواب و خیال کی فصیل پھاند کر جیتی جاگتی دنیا میں قدم رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس دُنیا میں جہاں بڑی سرگرمی سے اُس کے لئے ایک سفید گلاب کا پھول تلاش کیا جا رہا تھا اور اس تلاش نے پرویز کے گھر میں نئی زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ تمام کمروں میں سفیدی کروائی گئی۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر رنگ روغن، پرانے پردوں کی جگہ نئے پردے نظر آنے لگے۔ غسل خانے کی دیوار پر بڑا آئینہ آویزاں کر دیا گیا۔ لان کے چاروں طرف پھولوں کے نئے گملوں کی قطاریں لگ گئیں۔ فرنیچر پر نئے سرے سے پالش کرایا گیا۔ ہلمین کار جو مہینوں سے گیراج میں بند پڑی تھی سروسنگ کے لئے بھجوا دی گئی۔ پرویز کی ماں نے چند ہی دنوں میں گہنوں کے کئی ڈبے جمع کر لئے تھے۔ نیلی اور سرخ مخمل پر سجا ہوا طلائی رانی ہار، گھڑی چوڑی، جھومر، جھمکے اور انگوٹھیاں، شاندار بڑی کے لئے پرویز کی ماں نے دو ہرے گہنے بنوائے، رانی ہار اور نیکلس، گھڑی چوڑی اور کنگن، جھومر اور ٹیکا۔ جھمکے اور بالیاں، نیلم اور پکھراج سے جڑی ہوئی کئی انگوٹھیاں، پرویز کی ماں جب بجلی کی روشنی میں تمام ڈبے کھول کر میز پر رکھ دیتی۔ تو خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ نیلی اور سرخ مخمل پر سجے ہوئے طلائی گہنوں کے چھوٹ آنکھوں کو خیرہ کر دیتے۔ اور پھر کمخواب کے سوٹ، ریشمی غرارے دار پاجامے، دوپٹے، غضب کی ساریاں اور اُن سے میل کھاتے ہوئے رنگ برنگ کے بلاؤز۔ پھر وہ سنیں

پرویز کی ماں کے منہ پر تو اُس کی نظرِ انتخاب کی جی کھول کر داد دیتیں مگر کوٹھی سے باہر قدم رکھتے ہی بلو منہ میں ٹھونس ٹھونس کے ہنسی دبانے کی کوشش کرتیں۔ اور پھر تھوڑی دُور جا کر خوب مذاق اڑاتیں۔ کوئی ناک پر انگلی رکھ کر کہتی "سر پھر گیا ہے بڑھیا کا۔ بھلا پہلے بہو تو ڈھونڈے پھر گہنوں کی نمائش کرنا۔" دوسری کہتی "چھوکرا رنڈی باز اور لونڈیا لگائی پھرتی ہے شریف گھرانوں میں۔" بیچ میں تیسری بول اٹھتی "لڑکے کے لچھن اچھے ہوتے تو زینت ہی پرائے گھر کیوں جاتی۔" یہ باتیں اُڑتی اُڑتی پرویز کی ماں کے کانوں تک پہونچ جاتیں اور وہ خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتی۔ پرویز کی ماں نے بیسیوں لڑکیاں دیکھ ڈالیں مگر ایک بھی تو آنکھوں میں نہ جچی۔ اُدھر اپنے پرائے کی گز بھر کی زبان برابر کتر کتر کئے جا رہی تھی۔ پرویز کا قصہ خوب اچھالا گیا۔ بدنامی کی کیچڑ کے چھینٹے جان پہچان کے سارے حدود اربعہ تک پہونچ گئے۔ بالآخر پرویز کے ابا کی زمانہ سازی آڑے آئی، لڑکی بدنام ہوئی اور بھاڑ میں گئی۔ اِدھر انگلی اٹھی اُدھر مستقبل تاریک ہو گیا۔ ماں باپ کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگ گیا پر لڑکے کی بدنامی تو ایک پرچھائیں ٹھہری، لڑکا ٹھیک راہ پر آ گیا۔ تو بات آئی گئی ہو گئی۔ ان خیالات کا اظہار کرنے کے بعد پرویز کے ابا نے اپنی بیگم کو رائے دی کہ لڑکے کو کچھ عرصہ کے لئے پہاڑ پر بھیجدیا جائے۔ ایک تو اس کی صحت اچھی ہو جائے گی اور دوسرے اس کی عدم موجودگی میں بات خود بخود دب جائے گی۔ کالک آپ سے آپ دھل جائیگی۔ وقت کا دھارا ایسی باتوں کو ذہنوں سے مٹا ڈالتا ہے ایسا ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے۔ پرویز کی ماں کے سگھڑاپے نے اس مشورہ کو خوشی خوشی قبول کیا۔ چنانچہ ماں باپ کے حکم کے مطابق پرویز مری چلا گیا اور پرویز کی ماں نے چند دنوں کے لئے چپ سادھ لی۔

پرویز نے مری کی مال روڈ پر پنجاب ہوٹل میں کمرہ نمبر ۱۲ لے رکھا تھا۔ ہوٹل کے تمام کمروں کی بالکونی مشترک تھی۔ پرویز اکثر اپنے کمرے کے سامنے بالکونی میں کرسی بچھا کر بیٹھ جاتا اور مال روڈ پر گھومتی ہوئی بے فکروں کی ٹولیوں کو دیکھتا رہتا۔ لوٹ پوٹ کر دینے والے چہرے سامنے سے گذرتے۔ شام ہوتے ہوتے سج دھج، میک اپ اور ملبوسات کی رنگا رنگی، تارکول کی سڑک پر رواں دواں نظر آنے لگتی۔ ہر شخص چاق چوبند ہو کر آتا خوبصورت چہرے، دل آویز تبسم۔ اور شرارت انگیز مسکراہٹیں، شرمیلی نظریں اور بے باک نگاہیں سنجیدہ چہرے اور بے وقار شخصیتیں گویا رنگ و بو حسن و جمال اور سنجیدگی کی ایک دنیا مال روڈ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل جاتی۔

ہوٹل کے مقابل بلندی پر ایک گرجا اپنی تقدیس اور سطوت سمیٹے کھڑا تھا۔ اس کا پرشکوہ کلس

دُور دور سے دکھائی دیتا تھا۔ ہر اتوار کو جب اس گرجے کا گھنٹہ بجتا تو نصرانی عورتیں سر ڈھانپے ہوئے مردوں کے ہمراہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتی ہوئی اس گرجے کی سمت جاتی دکھائی دیتیں۔ ان میں ایک سانولے رنگ کی عورت اپنے خاوند کی باہوں میں باہیں ڈالے چڑھائی چڑھتی ہوئی نظر آتی۔ پرویز اُس عورت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا۔ متناسب بدن، لانبے بال، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کی شکل و صورت ششی سے ملتی جلتی تھی وہی مسکراہٹ، وہی چال ڈھال، وہی نغمگی اور شعریت کا مجموعی تاثر، گو پرویز نے ششی کو اپنے دل سے نکال کر گلے سڑے انسانوں کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا پھر بھی نہ جانے کیوں جب وہ اُس نصرانی عورت کو دیکھتا تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ وہ اُسی طرح بالکونی میں بیٹھا انتظار کرتا رہتا۔ عبادت ختم ہو جانے کے بعد نصرانی مرد اور عورتیں لمبے لمبے قدموں سے نشیبی راستے پر بہنے لگتے۔ وہ سانولی عورت بھی اپنے خاوند کی باہوں میں باہیں ڈالے نغمگی اور شعریت کا مجموعی تاثر بکھیرتی ہوئی مال روڈ پر پہونچ جاتی اور پنجاب ہوٹل کے سامنے سے گذر کر پنڈی پوائنٹ کی طرف نکل جاتی۔ پرویز کی نگاہیں اُس کا تعاقب کرتی رہتیں حتیٰ کہ وہ موڑ پر مُڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی اور پرویز دُور سامنے پہاڑ کی طرف دیکھنے لگتا۔ دُور بہت دُور فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف کی ایک سفید لکیر تھی۔ وہ لکیر جو ہر صبح ابھرتے ہوئے سورج کی شعاعوں میں نہاتی تھی اور اس کے کنوارے رخساروں سے شفق کی دھاریاں پھوٹ نکلتی تھیں وہ نظارہ دیکھ کر پرویز کو زینت یاد آنے لگتی۔ اور پھر اس سفید لکیر پر سلیٹی رنگ کی لمبی کار دوڑتی ہوئی پانچ منزلہ عمارت کی طرف نکل جاتی۔ اور پھر آڑھت کی منڈی سے روپے کی جھنکار بلند ہو کر چیڑھ کے درختوں کی سائیں سائیں میں گھل مل جاتی۔ پرویز اپنا سر جھنجھوڑ کر ماضی کے قبرستان سے نکلی ہوئی یاد کا گلا گھونٹ دیتا۔ اور اپنی قوتِ ارادی کے بھر پور عمل سے اپنے خیالات کی اُونچ نیچ کو کوٹ کوٹ کر ہموار کر دیتا۔ ذہن کی اس روِش کو ہموار کرنے میں یادوں کے چھوٹے چھوٹے کنکر تحت الشعور کی راہوں میں دب جاتے۔ مگر اتوار کی صبح کو جب گرجے کا گھڑیال ٹن ٹن کرتا۔ تو ایک آدھ کنکر اپنی جگہ سے سرک کر ہموار راہ کو ناہموار کر دیتا۔ پرویز سوالیہ نگاہوں سے گرجے کے کلس کی طرف دیکھتے ہوئے محسوس کرتا جیسے وہ بھی بھیڑوں کے گلے میں شامل ہو کر امن و امان کی دُعا مانگنے کے لئے کلیسا کی طرف جا رہا ہے۔ اور اس کا ذہن صلیب پر لٹکا ہوا ہو جس سے لہو کے قطرے ٹپکے پڑتے ہوں۔

ایک دن وہ دل کی ایسی ہی کیفیت لئے بالکونی سے اٹھ کر اندر کمرے میں چلا گیا۔ اور عقبی دریچے میں سے باہر دیکھنے لگا۔ ٹین کی چھتیں لہریئے بناتی ہوئی نیچے کشمیری محلے تک چلی گئی تھیں۔ بل کھاتا

ہوا ڈھلواں راستہ چشمہ کے پہلو سے گذر کر درختوں میں گم ہو گیا تھا۔ سامنے پہاڑوں کی سرسبز چوٹیاں نظر آرہی تھیں۔ اور ان پہاڑوں کے دامن میں چیڑ، بٹنگ۔ آڑو۔ ناشپاتی اور اخروٹ کے پیڑوں کی اوٹ سے چھوٹے بڑے بنگلے جھانک رہے تھے۔ معاً دھند چھانے لگی۔ ہوا کی نمی اس کی ناک ماتھے اور گلے پر اثر کرنے لگی۔ اُس نے دریچہ بند کر دیا۔ بوائے کو بلا کر کافی کا آرڈر دیا۔ اور پھر بستر پر لیٹ کر ٹالسٹائی کا ایک ناول پڑھنے لگا۔

"میں اپنی جان دے دوں گی" کمرہ نمبر پانچ سے آواز آئی۔ پرویز کتاب بند کر کے کنسوئے لینے لگا۔ اس کے بعد کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اتنے میں بوائے کافی لے کر آگیا۔ چھوٹی پیالی میں کافی بنا کر اس نے ایک چسکی لی اور ناول کھول کر پھر پڑھنے لگا۔

"میں زہر کھاؤں گی" کمرہ نمبر پانچ سے پھر آواز آئی۔ پرویز کے جی میں آیا کہ وہ وہیں سے بیٹھے بیٹھے کہہ دے "تم جھوٹ کہتی ہو" کشمیری دیہاتن کی تصویر بھی جھوٹ کہتی تھی یشفتی بھی جھوٹ کہتی تھی۔ کوئی کسی کے لئے زہر نہیں کھا سکتا۔ ہر شخص جینا چاہتا ہے۔ کوئی کسی کے لئے جان نہیں دے سکتا۔ میں خود جینے کے لئے پہاڑ پر آیا ہوں۔ ہر شخص جینے کے لئے پہاڑ پر آتا ہے۔ میں جینے کے لئے محل بنا رہا ہوں جس محل میں میری بیوی مانجھی کی چوتھی بیوی کی طرح زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہوگی اور پھر میں اپنی بیوی اور بچے کو ساتھ لے کر مال روڈ پر چہل قدمی کروں گا۔"

کنکریکے بعد دیگرے سرکنے لگے اور پرویز کا جی چاہا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رودے۔ یکایک کمرہ نمبر پانچ کا دروازہ کھلا۔ اور پھر دھم سے بند ہو گیا۔ اور پھر کسی عورت کی سسکیاں تیزی سے فضا میں ابھر کر ڈوب گئیں۔

پرویز نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ سورج چمک رہا تھا۔ ہر شے جگمگا اٹھی تھی۔ ہریالی نکھر گئی تھی۔ ہوا میں عجیب بھینی بھینی مہک بسی ہوئی تھی۔ قصاب کی دکان کی ٹین کی چھت پر پہاڑی کوّے کائیں کائیں کر رہے تھے۔ ایک میم اور صاحب باہوں میں باہیں ڈالے چڑھائی چڑھ رہے تھے۔ ایک ریشم جیسے بھورے اور چمکیلے بالوں والا فرنچ پوڈل ان کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ اور پوڈل کے پیچھے پیچھے ایک قلی دو بھاری بھاری صندوق پیٹھ پر لادے ہانپتا ہوا جا رہا تھا۔ ایک پہاڑن کٹہرے سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ اُس کے گالوں سے سرخ گلاب کی تازگی اور چمک پھوٹی پڑتی تھی۔ اُس کے کانوں میں چاندی کے بالے تھے۔ اور گلے میں ہنسلی۔ اس کے بالوں کی مینڈیوں پر سرسوں کا تیل چمک رہا تھا۔ دو مضبوط پہاڑی مرد اپنے کندھوں پر ڈانڈی اٹھائے اس کے قریب سے گذر گئے۔ ڈانڈی میں بیٹھی ہوئی ممبیگم ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس کے سر

اور شانوں کو سیاہ برقعے نے ڈھانپ رکھا تھا۔ چہرہ بے نقاب تھا۔ سیاہ ریشم نے سپید چہرے کو جلا دے رکھی تھی۔

"ارے" پرویز کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

سامنے ڈھلوان راستے پر کٹہرے کے پاس الطاف کھڑا تھا۔ وہ دائیں ہاتھ سے رومال ہلا رہا تھا۔ اس کے بائیں ہاتھ میں ایمپائر اسٹک تھی۔ کاندھے پر برساتی اور منہ میں سگار۔ چند ہی لمحوں میں الطاف ہوٹل میں پہونچ گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہوگئے۔ پہلے ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں پھر الطاف نے کہا۔

"اختر بھی مری آیا ہوا ہے۔ اس نے کشمیر پوائنٹ پر ایک شاندار کوٹھی لی ہے میں اسی کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"اچھا" پرویز کے دل میں پرانی یادوں نے چٹکی لی۔

"ہاں۔"

"بہت خوب۔"

الطاف باتونی تو تھا ہی۔ اب کے جو اس نے بولنا شروع کیا تو بے تکان بولتا ہی چلا گیا۔ وہ کہنے لگا "میری ٹرانسپورٹ کمپنی کا افتتاح بڑی شان و شوکت سے ہوا۔ یہاں میں برانچ آفس کھولنے آیا ہوں۔ اختر نے لکڑی کی تجارت شروع کر دی ہے۔ لکڑی درآمد کر کے تھوک اور پرچون دونوں دھندے چلا رہا ہے۔ پہلی درآمد میں اسے پانچ فیصدی نفع ہوا تھا۔ دوسری میں دس فیصدی، مگر وہ کہتا ہے کہ آج کل جس بیوپار میں سو فیصدی نفع نہ ہو۔ وہ بیوپار نہیں کہلاتا۔ اسی فکر میں اسے رات کو نیند نہیں آتی اور نیند لانے کے لئے اب اسے ہر شب پر دمانڈ کھانی پڑتی ہے۔ اسنے ایک الٹرا ماڈرن لڑکی سے شادی کرلی ہے۔ مسز اختر اپنے سر کے بال مردوں کی طرح ترشواتی ہیں۔

"یعنی ایٹن کٹ۔" پرویز نے وضاحت کی۔

"ہاں اور وہ شام کو بھی گاگلز پہنتی ہیں۔ کریوں اے کے سگریٹ پیتی ہیں۔ جب اختر اور مسز اختر ٹینگو ناچتے ہیں تو سچ مچ ایک دوسرے میں گم ہو جاتے ہیں۔ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔"

"ہونہہ۔"

"مسز اختر مشرقی رقص بھی جانتی ہیں۔ ان کے کمرۂ خاص میں طبلے کے علاوہ گھنگروؤں کی

جوڑیاں پڑی رہتی ہیں۔ اور دیکھو میں نے پانچ سو پچپن چھوڑ کر ہوانا (HAVANA) سگار پینا شروع کر دیا ہے۔" الطاف نے سلگتے ہوئے سگار کی طرف دیکھتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "چونکہ اس سگار کی خوشبو میری ہونے والی بیوی روحی کو بہت پسند ہے۔" روحی کتنا رومانٹک نام ہے۔" الطاف سگار کا ایک گہرا کش لے کر لمحہ بھر کے لئے چپ ہو گیا۔

چند ثانیئے کے بعد وہ رومان انگیز لہجے میں بولا۔ "روحی بڑی اچھی ہے۔ وسکی کو چھوتی تک نہیں۔ صرف شیری پیتی ہے۔ اُسے سب ناچوں میں "ٹینگو" پسند ہے۔ رمبا۔ سمبا تو اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ وہ ریس کورس میں "ون" کمیل کر روپیہ منائع نہیں کرتی۔ صرف پلیس کھیلتی ہے۔ روحی بڑی سوشل ہے۔ مگر انتہائی خوددار۔ کوئی دس دن کی بات ہوگی۔ بال روم میں وہ ایک امریکن کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ امریکن نے دورانِ رقص میں آدابِ محفل کی حدود سے تجاوز کرنا چاہا۔ روحی ایک شعلہ بن گئی اس نے تڑاخ تڑاخ دو چار طمانچے اس امریکن کے سُرخ سُرخ گالوں پر رسید کئے اور پھر وہ فلور چھوڑ کر چلی آئی۔

"ہونہہ"

الطاف نہایت بے تکلفی سے پلنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے دونوں تکیئے اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لئے تھے۔ دورانِ گفتگو میں کوئی اہم بات کرنے سے پہلے وہ سگار کا ایک گہرا کش لگاتا اور پھر ہونٹوں کا ایک چھوٹا سا دائرہ بنا کر سانس باہر نکالتا۔ دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے حلقے کمرے میں منڈلاتے ہوئے فضا میں تحلیل ہو جاتے۔

الطاف بولا "رفیق کہتا تھا کہ میں پہلے شادی کروں گا۔ اور بعد میں کام۔ شادی تو اس نے کر لی ہے۔ مگر کام وام کچھ نہیں کرتا۔ اب وہ دن بھر اپنی ان پڑھ بیوی کو لکھاتا پڑھاتا رہتا ہے۔ شام کو دو چار وسکی کے بڑے پیگ چڑھا کر بلیرڈ کھیلتا ہے اور رات کو پھولوں کے گجرے خرید کر گنگناتا ہوا گھر چلا جاتا ہے۔ سب کہتے ہیں کہ رفیق کو ان پڑھ بیوی مل گئی ہے۔ اس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی مگر رفیق کہتا ہے "پہلے میں اس دنیا میں اکیلا تھا اب مجھے ایک ساتھی مل گیا ہے۔ مجھے کار چاہیئے نہ بنگلہ اور نہ دوست" یہ کہہ کر الطاف کھل کھلا کر ہنس پڑا اور اس کے سگار کی راکھ خود بخود جھڑ کر پلنگ پوش پر بکھر گئی۔

"اور پرویز تمہاری وکالت کیسی" اتنا کہہ کر الطاف رُک گیا۔ پھر اس نے دھوئیں کے اَن گِنت حلقے بنائے۔ اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ کتنی دیر چھت کی طرف دیکھتا رہا۔ کمرے میں

سکوت چھا گیا اور پرویز کے نتھنوں میں گلی سڑی لاشوں کی سڑاند گھسنے لگی۔ اس کا جی چاہا کہ زمین پر تھوک دے۔ الطاف سے کہہ دے " دوست بھلا یہ قصہ چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی "

" پرویز " الطاف بولا اور اب اُس کی آواز شدتِ جذبات سے کانپ رہی تھی۔ پرویز اس فوری تغیر پر بھونچکا رہ گیا " اچھا پرویز ایک بات پوچھوں ؟ سچ سچ بتاؤ گے " الطاف نے مسکرا کر کہا۔

" ضرور "

" کیا تم سچ مچ رشتی کو چاہتے ہو ؟ "

جواباً پرویز نے ایک کھوکھلی ہنسی ہنس کر ہونٹ بھینچ لئے۔ الطاف چند لمحے چپ سادھے بیٹھا رہا۔ ان چند لمحوں میں اسنے دھوئیں کے بے شمار حلقے بنائے اس کی اندرونی بے چینی جیسے اس کے ہاتھوں میں سرایت کر آئی ہو۔ وہ کبھی تو تکیہ پلنگ پر رکھتا اور چند لمحوں بعد وہاں سے اٹھا کر پھر گود میں رکھ لیتا اور کبھی اپنی امپائر اسٹک کا دستہ کھولتا اور بند کر دیتا۔

" کافی منگواؤں " آخر پرویز نے خاموشی کو توڑا۔

" نہیں شکریہ " الطاف یہ کہہ کر پھر کسی گہرے سوچ میں گم ہو گیا۔

" اچھا بھئی تو کل ملیں گے۔ مجھے اس وقت کسی سے ملنا ہے " الطاف نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ الطاف نے پرویز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دبایا۔ پھر اُس نے برساتی کاندھے پر ڈالی۔ امپائر اسٹک ہاتھ میں لی۔ اور جس تیزی سے کمرے میں داخل ہوا تھا اُسی تیزی سے باہر نکل گیا۔

دوسرے دن پرویز ابھی بیڈ ٹی نوش کر رہا تھا کہ اختر آ پہونچا۔ اور آتے ہی پرویز سے لپٹ گیا۔

" شادی مبارک ہو " پرویز نے چہک کر کہا۔

اختر کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔

" اختر خیریت تو ہے ؟ " پرویز نے از راہ ہمدردی پوچھا۔

" پرویز مجھ سے زندگی میں لاکھوں گناہ ہوئے ہیں۔ اور ہر گناہ کا میرے پاس جواز موجود ہے۔ لیکن صرف ایک گناہ، ایک جرم مجھ سے ایسا سرزد ہوا ہے۔ جس کی تلافی کبھی نہیں ہو سکتی "

پرویز نے سگریٹ سُلگایا جس طرح پرویز کے دوست اس کے متعلق کامیاب پیشین گوئی کر سکتے تھے۔ اُسی طرح وہ بھی اختر کے جذبات کی ترجمانی کر سکتا تھا۔ اُسے فوراً احساس ہوا کہ اختر کوئی خاص بات کہنا چاہتا ہے۔ ایسی بات جو اس کے ضمیر میں ایک کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔ اور وہ جلد از جلد اُس کانٹے کو نکال باہر پھینک دینا چاہتا ہے۔ اختر کہنے لگا "پرویز میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ اور اب میں شستی کو بھی اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہاری محبت کو نفرت میں بدلنے والے ہم ہیں۔ تمہارے تاج محل کو گرانے والا میں ہوں۔ الطاف ہے، رفیق ہے، اور سب سے اول تمہارا باپ"

"اختر میں تمہاری پہیلی نہیں بوجھ سکا" پرویز نے چونک کر کہا۔

"پرویز میں چاہتا ہوں کہ اس پہیلی کو بوجھ کر تم میرے منہ پر تھوک دو۔ میرے گال پر طمانچہ مار دو" اختر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اور پھر وہ اٹھ کر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔

پرویز بولا "اختر تمہیں نے ایک دن مجھے بے چین دیکھ کر کہا تھا" آخر یہ سب کچھ ایک طوائف کے لئے"

"میں نے نہیں کہا تھا۔ وہ مجھ سے کہلوایا گیا تھا"

اختر نے یہ کہتے ہوئے پلٹ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے "اسی طرح شستی کو بھی زبردستی شراب پلائی گئی تھی"

یہ کہتے ہوئے اختر پھر کرسی پر بیٹھ گیا "تمہارے باپ نے کرائے کے آدمی شستی کے کوٹھے پر بھیجے تھے۔ اس سازش میں ہمارا بھی ہاتھ تھا۔ شستی روئی، چلائی مگر جبراً اس کے منہ میں شراب انڈیلی گئی۔ اُس کی ساڑھی کھینچ کر اتار دی گئی۔ اس کی آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔ چودھری اس کا دشمن، جناآپا، سازندے، اڑوس پڑوس کی طوائفیں سبھی اُس کے بیری، کوئی بھی اُس کی مدد کو نہ پہونچا۔ وہ تمہیں بلاتی رہی، پکارتی رہی، اس کی آواز، اس کی پکار کمرے میں گونج گونج کر سسکیوں میں بدل گئی اور جب اُسے اپنی سدھ بدھ نہ رہی تو تم وہاں پہونچے۔ تمہاری نگاہیں سازش کے دبیز پردوں کو چیر کر حقیقت تک نہ پہونچ سکیں۔ اس دن تمہارے باپ میں سویا ہوا سی۔ آئی۔ ڈی کا آفیسر جاگ کر بھرپور وار کر رہا تھا تاکہ اس کے بیٹے کا مستقبل تاریک نہ ہونے پائے" اختر نے اپنے ضمیر سے کانٹا نکال کر پرے پھینک دیا جیسے سینے میں کھبا ہوا تیر نکلنے کے بعد درد کی شدت بجلی کی سی سرعت کے ساتھ تیز ہو کر بدن کی توانائی نچوڑ لیتی ہے اسی طرح ضمیر کا کانٹا نکلنے کے بعد اختر

بے سدھ ہو کر پلنگ پر لیٹ گیا اور ایک کانٹا جو پہلو بدل بدل کر پرویز کے دل میں چبھتا رہتا تھا اب ایک واضح اور متعین شکل میں اس کے دل کے کونے کونے میں چھید کرنے لگا۔ اس کے کانوں میں گرجے کے گھڑیال کی ٹن ٹن گونجنے لگی اور اس ٹن ٹن کے ساتھ ششی کی پکار سنائی دینے لگی اور اس پکار کے پہلو بہ پہلو راج شاہی سے لے کر لاہور تک بیتے ہوئے حسین لمحات کا کارواں ذہن کے وسیع و بسیط صحرا میں دوڑنے لگا۔ آج کشمیری دیہاتن کی تصویر پھر بولنے لگی۔ "میں زندہ ہوں، میں زندہ رہوں گی، ششی زندہ ہے۔ ششی زندہ رہے گی" پرویز کی آنکھوں کے سامنے وہ مکان گھومنے لگا جس کے دروازے پر میلا ٹاٹ پڑا ہوا تھا۔ اور اس مکان کا وہ کمرہ جس کی سردل سے شلغم کی قاشیں لٹک رہی تھیں۔ اور ششی کی ایک پرچھائیں ہر اتوار کو گرجے جاتی تھی۔ جہاں سفید ریش پادری بھیڑوں کے گلے کو انجیل مقدس سے کوئی باب پڑھ کر سناتا ہوگا۔ اور انہیں پاک صاف زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتا ہوگا اور عبادت ختم ہونے کے بعد وہ بھیڑوں کا گلہ بیئر اور وہسکی پی کر امن و امان کی دعائیں مانگتا ہوگا۔ الطاف کی روح کسی امریکن کے ساتھ رقص کرتی ہوگی۔ مسز اختر اور مسٹر اختر ٹینگو ناچتے ہوں گے۔ وہ اختر جو اب پلنگ پر بے سدھ پڑا ہوا تھا جس نے اس کا تاج محل گرانے کی سازش میں حصہ لیا تھا۔ پھر پرویز کو اپنے ابا کا خیال آ گیا اور ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

"اختر! میں اسی وقت لاہور جا رہا ہوں" پرویز نے اختر کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"وہاں کیا دھرا ہے؟" اختر نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہاں ششی ہے میں اس کی پکار سن رہا ہوں" پرویز نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"ششی وہاں نہیں وہ سانولی سینی ٹوریم میں ہے" اختر بولا۔

"سانولی سینی ٹوریم؟"

"ہاں: ڈاکٹر تو کہتا ہے کہ اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ مگر وہ آرام نہیں کرتی وہ چیڑ کے درختوں سے باتیں کرتی رہتی ہے"

وہ اب بھی تمہیں پکارتی رہتی ہے۔ وہ کہیں بہت دور اپنا گھر بسانا چاہتی ہے اور وہ کہتی ہے کہ صرف ایک بار پرویز کو دیکھ لوں تو اچھی ہو جاؤں گی"

سارے کنکر اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر آڑے ترچھے ہو گئے۔

"پرویز" اختر نے پرویز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ملتجیانہ انداز میں کہا "تمہیں اب

میرے ساتھ جانا ہوگا۔ مسز اختر تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔ کل شستی بھی پہونچ جائے گی۔ الطاف آج صبح کار سے لاہور گیا ہے۔ کل واپسی پر اُسے ساتھ لیتا آئے گا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں دیکھتے ہی اچھی ہو جائے گی۔ اب میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ الطاف تمہارا ساتھ دے گا۔ اب ہم دنیا کی ہر طاقت سے لڑنے کے لئے تیار ہیں۔ شستی ایک انمول موتی ہے۔"

پرویز نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سامنے دیوار پر لٹکے ہوئے کلینڈر کی طرف دیکھتا رہا جس پر مہینے کا نام اور تاریخیں لکھی ہوئی تھیں۔ اور اُن تاریخوں کے اوپر کسی رقاصہ کی رنگین تصویر بنی ہوئی تھی۔ رقاصہ کے ہوا میں اٹھے ہوئے دونوں ہاتھ، گھاگرے کی اڑان، اور پاؤں کی محرابوں کی اٹھان، حرکت کا احساس دلا رہی تھی۔ پرویز کے تصوّر نے اس تصویر میں جان ڈال دی اور لوچ لچک کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ ہر پہلا خیال دوسرے خیال کو سہارا دے کر آگے بڑھتا گیا۔ ایک یاد دوسری یاد سے وابستہ ہو کر فاصلے طے کرتی گئی۔ یادوں اور خیالوں کا قافلہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں نظر آنے لگا۔ اور بجائے اس کے کہ پرویز اختر کے منہ پر تھوک دیتا، اس کے گال پر طمانچہ مار دیتا۔ وہ چپ چاپ سامان لے کر اس کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ جب وہ بل چکا کر ہوٹل کے دفتر سے باہر نکلے تو مال روڈ پر بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ چند پولیس کانسٹیبل اور ایک تھانیدار ہوٹل کی بالکونی میں کمرہ نمبر پانچ کے سامنے کھڑے تھے۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ کسی عورت نے خودکشی کر لی ہے۔ پرویز کے کانوں میں گذشتہ کل کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

"میں جان دے دوں گی، ہیرے ہیر کھا لوں گی۔"

پرویز سوچنے لگا: "تو سچ مچ اس نے جان دیدی۔ تو پہاڑ پر ہر شخص جینے ہی کے لئے نہیں آتا۔ یہاں لوگ مرنے کے لئے بھی آتے ہیں۔"

پرویز اور اختر قلیوں سے سامان اٹھوا کر چل پڑے۔ گرجے کا کلس اسی طرح اپنی تقدیس اور سطوت سمیٹے کھڑا تھا۔ ہوٹل کے سامنے ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ جب وہ پوسٹ آفس کے قریب ترائے پر پہونچے تو پرویز چلتے چلتے رک گیا۔ زینت ایک دکان سے نکل کر ڈھلوان راستے پر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس کے پاؤں میں اونچی ایڑی کے سینڈلوں کی بجائے فلیٹ ہیل کی سینڈلیں تھیں۔ غرارے دار پائجامے پر ڈھیلا ڈھالا کرتا پہن رکھا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے۔ چہرے کی رونق مدھم پڑ گئی تھی۔ سفید گلاب کا پھول کھلا گیا تھا۔ اور اس کے ہمراہ آڑھت کی منڈی کا بادشاہ کالے خان جا رہا تھا۔ جس کی زری کلاہ پر مشہدی لنگی کا طرّہ مور کے پروں کی طرح پھیلا ہوا

تھا۔ زینت کو دیکھ کر پرویز کے دل کو ایک دھچکا لگا۔ اور جب وہ اختر کی شاندار کوٹھی پر پہونچا تو اسے مسز اختر سے مل کر ظاہری اور رسمی طور پر بڑی مسرت ہوئی اور جب اسی دن شب کے پرتکلف کھانے کے بعد کوٹھی کے ہال میں ناچ شروع ہوا تو مسٹر اختر اور مسز اختر کا رقص دیکھ کر وہ داد نہ دے سکا۔ اور وہ شیشی کی پرچھائیں بھی ناچ میں شامل تھی جسے گرجے کو جاتے ہوئے دیکھ کر پرویز کے ذہن کی ہموار روش ناہموار ہو جایا کرتی تھی۔ وہ اتنا پئے ہوئے تھی کہ اُسکے سٹیپ اکھڑے اکھڑے اور بے ہنگم تھے۔ پہلے وہ اپنے خاوند کے ساتھ گھل مل کر ناچی پھر اسنے کسی دوسرے مرد کے ساتھ ٹینگو ناچا۔ اس مرد کے ساتھ بھی وہ اسی طرح گھل مل کر ناچی۔ روحی کسی یورو پین کے ساتھ ناچ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے دوڑ رہے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلاویز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ گراموفون پر بجتی ہوئی موسیقی پورے شباب پر تھی۔ حدِ مناسب گھٹتے گھٹتے گم ہو گئی اور رقص کے کھلے پردے میں ناچنے والوں کے جسموں نے ایک دوسرے سے جی کھول کر سرگوشیاں کیں۔ دوسرے ناچ میں مسز اختر نے پرویز سے مخاطب ہو کر کہا: "کیا میں اس ناچ کی مسرت حاصل کر سکتی ہوں؟"

مسز اختر کی پیش کش نے پرویز کو حیرت میں ڈال دیا۔ چونکہ ایسی دعوت بال روم ڈانسنگ کے آداب و قوانین کے منافی تھی۔ وہ ہمیشہ دیکھتا چلا آیا تھا کہ رقص کی مسرت چاہنے کے لئے مرد پیش قدمی کرتا ہے۔ سلو فاکس ٹراٹ کی دھن بجنے لگی۔

سلو۔ سلو۔ کوئیک۔

مسز اختر پرویز کے اور قریب آگئی۔

پرویز کا بایاں بازو بلند ہو کر کہنی سے مڑ گیا اور بایاں ہاتھ شانوں کی سطح سے ذرا اوپر چلا گیا۔ مسز اختر نے اپنی دائیں ہتھیلی پرویز کی بائیں ہتھیلی پر رکھ دی۔ پرویز نے اپنے دائیں ہاتھ سے مسز اختر کے بائیں کندھے کو تھام لیا۔ مسز اختر نے اپنے بائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں جوڑ کر اپنے ہم دست کے بائیں کندھے پر رکھ دیں۔ دونوں کے سر متوازن تھے۔ مسز اختر پرویز کے دائیں کندھے کے اوپر سے دیکھ رہی تھی۔

Slow, Slow, Quick. Quick. سلو۔ سلو۔ کوئیک۔ کوئیک

موسیقی کی ہم آہنگی میں پرویز نے اپنے بائیں پاؤں اور مسز اختر نے اپنے دائیں پاؤں سے فورسٹیپ کی ابتدا کی۔ تمام جوڑے ایک سمت میں بہہ رہے تھے۔ لائن آف ڈانس کے ساتھ ساتھ، دائیں سے بائیں ٹانگیں پینڈولم کی طرح آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں۔

سلو۔ سلو۔ کوئیک۔ کوئیک۔

مسز اختر کے منہ سے وہسکی کی بو آرہی تھی۔ میک اپ کے باوجود قریب سے اس کا چہرہ نہایت غیر دلچسپ معلوم ہو رہا تھا۔

"آپ ہماری شادی میں بھی شریک ہوئے؟" ناچتے ناچتے مسز اختر نے سرگوشی کی۔

"یہ میری بدقسمتی ہے۔" پرویز نے جواب دیا۔

"بدقسمتی! یہ الفاظ مجھے بالکل پسند نہیں۔" مسز اختر نے کوارٹر ٹرن لیتے ہوئے کہا۔

مسز اختر لونیک بلاوز پہنے ہوئے تھیں۔ جارجٹ کی نیلی ساڑھی میں کمر کا عریاں حصہ قمقموں کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ موسیقی کے دوش بدوش ہائی ہیل سینڈل کی آہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ ہرنا چنے والے کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پرویز بھی مسکرا رہا تھا۔

"کل دن بھر برج کا پروگرام ہے۔ شام کو پکچر دیکھنے جائیں گے۔ پرسوں ہمارے ہاں کاک ٹیل پارٹی اور ڈنر ہوگا۔" مسز اختر سائڈ سٹیپ لیتے ہوئے بولیں۔

"جی۔" پرویز نے جواب دیا۔

پرویز نے بائیں جانب اور مسز اختر نے دائیں جانب حرکت کی۔ پرویز کا منہ اور مسز اختر کی پشت دیوار کی طرف تھے۔ پرویز کا بایاں کولہا مسز اختر کے دائیں کولہے کو چھو رہا تھا۔

"اور آپ کے دوست کو رات کو نیند نہیں آتی۔ ہر شب بروما ئڈ کھانی پڑتی ہے۔" مسز اختر پرومینیڈ پوزیشن کے بیچ بولیں۔

"جی۔"

سلو۔ سلو۔ کوئیک۔ کوئیک۔

"مجھے آپ کے ساتھ ناچتے ہوئے واقعی بڑی مسرت ہو رہی ہے۔" مسز اختر نے نیچرل ٹرن لیتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔"

"مجھے کبھی کبھار ایسا پارٹنر ملتا ہے۔"

"نوازش۔"

رو تی پرومینیڈ پوزیشن میں بھرپور چلبلاہٹ اور زندہ دلی کا ثبوت دے رہی تھی اس کا ہم سمت دوپٹہ گرم جوشی کا اظہار کر رہا تھا۔

"اوہ کل تو آپ کی شیتی آ رہی ہے۔" مسز اختر نے ریورس ٹرن لیتے ہوئے کہا۔ اور پھر ناچتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "میں نے آپ کی شیتی کے لئے کونے والا کمرہ تجویز کیا ہے۔ برتن بھی علیحدہ ہوں گے۔ آپ جانتے ہی ہیں یہ ایسی بیماری ہے۔" پرویز کا جی چاہا کہ وہ فلور چھوڑ کر چلا جائے۔ اس ہال سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں دو چار گہرے سانس لے۔ اسنے محسوس کیا کہ اس بھرے ہال میں ہر شخص ایک دوسرے کو فریب دے رہا ہے۔ وہاں ہر شخص مسکرانے پر مجبور تھا۔ ہر شخص جیسا وہاں نظر آ رہا تھا حقیقت میں ویسا نہ تھا۔ شیتی کی پرچھائیں جو دور سے اتنی دل کش معلوم ہوتی تھی قریب سے دیکھنے پر کتنی گھناؤنی نکلی یکایک تالیاں بجنے کی آوازیں آئیں۔ ناچ ختم ہو چکا تھا۔ مغربی موسیقی کی بہتی ہوئی ندی رک گئی تھی۔ ملبوسات کی سرسراہٹ، قدموں کی چاپ، سینٹ کی بھینی بھینی مہک، وسکی کی نشیلی بو، سگریٹ کے دھویں کے مرغولے، شکریہ شکریہ کی آوازیں، سب نے مل جل کر ہی تو اختر کی کوٹھی میں اس سوشل اجتماع کو کامیاب بنایا تھا۔

دوسرے دن اتوار تھا۔ کھانے کے بعد برج کے کھلاڑی آ پہونچے۔ ان میں ایک تو محکمۂ جنگلات کے مقامی آفیسر تھے۔ جو شکار کے رسیا تھے۔ کتوں کا بھی بڑا شوق تھا۔ چھوٹتے ہی ان دو موضوعات پر انہوں نے اپنی ساری لعنت جھاڑ دی۔ ان کی بیوی یورپین تھیں۔ جن کی جائے پیدائش تو برمنگھم تھی مگر ایک زمانے تک پکاڈلی کے ایک مشہور ہیئر ڈریسنگ مینی کیور اور بیوٹی کلچر ہوم میں کام کر چکی تھیں۔ محکمۂ جنگلات کے مقامی آفیسر جہلم کے رہنے والے تھے۔ انہیں اپنی سرخ و سپید اور سنہرے بالوں والی بیوی پر بے حد ناز تھا۔ اس حقیقت سے ان کی ولایتی بیوی بخوبی واقف تھیں۔ چنانچہ ازدواجی اور سوشل زندگی کے ساتھ ساتھ گھمنڈ بھی بڑھتا گیا۔ مسکراہٹوں کے تیور بھی بدلتے گئے۔ پکاڈلی میں تو لحظہ لحظہ کی مسکراہٹ گاہکوں کی خوشنودی کے لئے تھی مگر مری میں زیر لب تبسم عنایات کی نشان دہی کرنے لگا۔ تاہم ولایتی بیگم کبھی کبھی یہ سوچ کر حیران رہ جاتیں کہ پکاڈلی سے مری پہونچ کر جذبۂ کمتری کتنی سرعت سے جذبۂ برتری میں بدل جاتا ہے۔ بایں ہمہ وہ دوران گفتگو میں اکثر سر کے بالوں کی عمودی اور افقی لکیروں کی فنی اہمیت اجاگر کرنے لگتیں۔ پیج کٹ، کلب کٹ، پوڈل کٹ اور کیپ کٹ سے لے کر اطالوی، امریکی، برطانوی، فرانسیسی کٹ اور پھر شیمی شنگل اور شارٹ کراپ کی انفرادی خوبصورتی پر روشنی ڈالتیں۔ وہ کئی بار دہرا چکی تھیں کہ بیضوی سر ہیئر ڈریسنگ کے لئے آئیڈیل ہے۔ جس کی چوڑائی اونچائی کا تین چوتھائی حصہ ہونا چاہئے اس فن میں تناسب اور توازن لازم و ملزوم ہیں۔ میک اپ اور مینی کیور تو ان کے چہیتے موضوعات تھے۔ آنکھوں، پلکوں اور ابروؤں

کی میک اپ پر عالمانہ تنقید کر دیتیں۔ جب مینی کیور کے میدان میں اُتر آتیں تو نیل فولڈ نیل رُوٹ، نیل بیڈ، نیل پلیٹ، فری ایج، نیل وال اور ہاف مُون کا تجزیہ کر کے اس فن کی جمالیاتی دل کشی کو نہایت موثر انداز میں پیش کرتیں۔ اور جب وہ تاریخی ہیئر ڈریسنگ کے متعلق گفتگو کرتیں تو اٹھارویں صدی کے ڈانڈے بیسویں صدی سے ملا کر سامعین کو مرعوب کر دیتیں۔

"مسز اختر میں مشورہ دوں گی کہ آپ پیج کٹ کی بجائے بالوں کی افقی لکیروں کو نمایاں کریں۔ چار چاند لگ جائیں گے۔" انھوں نے آج پھر مسز اختر کے لمبوترے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

مسز اختر نے آج پھر ہنس کر اپنے ترشے ہوئے بالوں کو جھٹک دیا اور پھر اپنے لیپ ڈاگ کو تھپک تھپک کر دل ہی دل میں اپنے ہیئر اسٹائل کو بدلنے کے متعلق غور کرنے لگیں۔

دوسرے صاحب کسی برطانوی فرم کے منیجر تھے۔ ان کی گوری چٹی بیوی نے آسمانی رنگ کی ساڑھی اور پیلا سویٹر پہن رکھا تھا۔ وہ بولتی کم اور مسکراتی زیادہ تھیں مسز اختر سفید ساٹن کی شلوار، بادامی کریپ کی قمیص اور ارغوانی کوٹ پہنے ہوئے تھیں۔ کوٹ پر ننھے ننھے مدوّر شیشے جڑے ہوئے تھے۔ شیفون کا دوپٹہ گلے میں ڈالے چہک چہک کر مہمانوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ حسب معمول گاگلز لگائے ہوئے تھیں۔ گفتگو کے موضوع بڑی تیزی سے بدلتے گئے۔ فرم کے منیجر نے ابھی ریس کورس کا ذکر چھیڑا ہی تھا کہ روحی آ پہونچی اور اس کی آمد نے محفل میں نئی روح پھونک دی۔ چند اِدھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور پھر دو میزوں پر کانٹریکٹ برج شروع ہو گئی۔ ہر بازی ختم ہونے پر ایک اودھم مچ جاتا۔ بحث و تنقید اتنے اونچے سروں میں ہوتی کہ الاماں۔ پھر جب دوسری بازی شروع ہوتی تو مکمل خاموشی چھا جاتی۔ ہر شخص پتوں کے جوڑ توڑ، فینس اور ڈسکارڈ کی باریکیوں میں الجھ کر چپ ہو جاتا۔ روحی جب پتے پھینٹتی تو اس کی نازک نازک انگلیاں بڑی پھرتی سے حرکت کرتیں اور مسز اختر ڈمی بن کر کھیلنے والوں کو گھور گھور کر دیکھتیں اور منیجر کی بیوی منہ سے صرف "ہوں" ہاں کرتیں مگر مسلسل مسکرائے جاتیں۔

ڈرائنگ روم کی ہر شے کی ترتیب سے مشرقی اور مغربی ذوق کا امتزاج مترشح تھا۔ آتشدان پر مسٹر اور مسز اختر کے فوٹو کے پاس کیوپڈ اور میڈونا کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ ریڈیوگرام کے شیلفوں میں چند انگریزی کی کتابیں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ قالین، صوفہ سیٹ، دروازوں میں لٹکے ہوئے پردے اور دیواریں ہلکے سبز رنگ کی تھیں۔ مغربی دیوار کے پاس تخت پر چاندنی بچھی ہوئی تھی جس پر اُجلے اُجلے گاؤ تکیے پڑے ہوئے تھے۔ پیتل کی چمکتی ہوئی منقش میز پر چینی کے گلدان میں سبز سبز پتے، رنگ برنگ کے پھول اور ان کے ہرے ہرے ڈنٹھل نظر آ رہے تھے۔ صوفہ سیٹ کی درمیانی پیس کے دائیں بائیں

ایک ایک تپائی پر ایک ایک راکھ دانی رکھی تھی۔ میزیں پر مائیک کی بنی ہوئی تھیں جن پر اس جا بکدستی سے پالش کیا گیا تھا کہ بس منہ دیکھ لو۔ تپے بیٹھے میں روحی کی بلوریں کلائیاں میز کے سینے پر منعکس ہوکر چھا ئیں مائیں ہو جاتیں۔ مسز اختر کی کوٹی کے مدوّر شیشے جھانک کر روپوش ہو جاتے۔ مقامی فارسیٹ آفیسر کی یورپین بیوی کے مرمریں شانے پل بھر کو مڑ کر پھر کرسی کی پشت سے جا لگتے اور منیجر کی بیوی کی اجلی مسکراہٹ نمودار ہو کر جالیاتی بہار پیدا کر دیتی۔ بیچ بیچ میں مسز اختر اپنے لیپ ڈاگ کو اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیتیں اور پھر اپنے ترشے ہوئے بال جھٹک کر اس کا منہ چوم کر فرطِ مسرت سے جھوم اٹھتیں۔ یہ دیکھ کر پرویز نہایت غور سے اختر کے ہونٹوں کی طرف دیکھنے لگتا۔ اور پھر اس کی نگاہیں اُس کونے والے کمرے کی طرف اٹھ جاتیں جس میں شینی کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

ٹھیک چار بجے بیرا کافی لے کر آگیا جس کا پہلا گھونٹ پی کر مسز اختر نے کریون اے کا نیا سگریٹ سلگا لیا اور پھر اپنی کلائی کی گھڑی دیکھ کر بولیں۔

"ابھی تک مسٹر الطاف نہیں پہونچے۔"

"بھئی اُسے سا ونی بھی تو رکنا ہے۔" مسٹر اختر بولے۔

"کیوں وہاں بھی کوئی ٹرانسپورٹ ایجنسی کھولی ہے؟" منیجر نے کہا۔

"نہیں، بات دراصل یہ ہے۔" مسٹر اختر نے سنجیدہ ہو کر کہا اور پھر نہایت شائستگی سے شینی کا مہمانوں سے غائبانہ تعارف کرایا۔

"تب تو ہم آپ کی شینی کا رقص ضرور دیکھیں گے۔" منیجر کی بیوی پرویز سے مخاطب ہو کر بولیں۔ سب نے اس فرمائش کی تائید کی۔

"اور گھنگھروؤں کی جوڑیاں ہر وقت حاضر ہیں۔" مسز اختر نے اپنی خواب گاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ جہاں کریون اے کے ڈبوں اور وہائٹ ہارس وسکی کے علاوہ گھنگھرو بھی موجود رہتے تھے۔

جواباً قہقہے سنائی دیے۔ کھیل پھر شروع ہو گیا۔

رات کے کھانے کے بعد سینما کا آخری شو دیکھا گیا۔ پھر مہمان اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ روحی بھی گڈ نائٹ کہہ کر اپنے بنگلے کی طرف بڑھ گئی۔ مسٹر اور مسز اختر پرویز کے ہمراہ اپنی کوٹھی میں پہنچے تو الطاف صوفے پر ٹانگیں پھیلائے سگار کے کش لے رہا تھا۔

"کیوں بھئی خیریت تو ہے؟" اختر نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

الطاف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بدستور سگار کے کش لیتا رہا۔ دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے حلقے اٹھ اٹھ کر فضا میں تحلیل ہونے لگے۔ الطاف چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ اپنی امپائر اٹک کا دستہ کھولتا اور بند کرتا رہا۔

مسٹر اختر، مسز اختر اور پرویز چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئے۔

"بیڈ لک" الطاف نے منہ سے دھوئیں کا ایک بادل چھوڑتے ہوئے کہا۔

باہر سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ قالین پر بیٹھے ہوئے لیپ ڈاگ نے کان کھڑے کر لیے۔

"اس مرتبہ ہرنشانہ غلط بیٹھا!" الطاف نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اور پھر سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ کر کہنے لگا "مسز اختر، امید ہے کہ آپ میری بدتمیزی معاف فرمائیں گی۔ دراصل میں کچھ پریشان سا ہوں۔"

"پھر تو آپ کو وسکی کی سخت ضرورت ہے۔" مسز اختر اٹھتے ہوئے بولیں۔

"نہیں، برانڈی کی۔" اختر نے کہا۔

"نہیں، دونوں کی۔" الطاف نے مسکرا کر کہا۔

"پنچ!" اختر بولا۔

"ہاٹ پنچ" مسز اختر چہکیں۔

اور پھر سب اٹھ کر آتشدان کے قریب گدوں پر جا بیٹھے۔ وسکی، شیری، برانڈی، رم اور جن مل کر گرم کی گئی۔ پھر ہاٹ پنچ سے لبالب چھوٹے چھوٹے بلوریں ساغر بلند ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرائے۔ مردوں نے دو دو چار چار گھونٹ پیے۔ مسز اختر نے ایک چسکی لے کر شانے سکیڑ لیے۔ اور سپید ہاتھ گلے پر رکھ کر پنچ کی تندی کا اظہار کیا۔ کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کو ننھے سے ریشمی رومال سے پونچھا اور پھر مسکراتے ہوئے جھٹ دوسری چسکی لے لی۔

چولھے میں دو موٹی موٹی لکڑیاں جل رہی تھیں۔ سرخ انگاروں کی تپش اور انتڑیوں میں دوڑتی ہوئی آگ نے خون کی گردش کو تیز کر دیا۔ چہروں پر بلا کی سرخی آ گئی۔ مسز اختر نے دوسرا جام لینے سے انکار کر دیا۔ مردوں نے جب تین تین پیگ پی لیے تو ماحول ہی بدل گیا۔ شعور اور تحت الشعور کے دروازے کھل گئے۔ کوئی دیوار حائل نہ رہی۔

الطاف بولا "میری ایک بس جل گئی ہے۔ ہزاروں کا نقصان ہو گیا ہے۔ دوسری بس کا گیئر بکس

خراب ہوگیا ہے۔ سپیئر پارٹس نہیں ملتے ایک عجیب آفت میں جان پھنس گئی ہے۔

اختر بولا " بس اتنی سی بات پر پریشان ہوگئے۔ گھر سے چلے ہیں کاروبار کرنے۔ میاں اس نقصان کو خرچ کے کھاتے میں ڈالو۔ پھر آمدنی کا حساب کرو جب کہیں پتہ چلے گا کہ نفع ہوا یا نقصان۔ اب یہ بتاؤ کہ ششی کیوں نہیں آئی۔"

" اس نے آنے سے انکار کردیا ہے۔"

" تم سب جھوٹے ہو۔ تم سب غدّار ہو۔" دفعتاً پرویز نے گرج کر کہا۔

مسز اختر چونک گئیں۔ الطاف چوتھا جام غٹ غٹ پی گیا۔ اختر اپنی دونوں باہیں صوفے کی پشت پر پھیلا کر پرویز کی طرف دیکھنے لگا۔ پرویز چپ چاپ صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ جیسے اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا ہو۔ جیسے زبان پر آئی ہوئی بات کہہ کر اُسے سکون مل گیا ہو۔ وہ اسی طرح صوفے پر لیٹا رہا۔ کسی نے اُسے نہ چھیڑا۔ پرویز کے بوجھل پپوٹوں نے اس کی سُرخ سُرخ آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔ الطاف، مسٹر اور مسز اختر کو خبریں سناتا رہا۔ " پرویز کے آبا بڑے خوش ہیں۔ ایک اونچے گھرانے میں پرویز کی شادی کی بات چیت ہو رہی ہے۔ ششی نے پہلے تو یہاں آنے سے صاف انکار کردیا تھا مگر بعد میں کہنے لگی " اچھا دو چار روز میں پہنچ جاؤں گی۔"

" وہ کیسے؟ اُسے ہمارا پتہ وتہ تو معلوم نہیں۔" اختر نے بات کاٹ کر پوچھا۔

" میں پتہ دے آیا ہوں" الطاف نے جواب دیا۔

" وہ کہتی تھی اب میں اچھی ہوگئی ہوں" الطاف کہنے لگا۔ " مگر ڈاکٹر کی رائے اس کے خلاف ہے۔ ششی کہتی تھی اب میں راج شاہی چلی جاؤں گی۔ وہاں میری ماں ہے، وہاں میرا ایک تالاب ہے وہاں ایک نارائن پور ہے جس کے راستے میں ایک چھوٹی سی جھیل ہے۔ اُس جھیل کے پانی میں چاند مسکراتا ہے۔ پھر وہ کہتی تھی میرا کوئی بھی نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔"

" بچاری ششی" مسز اختر نے جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اوپر تلے دو چار گھونٹ پی کر کریون اے کا سگریٹ سلگا لیا۔

آتشدان میں دفعتاً لکڑی چٹخی۔ آگ کا ایک ننھا سا شعلہ لپک کر انگاروں کی سُرخی میں گم ہو گیا۔ الطاف نے نیا سگار سلگا لیا۔ اختر کل کی کاک ٹیل پارٹی کے متعلق سوچنے لگا۔ پھر اُس نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈال کر دل میں کہا " آج تو برومائڈ کی ضرورت نہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے نیند خود بخود آجائے گی۔" دور سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ پرویز اسی طرح صوفے پر بے سدھ

پڑا تھا۔

زندگی کی ایک اور رات اپنی تمام رنگینیاں، تمام اداسیاں اور تمام الجھنیں ساتھ لئے ماضی کے اتھاہ غار میں گم ہونے لگی اور لمحہ بہ لمحہ گھٹتا ہوا اندھیرا نمودِ صبح کا انتظار کرنے لگا۔

اختر کی کوٹھی برقی قمقموں سے جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ مسز اختر ترتیب دی ہوئی چیزوں کی نوک پلک سنوارنے میں مصروف تھیں مسٹر اختر ڈریس سوٹ پہنے ہوئے برآمدے میں پرویز سے باتیں کر رہا تھا۔ پرویز نے کالی شیروانی پہن رکھی تھی۔ کشادہ برآمدے کا موزیک فرش اس قدر صاف شفاف تھا کہ پڑا ہوا تنکا بھی نظروں میں کھٹکے۔ دروازے کے دائیں بائیں پیتل کے چمکتے ہوئے گملوں میں پام کے پودے بڑے خوشنما معلوم ہو رہے تھے۔ دونوں جانب چھوٹے چھوٹے کاشانی قالینوں کے وسط میں بید کی سبز میزیں پڑی تھیں۔ جن کے اردگرد اسی ساخت اور رنگ کی کرسیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ دروازے پر پیتل کے چھلوں میں ٹنگے ہوئے ہلکے سبز رنگ کے پردے دائیں بائیں سرکا کر بیچ بیچ سے باندھ دیئے گئے تھے نشست کے کمرے کا نصف حصہ اور اس سے ملحقہ ڈرائینگ روم کا تقریباً چوتھائی حصہ برآمدے سے نظر آرہا تھا۔ یہاں سے وہاں تک نفاست اور موزونیت کی ایک دنیا پھیلی ہوئی تھی۔ اجلی اجلی وردیاں پہنے دو بیرے کانچ کے گلاسوں اور بلور کے ساغروں کو صافیوں سے خشک کر کرکے میزوں پر اوندھا رکھ رہے تھے۔ ایک گول میز پر چاندی کے بیئرنگ جن کے پیندے کانچ کے تھے۔ نصف دائرے کی صورت میں رکھے تھے مسز اختر دامانی فر کا سلیٹی کوٹ پہنے ہوئے تھیں۔ صوفے کے بازو پر سلیٹی رنگ کے فر کا مفت پڑا ہوا تھا جس کے بیرونی حصے پر لپ سٹک، روج، پاوڈر اور چھوٹا آئینہ رکھنے کے لئے دو جیبیں بنی ہوئی تھیں مسز اختر پھول دان میں پینیزی، میری گولڈ اور ڈیزی کے پھول سجا چکیں تو مفت سے چھوٹا آئینہ نکال کر اپنے میک اپ کا جائزہ لینے لگیں۔ دفعتہً باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر روحی کا قہقہہ بلند ہوا مسز اختر نے باہر جا کر روحی اور الطاف کا استقبال کیا اتنے میں محکمۂ جنگلات کے مقامی آفیسر اپنی یورپین بیوی کے ہمراہ پہنچ گئے "گڈ ایوننگ، گڈ ایوننگ" کی پر تکلف آوازوں، مسکراہٹوں اور ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے کا سلسلہ ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ برطانوی فرم کے منیجر اپنی گوری چٹی بیوی کے ہمراہ پہنچ گئے ہر شخص جچے تلے اور چست فقروں سے مذاقِ سلیم کا ثبوت دینے لگا۔ پہلے خواتین اور بعد میں مرد نشست کے کمرے میں داخل ہوئے۔ گفتگو مری کی خوبصورت شام سے شروع ہو کر سیدھی لندن کے مضافات تک جا پہنچی۔ جہاں جنگلات کے مقامی آفیسر کی بیوی نے زندگی

کا پہلا سانس لیا تھا۔

"وہاں تو سورج کی روشنی کو آنکھیں ترس جاتی ہیں۔" یورپین خاتون نے اس انداز سے ہاتھ جھٹک کر کہا جیسے وہ سمندر پار کے دھندلکے سے اُکتا کر ہیر ڈریسنگ سیلون کو خیرباد کہہ آئی تھیں۔

"بھئی مجھے تو وہاں کا موسم بے حد پسند ہے۔" برطانوی فرم کے منیجر نے سگریٹ کا کش لیکر کہا۔

"بھیا پاؤنڈ اسٹرلنگ کا بکھیڑا نہ ہو تو وہاں سے کون لوٹ کر آتا۔" محکمۂ جنگلات کے مقامی افسر نے یوں کہا جیسے وہ آواز اس کے دل کی گہرائیوں سے نکل رہی ہو۔

"مجھے تو نیویارک اچھا لگتا ہے۔ اگر میرے پاس ڈالر ختم نہ ہو جاتے تو میں اتنے حسین شہر کو کبھی نہ چھوڑتی۔" روحی اپنی انگلیوں کے چمکتے ہوئے سرخ سرخ ناخنوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"اچھا ہوا آپکے پاس ڈالر ختم ہو گئے ورنہ ہمارا الطاف اس دنیا میں تنہا رہ جاتا۔" اختر نے کہا اور جواباً قہقہوں پر قہقہے بلند ہونے لگے۔

پاؤنڈ اسٹرلنگ، ڈالر اور روپیہ، لندن، نیویارک اور مری۔ پرویز ان دو مثلثوں پر سوچ ہی رہا تھا کہ کچھ مہمان اور تشریف لے آئے۔ خواتین نے دستانے اتار کر نرم نرم انگلیوں سے مصافحہ کیا۔ گڈ ایوننگ، گڈ ایوننگ، تھوڑی دیر کے لئے مہمانوں کا تانتا بندھ گیا۔ رنگ و بو کی دنیا کروٹیں لینے لگی۔ ہونٹوں کی سرخی، گلابی اور کلیجی رنگ کی کلیاں چاروں طرف کھل گئیں۔ رنگ برنگی ساڑھیاں، فر کے کوٹ، ڈنر سوٹ، سیاہ شیروانیاں، سلیم شاہی جوتے اور سیاہ پیٹینٹ کے شوز، سب نے مل جُل کر دونوں مثلثوں کو غلط ملط کر دیا۔ پرویز کی آنکھوں کے سامنے دونوں مثلثوں پر بہت سارے خط کھنچ گئے۔ بے شمار زاویے بن گئے۔ اور ہر زاویئے سے لاتعداد سنہری لکیریں نکلنے اور گم ہونے لگیں۔ پرویز دل ہی دل میں اختر کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ اختر نے اُسے بتایا تھا کہ آج کی کاک ٹیل پارٹی اور ڈنر پر تقریباً ایک ہزار روپیہ خرچ ہو گا اور نیز یہ کہ وہ سوشل اجتماع کاروباری نقطۂ نظر سے نہایت اہم اور ضروری تھا۔ اس لئے کہ اس دن محکمۂ جنگلات کے حکام اعلےٰ ملک کے گوشے گوشے سے مری آئے ہوئے تھے اور اختر کی نگاہِ دُوربین صرف مری، ہزارہ، کوہ ہندو کش، کوہ سلیمان، چترال، سوات اور تبت کے جنگلات ہی پر نہیں بلکہ چٹا گانگ، سلہٹ اور سندربن کے جنگلات پر بھی تھی۔ وہ شہتوت، شیشم، چیڑھ، پڑتل، دیودار اور کیل کے محدود دائرے سے نکل کر منگرو، ساگوان اور سنبل کی وسیع دنیا میں قدم رکھنے کا متمنی تھا۔ اور وہ مقام حاصل کرنے کے لئے ایک شاندار کاک ٹیل پارٹی

"اور ڈنر کی اشد ضرورت تھی۔

"آپ کی شیتی تشریف نہیں لائیں؟" برطانوی فرم کے منیجر کی گوری چٹی بیوی نے پرویز سے مخاطب ہو کر کہا۔

پرویز نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

وائن ٹرومیاں حرکت کرنے لگیں۔ ورموتھ، وہسکی، برانڈی، شیری، بیئر، رم اور جن کے دور چلنے لگے۔ آہستہ آہستہ گرد و پیش، آس پاس اور فرداً فرداً پر مسکرات کا اثر نمایاں ہونے لگا۔ سرور کی بہار میں طبیعتوں کے شگوفے کھلنے لگے۔ ذہنی مسرت نے اپنی تمام رعنائیاں، دلفریبیاں اور گمبھیرتا چاروں طرف بکھیر دی۔ پرویز اپنی ذہنی اور ستاری کش مکش کو وہسکی میں ڈبو کر محفل کا ساتھ دینے لگا۔ برطانوی فرم کے منیجر کی کم گفتار بیگم کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ رنگ برنگی ساڑھیاں مل کر جیسے قوس قزح بن گئی ہوں۔ کانوں میں لرزتے ہوئے آویزے جیسے سرگوشیاں کر رہے ہوں ہر شخص ایک دوسرے کو قریب پانے لگا۔ تکلف کی جگہ بے تکلفی نے لے لی۔ جینے کا لطف آنے لگا۔ روحی کا گنگنا قہقہوں میں بدل گیا۔ مسز اختر کی لپک جھپک اور حاضر جوابی مخمور چہل پہل کو ہر قدم پر کمک پہنچاتی رہی۔

ڈرائینگ روم میں کھانے کی لمبی میز پر بلور کی صراحیاں سجی ہوئی تھیں جن میں نپولین وائن تھی۔ یہ کھانے کے ساتھ پینے کے لئے مخصوص تھی۔ ایک میز پر فرانس کی بوتلیں پڑی تھیں جن میں سبز رنگ کی شراب تھی۔ اُن کے پاس ڈیمبوئی کی بوتلیں رکھی تھیں جن میں زردی مائل شراب تھی۔ چند بوتلیں کومیل کی تھیں جن میں سفید شراب تھی۔ مشروبات کی یہ قسمیں کھانے کے بعد پینے کے لئے وقف تھیں۔

یکایک محکمہ جنگلات کے ایک آفیسر اعلے نے جام بلند کر کے کہا۔

"مسز اختر کی صحت کا جام"

ساغروں کے ٹکرانے کی آوازیں آئیں۔ پھر آتش سیال آنتوں میں دوڑ دوڑ کر آنکھوں کے گلابی ڈورے گہرے سرخ کرنے لگی۔ مسز اختر کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ الطاف نے سگار کا ایک گہرا کش لے کر دھوئیں کا بادل روحی کے چہرے پر چھوڑ دیا اور اُسے یوں معلوم ہوا جیسے ایک خواب آور دھند لکے میں سے اُبھر کر روحی کا کھڑا نقش سامنے آ گیا ہو۔ جیسے روحی کی پنسل سے بنی ہوئی ابروؤں کی کمانوں کے تلے آنکھوں کی پتلیوں کے ارد گرد چھپی ہوئی شوخی اس کی روح کی گہرائیوں میں اترتی چلی جا رہی ہو۔

" جادو بھری آنکھیں " الطاف نے رومان انگیز لہجے میں سرگوشی کی۔ یہ سنکر روحی کے ابھرے ہونٹ کپکپانے لگے۔ الطاف کا یہ فقرہ روحی سینکڑوں مرتبہ سن چکی تھی۔ مگر الطاف کے لہجے میں رومان کی وہ گہرائی اور گیرائی نہ تھی جو نیو یارک کے ایک شہری گرفتہ نامی کے لہجے میں تھی۔ گرفتہ کے سنہرے اور گنگھریالے بال اب بھی روحی کو یاد آرہے تھے۔ اور اس بے اختیار یاد پر اختیار پانے کے لئے روحی شیری کا پورا جام ایک ہی سانس میں پی گئی۔

" آج نہیں، آج نہیں " مسز اختر کی آواز آئی۔ چند خواتین مسز اختر کو مشرقی رقص کرنے پر مجبور کررہی تھیں اور مسز اختر مسلسل انکار کئے جارہی تھیں۔

" ہیلن آف ٹرائے " ایک لمبے چوڑے اور بڑی بڑی مونچھوں والے آفیسر نے باواز بلند کہا اور آنا فانا ہر شخص کی نگاہ اس خاتون پر جم کر رہ گئی جو سنتے ہی آکر صوفے پر کھڑی تھی۔ اس کا یونانی ناک نقشہ ہیلن آف ٹرائے کی یاد تازہ کر رہے تھے۔

" ہیلن آف ٹرائے کی صحت کا جام " لمبے چوڑے اور بڑی بڑی مونچھوں والے آفیسر نے ساغر بلند کرتے ہوئے کہا۔

ساغروں کے ٹکرانے کی آوازیں آئیں۔

ہیلن آف ٹرائے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہر شخص قہقہے مارنے لگا۔ منٹگمری، ساگوان اور سنبل کی وسیع دنیا میں سونے اور چاندی کی جھنکار سنائی دینے لگی لمبے چوڑے اور بڑی بڑی مونچھوں والے آفیسر کا ایک ماتحت عہدے دار بغلیں جھانکنے لگا اور چند لمحوں کے لئے اختر کو وہ دن یاد آگیا جب ہیلن آف ٹرائے کی صحت کا جام بلند کرنے والے نے دفتر میں بیٹھ کر اس سے ملاقات کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

" سگریٹ " ایک سانولے رنگ کی عورت نے پرویز کی طرف سگریٹ کا ٹن بڑھاتے ہوئے کہا۔

" شکریہ " پرویز نے سگریٹ لے کر لائٹر سے پہلے اس کا پھر اپنا سگریٹ سلگایا اور پھر وہ سانولے رنگ کی خاتون ایک یوروپین لیڈی سے گفتگو کرنے لگیں اور پرویز کو برطانوی فرم کے منیجر کی گوری چٹی بیوی نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

" اس دن سلو فاکس ٹراٹ میں آپ مسز اختر کے پارٹنر تھے۔ مجھے آپ کا ناچ بہت پسند آیا " منیجر کی بیوی بولی۔

" شکریہ " پرویز نے جواب دیا۔

"اور برج کے کھیل میں تو میں آپ کی بصیرت کی قائل ہو چکی ہوں۔"

"شکریہ" پرویز نے یہ کہہ کر ساغر ہونٹوں سے لگا لیا۔ وھسکی کے گھونٹ حلق سے اُتر اُتر کر اندر کی آنچ کو تیز سے تیز تر کرنے لگے۔ نگاہوں نے نشے سے دیکھا۔ خیالوں اور یادوں نے نشے سے پکارا۔ اور آن کی آن میں تخیل کی اڑان کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ سرسبز و شاداب بنگال جس کی دھرتی سے سنہرا ریشہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کے شمالی حصہ میں پدما بہتی ہے۔ اس پدما کے کنارے پرویز نے پہلی بار ششتی کے ہاتھ کو چھوا تھا۔ نارائن پور کے ریتلے میدان میں ایک چھوٹی سی جھیل تھی۔ جس کے کنارے پر ششتی نے ایک گیت گایا تھا۔ ایک ناچ ناچا تھا۔ وہ مرشد آباد کی حدود کو چھو کر واپس شاہی لوٹ آئے تھے۔ پھر ششتی کا گونا تھا۔ پیراڈائز ہاؤس بوٹ، سانولی سینٹوریم اور مری کا پُر فضا مقام۔ کشمیری دیہات کی تصویر آج پھر بولنے لگی۔ گل نواز کی رعنیہ زندہ رہ رہ کر مرنے لگی اور مر مر کر زندہ رہنے لگی۔ زینت ڈھلوان راستہ پر آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ اس کے پاؤں میں اونچی ایڑی کی سینڈلوں کی بجائے فلیٹ ہیل کی سینڈلیں تھیں۔ اس نے غرارے دار پاجامے پر ڈھیلا ڈھالا کرتا پہن رکھا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے نظر آ رہے تھے چہرے کی رونق مدھم پڑ گئی تھی۔ سفید گلاب کا پھول کمھلا گیا تھا۔ اور اس کے ہمراہ داڑھی کی منڈی کا بادشاہ کلے خان جا رہا تھا جس کے زری کلاہ پر شہدی لنگی کا طُرّہ مور کے پروں کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اور ششتی سینٹوریم میں چیڑ کے درختوں سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ ایک نئی دنیا کی تلاش میں گھر سے بھاگ آئی تھی اور ابھی تک ایسا گھر نہ بنا سکی تھی جہاں مکمل سکون ہو۔ بھرپور زندگی ہو، ناچ ہو، گیت ہوں، اور ننھی منی زندگیوں کی چہل پہل ہو۔ مانجھی کی چوتھی بیوی پرویز کی آنکھوں کے سامنے تڑپنے لگی۔ مری مال پر پنجاب ہوٹل کے کمرہ نمبر پانچ سے کسی عورت کی آواز سنائی دینے لگی "میں زہر کھاؤں گی۔ اپنی جان دے دوں گی۔" پھر آیا کی آواز آنے لگی "یہ بوتل بول نہیں سکتی مگر ٹوٹ سکتی ہے" سوچتے سوچتے پرویز کا جی گھبرا گیا۔ وھسکی کا ایک لبالب جام حلق میں انڈیل کر اُس نے دائیں بائیں دیکھا۔ خوبصورت چہرے، مسکراہٹیں، قہقہے، بہکی بہکی باتیں، رونق، گہما گہمی، جیتی جاگتی بھرپور زندگی۔ ابھرتی ہوئی یادیں پھر دب گئیں۔

"ابھی آج نہیں۔ پھر کبھی" مسز اختر مسلسل انکار کئے جا رہی تھیں۔ منیجر کی بیوی گھنگروؤں کی جوڑی ہتھیلی پر رکھے منتظر کھڑی تھی۔ دو عورتیں مسز اختر کے ہاتھ پکڑ کر صوفے پر سے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اختر بیلن آف ٹراے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ رو حی چہک چہک کر ایک یورپین سے گفتگو کر رہی تھی۔ الطاف کے منہ سے نکلتے ہوئے دھوئیں کے بادل ایک سانولے نسوانی چہرے پر منڈلا رہے تھے۔

دفعتہً پرویز کے ہاتھ سے جام گر پڑا۔ اختر کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ الطاف حیرت سے آنکھوں کو

کھولتے اور بند کرنے لگا۔ سناٹا چھا گیا۔ معزز مہمان ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

ششی دہلیز پر کھڑی تھی۔ وہ سفید شال اوڑھے ہوئے تھی۔ سفید جارجٹ کی ساڑھی اور پورے بازو کے سفید سوئیٹر میں وہ آن اور دلربائی کا مجسمہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا بھاری جوڑا روشنی میں جگمگ رہا تھا۔ اس کے کانوں کی لوؤں میں طلائی ٹاپس جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ روگ نے اس کے متناسب بدن کو چھریرا کر دیا تھا جس کا بانکپن اور لطافت اور اجاگر ہو گئے تھے۔

"ششی!" پرویز جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز سے پکارتا ہوا آگے بڑھا۔

منیجر کی بیوی دوڑ کر ششی سے لپٹ گئی۔ اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی "یہ ہماری ششی ہیں جن کا ناچ دیکھ کر آپ دنگ رہ جائیں گے۔"

پرویز کو منیجر کی بیوی کا یہ رویہ قطعاً پسند نہ آیا۔ مسز اختر بھویں سکیڑ کر کونے والے کرے کے متعلق سوچنے لگیں۔

"وہسکی" ایک آفیسر نے ششی سے مخاطب ہو کر جام پیش کیا۔

"شکریہ" ششی نے مسکرا کر جام تھام لیا اور پھر آنکھیں بند کر کے سارا جام ایک ہی سانس میں ختم کر ڈالا۔

پرویز کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ الطاف اور اختر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

منیجر کی بیوی نے ششی کو کلائی سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا اور پھر اس کے پہلو میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگی۔

"برانڈی"

"شکریہ"

"رم"

"مہربانی"

اوپر تلے تین جام پی کر ششی سرور میں آ گئی۔ سگار، پائپ اور سگریٹ کے دھوئیں اٹھ اٹھ کر فضا میں پھیلنے لگے۔ ششی کے آنے سے پہلے مختلف موضوعات پر باتیں ہو رہی تھیں۔ مگر اب صرف ششی گفتگو کا موضوع بن کر رہ گئی۔

ششی نے پیاسی آنکھوں سے پرویز کی طرف دیکھا اور پھر چوتھے جام کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔ یہ سب کچھ آنکھ جھپکتے میں ہو گیا۔ پرویز، الطاف اور اختر کو تو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ ملا۔

آخر اختر نے منیجر کی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا "معاف کیجئے۔ یہ تھکی ہوئی آئی ہیں ذرا آرام

کرلیں تو بہتر ہوگا۔"

پیشتر اس کے کہ منیجر کی بیوی کچھ جواب دیتیں سشتی بول اٹھی "مجھے تکان بالکل نہیں معلوم ہو رہی۔ بھلا اتنی اچھی محفل چھوڑ کر بھی کوئی جا سکتا ہے۔"

اختر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ قہقہوں، مسکراہٹوں، بہکی بہکی باتوں اور مزے مزے کے ہنگامے میں سشتی کے چہرے پر ایک ناقابلِ بیان مسرت کھیلنے لگی۔ جیسے اس کی آنکھیں کہہ رہی ہوں "یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ مجھے زندگی سے پیار ہے۔ میں جینا چاہتی ہوں۔ میں ایک گھر بساؤں گی جہاں تم ہوگے۔ بھرپور زندگی ہوگی۔ ناچ ہوگا۔ گیت ہوں گے اور ننھی ننھی زندگیوں کی چہل پہل۔"

منیجر کی بیوی نے سشتی کے کان میں کچھ کہا اور پھر گھنگھروؤں کی جوڑی اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ ہیلن آف ٹرائے نے صوفہ پر کھڑے ہو کر رقص کا اعلان کیا۔ سب تالیاں پیٹنے لگے۔ ماحول ہی بدل گیا۔

"رقص ہال میں ہوگا۔" ایک آواز آئی۔

سب اٹھ کر ہال میں چلے گئے۔

چند لمحوں میں بات کہاں سے کہاں جا پہونچی۔ واقعات عجیب سرعت اور بے ساختگی سے رونما ہوئے۔ پرویز حیران نظروں سے دیکھتا رہ گیا۔ سوچنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ ہر شخص لاابالیانہ رنگ میں تھا۔ فرد فرد، گذشتہ کل اور آنے والے کل سے بے نیاز ہو کر آج کی ہر ساعت کو جی کر، زندہ رہ کر ہنس کھیل کر بسر کر رہا تھا۔

دفعتہً گھنگھروؤں کی چھناچھن ہال کے کونے کونے میں گونج اٹھی۔ مسز اختر نے چونک کر سامنے دیکھا۔ وہی گھنگھرو پہن کر مسز اختر بھی ناچا کرتی تھیں۔ مگر آج ان پتیل کی چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں میں جیسے جان پڑ گئی ہو۔ سانولے پاؤں موزیک فرش کے صاف و شفاف سینے پر بڑی پھرتی، بے باکی اور برجستگی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ دیکھنے والے بت بنے کھڑے تھے۔ پرویز بھی بت بنا کھڑا تھا۔ ہر شخص رقص میں کھو گیا۔ منیجر کی بیوی نے اپنے ماتھے پر آئی ہوئی لٹ کو انگلیوں سے پکڑ کر پرے نہ ہٹایا۔ جیسے اتنی سی جنبش بھی ناچ میں خلل انداز ہوگی۔ کسی نے سگار نہ سلگایا۔ کسی نے سگریٹ کا کش نہ لیا۔ جیسے کہ مسکراہٹ اور چوڑیوں کی جھنکار تک پیدا نہ ہوئی۔ صرف گھنگھرو گیت گاتے رہے، درمیان میں بدن کی لطافت اور بانکپن بولتا رہا۔

منگرد، ساگوان اور سنبل کی وسیع دنیائیں پردہ چلی گئی۔ اسلاف کی تراشیدہ رسمیں بھی سب سمجھے

رہ گئی۔ شکارا، ہیرا، ستائیں۔ نیٹگو اور کانٹریکٹ برج کی باتیں تاریکیوں میں ڈوب گئیں۔ روحی کا نیویارک سمٹ کر سانولے پیروں میں لرزنے لگا۔ ہیلن آف ٹرائے پرس کو دونوں ہاتھوں میں دبا کر پھر یونانی مجسمہ بن گئی۔ تمام احساسات۔ کل موتی اور ملی بلندیاں لوچ لچک کے سمندر میں کھو گئیں۔ پرویز کا دل بولنے لگا۔ روح پکارنے لگی۔ اور وہ اُس اجنبی آواز کو پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ جس کا وہ ایک مدت سے انتظار کر رہا تھا۔ اُسنے سوچا سویرا اب ہوا ہے۔ وہ سامنے پگڈنڈی ہے اور وہ پگڈنڈی ادھر جاتی ہے جدھر ششی کا گھر ہوگا۔ جہاں بھرپور زندگی ہوگی۔ ناچ ہوگا۔ گیت ہوں گے اور ننھی ننھی زندگیوں کی چہل پہل۔"

ششی ناچتے ناچتے پرویز کے قریب آگئی۔ پاؤں کی رفتار مدھم پڑ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں کانپ رہی تھیں۔ وہ بے تحاشا ہانپ رہی تھی۔ یکایک سانولی باہیں رک گئیں۔ چھنا چھن کی بہتی ہوئی ندی خاموش ہو گئی۔ دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں نے ایک بھرپور نظر پرویز کے چہرے پر ڈالی۔ دفعتہً جیسے ششی رقص کا ایک عمیق غوطہ لے رہی ہو۔ وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑی۔ پرویز نے لپک کر اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"پرویز بابو اب میں تمہیں کہیں نہ جانے دوں گی۔" ششی مدھم آواز میں بولی "میں تمہارے لئے ایک سوئیٹر بنوں گی، ایک فاختائی رنگ کی ٹی کوزی بناؤں گی، میز پوش پر سبز اور گلابی رنگ کے دھاگوں سے بیل بوٹے کاڑھوں گی۔ تمہاری قمیص کے بٹن ٹانکوں گی، صحن میں چنبیلی اور رات کی رانی کے پھول اگاؤں گی . . . . . ."

یہ کہتے ہوئے ششی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پرویز کے ہاتھ پکڑ لئے اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے دُہرایا "اب میں تمہیں کہیں نہ جانے دوں گی۔"

"اب ہمیں دنیا کی کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی۔" پرویز نے خود اعتمادی سے کہا۔

ششی کے ہونٹوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

"یہ دنیا کتنی خوبصورت ہے" ششی نے ایک ہاتھ بلند کر کے کہا اور پھر وہ ہاتھ ٹوٹی ہوئی ٹہنی کی طرح کالی شیروانی کو چھوتا ہوا سفید ساری پر گر پڑا۔ اور ششی چاندنی کی ایک کرن بنکر گیت کی ایک لے بنکر ابدی حسن کی انجانی راہوں میں گم ہو گئی۔